روشنی کے سفیر

پاکستان کے مثالی اساتذہ

پروفیسر آفتاب اقبال شمیم
علامہ آئی آئی قاضی
ڈاکٹر سید محمد ابوالخیر کشفی
پروفیسر ابوالاعجاز حفیظ صدیقی
پروفیسر ڈاکٹر ابواللیث صدیقی
پروفیسر احمد شاہ پطرس بخاری
پروفیسر ڈاکٹر ادیب الحسن رضوی
پروفیسر ارملا سراج الدین
ڈاکٹر اسلم انصاری
ڈاکٹر اسلم فرخی
پروفیسر ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی
پروفیسر ڈاکٹر اقتدا حسن
پروفیسر انجم رومانی
ڈاکٹر انعام الحق کوثر
پروفیسر انیتا غلام علی
پروفیسر حمید احمد خاں
خلیفہ عبدالحکیم
پروفیسر خلیل صدیقی
پروفیسر خواجہ مسعود
پروفیسر خواجہ منظور حسین
ڈاکٹر خورشید رضوی

ڈاکٹر رحیم بخش شاہین
پروفیسر ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی
پروفیسر ڈاکٹر سید سجاد باقر رضوی
ڈاکٹر سہیل احمد خاں
ڈاکٹر سی اے قادر
پروفیسر ڈاکٹر شریف المجاہد
پروفیسر شریف کنجاہی
پروفیسر شوکت سبزواری
پروفیسر ڈاکٹر محمد صدیق خاں شبلی
صوفی غلام مصطفیٰ تبسم
پروفیسر ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری
ڈاکٹر عاصی کرنالی
سید عابد علی عابد
علامہ عبدالعزیز میمن
ڈاکٹر سید عبداللہ
پروفیسر میر عبداللہ جان جمالدینی
پروفیسر عرش صدیقی
پروفیسر سید علی عباس جلالپوری

پروفیسر غلام جیلانی اصغر
ڈاکٹر غلام جیلانی برق
ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار
پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں
علامہ غلام مصطفےٰ قاسمی
پروفیسر فتح محمد ملک
ڈاکٹر فرمان فتح پوری
پروفیسر کرار حسین
ڈاکٹر کنیز فاطمہ یوسف
پروفیسر لطیف الزماں خاں
پروفیسر محمد حسن عسکری
پروفیسر محمد نواز طائر
ڈاکٹر محمود احمد غازی
پروفیسر مریم سلطانہ نوحانی
پروفیسر مولوی محمد شفیع
پروفیسر میر افیلبوس
پروفیسر نادر قمبرانی
ڈاکٹر نبی بخش خاں بلوچ
ڈاکٹر نذیر احمد
ڈاکٹر وحید قریشی
پروفیسر سید وقار عظیم

مرتبین
ڈاکٹر راشد حمید
ڈاکٹر صفدر رشید

ادارہ فروغ قومی زبان، قومی تاریخ و ادبی ورثہ ڈویژن ۲۰۱۸ء

روشنی کے سفیر

پاکستان کے مثالی اساتذہ

مرتبین

ڈاکٹر راشد حمید

ڈاکٹر صفدر رشید

ادارہ فروغ قومی زبان، اسلام آباد

قومی تاریخ و ادبی ورثہ ڈویژن

فہرست

o	عرضِ حال	افتخار عارف	۷
oo	پیش لفظ	عرفان صدیقی	۹

نمبر شمار	نام مضمون	مضمون نگار کا نام	صفحہ نمبر
۱	پروفیسر آفتاب اقبال شمیم	ڈاکٹر صفدر رشید	۱۱
۲	علامہ آئی آئی قاضی	ڈاکٹر ظفر حسین ظفر	۱۵
۳	ڈاکٹر سید محمد ابوالخیر کشفی	ڈاکٹر سید عزیز الرحمٰن	۲۱
۴	پروفیسر ابوالاعجاز حفیظ صدیقی	پروفیسر امجد علی شاکر	۲۹
۵	پروفیسر ڈاکٹر ابواللیث صدیقی	پروفیسر ڈاکٹر معین الدین عقیل	۳۹
۶	پروفیسر احمد شاہ پطرس بخاری	ڈاکٹر عبدالواجد تبسم	۴۶
۷	پروفیسر ڈاکٹر ادیب الحسن رضوی	ڈاکٹر آصف فرخی	۵۱
۸	پروفیسر ارملا سراج الدین	پروفیسر عفت سعید	۵۶
۹	ڈاکٹر اسلم انصاری	ڈاکٹر محمد افتخار شفیع	۶۰
۱۰	ڈاکٹر اسلم فرخی	ڈاکٹر انوار احمد زئی	۶۹
۱۱	پروفیسر ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی	ڈاکٹر معین الدین عقیل	۷۹
۱۲	پروفیسر ڈاکٹر اقتدا حسن	ڈاکٹر امین اللہ وثیر	۹۲
۱۳	پروفیسر انجم رومانی	کرن رباب نقوی	۹۸
۱۴	ڈاکٹر انعام الحق کوثر	فیصل ریحان	۱۰۵
۱۵	پروفیسر انیتا غلام علی	مہتاب اکبر راشدی	۱۱۶
۱۶	پروفیسر حمید احمد خاں	میرزا ادیب	۱۲۱
۱۷	خلیفہ عبدالحکیم	ڈاکٹر محمد آصف اعوان	۱۲۵

۱۸	پروفیسر خلیل صدیقی	پروفیسر ڈاکٹر انوار احمد	۱۳۷
۱۹	پروفیسر خواجہ مسعود	ڈاکٹر روش ندیم	۱۴۷
۲۰	پروفیسر خواجہ منظور حسین	ڈاکٹر طارق ہاشمی	۱۵۳
۲۱	ڈاکٹر خورشید رضوی	ڈاکٹر ناہید قمر	۱۵۹
۲۲	ڈاکٹر رحیم بخش شاہین	ڈاکٹر محمد وسیم انجم	۱۶۵
۲۳	پروفیسر ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی	ڈاکٹر راشد حمید	۱۷۱
۲۴	پروفیسر ڈاکٹر سید سجاد باقر رضوی	پروفیسر امجد علی شاکر	۱۸۰
۲۵	ڈاکٹر سہیل احمد خاں	ڈاکٹر عزیز ابن الحسن	۱۹۳
۲۶	ڈاکٹر سی اے قادر	قاضی جاوید	۲۰۳
۲۷	پروفیسر ڈاکٹر شریف المجاہد	ڈاکٹر طاہر مسعود	۲۰۹
۲۸	پروفیسر شریف کنجاہی	ڈاکٹر محمد منیر احمد سلیچ	۲۱۴
۲۹	پروفیسر شوکت سبزواری	ڈاکٹر رؤف پاریکھ	۲۲۴
۳۰	پروفیسر ڈاکٹر محمد صدیق خاں شبلی	ڈاکٹر زینت افشاں	۲۳۳
۳۱	صوفی غلام مصطفیٰ تبسم	زاہد حسن	۲۴۲
۳۲	پروفیسر ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری	ڈاکٹر سید عزیز الرحمٰن	۲۴۹
۳۳	ڈاکٹر عاصی کرنالی	ڈاکٹر لیاقت علی	۲۵۵
۳۴	سید عابد علی عابد	ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد	۲۵۸
۳۵	علامہ عبدالعزیز میمن	ڈاکٹر رؤف پاریکھ	۲۶۶
۳۶	ڈاکٹر سید عبداللہ	ڈاکٹر روبینہ شاہین	۲۷۱
۳۷	پروفیسر میر عبداللہ جان جمالدینی	ڈاکٹر شاہ محمد مری	۲۸۲
۳۸	پروفیسر عرش صدیقی	رضی الدین رضی	۲۹۰
۳۹	پروفیسر سید علی عباس جلالپوری	پروفیسر امجد علی شاکر	۲۹۲
۴۰	پروفیسر غلام جیلانی اصغر	ڈاکٹر عابد سیال	۳۰۶

۴۱	ڈاکٹر غلام جیلانی برق	ڈاکٹر عبدالعزیز ساحر	۳۱۳
۴۲	ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار	ڈاکٹر پروین کلّو	۳۲۰
۴۳	پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں	ڈاکٹر مسرور احمد زئی	۳۲۶
۴۴	علامہ غلام مصطفےٰ قاسمی	آغا نور محمد پٹھان	۳۳۳
۴۵	پروفیسر فتح محمد ملک	ڈاکٹر سعدیہ طاہر	۳۳۸
۴۶	ڈاکٹر فرمان فتح پوری	خواجہ رضی حیدر	۳۴۳
۴۷	پروفیسر کرّار حسین	ڈاکٹر انوار احمد زئی	۳۴۸
۴۸	ڈاکٹر کنیز فاطمہ یوسف	ڈاکٹر فہمیدہ تبسم	۳۵۳
۴۹	پروفیسر لطیف الزماں خاں	شاکر حسین شاکر	۳۵۸
۵۰	پروفیسر محمد حسن عسکری	ڈاکٹر عزیز ابن الحسن	۳۶۵
۵۱	پروفیسر محمد نواز طائر	ڈاکٹر سلمٰی شاہین	۳۷۸
۵۲	ڈاکٹر محمود احمد غازی	ڈاکٹر سید عزیز الرحمٰن	۳۸۹
۵۳	پروفیسر مریم سلطانہ نوحانی	مہتاب اکبر راشدی	۳۹۵
۵۴	پروفیسر مولوی محمد شفیع	ڈاکٹر محمد اشرف کمال	۴۰۱
۵۵	پروفیسر میر افیلبوس	ڈاکٹر شیبا عالم	۴۱۳
۵۶	پروفیسر نادر قمبرانی	افضل مراد	۴۱۶
۵۷	ڈاکٹر نبی بخش خاں بلوچ	پروفیسر ڈاکٹر محمد قاسم بگھیو	۴۲۱
۵۸	ڈاکٹر نذیر احمد	ڈاکٹر آفتاب احمد	۴۲۹
۵۹	ڈاکٹر وحید قریشی	ڈاکٹر نسیم بانو	۴۳۸
۶۰	پروفیسر سید وقار عظیم	ڈاکٹر اصغر ندیم سید	۴۴۸

عرضِ حال

مشرق ومغرب کی تہذیبوں کی معلوم تاریخ گواہ ہے کہ ہر دور اور ہر معاشرے میں اساتذہ کرام کو ہمیشہ عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا رہا ہے۔ ہماری قومی تاریخ اساتذہ کی ایسی مثالوں سے ثروت مند ہے جنھوں نے نسلوں کی تہذیب و تربیت میں بنیادی کردار ادا کیا ہے۔ اردو کے ممتاز استاد اور دانش ور پروفیسر سید وقار عظیم کی شخصیت اور فن کے حوالے سے عزیزم اختر وقار عظیم کی کتاب ''پدرم سلطان بود'' کی تقریب رونمائی کے صدارتی خطبے میں مشیر وزیر اعظم جناب عرفان صدیقی نے ایک تجویز دی کہ کیا ہی اچھا ہو کہ ہم مثالی اساتذہ پر مثالیے (رول ماڈل) کی حیثیت سے کتابیں مرتب کریں۔ ماہرین کی ایک مجلس کی زیر نگرانی ملک بھر سے سو (۱۰۰) اساتذہ کا انتخاب کیا گیا ان میں سے ساٹھ (۶۰) تعارفی مضامین جمع ہوئے جن پر مشتمل پہلی جلد اساتذہ کے احوال و آثار کو محیط ہے۔ فہرست پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہو جائے گا کہ نامور اساتذہ کے بارے میں لکھنے والے بھی اپنی جگہ ہماری علمی و ادبی دنیا کے ممتاز لوگوں میں شامل ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ تعارفی نوعیت کے مضامین ہیں لیکن ان کو پڑھ کر نہ صرف یہ کہ ہمیں اپنے محسنوں کو یاد کرنے کی ایک سبیل مہیا ہوتی ہے بلکہ یہ بھی خیال پیدا ہوتا ہے کہ ان شخصیتوں پر مفصل کام کیا جانا چاہیے۔ ایک ہی جلد میں سارے مضامین شامل کرنا معمول کی ضخامت سے بہت زیادہ ہو جاتا، اس لیے طے کیا گیا کہ اس پر مزید جلدیں بھی مرحلہ وار شائع کی جائیں گی۔

پاکستان کے عظیم اساتذہ کو خراج عقیدت پیش کرنے کی غرض سے ان کے احوال و خدمات کے تذکرے پر مشتمل اپنی نوعیت کی یقیناً یہ پہلی کتاب ہے۔ یہ بات بھی کم اہم نہیں کہ یہ کتاب شائع کرنے کا اعزاز ادارہ فروغ قومی زبان کو حاصل ہو رہا ہے۔ اس امر پر بے حد طمانیت کا احساس ہے کہ شاید ہی کوئی کتاب ہو جس میں بہ یک وقت اتنی بڑی تعداد میں ایسی غیر معمولی شخصیات کو موضوع بنایا گیا ہو۔ بلا شبہ ان ہستیوں نے کئی نسلوں کی ذہن سازی اور کردار سازی

میں بنیادی کردار ادا کیا ہے۔

ایک گزارش جو سب سے پہلے کی جانی چاہیے تھی، وہ یہ ہے کہ پاکستان کے ستر برس میں ہر سطح پر بے شمار ایسے اساتذہ ہوں گے، جنھوں نے مختلف سطحوں پر لوگوں کو متاثر کیا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ سب کو شامل اشاعت کرنا ضخیم سے ضخیم کتاب کی ایک جلد میں ممکن نہیں تھا۔ مدرسے سے لے کر دانش گاہوں تک تعلیم و تدریس کی بے شمار جہتیں ہیں، علوم کی مختلف سطحوں سے متعلق اساتذہ ہیں، یہاں تک کہ ایسے ایسے ذہن سازی کرنے والے عظیم اساتذہ بھی یقیناً قابل ذکر ہیں اور ہمارا عظیم تدریسی اور علمی سرمایہ ہیں، جنھوں نے یقیناً اداروں سے بڑھ کر کام کیا۔ ہماری مجبوری یہ ہے کہ عمومی طور پر جامعات میں خدمات انجام دینے والے اساتذہ ہی ہمارا موضوع ہیں۔ بڑے شہروں اور نامور دانش گاہوں میں ہی نہیں، قصبوں اور گاؤں دیہات میں بھی ایسے مثالی اساتذہ موجود رہے اور آج بھی موجود ہیں، جنھوں نے اپنے شاگردوں کی زندگیاں بدل دیں۔ ہمیں اس کا احساس ہے اور ان شاءاللہ آئندہ ان شخصیتوں پر مضامین کی اشاعت بھی زیر غور لائی جائے گی۔

مجھے اس بات کا احساس ہے اور یقیناً آپ کو بھی یہ خیال گزر رہا ہوگا کہ بعض بہت اہم نام اساتذہ کی فہرست میں نظر نہیں آ رہے، اعتراف کرنا چاہیے کہ پہلی جلد میں جو نام نظر نہیں آ رہے وہ ان شاءاللہ اگلی جلد میں شامل ہوں گے۔ درخواست یہ بھی ہے کہ اگر قارئین کے ذہن میں کوئی بڑا نام آئے، جو اس کتاب میں شامل ہونے سے رہ گیا ہو تو اس کی نشان دہی ضرور فرما دیں۔

میرا ایک خوشگوار فریضہ ہے کہ اس کتاب کے لائق اور صاحب علم مرتبین عزیزم ڈاکٹر راشد حمید اور برادر عزیز ڈاکٹر صفدر رشید کا خاص طور پر شکریہ ادا کروں کہ جن کی توجہ، لگن اور انہماک کے سبب یہ کتاب مکمل ہو کر شائع ہو سکی۔ ملک بھر کے ممتاز اساتذہ کی فہرست میں سے ناموں کا انتخاب اور پھر ان کے بارے میں لکھوانے کا کام بہت آسان نہیں تھا مگر مرتبین نے اسے بحسن و خوبی انجام دیا جو میرے لیے اور قومی تاریخ و ادبی ورثہ ڈویژن کے لیے خوشی اور طمانیت کی بات ہے۔

افتخار عارف

پیش لفظ

شرق و غرب کے تمام معاشروں میں اساتذہ کی قدر و منزلت بنیادی جوہر کی حیثیت رکھتی ہے۔ افراد کے ذہن و فکر کی تعمیر اور معاشروں کی تہذیب و اقدار کی پرورش میں اساتذہ بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔ تعلیم و تدریس کے عمل میں جدید تکنیکی مہارتوں اور متنوع تبدیلیوں کے باوجود استاد کا کردار آج بھی مرکزی اہمیت رکھتا ہے۔ پاکستان جیسے نظریاتی معاشرے اور مخصوص سماجی اقدار کے حامل ماحول میں استاد کی حیثیت اور بھی زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ ہمارے بعض اساتذہ نے کمرہ جماعت کی محدود دنیا سے ہٹ کر پورے معاشرے کی علمی، ادبی اور اخلاقی جہتوں پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔

استاد گرامی مرتبت پروفیسر سیّد وقار عظیم مرحوم کی شخصیت پر برادر عزیز سید اختر وقار عظیم کی کتاب ''پدرم سلطان بود'' کی تعارفی تقریب کے موقعے پر اظہار خیال کرتے ہوئے میں نے اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ ہمیں ایسے اساتذہ کی شخصیتوں کو بھی نمایاں کرنا چاہیے جن سے نسلیں فیضیاب ہوئیں اور جو مینارۂ نور بن کر عمر بھر زندگی کی جدوجہد میں ان کی رہنمائی کرتے رہے۔ میں نے برادرم افتخار عارف کے سپرد یہ کام کیا کہ ملک بھر کی مختلف دانش گاہوں اور تعلیمی اداروں سے مثالی اساتذہ کی فہرست مرتب کریں اور مختصر مضامین پر مشتمل ایک سے زیادہ کتابی جلدوں میں اسے شائع کیا جائے۔ اس سلسلے کی ساٹھ (۶۰) افراد کی طویل فہرست پر مضامین لکھوائے گئے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کی کوئی فہرست حتمی نہیں ہو سکتی، پھر بھی عمومی مقبولیت کو پیش نظر رکھا گیا اور ان کے قد و قامت کو بھی ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے۔

یوم پاکستان کی مناسبت سے اساتذہ کرام کی روشن شخصیت اور خدمات پر یہ کتاب ایک خراج عقیدت کی حیثیت رکھتی ہے۔ قومی مشاہیر (National Icons) پر مرتبہ اپنی نوعیت کی یہ منفرد کتاب ڈاکٹر راشد حمید اور ڈاکٹر صفدر رشید کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔

قومی تاریخ وادبی ورثہ ڈویژن کے منصوبے کی تکمیل کے لیے ادارہ فروغِ قومی زبان کا نامور اساتذہ کے احوال وکوائف اور خدمات کو کتابی شکل میں مرتب کرنے کا سلسلہ لائق تحسین ہے۔ میں اس منصوبے کی کامیابی کے لیے دعا گو ہوں۔

عرفان صدیقی

پروفیسر آفتاب اقبال شمیم

ڈاکٹر صفدر رشید

۱۹۹۲ء میں بی۔اے کرنے کے بعد راولپنڈی/اسلام آباد کے تین کالجوں میں ایم۔اے انگریزی میں داخلہ مل گیا۔ جب ادارے کے انتخاب کا وقت گیا تو ہر جگہ سے یہی مشورہ ملا کہ گورڈن کالج کا انتخاب کیا جائے کیونکہ یہاں پروفیسر سجاد شیخ اور پروفیسر آفتاب اقبال شمیم جیسے اساتذہ موجود ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ گورڈن کالج کا ذکر ہو اور پروفیسر سجاد شیخ صاحب کا حوالہ نہ آئے۔ سجاد شیخ مرحوم ان اساتذہ میں سے ہیں جنہیں بے انتہا محبت واحترام ملا۔ کتاب اور طالب علم شیخ صاحب کی زندگی کا محور تھے۔ وہ واقعی ان اساتذہ میں شامل ہیں جنہوں نے طالب علموں میں علم و ادب اور کتاب کی لگن پیدا کی اور ان کی زندگیاں بدلیں۔ پی ٹی وی پر نشر ہونے والے شیکسپیئرین ٹریجڈی پر ان کے لیکچرز نے اس وقت علمی وادبی حلقوں میں دھوم مچا رکھی تھی۔ ایک مرتبہ انہوں نے ہمیں پیراڈائز لاسٹ کے ہیرو کے حوالے سے پانچ گھنٹے کا لیکچر دیا۔

آفتاب اقبال شمیم صاحب نہایت کم گو انسان ہیں اور شاید ہی کسی پر کھلے ہوں۔ ان کا اظہار بس ان کی نظم ہے۔ اس کے باوجود وہ یار باش آدمی ہیں اور بہت دوستیاں پالیں۔ وہ دوستوں کے ساتھ رتجگوں کے عادی تھے اور دیر گئے گھر داخل ہوتے۔ کالج میں آفتاب صاحب اور سجاد شیخ مرحوم کی جوڑی مشہور تھی، حالاں کہ بظاہر دونوں کے مزاج میں کوئی خاص بات مشترک نہیں تھی۔

آفتاب اقبال شمیم صاحب ۱۹۳۳ء میں جہلم میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام عبدالحکیم ہے جو شاعر بھی تھے مگر آفتاب صاحب ہی کی طرح کبھی اپنی تشہیر نہیں کی۔ آفتاب صاحب نے میٹرک جہلم سے کیا، ایف اے اور بی اے گورنمنٹ کالج اصغر مال، راولپنڈی سے اور ایم اے اردو

گورڈن کالج راولپنڈی سے کیا۔ ۱۹۶۳ء میں آفتاب صاحب گورڈن کالج میں ہی اردو کے لیکچرار ہو گئے۔ گورڈن کالج ان دنوں مشنری کالج تھا۔ فلسطین کے کسی مسئلے پر انہیں کالج سے ۱۹۶۷ء میں نکال دیا گیا۔ سجاد شیخ مرحوم کے اصرار اور ان کی ذاتی توجہ سے آفتاب صاحب نے پرائیویٹ ایم اے انگریزی کیا۔ سجاد شیخ صاحب ان دنوں انگلینڈ میں مقیم تھے۔ آفتاب صاحب نے انہیں خط لکھا کہ ''ایم اے انگریزی میں تم دوبارہ پاس ہو گئے ہو''۔ ۱۹۷۲ء میں آفتاب صاحب دوبارہ گورڈن کالج میں انگریزی کے لیکچرار مقرر ہوئے جہاں سے وہ ۱۹۹۳ء میں ریٹائر ہوئے۔ (ان کے اعزاز میں کالج میں ایک بڑی اور بھرپور الوداعی تقریب منعقد ہوئی جس کے سٹیج سیکریٹری ہونے کا اعزاز راقم کو حاصل ہے)

آفتاب صاحب کا ایک بڑا حوالہ چین میں اردو کی تدریس ہے۔ پہلی مرتبہ وہ ۱۹۷۲ء میں بیجنگ یونیورسٹی میں چار سال کے لیے گئے۔ اس کے بعد وہ دو مرتبہ مزید بیجنگ یونیورسٹی گئے۔ انہوں نے کم وبیش بارہ (۱۲) برس بیجنگ یونیورسٹی میں پڑھایا۔ پاکستان کی طرح وہاں بھی ان کے قدردان کم نہیں۔ چینیوں کی اردو سے محبت کے بارے میں آفتاب صاحب نے ایک واقعہ سنایا کہ ایک طالب علم نے حرف ''ز'' کی ادائیگی کے لیے اتنی مشق کی کہ اس کے منہ سے خون نکلنے لگا۔ ان کا کہنا ہے کہ انھوں نے چینی قوم سے کمٹمنٹ سیکھی۔

آفتاب صاحب کے قریبی دوست آصف ہمایوں ان پر اپنے خاکے ''نہ تو زمیں کے لیے ہے نہ آسمان کے لیے'' میں آفتاب صاحب کے بارے میں جو لکھتے ہیں وہ زبانِ خلق بھی ہے:

> ''آفتاب اقبال شمیم سے ملاقات کے ابتدائی دنوں میں ایک بڑی مشکل کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے بارے میں کالج کے اساتذہ اور طلباء کی رائے کم وبیش ایک سی تھی۔ تاہم کسی کو اس کے چہرے میں مہاتما بدھ کا چہرہ نظر آتا تو کسی کو ایک قلندر کا چہرہ۔ انگریزی شعبے کے صدر بشیر صاحب اسے بھکشو کہتے۔ کالج کے باہر سے آنے والے لوگوں میں احمد شمیم کی مسکراہٹ اس بات کا پتہ دیتی کہ وہ کالج میں ایک دوست چہرے کی تلاش میں آیا ہے۔۔۔ آفتاب کم گو ہے، بہت کم گو۔ بہت سے افراد کے درمیان بیٹھا ہو تو بڑی دیر کے بعد اُس کا ایک آدھ جملہ سنائی دے جاتا ہے۔ آپ اس کی طرف غور سے دیکھیں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے وہ بات

> کرنے کا ارادہ کر رہا ہے لیکن دوسرے ہی لمحے یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے اس نے ارادہ ترک کر دیا ہے۔''

آفتاب صاحب کی ایک بڑی صفت ان کی بے نیازی ہے۔ انہیں دیکھ کر اندازہ نہیں ہوتا کہ اس خاموش شخص کے اندر کیسا طوفان برپا ہے۔ اس طوفان کی شدت کا اندازہ ان کی نظموں اور خصوصاً طویل نظموں سے ہوتا ہے۔ آفتاب صاحب نے کبھی چھپنے پر توجہ نہیں دی۔ ان کی پہلی کتاب ۱۹۸۵ء میں ۵۲ برس کی عمر میں آئی۔ پھر ۱۹۸۹ء میں دوسری کتاب، جسے ان کی نمائندہ کتاب کہا جا سکتا ہے، ''زید سے مکالمہ'' آئی۔ طویل نظم سے ان کو ایسی مناسبت ہے کہ اس حوالے سے آزاد نظم کا کوئی دوسرا شاعر ان کا ہم سر دکھائی نہیں دیتا۔ وہ مختصر نظم سے مطمئن نہیں ہوتے۔ طویل نظم ان کے اندر سوال در سوال پیدا کرتی ہے۔ وہ خود کہتے ہیں کہ ان کے پاس کہنے کو بہت کچھ ہے جس کا اظہار صرف طویل نظم میں ہی ممکن ہے۔ تیسرا مجموعہ ''گم سمندر'' ہے۔ اس میں ان کا وجودی رنگ غالب ہے۔ وہ اس کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

> ''میرا وجدان اور شعور اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ میں ایک نیم آفریدہ دنیا میں پیدا ہوا ہوں۔ ایک نامکمل منظر کی نامکمل شناخت کرنے کے لیے۔ میری روشنی کے علاقے میرے وجود کے اندر، باہر اور اس کے مضافات میں کہیں کہیں واقع ہیں اور میں دیکھتا ہوں کہ ان کے بیچ میں خلا ہی خلا ہے۔ یہ علاقے نادریافت شدہ اسرار کے سمندر میں تیرتے ہوئے اوجھل ہوتے ہوئے ابھرتے ہوئے جزیرے ہیں۔ زندگی اپنی پہچان کے لیے مجھے مٹا کر پھر بناتی ہے اور بار بار ایک ہی نقش بنتا ہے۔ جس میں زندگی کا جوہر ایک لاتعلق خارجی حقیقت سے دست وگریباں نظر آتا ہے۔ کیا یہ جنگ لامتناہی ہے یا ہار جیت کے بغیر ختم ہو جائے گی؟ میں زندگی کے حق میں کوئی گواہی نہیں دے سکتا۔ وقت کی سمتیں اور ان کی طوالتیں میرے ادراک کے احاطے سے باہر ہیں۔''

آفتاب صاحب جیسے بڑے شاعر پر کوئی ایک لیبل چسپاں کرنا ممکن نہیں۔ وہ مارکسزم سے بھی متاثر ہوئے اور فلسفہ وجودیت یا موجودیت سے بھی، شائد اسی لیے وہ بیروں بیں بھی ہیں اور دروں بیں بھی۔ آفتاب صاحب کی نظم اسی وقت کسی قدر گرفت میں آسکتی ہے جب انھیں کُلیت میں دیکھا

جائے۔

ان کا چوتھا مجموعہ ''میں نظم لکھتا ہوں'' ہے جو ۲۰۰۹ء میں شائع ہوا۔ ۲۰۱۲ء میں آفتاب صاحب کی غزلوں کے مجموعے ''سایہ نورد'' کی اشاعت نے ادبی دنیا میں ایک خوشگوار حیرت پیدا کی۔ ایسا عام طور پر کم ہی دیکھنے میں آیا ہے کہ ایک بڑا نظم نگار منجھے ہوئے غزل گو کی حیثیت سے بھی سامنے آئے۔ ان کی مشہور غزل کے مطلع کا اطلاق خود آفتاب صاحب پر ہوتا ہے:

اک چادرِ بوسیدہ میں دوش پہ رکھتا ہوں
اور دولتِ دنیا کو پاپوش پہ رکھتا ہوں

آفتاب صاحب فطرتاً کم گو بلکہ شرمیلے انسان ہیں۔ کالج کے دنوں میں ہمیں معلوم نہیں تھا کہ ہم کتنے بڑے انسان اور شاعر سے پڑھ رہے ہیں۔ انہوں نے ہمیں ناول پڑھایا۔ ان کے لیکچر میں کبھی شاعری اور خاص طور پر اپنی شاعری کا کوئی حوالہ نہیں آیا۔ وہ صحیح معنوں میں گم سمندر ہیں۔ ان کے قریبی دوستوں کے علاوہ سعید احمد، قاسم یعقوب، منیر فیاض اور مجھ جیسے عقیدت مندان سے کئی برس تک مسلسل تقاضا کرتے رہے کہ کلیات شائع ہونا چاہیے۔ بالآخر یہ سعادت عزیز دوست سعید احمد کے حصہ میں آئی کہ ان کی شاعری کو مرتب کریں۔ اس طرح نظم کی پانچ کتابوں کے علاوہ ایک نیا مجموعہ ''ممنوعہ مسافتیں'' بھی اس کلیات ''نادر یافتہ'' کا حصہ ہے۔ پروفیسر آفتاب اقبال شمیم کا تخلیقی وفور ممنوعہ مسافتوں کے باوجود ابھی تک نادر یافتہ ہی ہے۔ بحیثیت انسان اور بحیثیت استاد پروفیسر آفتاب اقبال شمیم نے اپنے شاگردوں پر انمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔

ڈاکٹر سہیل احمد خان نے آفتاب صاحب کی شاعری پر ایک مجموعی رائے دیتے ہوئے لکھا:

''راشد کی فارسیت، مجید امجد کی روزمرہ زندگی کی تمثالیں، ضیا جالندھری کی طویل نظموں کی اداسی، اپنے پیشرو شاعروں کے کچھ رنگ، آفتاب اقبال شمیم کے شعری لہجے اور آہنگ میں پہچانے جا سکتے ہیں لیکن ان کی آواز الگ محسوس ہوتی ہے اور یہ کامیابی معمولی نہیں کہی جا سکتی۔''

علامہ آئی آئی قاضی

ڈاکٹر ظفر حسین ظفر

درمیانہ قد خاموش طبع، مائل بہ تصوف خاندانی وجاہت، وقار، آنکھوں میں روایتی دین داری کی حیا اور چہرے پر فکر و تدبر اور ذہانت کے نقوش والے علامہ آئی آئی قاضی ۹، اپریل ۱۸۸۶ء کو ضلع دادو (سندھ) کے ایک تاریخی قصبے پت (Pat) میں پیدا ہوئے۔ علامہ قاضی کے جد امجد قاضی عبداللہ انصاری عرب تھے، جو محمد بن قاسم (۷۱۲ء) کی فوج میں شامل ہو کر عرب کے صحراوں سے سندھ کے ریگستانوں میں منتقل ہوئے! فتح یاب ہوئے اور ہمیشہ کے لیے باب الاسلام میں متوطن ہوئے۔

سندھ میں انھوں نے اپنی رہائش کے لیے ضلع دادو کا ایک تہذیبی علاقہ پت (Pat) منتخب کیا جب انگریز برعظیم پر قابض ہوئے تو انتظام حکومت کے لیے انگریزوں نے مقامی باشندوں کا انتخاب شروع کیا ان کی نظر، پت کے قاضی خاندان پر بھی پڑی چنانچہ انگریز دربار میں اس خاندان کو خاص رسوخ حاصل ہوا اور مختار خاص کا عہدہ مل گیا۔

علامہ کے والد قاضی امام دو شادیوں کی وجہ سے کثیر العیال تھے۔ آئی آئی قاضی ان کی دوسری شادی کی اولاد میں سے تھے۔ قاضی صاحب جب سکول جانے کی عمر کو پہنچے تو ان کا سارا خاندان حیدر آباد منتقل ہو چکا تھا۔ حیدر آباد قیام کے دوران میں آپ کے والد نے امداد علی قاضی کو کسی رسمی مدرسے یا سکول میں بھیجنے کی بجائے مشہور عالم دین اخوند عبدالعزیز کے پاس بھیج دیا۔ صاحبِ نظر استاد نے ہونہار شاگرد کی تربیت بڑی توجہ سے کی۔ فارسی شاعری اور تصوف کے مبادیات سے آگہی آئی آئی قاضی کو اخوند عبدالعزیز کی درگاہ سے ہی حاصل ہوئی۔ اخوند صاحب کی صحبت میں قاضی صاحب نے تعلیم و تربیت کے زینے بڑی عمدگی سے طے کیے اور جن بنیادی

اخلاقی اقدار کا شعور اُس وقت حاصل کیا وہ ان کا وظیفہ زندگی رہا۔

قاضی صاحب کے والد اپنے بچے کی تعلیم و تربیت کے معاملے میں اس قدر متفکر تھے کہ انھوں نے بچے کو کسی رسمی مدرسے میں داخل نہ کرایا کہ مبادا عام طلبہ کے ساتھ میل جول کے باعث اس کی عادتیں بگڑ جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ اخوند عبدالعزیز کے مکتب کے بعد بھی وہ کسی سکول میں داخل نہ ہوئے اور مزید تعلیم پرائیوٹ حاصل کی۔ سندھی ورنکلر امتحان (Sindhi Vernacular) ۱۹۰۴ء اور میٹرک کا امتحان (۱۹۰۵ء) بھی بطور پرائیویٹ امیدوار امتیازی حیثیت سے پاس کیا۔ میٹرک کے بعد ۱۹۰۶ء میں مزید تعلیم کے لیے وہ علی گڑھ گئے لیکن صرف ایک سال قیام کے بعد لوٹ آئے اور ۱۹۰۷ء میں انگلینڈ روانہ ہو گئے۔

آئی آئی قاضی نے اپنے والد اور والدہ کے اصرار پر دو شادیاں کیں چونکہ ایک شادی والد اور دوسری والدہ کی مرضی کے تابع ہوئی تھی، ان کی رائے شامل نہ تھی سو دونوں شادیوں کا انجام علیحدگی پر منتج ہوا۔

جب وہ برطانیہ پہنچے انھوں نے اپنی توجہ تعلیم پر مرکوز رکھی۔ ویسے بھی وہ خلوت پسند تھے زیادہ میل جول بھی نہ رکھتے تھے لیکن قدرت کے اپنے ہی فیصلے ہوتے ہیں۔ ان کی تیسری شادی ہی اتفاقی حادثہ کا نتیجہ تھی جس نے ان کی بعد کی زندگی پر غیر معمولی اثرات مرتب کیے۔ ایک جرمن خاتون ایلسا (Elesa) سے ٹرین میں اتفاقی ملاقات ہوئی، جو بعد میں گہری محبت اور پھر ان کی شادی میں بدل گئی۔ شادی کے ایک سال بعد ۱۹۱۱ء میں وہ نئی دلہن کے ساتھ سندھ آئے لیکن چند برسوں کے بعد واپس لندن روانہ ہو گئے۔ دونوں میاں بیوی نے اپنے لیے تعلیم و تحقیق کا میدان منتخب کیا اور کم و بیش تیس برس لندن ہی میں مقیم رہے۔

قاضی صاحب کا شمار اقبال کے معاصرین میں ہوتا ہے۔ لندن قیام کے دوران میں وہ تحریک پاکستان میں دلچسپی لیتے رہے لیکن اپنے غیر سیاسی اور علمی مزاج کے باعث سیاسی میدان میں زیادہ نمایاں نہ ہوئے۔ البتہ جدید علوم کے تناظر میں فکرِ اسلامی کی ترویج و اشاعت اُن کا مقصد رہا اور وہ ''جمیت المسلمین'' کے پلیٹ فارم پر فعالیت کے ساتھ کام کرتے رہے۔

قاضی صاحب اور ایلسا نے برطانیہ میں تیس سال گزارے اِس دوران میں ان کی مصروفیات کا دائرہ کیا تھا۔ ذیل کے اقتباس سے اس کی ایک جھلک نمایاں ہوتی ہے۔

He drank deep in to the various vital branches of modern knowledge which he combined with his deeper scholarship in the islamic studies and embraked upon preaching Islam in England under the aegis of " Jamit ul muslameen

۱۹۱۹ء میں ایک بار پھر وہ سندھ آئے اور ٹنڈو محمد خان اور حیدر آباد میں جج ہو گئے۔ کچھ عرصہ ریاست خیر پور میں بھی بطور سیشن جج کام کیا لیکن یہاں کی فضا انھیں راس نہ آئی اور استعفیٰ دے کر واپس لندن چلے گئے۔

علامہ آئی آئی قاضی نے مسلمانوں کے عہد غلامی میں آنکھ کھولی جب انگریز برعظیم پر بلاشرکت غیرے حکمران تھے۔ اُن کا آبائی صوبہ انگریزوں نے ۱۸۴۳ء میں فتح کیا اور ۱۸۴۷ء میں اُسے بمبئی کے ساتھ ملا دیا۔ ہندو اِس الحاق پر خوش ہوتے تھے کیونکہ مجموعی طور پر انھیں اکثریت حاصل ہو گئی تھی۔ سندھ کے مسلمانوں کے سامنے دو بڑے چیلنج تھے:

۱۔ سندھ کی الگ شناخت ۲۔ مسلم آبادی کے لیے جدید تعلیم کا انتظام۔

بقیہ ہندوستان کی طرح سندھ میں بھی مسلمانوں کے درمیان جدید تعلیم کے حصول کے معاملے میں مزاحمت پائی جاتی تھی۔ قاضی صاحب کی خوش نصیبی تھی کہ ان کی پیدائش سے دو سال پہلے کے۔ بی حسن آفندی کراچی نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن بنانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ پورے ہندوستان کی طرح سندھ میں بھی جدید تعلیم کے حصول کا احساس بیدار ہونا شروع ہو گیا تھا۔ ۱۹۰۷ء میں آئی آئی قاضی صاحب جب لندن جا رہے تھے تو کراچی میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس میں مسلمانوں کے کے لیے جدید تعلیم اور روزگار کے حوالے سے قرارداد منظور کی گئی ازاں بعد ایسی قراردادیں سندھ کے دیگر شہروں سے بھی پاس ہوئیں جن کی توثیق بعد میں وزیر تعلیم بمبئی نے کی۔ علامہ آئی آئی قاضی کئی انقلابات اور حوادث کے عینی شاہد ہیں۔ جنگ عظیم اول و دوم، انقلاب روس، تاج برطانیہ کا عروج و زوال اور پھر ۱۹۴۷ء میں تقسیم ہندوستان کا معجزہ۔

قاضی صاحب نے ان انقلاب کے نتائج و اثرات کا جائزہ لیا؛ مغرب کی مادی تہذیب اور فلسفے کا گہرا مطالعہ کیا اور مغرب کی مادی تہذیب کے غلبے کے باعث مٹتی ہوئی انسانی اقدار کے مقابلے میں اسلامی اقدار کے فروغ میں مصروف عمل رہے۔ ۱۹۳۶ء میں جب سندھ بمبئی سے

علیحدہ ہوا تو موجودہ پاکستان کے علاقے میں صرف ایک یونیورسٹی (پنجاب لاہور) تھی۔ سندھ کے تمام کالج بمبئی یونیورسٹی کے ساتھ ملحق تھے۔ ایک طویل جدو جہد کے بعد سندھ یونیورسٹی ۳، اپریل ۱۹۴۷ کو قائم ہوئی۔

علامہ قاضی نے سندھ کے مسلمان طلبہ کو جدید تعلیم اور اسلامی آئیڈیالوجی کی طرف متوجہ کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ سندھ یونیورسٹی آغاز میں کراچی میں قائم ہوئی۔ تھوڑے عرصے کے بعد کراچی یونیورسٹی کے نام سے الگ یونیورٹی بنائی گئی اور سندھ یونیورسٹی کو حیدرآباد منتقل کر دیا گیا۔

علامہ آئی آئی قاضی ۱۹۴۷ء میں لندن سے سندھ آئے۔ اس وقت ان کی عمر ۶۱ سال تھی۔ یونیورسٹی کے قیام کے چار سال بعد انھیں سندھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی پیش کش ہوئی۔ چنانچہ ۹۔ اپریل ۱۹۵۱ء کو انھوں نے وائس چانسلر (سندھ یونیورسٹی) کا منصب سنبھالا۔

علامہ آئی آئی قاضی کو قدرت کی طرف سے بڑا اچھا موقع ملا کہ وہ سندھ کی نئی نسل کو جدید تعلیم سے روشناس کرائیں اور اپنے طویل تعلیمی تجربے کی بنیاد پر یونیورسٹی کو صحیح منہج عطا کریں۔

جس وقت علامہ قاضی نے وائس چانسلر کا منصب سنبھالا۔ سندھ یونیورسٹی محض ایک امتحان منعقد کرنے کا ادارہ تھی جس کے ساتھ صرف ۵ کالج اور ۳۴ ہائی سکول ملحق (Affilated) تھے، علامہ قاضی کے لیے یونیورسٹی کو تدریسی یونیورسٹی (Teaching University) بنانے اور یونیورسٹی کا الگ ٹاؤن اور کیمپس بنانے کا چیلنج درپیش تھا۔ علامہ صاحب نے اپنی ذاتی کوششوں سے حیدرآباد میں مختلف اداروں کی عمارات حاصل کر کے ۴ مئی ۱۹۵۱ء کو یونیورسٹی حیدرآباد منتقل کر دی۔

محض امتحانوں کے انعقاد کے بجائے ان کے سامنے جدید یونیورسٹی کا مکمل خاکہ تھا۔ چنانچہ انھوں نے صرف پانچ ماہ بعد ستمبر ۱۹۵۱ء میں یونیورسٹی میں شعبہ ایجوکیشن اور شعبہ تقابل ادیان (Compertine study of Religons) شروع کیا اور ایک سال بعد اسلامک کلچر کا شعبہ بھی شروع کر دیا گیا۔

علامہ آئی قاضی چونکہ ایک تجربہ کار اور کہنہ مشق استاد تھے۔ وہ یورپ کی کئی جامعات کے ساتھ وابستہ رہے۔ ان کے تخیل میں ایک واضح روڈ میپ موجود تھا۔ اس لیے تدریجاً یونیورسٹی

آف سندھ کو ایک Examination Conducting ادارے سے مکمل تعلیمی ادارے میں بدل دیا اور سندھ یونیورسٹی کامیابی کے سفر پر تیزی سے گامزن ہوئی بعد میں اردو سمیت دیگر کئی شعبہ جات کھولے گئے۔

علامہ قاضی نے اپنے ذاتی اثر و رسوخ سے قابل اساتذہ کو یونیورسٹی میں لایا۔ ۱۹۵۳ میں طلبہ کی تعداد ۲۷۶۲ تھی جبکہ ۱۹۵۵ میں یہ تعداد ۵۸۶۴ ہوگئی۔ یونیورسٹی سے الحاق شدہ کالج ابتدا میں صرف ۵ جبکہ ۱۹۵۵ء میں ۱۷ ہو گئے۔ انھوں نے پہلی بار یونیورسٹی میں پرائیویٹ امیدواروں کے لیے امتحان دینے کا نظام متعارف کرایا۔

پاکستان میں یونیورسٹی ٹاؤن کا تصور بھی پہلی بار علامہ قاضی نے ہی پیش کیا جو بعد میں تمام یونیورسٹیوں کے منصوبے میں شامل ہوگیا۔ بیوروکریسی کی مخالفتوں اور طویل بحث مباحثوں کے بعد قاضی کے تصور کے مطابق یونیورسٹی کا منصوبہ منظور ہوا۔ بیوروکریسی کی رائے تھی کہ لیاقت میڈیکل کالج اور سندھ یونیورسٹی شہر میں ہی ہونے چاہیں لیکن قاضی صاحب کی دوررس نگاہوں میں یونیورسٹی کا حقیقی تصور موجود تھا کہ اداروں کو شہر کی فضا سے دور ہونا چاہیے انھوں نے طویل جنگ کے بعد آخر میں یونیورسٹی کا منصوبہ منظور کروالیا۔ مرحوم پیر علی محمد راشدی لکھتے ہیں کہ یہ معاملہ نزاعی صورت اختیار کر گیا تو انھوں نے آخری فیصلے کا اختیار علامہ قاضی کو دیا ان کے الفاظ سے قاضی صاحب کے مقام و مرتبے کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

A meeting was held in the circut house (Hyderabad). After listening to the arguments of the officer's, I turned to kazi Saheb. I said; "I shall be guided by what you guide to me. Mine or anybody els's opinion carries no weight before yours". His eyes were full of tears mildly he said: "Ali Muhammed my son, "Jamshoro." I took the file and wrote "Jamshoro".

علامہ قاضی کی مشاہیر کے ساتھ خط کتابت بھی رہی۔ جی ایم سید کے نام ان کے خطوط چھپ چکے ہیں جبکہ انھوں نے اپنے کاغذات کے تین صندوق ممتاز قانون دان اے کے بروہی

کے حوالے کیے تھے۔ جن پر شاید ابھی تک کوئی زیادہ کام نہیں ہوا۔ ان کے بارے میں زیادہ معلومات بھی نہیں ملتیں۔ وہ جس مرتبے کی شخصیت تھے ان کے بارے میں علمی حلقوں میں اتنی ہی لاعلمی ہے۔ اُن کے متعلق انگریزی اور سندھی زبان میں کچھ کام ہوا ہے لیکن ان کے مقام سے فروتر۔ جو لوازمہ موجود ہے اس کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ وہ نہ صرف قدرت کا ایک انمول عطیہ بلکہ ایک اچھے اور فعال انسان کی خوبیوں کا مرقع صاحبِ دانش و معرفت، مشرقی و مغربی علوم کے عالم بے بدل، کامیاب معلم اور دانا منتظم تھے۔ ۱۳، اپریل ۱۹۶۸ء کو وہ اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے۔ اب انھیں ڈھونڈو چراغ ''دل سوزاں'' لے کر۔

ڈاکٹر سید محمد ابوالخیر کشفی

ڈاکٹر سید عزیز الرحمٰن

کشفی صاحب کاغذات میں درج تاریخ کے مطابق ۱۲/ مارچ ۱۹۳۲ء کو کان پور انڈیا میں پیدا ہوئے مگر آپ کا اپنا بیان ہے کہ میرا سنِ پیدائش ۱۹۳۰ء یا اس سے کچھ پہلے ہے۔

کشفی صاحب کان پور کے علاقے بیگم گنج میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق صاحب علم و فضل خانوادے سے تھا۔ حضرت غلام رسول رسول نمّاؒ آپ کے جد امجد ہیں۔ کشفی صاحب کے دادا سید شاہ محمد اکبر عالمِ دین اور صاحبِ نسبت بزرگ تھے۔ انہیں عربی، فارسی، اور اردو پر مکمل گرفت حاصل تھی۔

آپ کے والد سید ابو محمد تھے جو ثاقب تخلص کرتے تھے۔ آپ کے والد ۱۹۰۴ء میں پیدا ہوئے۔ معروف شاعر تھے، غزل اور نظم دونوں میں طبع آزمائی کی۔ نثر بھی خوب لکھتے تھے، آپ کے مضامین مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہے۔ متاعِ درد، روحِ جاوداں، انتخابِ سودا، آریہ سماج کا آئینہ انہوں نے اپنی تحریری یادگاریں چھوڑی ہیں۔

کشفی صاحب نے ابتدائی تعلیم اس عہد کے رواج کے مطابق اپنے گھر پر حاصل کی۔ بڑے ہوئے تو اردو اور ریاضی کے اسباق شروع کئے گئے۔ کچھ عرصے بعد ان کی تعلیم کے لئے باقاعدہ استاد کا انتظام کیا گیا۔

مولانا سعید رزمی آپ کے پہلے استاد ہیں جن سے آپ نے فارسی کی تعلیم حاصل کی جس سے آپ کو فارسی زبان پر مکمل عبور حاصل ہو گیا:

آپ خود فرماتے ہیں کہ مولانا کا پڑھانا میرے حق میں مفید ثابت ہوا ایک ہی سال میں فارسی میں اس حد تک رواں ہو گیا تھا کہ جلسوں میں فی البدیہہ تقریر کر لیتا۔ میں بہ مشکل آٹھ نو سال کا تھا۔

۱۹۴۰ء کے لگ بھگ آپ نے ایک عرب معلم سے عربی زبان سیکھی اور اس قدر سیکھی کہ آپ نے

عربی زبان پر قدرت حاصل کر لی۔ ۱۹۴۰ء میں ہی آپ نے لطیف اثر اور جناب عبدالستار صاحب سے دو ماہ تک انگریزی تعلیم حاسل کی۔ اردو، عربی فارسی کی بنیادی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ''حلیم مسلم کالج کان پور'' میں چھٹی جماعت میں داخلہ لیا اس کے بعد'' کرائسٹ چرچ کالج'' میں زیر تعلیم رہے۔ یہ ۱۹۴۵ء۔۱۹۴۶ء کی بات ہے۔

۱۹۴۷ء کے ہنگامے اور قیام پاکستان سے ذرا پہلے انٹرالہ آباد بورڈ سے، کرائسٹ چرچ کالج سے بی۔اے کی سند حاصل کی۔

قیام پاکستان کے بعد آپ نے پاکستان جانے کو ترجیح دی اور چند ساتھیوں کے ساتھ آپ ہجرت کر کے پاکستان آ گئے۔ یہاں آپ نے سندھ یونیورسٹی سے بی۔اے آنرز اور اردو آنرز میں پہلی پوزیشن حاصل کی، پھر ۱۹۵۲ء میں جامعہ کراچی سے ایم۔اے اردو کیا۔ اور ۱۹۶۷ء میں کولمبیا یونیورسٹی سے ایم۔اے انگریزی کیا۔ آپ کے مقالے کا عنوان تھا'' انگریزی کی تدریس بہ حیثیت غیر ملکی زبان''۔

۱۹۷۱ء میں اردو ادب میں جامعہ کراچی سے'' اردو شاعری کا سیاسی وتاریخی پس منظر ۱۷۰۷ء۔۱۸۵۷ء'' کے زیر عنوان اپنا تحقیقی کام مکمل کر کے پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی۔

ازدواجی زندگی

ڈاکٹر صاحب کی پہلی شادی ۱۹۵۷ء میں طاہرہ بیگم سے ہوئی۔ ۱۹۵۷ء میں آپ رشتۂ ازواج میں منسلک ہوئے۔ اس شادی سے آپ کے تین بیٹے پیدا ہوئے۔ ۱۹۶۳ء میں زندگی کے خوب صورت سات سال آپ کے ساتھ گزار کر طاہرہ کشفی دو چھوٹے بچوں کے ساتھ ایک حادثے کے نتیجے میں اللہ کو پیاری ہوئیں۔

۱۹۶۶ء میں محترمہ بلقیس شاہین صاحبہ سے عقد ثانی ہوا۔ مگر اس عقد کے فوراً بعد آپ اپنے صاحب زادے ابواحمد عاکف کے ساتھ پہلے عمرے پر اور پھر اعلیٰ تعلیم کے سلسلے میں امریکہ روانہ ہو گئے۔ وہاں سے آپ کی واپسی فروری ۱۹۶۸ء میں ہوئی اور جولائی ۱۹۶۸ء رخصتی عمل میں آئی۔

بلقیس شاہین صاحبہ سے آپ کی چار صاحب زادیاں ہوئیں، جو ماشاءاللہ بہ قید حیات اور صاحبِ اولاد ہیں۔

آپ کے صاحب زادے سید ابواحمد عاکف اہم ترین ذمے داریوں پر فائز رہے۔ آج کل اسلام آباد

میں وفاقی وزارت موسمیاتی تبدیلی میں سیکریٹری کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

تدریس

کشفی صاحب کی علمی، دینی اور تحقیقی اور تنقیدی سرگرمیاں اپنی جگہ، وہ بنیادی طور پر ایک استاد تھے۔ اور ان کی عملی زندگی کا آغاز بھی بحیثیت استاد ہی ہوا۔ آپ کی تدریسی زندگی کا دائرہ بہت وسیع ہے اور اس کا دورانیہ بھی کئی عشروں کو محیط ہے۔ آپ نے اپنی تدریسی زندگی کا آغاز ۱۹۵۶ء میں اسلامیہ کالج کراچی سے کیا۔ یہاں آپ تین سال تک تدریس کے فرائض سرانجام دیتے رہے۔

۱۹۵۹ء میں کشفی صاحب جامعہ کراچی کے شعبۂ اردو سے منسلک ہو گئے۔ ۱۹۷۰ء میں آپ جاپان کی اوساکا یونیورسٹی کے شعبۂ ادبیات پاک و ہند سے وابستہ ہو گئے۔ اور وہاں اردو کے پروفیسر کی حیثیت سے آپ نے تین سال تک تدریسی خدمات انجام دیں۔ ۱۹۷۴ء میں دوبارہ جامعہ کراچی کے شعبۂ اردو سے منسلک ہو گئے۔ جامعہ کراچی میں آپ کا تدریسی دورانیہ سب سے طویل ہے۔ یہاں آپ نے کچھ عرصے صدر شعبہ کے فرائض بھی انجام دیئے۔ اور یہیں سے آپ مدت ملازمت پوری کر کے ۱۹۹۲ء میں ریٹائر ہو گئے۔

مطبوعات

کشفی صاحب کی بہت سی کتب شائع ہو چکی ہیں ان میں دونوں طرح کی کتب شامل ہیں۔ آپ کی طبع زاد کتب اور مرتب فرمودہ کتابیں۔ آپ کی تحریر فرمودہ کتب میں درج ذیل قابل ذکر ہیں:

جدید اردو ادب کے دو تنقیدی جائزے ۱۹۶۳ء۔ اردو ادب کی تاریخ پر ایک نظر۔ ہمارے عہد کا ادب اور ادیب ۱۹۷۱ء۔ اردو شاعری کا سیاسی وتاریخی پس منظر ۱۷۰۷ء تا ۱۸۵۷ء۔ ۱۹۷۵ء۔ نعت اور تنقیدِ نعت ۲۰۰۱ء۔ آدمی اور کتاب ۲۰۰۴ء۔ ہمارے عہد کے ادبی، لسانی اور تعلیمی مسائل ۲۰۰۶ء۔ مقامِ محمد ﷺ قرآن کے آئینے میں ۲۰۰۵ء۔ مسلمان کی زندگی کیا ہے ۱۴۲۲ھ۔ تعارفِ اسلام ۱۹۹۹ء۔ حیاتِ محمدی ﷺ قرآن کے آئینے میں ۲۰۰۶ء۔ اخلاق محمد ﷺ قرآن حکیم کے آئینے میں ۲۰۰۸ء۔

اس کے علاوہ آپ کی مرتب فرمودہ کتب کی تعداد بیس کے قریب ہے، نیز آپ نے کچھ مختصر سوانحی کتب بھی تحریر فرمائی جن میں صلاح الدین ایوبی، عبدالکریم سومار، امام ابوحنیفہ، شوکت تھانوی،

ہمارے سرسید، مولانا جلال الدین رومی، خواجہ حسن نظامی اور حضرت عمر بن عبدالعزیز شامل ہیں۔
آپ نے مختلف تراجم بھی کیے ان میں سے کئی ایک اردو اکیڈمی سندھ سے شائع ہوئے۔ آپ کا مختصر نعتیہ مجموعہ ''نسبت'' کے نام سے اور سفر نامۂ حجاز ''وطن سے وطن تک'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ آپ کے شخصی خاکوں کے مجموعے ''یہ لوگ بھی غضب تھے'' اور ''سائبان لوگ'' کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے علمی، تنقیدی، ادبی اور دینی مضامین اور مقالات کی تعداد دو سو سے زائد ہے۔ یہ مضامین زیادہ تر ششماہی السیرہ عالمی، کراچی۔ ماہ نامہ تعمیر افکار، کراچی۔ کتابی سلسلہ نعت رنگ، کراچی۔ ماہ نامہ دائرے، کراچی۔ ماہ نامہ بدایوں، کراچی۔ ماہ نامہ تہذیب، کراچی۔ ماہ نامہ سیپ، کراچی۔ ماہ نامہ ساقی، کراچی۔ ماہ نامہ ماہ نو، کراچی۔ ماہ نامہ فنون، لاہور۔ ماہ نامہ الاسلام، کراچی میں شائع ہوتے رہے ہیں۔
ڈاکٹر صاحب کے حیات اور خدمات کے حوالے سے سہ ماہی فکر و نظر اسلام آباد اور ماہ نامہ ارمغانِ حمد نے دو ضخیم اشاعتیں مرتب کی ہیں، اور ڈاکٹر داؤد عثمانی کے قلم سے آپ کے حوالے سے ایک یاد نامہ ''شفقت کا سائبان'' بھی شائع ہو چکا ہے۔

مزاج و مذاق

کشفی صاحب شاہانہ مزاج کے آدمی تھے، کسی اور معنی میں نہیں صرف دو حوالوں سے۔ جو کچھ پاس ہوتا وہ دینے میں تاخیر نہ کرتے، کسی نے کسی چیز کے بارے میں پسندیدگی کا اظہار کر دیا، اسے بخش دی، کسی کی کوئی ضرورت محسوس کی وہ پوری کر دی، کسی بات کا ویسے ہی خیال آ گیا تو اسے بھی مکمل کر کے ہی اطمینان ہوا۔ اب ایسے واقعات کیا لکھوں؟ جو کشفی صاحب کو جانتا ہے، وہ یہ سب بھی بہ خوبی جانتا ہے۔
اور دوسرا حوالہ ہے زبان و بیان کا۔ کسی کے بارے میں کوئی جملہ سوجھ گیا، کوئی بات لب پر آئی، تو اب ٹال نہیں سکتے۔ بندہ ضائع ہو سکتا ہے لب پر آیا ہوا جملہ ترک نہیں کیا جا سکتا۔ ایک صاحب کا تبادلہ کراچی سے باہر ہو گیا۔ کشفی صاحب ان کے مزاج کے سبب ان سے کوئی خوش نہ تھے، انہیں نہ جانے کیا سوجھی کہ کشفی صاحب کو فون پر بتانے لگے کہ میری ترقی ہو گئی ہے اور میں جا رہا ہوں۔ کشفی صاحب فوراً بولے الحمدللہ کراچی سے ایک منافق کم ہو گیا۔ وہ صاحب اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔

ایک صاحب کا ذکر آیا، بولے اچھا اس سے بھی ملے تھے، میں اس سوال کی غایت سے واقف تھا، اس لئے کشفی صاحب کو چھیڑنے کی غرض سے کہا کہ ہاں وہ تو اپنا دوست ہے، ذرا توقف کیا اور بولے: کم بخت ایسے بنا کر بولتا ہے، جیسے واقعی پڑھا لکھا ہو۔ اب جملہ پڑھئے اور لطف لیجئے۔
ایک اور صاحب کا دوران گفت گو ذکر ہوا، میں نے کہا کہ آپ بھی پاکستان سے باہر رہے، مگر بعض لوگ ایک ہی جگہ ایک سے زائد بار جا چکے ہیں، آپ کے ساتھ ایسا کیوں نہیں ہوا؟ ان کی وجہ انتخاب کیا ہے، بولے جو انہیں شراب پلا سکتا ہے، اس کا انتخاب بار بار ہو سکتا ہے، دین داری صرف دعوے کا نام نہیں ہے۔
اب ایسے کاٹ دار جملے ہر ایک کو کہاں ہضم ہو سکتے ہیں؟ مگر کشفی صاحب کو جاننے والے یہ بھی جانتے ہیں کہ یہ جملے ان کی زبان پر آتے اور ہوا میں تحلیل ہو جاتے، نہ ان کے دل میں جگہ پاتے اور نہ ان کے ذہن میں ایسی باتوں کی گنجائش تھی۔ کسی کے لئے برا کرنا تو دور کی بات ہے، برا چاہنا بھی ان کے لئے ممکن نہ تھا۔ یہ امر واقعی ہے، مداحی نہیں۔ جامعہ کراچی کی ایک شخصیت سے روابط کچھ اچھے نہ تھے، ان کے انتقال کے بعد ان کے اہل خانہ نے ان کی یاد میں مرتب ہونے والی کتاب کے لئے کشفی صاحب سے بھی مضمون کا تقاضا کیا، کشفی صاحب نے لکھ کر دے دیا۔ میں نے حسب عادت سوال کر دیا، اور جان بوجھ کر انداز بھی ایسا اختیار کیا کہ وہ کچھ بولیں۔ کہنے لگے کہ اسی لئے تو لکھا ہے کہ کہیں ان کے دل میں یہ خیال نہ آئے کہ چوں کہ زندگی میں ان سے اختلاف رہا، اس لئے اب لکھنے سے انکار کر دیا۔ جب بندہ دنیا سے چلا گیا تو اب کیسا اختلاف؟
کشفی صاحب مزاجاً زندگی بھر مثالیت پسند رہے۔ ابتدا میں ذکر کر چکا ہوں کہ بعض مضامین مجھے کشفی صاحب نے املا کرائے تھے۔ اس غرض سے جب حاضر ہوتا تو کاغذ قلم اہتمام سے ساتھ رکھتا، ایسے میں میری دل چسپی صرف کام سے ہوتی، کاغذ اور قلم کا معیار کبھی پیش نظر نہیں رہا، پھر طبعی لاابالی پن، جو قلم اور جیسا کاغذ ہاتھ آیا، لے لیا، مگر کشفی صاحب یہ بھی دیکھتے کہ جس کاغذ پر میں لکھ رہا ہوں وہ کیسا ہے؟ پھر کئی نوٹ بکس اور اپنے نام کی لوح کے ساتھ چھپے ہوئے عمدہ کاغذ کے دستے عطا کئے، جو ایک صاحب وقتاً فوقتاً اسی مقصد کے لئے کشفی صاحب کو دیتے رہتے تھے۔
یہ مزاج شروع سے تھا، اور ہر معاملے میں تھا، اسی بنا پر جب تک جامعہ کراچی میں رہے، ایک دو استثنا کے سوا جامعہ کی انتظامیہ سے اختلاف ہی رہا، مگر آخری دور میں ایک بار کم از کم یہ جملہ خود میں

نے سنا کہ اب آ کر سوچتا ہوں کہ اپنے شعبے (شعبہ اردو) کے مفاد میں مجھے بعض کم نوعیت کی زوریوں کو نظر انداز کر دینا چاہئے تھا۔ انتظامی ذمے داریوں سے وابستہ حضرات کے لئے یہ بہت بڑی رہ نمائی ہے۔ یہ ذمے داریاں جہاں ایک طرف دیانت اور عدل کا تقاضا کرتی ہیں وہیں اعتدال اور توازن کا مطالبہ بھی کرتی ہیں، پھر ان ذمے داریوں سے عہدا برا ہونے کے لئے قوت فیصلہ بھی درکار ہوتی ہے، جو صحیح موقع پر درست فیصلہ صادر کرا سکے۔

کشفی صاحب کی عام زندگی بھی شگفتگی سے بھرپور ہوتی تھی اور ان کے برجستہ جملے ایسے معلوم ہوتے کہ ان کی تراش خراش میں برسوں کی ریاضت شامل ہے، حال آں کہ ایسا کچھ نہ ہوتا، اِدھر لب پہ آتے اور اُدھر ادا کر دیتے اور وہ بھول بھی جاتے۔

ایک بار غالباً تعمیر افکا کا سیرت نمبر شائع ہوا تھا، وہ میں نے پیش کیا، دیکھا تو خوش ہو کر دعائیں دیتے رہے، اور ورق الٹتے رہے، پیش کش کی تعریف کی، اس دوران اسی روز یا ایک روز قبل ایک ادبی مجلّہ ان کے پاس آیا تھا، جس کے مدیر سے بھی کشفی صاحب کو بڑا تعلق خاطر تھا، پھر ان کا نام لے کر بولے کہ اگر دعاؤں سے سلیقہ مل سکتا تو میں ان کے لئے بھی سلیقے کی دعا کرتا۔ اب یہ ایک جملہ میری بہت بڑی حوصلہ افزائی بھی تھی اور اس مجلّے پر لطیف طنز بھی، کشفی صاحب کے جملے ایسے ہی ہوتے تھے۔ تہہ دار، لطف سے بھرپور، طنز و مزاح میں گندھے ہوئے اور بیشتر کسی نہ کسی حوالے سے سبق آموز۔

کئی سال پہلے کی بات ہے، آفتاب کریمی صاحب کے ہاں دعوت تھی۔ اب تو وہ بھی مرحوم ہوئے۔ ڈاکٹر منظور قریشی اور مفتی مظہر بقا صاحب کے ساتھ کشفی صاحب بھی موجود تھے۔ اثنائے گفتگو میں مفتی صاحب نے دادا جان مولانا سید زوّار حسین شاہ رحمہ اللہ سے ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں رحمہ اللہ کی بیعت کا واقعہ بیان کیا کہ ڈاکٹر غلام مصطفٰے خاں صاحب بیمار ہوئے تو کسی کے بتانے پر دادا جان کے خلیفہ خاص صوفی محمد احمد صاحب سے تعویذ لیا۔ جس سے افاقہ ہو گیا۔ یہی واقعہ دادا جان سے ان کی ملاقات اور پھر بیعت کا سبب بنا۔ واقعہ سن کر کشفی صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں فرمایا کہ یہ سب ٹھیک ہے مگر میرا خیال ہے کہ جو کام ڈسپرین کی دو گولیوں سے ہو جائے، اس کے لئے بزرگوں کو تکلیف نہیں دینی چاہئے۔

ایک بار پاکستان کی ایک مذہبی سیاسی جماعت کا ذکر چھڑ گیا، کہنے لگے کہ عجیب لوگ ہیں، جو کام خدا

کے کرنے کا ہے وہ یہ خود کرنے لگتے ہیں اور جو کام ان کے کرنے کا ہے وہ یہ لوگ خدا پر چھوڑ دیتے ہیں۔

کشفی صاحب ان ہی جملوں میں کام کی باتیں بھی کر جاتے، جو برسوں کی ریاضت کا حاصل، غور و فکر کا نچوڑ اور تجربات و مشاہدات کا ثمرہ معلوم ہوتیں۔

ایک بار کہنے لگے کہ میں نے جب دیکھا کہ لوگ اپنے نام سے شامیں مناتے ہیں مگر شہرت انہیں پھر بھی نہیں ملتی تو یقین آ گیا کہ شہرت کا معاملہ بھی رزق کی طرح ہے، جس طرح رزق جتنا مقدر میں لکھ دیا گیا ہے اسی قدر ملے گا، انسان نہ اس کو گھٹا سکتا ہے اور نہ بڑھا سکتا ہے۔ اس طرح انسان خواہ کچھ کر لے، شہرت جس قدر مقدر میں ہے اتنی ہی ملے گی۔ اس لئے انسان کو شہرت کی خواہش رکھنی ہی نہیں چاہیے۔ کام میں زور اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب انسان اپنے آپ کی نفی کر دے۔ یہ کام مشکل نظر آتا ہے، ہے بہت آسان۔ صرف چند روز مشقت برداشت کرنی پڑتی ہے۔

کشفی صاحب بہت سی جہتوں کے مالک تھے۔ آپ استاد تھے، محقق تھے، شاعر اور نعت گو تھے، نقاد تھے، مترجم تھے، سیرت نگار تھے، لغت پر نظر تھی، افسانے بھی لکھے، غزلیں بھی کہیں، لوگوں کی راہنمائی بھی کی، دیباچے اور فلیپ بھی لکھے، غرض ادب کی مختلف اصنافِ سخن میں مسلسل لکھتے رہے۔ ایک بڑا چلتا ہوا جملہ ہے جو ہر ایک کے بارے میں کہہ دیا جاتا ہے کہ فلاں صاحب کی زندگی کے کئی پہلو تھے اور ہر پہلو معتبر تھا، مگر یہ جملہ کشفی صاحب کے بارے میں یقیناً درست ہے کہ آپ کی تمام خدمات کے ثبوت و شواہد موجود ہیں۔ زیادہ تر کام مطبوعہ ہے اور اہلِ علم کے سامنے ہے، اور بحیثیت استاد تو آپ کی خدمات اس قدر واضح ہیں کہ آج بہت سے مقامات پر آپ کے شاگرد بجائے خود قدر و منزلت رکھتے ہیں۔ کسی استاد کے لئے اس سے بڑھ کر اور کیا اعزاز ہو سکتا ہے؟

کشفی صاحب نے بہت لکھا، آخری برسوں میں ان کا قلم سو فیصد تو نہیں ۹۰ فیصد ضرور اسلامی موضوعات کے لئے وقف ہو گیا تھا۔ ان میں سرفہرست سیرت طیبہ اور نعت ہے، سیرت پر تو اپنی اپنی جگہ مکمل و مرتب تین کتب لکھیں۔ تنقید نعت کے حوالے سے بھی ان کے مضامین کتابی شکل میں ان کی حیات ہی میں شائع ہو گئے تھے۔ اس کے علاوہ الاسلام کے نام سے ماہانہ مجلّہ شروع کیا، جسے مرتب کرنے کا کام تنہا انجام دیتے رہے اور جب اس کی اشاعت میں تعطل زیادہ آنے لگا تو

خود ہی اس کا آخری شمارہ بھی مرتب کیا اور اس میں اس کا اعلان بھی کر دیا کہ یہ اس کا آخری شمارہ ہے۔ اس کے علاوہ شاعر تھے، گو کبھی اپنی شاعری کو سنجیدگی سے نہیں لیا، نعتیں کہیں اور نعت میں تو صاحب دیوان شاعر ہوئے، مجموعے کا نام بھی دیکھئے ''نسبت''، جس پر کتاب کے نام سے زیادہ تشکر آمیز تفاخر کا گمان گزرتا ہے۔ تنقید بھی لکھی اور اس میں بھی کئی کتب چھوڑیں۔ تحقیق میں بھی ایسا کام چھوڑا ہے، جس سے ادب کا قاری کسی عہد میں بھی بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ ان کا مقالہ برائے پی ایچ ڈی ہی اس باب میں ان کے بھرپور تعارف کے لئے کافی ہے۔ لسانیات پر بھی کام کیا۔ اور سب سے بڑھ کر چہ دلاوراست کے عنوان سے شروع کیا جانے والا سلسلۂ تحقیق ہے، جو بعد میں جامعہ کراچی کے شعبۂ تحقیق وتصنیف، ترجمہ کے علمی مجلّے ''جریدہ'' کی اشاعت خاص میں کچھ کشفی صاحب کے نام سے اور کچھ دوسروں کے نام سے شائع ہوا ہے۔ حق یہ ہے کہ اس وقت حکمت کے تحت کشفی صاحب نے وہ اپنے نام سے شائع نہیں کیا تھا، مگر جاننے والے جانتے ہیں کہ وہ سب کشفی صاحب کے قلم سے تھا، مگر نہ جانے کیوں منتظمین جریدہ نے بعض مضامین کو توبہ جا طور پر کشفی صاحب کی طرف منسوب کیا اور بعض کا انتساب وہ ان کی جانب نہ کر سکے۔ انہیں کوئی تامل تھا تو اس وقت کشفی صاحب حیات تھے، ان سے پوچھا جا سکتا تھا، میں نے جب بھی اس موضوع پر بات کی تو ٹال گئے۔ وجہ صرف ایک تھی، اب ان کا خیال یہ تھا کہ اس سلسلۂ مضامین میں جن اہل علم کی جانب سرقے کی نسبت کی گئی ہے، وہ اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں، اب اس بحث کو لپیٹ دینا چاہئے، میرا موقف کچھ اور تھا، میں یہ کہتا کہ یہ سب آپ کے قلم سے نکلا ہے، اس کی نسبت آپ ہی کی جانب ہونی چاہئے، نیز یہ تاریخ اور تحقیق کا قرض ہے، اسے کسی ذاتی اور تشخصی تناظر میں دیکھنے کی بہ جائے اسی انداز میں دیکھنا چاہئے، تاکہ مستقبل کا قاری صحیح صورت حال سے آشنا ہو سکے۔ کشفی صاحب یہ سنتے اور خاموش ہو جاتے۔ سیکڑوں صفحات پر پھیلی یہ تحقیق ہزاروں صفحات کے مطالعے اور برسوں کی ریاضت کا ثمرہ معلوم ہوتی ہے۔

کشفی صاحب نے مختصر افسانے بھی لکھے اور ترجمے بھی کئے، مگر ان کا زیادہ کام اردو ادب کے حوالے سے تحقیق اور تنقید سے تعلق رکھتا ہے۔ کشفی صاحب کے تحریر کردہ صفحات کی تعداد دیکھئے تو یہ باور کرنے میں واقعی دقت ہوتی ہے کہ اس قدر تنوع کے ساتھ اس قدر ضخامت کا حامل سرمایۂ تحریر انہوں نے کس طرح تیار کیا؟

پروفیسر ابوالاعجاز حفیظ صدیقی

پروفیسر امجد علی شاکر

پروفیسر ابوالاعجاز حفیظ صدیقی کا اصل نام عبدالحفیظ صدیقی تھا۔ وہ مولوی علم الدین صدیقی کے فرزند ارجمند تھے۔ اُن کی تاریخ پیدائش سرکاری ریکارڈ کے مطابق ۱۷/اپریل ۱۹۳۰ء ہے، مگر یہ تاریخ درست نہیں۔ اس تاریخ کے اندراج کا باعث یہ تھا کہ انھیں ۱۹۴۷ء کے بعد مالی مشکلات کے باعث جے۔ وی کورس میں داخلہ لینا پڑا۔ داخلہ کے وقت ایک خاص عمر درکار تھی۔ ورنیکلر سکول گکھڑ کے ایک استاد نے ضرورت کے مطابق یہ تاریخ لکھ دی، یہی تاریخ مستقلاً ریکارڈ کا حصہ ہوگئی۔ حقیقی تاریخ پیدائش والد محترم نے صحیح مسلم کے نسخے کے آخر میں سفید کاغذ پر لکھ رکھی تھی جو ۱۹۴۷ء میں تقسیم کے وقت ان کے پیدائش کے گاؤں میں رہ گئی کیونکہ یہ گاؤں تقسیم کے وقت ہندوستان میں شامل ہوگیا۔ آپ کی پیدائش کا گاؤں ضلع جالندھر کا موضع ساندہ تھا۔ ان کے والد مرحوم دیوبند کے فاضل تھے اور ان دنوں گکھڑ ضلع گوجرانوالا میں امامت وخطابت کے فرائض سرانجام دیتے تھے۔ ۱۹۳۸ء میں وہ بچوں کو اپنے پاس گکھڑ لے آئے۔ جناب حفیظ صدیقی بتاتے تھے کہ ان کی پہلی یاد ۲۱/اپریل ۱۹۳۸ء کی ہے۔ اُس روز ہر شخص ہر دوسرے فرد سے کہہ رہا تھا کہ علامہ اقبال فوت ہوگئے ہیں، بہت افسوس ہوا۔ یہ وہ جملے تھے جو پہلی یاد کے طور پر ان کے حافظے کی لوح پر مرتسم ہوگئے۔ والد کچھ عرصے بعد گاؤں منتقل ہوگئے اور آس پاس کے دیہات میں تعلیم اور تبلیغ کے فرائض سرانجام دیتے رہے۔ حفیظ صدیقی نے عربی فارسی کی تعلیم اپنے والد محترم سے حاصل کی اور پھر سکول میں داخل ہوگئے ساتھ ساتھ عربی فارسی کی تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رہا۔

۱۹۴۷ء کی تقسیم کے وقت حفیظ صدیقی خاندان سمیت گکھڑ ضلع گوجرانوالہ منتقل ہوگئے۔ مہاجرت کے مسائل کے باعث وہ جے۔ وی کر کے پرائمری سکول ٹیچر ہوگئے اور پھر مزید تعلیم کا

سلسلہ جاری رکھا، وہ گورنمنٹ ٹریننگ کالج لاہور سے بی۔ٹی کا امتحان پاس کر کے سیکنڈری سکول ٹیچر ہو گئے۔ایم۔اے اردو اور ایم۔اے فارسی کے امتحانات درجہ اول میں پنجاب یونیورسٹی سے پاس کیے اور کالج میں لیکچرر ہو گئے۔

حفیظ صدیقی گکھڑ کے نواحی دیہات میں پرائمری سکول ٹیچر کے طور پر ملازمت کرتے رہے، آخر کو گورنمنٹ ہائی سکول گکھڑ میں سیکنڈری سکول ٹیچر تھے کہ ۱۹۶۲ء میں میونسپل ڈگری کالج اوکاڑا میں اُردو کے لیکچرر منتخب ہو گئے۔ پھر آپ ریٹائرمنٹ تک اسی کالج میں تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے۔ یہ کالج جو ۱۹۶۲ء میں میونسپل ڈگری کالج تھا، ۱۹۷۲ء میں گورنمنٹ ڈگری کالج ہو گیا۔ یہیں سے آپ بطور صدر شعبہ اردو ۱۹۹۰ء میں ریٹائر ہوئے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد انھوں نے بقیہ زندگی تصنیف و تالیف کے لیے وقف کر دی۔ آخر کار ۲۱ر دسمبر ۲۰۰۶ء کو اُن کا پیمانۂ عمر بھر گیا اور وہ رختِ سفر باندھ کر عقبیٰ کے سفر کو چلے گئے۔

آپ نے مندرجہ ذیل کتابیں تصنیف فرمائیں۔

۱۔ مبادیاتِ فنِ مباحثہ	۲۔ ایک یادگار مباحثہ
۳۔ کہاوتیں اور کہانیاں	۴۔ اوزانِ اقبال
۵۔ تفہیم و تحسین شعر	۶۔ اصنافِ ادب
۷۔ کشاف تنقیدی اصطلاحات	۸۔ ادبی اصطلاحات کا تعارف
۹۔ بابا بالک اور بجوگ	۱۰۔ یادوں کی دھول

درج ذیل کتابیں زیرِ طبع ہیں:

۱۔ ریگستان کا سفر (شعری کلیات)	۲۔ فیضان سعدی
۳۔ زہراب	۴۔ ادھوری رفاقتوں کی تھکن

مسترد شدہ کتابیں:

۱۔ کیا زندگی شایانِ زیست ہے	۲۔ ساتھی ہاتھ بڑھانا

تاثرات

میں ۱۹۷۱ء میں تھرڈ ایئر کا طالب تھا جب ڈگری کالج اوکاڑا میں اُن کی کلاس میں پڑھنے کے لیے گیا پھر تمام عمر اُن سے علم حاصل کرتا رہا۔ اُن کے قدموں میں بیٹھ کر قلم پکڑنا، لفظوں سے

کھیلنا، اُن سے دوستی کرنا اور اُن کے ساتھ زندگی کرنا سیکھا۔ ہمارے تعلیمی نظام میں والدین ایک بچے کو کیریئر کے حصول کے لیے سکول/کالج بھیجتے ہیں، مگر وہ علم کے حصول کی راہ دکھاتے تھے اور جب کوئی اس راستے پر چل نکلتا، وہ قدم قدم پر اُسے راہنمائی عطا کرتے تھے۔

استاد کو کیا ہونا چاہیے اس پر سید سلیمان ندوی کا واقعہ یاد آ رہا ہے۔ کسی نے اُن سے مصنف بننے کا طریقہ دریافت کیا۔ وہ کہنے لگے کہ ''اتنا پڑھو، اتنا پڑھو کہ علم تم میں سے بہہ نکلے۔'' میرے خیال میں استاد بننے کا طریقہ بھی یہی ہے۔ ایک سچے اُستاد کا تصور کرتا ہوں تو ابوالاعجاز حفیظ صدیقی کی مثال ذہن میں آتی ہے۔ وہ بہت پڑھتے تھے، خصوصاً زیرِ تدریس متون اور نصابوں کو گہرائی اور وسعت میں دیکھتے، نوٹس لیتے اور ایک ایک نکتہ اور لفظ واضح کرتے تب کلاس میں جاتے اور زیرِ تدریس موضوع اور مضمون کو طلبہ کے من میں اتار دیتے۔ وہ نصابی کتاب کو انٹرلیف کرواتے اور پھر مسلسل اشارات نوٹ کرتے رہتے۔ اپنی تدریس پر اس قدر محنت کرتے میں نے کم ہی کسی کو دیکھا ہے۔

حفیظ صاحب اردو زبان و ادب کے استاد تھے، وہ زبان کے اسرار بتاتے، ادب کا ذوق دیتے اور اس کی تفہیم کراتے، وہ ایک عمر یہ کام کلاس روم میں بیٹھ کر کرتے رہے یا کاغذ قلم کی صحبت میں رہ کر کرتے رہے۔ آخری عمر میں صرف کاغذ قلم کی صحبت رہ گئی تھی، مگر جب بھی کوئی علم کا پیاسا آپ کے در پر جا پہنچتا تو سیراب ہو کر اٹھتا تھا۔ وہ حرفوں لفظوں کی دولت سے مالا مال تھے۔ اس پر انھیں دستِ سخا میسر تھا۔ وہ کسی طالب علم کو محروم رکھنے کے کبھی روادار نہ ہوئے۔ حفیظ صاحب کے تدفین کے بعد لوٹتے ہوئے ان کے ایک شاگرد پروفیسر محمد اکرم طاہر نے کہا تھا:

''آج کتنے ہی لوگ یتیم ہو گئے ہیں۔''

یہ جملہ حرف حقیقت تھا۔ ہم کتنے ہی لوگ تھے جو ان کی سرپرستی سے محروم ہو گئے، مگر اُن کا دکھایا ہوا راستہ ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔ ان کی دی ہوئی روشنی اس راہ کو روشن رکھتی ہے اور ہمارے لیے یہ جادۂ راہ کشش کافِ کرم بنا ہوا ہے۔ حفیظ صدیقی گزرے دنوں کی یادگار تھے۔ اُن دنوں اچھے لوگ عزت Honour کے لیے جیتے مرتے تھے اور مفاد (Interest) سے بے نیاز رہ کر زندگی کرتے تھے۔ حفیظ صاحب تمام عمر پرانے لوگوں کا بتایا ہوا طرزِ زندگی اپنانے کا ڈھنگ سکھاتے تھے۔ اُن کے شاگرد ہمیشہ مقدار پر اقدار کو فوقیت دیتے اور قدروں کے لیے جیتے مرتے

تھے۔ہم نے اُن سے یہی اصول سیکھا تھا۔اس لیے عمر بھر کبھی محروم رہنے کا احساس نہیں ہوا۔اس اصول نے ہمیشہ حوصلہ دیا اور کبھی گرنے نہیں دیا۔

ابوالاعجاز حفیظ صدیقی کی شخصیت کا تصور آتے ہی روایت اور کلاسیک کا تصور ذہن میں آتا ہے۔کلاسیک میں عظمت، اعلیٰ سنجیدگی اور نظم وضبط بنیادی اجزا ہیں، یہی حفیظ صدیقی کی شخصیت کے بنیادی اجزا تھے۔ان کو دیکھ کر برصغیر کے روایتی معاشرے کا تصور ذہن میں آتا ہے جس میں ہمہ عمر کا عشق ہوا کرتا تھا۔وہ ہمہ عمر کے لیے استاد تھے اور ہمہ وقت کے لیے استاد تھے۔وہ تمام عمر پڑھاتے رہے۔ریٹائر ہوئے تو گھر بیٹھ رہے، مگر پڑھانا جاری رکھا۔فرق یہ تھا کہ اب وہ طلبہ کو سامنے بٹھا کر پڑھاتے نہیں تھے، کاغذ پر اپنا علمی تجربہ منتقل کرتے تھے۔انھوں نے اردو ادب کی شعریات پر لکھنا شروع کیا۔زندگی کے سماجی پہلوؤں پر لکھنا شروع کیا اور تب تک لکھتے رہے جب تک زندگی کا سفر جاری رہا۔انھوں نے اردو ادب پر بعض لیکچر ریکارڈ کرائے تاکہ ان کی تدریس کا سفر جاری رہے:

ہمہ عمر یا تو قدح زدیم و نہ رفت رنج خمارِ ما
چہ قیامتی کہ نمی رسی زِکنارِ ما بکنارِ ما

تصانیف

مبادیاتِ فنِ مباحثہ

۱۹۷۵ء، مکتبہ رشیدیہ لمیٹڈ لاہور

یہ کتاب تصنیف کے اعتبار سے دوسری اور اشاعت کے اعتبار سے آپ کی پہلی تصنیف ہے۔اس کی تصنیف کے دو محرکات تھے، ایک محرک تو واضح ہے کہ یہ طلبہ کی عملی ضرورت کو مدنظر رکھ کر لکھی گئی۔ایک وقت تھا کہ کالجز میں مباحثے بہت بھرپور انداز میں منعقد کیے جاتے تھے۔دور دور کے کالجوں سے مقررین جمع ہوتے اور اپنی تقاریر سے ماحول کو گرماتے تھے۔مصنف محترم اپنے طلبہ کو مباحثوں کے لیے تیار کرتے اور انھیں اس فن کی باریکیوں سے آگاہ کرتے۔طلبہ کی عملی ضروریات اس کتاب کی تسوید کا باعث ہوئیں۔

اس کتاب میں فنِ تقریر اور مباحثہ کے اسرار و رموز پر اتنے بے شمار نکات زیر بحث آئے ہیں جو اس موضوع کی دوسری کتابوں میں کم ہی ملتے ہیں۔اس میں اصولِ منطق بھی زیر بحث آئے

ہیں اور تقریر کے مختلف انداز اور اسلوب بھی۔اس میں اس بات پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے کہ شعر موقع اور محل سے پڑھا جائے۔نیز مثالوں سے واضح کیا گیا ہے کہ کس موقع پر اور کس محل میں کون سا شعر پڑھا جا سکتا ہے۔اس کتاب میں منطق اور دلیل کا مفہوم و معنی اور اس کے اصول وضوابط بھی بیان کیے گئے ہیں۔

ایک یادگار مباحثہ

پروفیسر ابوالاعجاز حفیظ صدیقی سچے مسلمان اور پکے پاکستانی تھے۔وہ ۱۹۴۷ء کی صورتِ حال میں پاکستان کو بہترین اور موزوں ترین انتخاب خیال کرے تھے۔اس خیال کو انھوں نے ایک خاص انداز میں پیش کیا ہے۔

زیرِ نظر کتاب ایک مباحثہ کی روداد ہے۔اس میں بانیِ پاکستان اپنے نقطۂ نظر کو مضبوط استدلال کے ساتھ پیش کرتے نظر آتے ہیں۔دراصل اس کتاب میں قیامِ پاکستان کے مباحثے کو یادگار مباحثے کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔یہی اس کتاب کی انفرادیت ہے اور یہی اس کتاب کا جواز ہے۔کتاب کا مواد بانی پاکستان کی تقاریر سے اخذ کیا گیا ہے۔یہ اخذ وانتخاب کتاب کے مصنف کا اصل کام اور کارنامہ ہے۔

کہاوتیں اور کہانیاں (۳ جلدیں)

فیروز سنز، لاہور

اُردو میں بہت سی کہاوتیں اور ضرب الامثال معروف اور متعارف ہیں۔ان کے پس منظر میں بہت سی کہانیاں تصور کی جا سکتی ہیں یا فرض کی جا سکتی ہیں۔ابوالاعجاز حفیظ صدیقی نے چند ایک کہاوتوں اور ضرب الامثال کے پس منظر کی کہانیاں بچوں کے لیے لکھیں اور فیروز سنز کو پیش کر دیں۔یہ کہانیاں مختلف عنوانات کے ساتھ تین ننھی منی کتابوں کی شکل میں شائع کی گئیں اور بار بار شائع کی گئیں۔

اوزانِ اقبال

اشاعت اول ۱۹۸۳ء، شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز، ادبی مارکیٹ چوک انارکلی لاہور

اس کتاب کا موضوع علامہ اقبال کے اردو اور فارسی کلام کے اوزان و بحور اور اصناف

وہیئت ہیں۔اس کتاب میں علامہ کے جملہ شعری کلیات کے اوزان کا تعین کیا گیا ہے۔ نیز کلام اقبال میں مستعمل تمام اوزان کا مناسب الفاظ میں تعارف بھی کرایا گیا ہے۔آخر میں کلامِ اقبال میں استعمال شدہ اوزان کو مدنظر رکھتے ہوئے بعض نتائج اخذ کیے گئے ہیں جو بذاتِ خود بہت اہم ہیں۔تعینِ اوزان کا مسئلہ بہت پیچیدہ ہے،مگر مصنف نے اس مسئلے کو بہت سہل انداز میں حل کیا ہے۔اس سلسلے میں ممتاز محقق جناب اقبال صلاح الدین لکھتے ہیں:

''اوزان و بحور کا تسمیہ ایک پیچیدہ اور میکانکی عمل ہے جس سے بڑے بڑے محققین بھی کترا کر نکل جاتے ہیں،لیکن حفیظ صدیقی نے تسمیۂ اوزان و بحور کے سمجھانے کے لیے نہایت آسان طریق کار اختیار کیا ہے۔انھوں نے چند صفحات میں اہم زحافات کا عروضی عمل سمجھا دیا ہے اور پھر ہر وزن کے تعارف میں کسی بحر کے بنیادی رکن یا ارکان پر ان زحافات کے عروضی عمل کی مناسب تشریح بھی کر دی ہے۔اس طرح اوسط استعداد رکھنے والا قاری بھی ان تشریحات کی مدد سے تسمیۂ اوزان و بحور کے عمل کو بخوبی سمجھ سکتا ہے۔''

اس کتاب میں اوزان و بحور کے علاوہ علامہ اقبال کے ہاں استعمال کی گئی ہیئتوں پر بھی بحث کی گئی ہے۔اس حوالے سے انھوں نے ایک جامع باب قلمبند کیا ہے۔یہ باب مختصر تو ہے،مگر بے حد اہمیت کا حامل ہے۔اس باب میں ایسے اشارے موجود ہیں جو علامہ اقبال کی تفہیم اور ان کے فنی کمالات کی تحسین میں بہت اہم ہیں۔ہیئت کے سلسلے کا باب علامہ اقبال کے فنی کمالات کے بہت سے اہم گوشوں کی طرف مشیر ہوتا ہے اور اقبال کی فنی عظمت کا بہت عمدہ تعارف کراتا ہے۔

تفہیم و تحسین شعر

ابوالاعجاز حفیظ صدیقی،اشاعت اول،۲۰۰۶ء،اشاعت دوم ۲۰۱۶ء سنگت پبلشرز لاہور

ہمارے ہاں شعر کی شرح کرنے کا آسان نسخہ اس کی نثر بنانا ہے۔اس سے شعر کا حسن ضائع ہو جاتا ہے۔اس عمل سے طالب علم لفظوں کا قیدی سا بن جاتا ہے اور ان لفظوں کے لغوی مفہوم سے آگے نہیں جا سکتا،حالانکہ غزل میں بہت کچھ لفظوں سے ورا بلکہ وراء الوراء ہوتا ہے۔اس سب کچھ کو جاننے اور سمجھنے کے لیے علم اور ذوق دونوں کی تربیت کی ضرورت ہوتی ہے۔یہ کتاب یہی ضرورت پوری کر رہی ہے۔پروفیسر ابوالاعجاز حفیظ صدیقی نے شعر فہمی کے اصول شاعری سے اخذ

کیے ہیں۔انھوں نے ذوق شعر اور فکر سلیم کو راہنما بنایا ہے۔ان کے نزدیک شاعری کسی اور مقصد کے حصول کا ذریعہ نہیں رہی۔یہ شاعری ہے اور اسے شاعری ہی رہنا چاہیے۔تاج محل کسی مقصد کے حصول کا ذریعہ نہیں۔اس کا حسن ہی اس کا مقصد ہے۔جناب ابوالاعجاز حفیظ صدیقی نے شاعری کو یہی مقام دیا ہے۔وہ نہ اس کی سماجی حیثیت اور اہمیت سے انکار کرتے ہیں نہ اس کے سماجی و سیاسی پس منظر سے،نہ سماج میں اس کی حیثیت سے اور نہ شاعر کے لیے تخلیق شعر کے نفسیاتی تجربے کی اہمیت سے،لیکن شعر کے بارے میں ان کا اصول یہ ہے کہ یہ شعر ہو۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ شعر کیا ہے۔یہ کتاب اسی سوال کا جواب ہے۔انھوں نے شعر پیش کرتے ہوئے اس کا نسب نامہ نہیں دیکھا۔یہ نہیں دیکھا کہ شعر قدیم ہو یا جدید۔انھوں نے صرف یہ مدنظر رکھا ہے کہ شعر بہر حال شعر ہو۔انھوں نے شعر کے خارجی پیکر سے اس کے موضوعات ، کرداروں، مضامین، فلسفہ، بصیرت ہر پہلو کا احاطہ کیا ہے۔انھوں نے غزل کی شعریات کو تفصیل سے بیان کیا ہے اور ادب کے قاری کی ذہنی تربیت کی ہے۔

کتاب کے آخر میں چند اشعار پر شذرات قلمبند کیے گئے ہیں۔ان میں پنجابی کے دو لوک گیت بھی شامل ہیں۔ان شذرات کو پڑھ کر قاری سوچتا ہے کہ اس نے اس انداز میں پہلے کبھی کیوں نہیں سوچا تھا اور یہ سب کچھ ان گیتوں میں بہر حال موجود تھا۔

اصناف ادب

۲۰۱۲ء،سنگت پبلشرز،لاہور

اُردو ادب میں اصناف اور ہیئتوں کا مسئلہ بہت اہم ہے۔بعض جگہ اصناف اور ہیئتوں کا مسئلہ الجھ سا گیا ہے۔ابوالاعجاز حفیظ صدیقی نے اردو کی روایتی شعریات کو مدنظر رکھتے ہوئے قدیم اصناف اور ہیئتوں کی شناخت کو واضح کیا ہے اور ہر صنف و ہیئت کے اصول متعین انداز میں پیش کیے ہیں۔اردو میں بعض جدید اصناف مغرب اور مشرق کے مختلف ممالک سے آئیں اور متعارف ہوئیں۔مصنف مرحوم نے ان اصناف کی شناخت کے اصول بھی طے کیے ہیں اور اُردو میں ان کی الگ سے جو شناخت وجود میں آئی،انھیں بھی سامنے لانے کی کاوش کی ہے۔یہ کتاب بنیادی طور پر ان کی کتاب ادبی اصطلاحات کا تعارف کی ہی ایک ذیلی اور توسیعی سرگرمی ہے،مگر یہ کتاب الگ سے اپنی حیثیت بھی رکھتی ہے۔

کشاف تنقیدی اصطلاحات

۱۹۸۵ء مقتدرہ قومی زبان لاہور

ادبی اصطلاحات کا تعارف

۲۰۱۵ء اسلوب لاہور

ابوالاعجاز حفیظ صدیقی نے ۱۹۷۰ء کی دہائی میں ادبی اصطلاحات کی تشریحی لغات مرتب کی۔ یہ کام انسائیکلوپیڈیا کے انداز کا تھا، اس لیے ضخیم تھا۔ اس کی ضخامت کو دیکھتے ہوئے پرائیویٹ پبلشر تو اس کو دیکھ کر ہی کان کو ہاتھ لگاتے اور دور بھاگتے۔ بعض سرکاری اداروں سے رابطہ کیا گیا، مگر مارشل لا کے زمانے میں ادبی اداروں کی گرانٹ اس پراجیکٹ کے لیے خاصی ناکافی تھی۔ آخر کار مقتدرہ قومی زبان نے ایک درمیان کی راہ نکالی۔ انھوں نے فیصلہ کیا کہ پوری کتاب کو شائع کرنا ان کے لیے ممکن نہیں۔ اس لیے اپنے وسائل کے اندر رہتے ہوئے اس کا مختصر ایڈیشن شائع کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ اس اختصار کے کام کے لیے انھوں نے ایک نقاد جناب ڈاکٹر آفتاب احمد کو آمادہ کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے بعض توضیحات اور تفصیلات نیز بعض اصطلاحات پر خط تنسیخ کھینچ کر اسے مختصر کر دیا۔ یہ مسودہ مقتدرہ کے اپنے دیئے گئے نام یعنی کشاف تنقیدی اصطلاحات کے نام سے ۱۹۸۵ء میں شائع ہوا۔

یہ کتاب سامنے آئی تو اصل مسودے کے مقابلے میں مختصر ہونے اور بہت سی اصطلاحات سے محروم ہونے کے باوجود بہت مفید ثابت ہوئی۔ اساتذہ وطلبہ نے اس سے استفادہ کیا اور یہ دیکھا گیا کہ اکثر تحقیقی کتب ومقالات میں اس کتاب کے حوالے موجود ہیں۔

اصل کتاب ۲۰۱۵ء میں ادبی اصطلاحات کا تعارف کے نام سے شائع ہوئی۔ اس میں ادب میں استعمال ہونے والی ادبی، فنی، نفسیاتی، فلسفیانہ، سماجی اور تہذیبی اصطلاحات کی تشریح و توضیح جامع انداز میں کی گئی ہے۔ یہ کتاب اردو تنقید میں استعمال ہونے والی اصطلاحات کی جامع لغات کا درجہ رکھتی ہے۔

بابا بالک اور بجوگ

مارچ ۱۹۸۹ء، ادب خیمہ، لاہور

یہ کتاب جناب حفیظ صدیقی کی ایک خاص انداز کی شاعری کا مجموعہ ہے۔ اس کا لہجہ اور

انداز بھگتوں کی شاعری کی یاد دلاتا ہے۔ اس میں دو کردار مسلسل ہمکلام ہیں۔ ایک بابا ہے جسے گرو کہا جا سکتا ہے، دوسرا بالک ہے جسے مرید یا چیلا کہا جا سکتا ہے۔ گرو چیلے کی یہ گفتگو حیات و کائنات کے پرت الٹتی اور زندگی کے راز کھولتی ہے۔ اس میں انفس و آفاق کو نئے سے نئے زاویوں سے دیکھا گیا ہے۔ بھگتی شاعری میں انفس کا حوالہ ہمیشہ موجود رہا ہے۔ اس کتاب میں آفاق کا حوالہ بھی اتنا ہی بھرپور ہے جتنا انفس کا حوالہ ہے۔ حفیظ صدیقی نے ایک خاص لے اور لہجے میں بابا بالک اور بجوگ کی شاعری تخلیق کی ہے۔ اس میں غزلیں بھی ہیں، نظمیں بھی ہیں، مختصر نظمیں بھی اور طویل نظمیں بھی۔ یہ کتاب اردو شاعری میں نئے ذائقے کی خبر دیتی ہے۔

یادوں کی دھول

۱۹۹۲ء اشاعت اول، مقبول اکیڈمی، لاہور

۲۰۱۱ء اشاعت ثانی، سانجھ لاہور

یادوں کی دھول میں یادوں کی باز آفرینی ہے اور مختلف لوگوں کے شخصی خاکے ہیں۔ اس کتاب میں اُس پنجاب کی تصویر ملتی ہے جو تاجرانہ اور صنعتی پنجاب کی تشکیل سے قبل تھا۔ اس میں اقدار تھیں، روایتیں تھیں، صوفی رویے تھے اور ہمہ عمر کا عشق تھا۔ اس کے کردار شہرت اور دولت سے بے خبر تھے۔ یہ لوگ فقیرانہ زیست کرتے تھے اور ہر حوالے سے قلندر تھے۔ اس کے کردار اب گزرے زمانے کے کردار لگتے ہیں، مگر ان کرداروں کی آج بھی معنویت اور افادیت موجود ہے۔ اس میں گزرے دنوں کے قصے ہیں اور وہ مناظر ہیں جو آج نظر نہیں آتے۔ ان منظروں، ان قصوں اور ان کرداروں میں ہماری تہذیبی روایت کی بازیافت ہوتی ہے۔ یہی بات اس کتاب کی انفرادیت اور معنویت ہے۔

زیر طبع کتب

۱۔ ادھوری رفاقتوں کی تھکن

یہ کتاب ابوالاعجاز حفیظ صدیقی کے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ ان میں تجریدیت اور علامتیت موجود ہے۔ یہ افسانے ہماری ہم عصر صورتِ حال کی عمدہ تصویر اور تعبیر ہیں۔

۲۔ ریگستان کا سفر

یہ حفیظ صدیقی کا شعر کلیات ہے۔ اس میں بابا بالک اور بجوگ کے ساتھ ساتھ غیر مطبوعہ اور غیر مدون کلام بھی شامل ہے۔

۳۔ فیضان سعدی

حفیظ صاحب کو سعدی سے بہت عقیدت اور محبت تھی۔ انھوں نے احوالِ سعدی اور فیضان سعدی کو موضوع بنایا ہے۔ سعدی پر اب تک کے کلام کا جائزہ پیش کیا ہے اور نئے امکانات کی طرف توجہ دلائی ہے۔

۴۔ زہراب

اس کتاب میں حفیظ صدیقی کے سماجی اور تہذیبی موضوعات پر مضامین اور انشائیے شامل ہیں۔ اس میں مصنف نے اپنی زندگی کے تجربات کی روشنی میں بہت سے فکری اور سماجی مسائل کو موضوعِ بحث بنایا ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر ابواللیث صدیقی

پروفیسر ڈاکٹر معین الدین عقیل

قیام پاکستان کے بعد کراچی کو علمی و ادبی اعتبار سے جو مرکزیت حاصل ہوئی اس کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ بھارت سے پاکستان ہجرت کرنے والوں کی اکثریت، اور خاص طور پر متوسط اور تعلیم یافتہ طبقے نے کراچی کا رخ کیا اور رفتہ رفتہ اس شہر کو ہر میدان میں وسعت، رونق اور بے پناہ ترقی سے ہم کنار کر دیا۔ یہ آنے والے اپنے ساتھ اپنی تاریخی و تہذیبی روایات کے ساتھ ساتھ اپنا علمی و تہذیبی تجربہ، سائنسی و فنی مہارت اور علمی و ادبی ذوق کا ورثہ بھی لائے تھے، جسے انھوں نے یہاں خاصا فروغ بھی دیا۔ پھر ان کے ساتھ متعدد آنے والے اپنا ذاتی یا آبائی علمی ذخیرہ بھی یہاں لے آئے جو ذاتی کتب خانوں کی صورت میں اس شہر کی ایک ایسی شناخت کا سبب بنا جس نے اس شہر کو اور اس کے رہنے والوں کو ملک بھر کی علمی و ادبی فضا میں ایک وقعت اور امتیاز بخشا۔ قیام پاکستان کے فوری بعد مولوی عبدالحق (بابائے اردو) نے ''انجمن ترقی اردو'' کی سرگرمیوں کو یہاں فعال کیا اور اس کے نہایت قیمتی و نادر کتب خانے کو اس شہر کا امتیاز بنا دیا۔ پھر دو ہی تین برسوں میں یہاں کراچی یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا جس نے اپنے ابتدائی عہد کے مخلص، دیانت دار اور باشعور اور تجربہ کار سربراہوں کی علمی جستجو اور فروغِ علم کے جذبے کے تحت کچھ ہی عرصے میں ملک کی دیگر تمام جامعات کے مقابلے میں وسعت و ترقی اور معیار کے حوالے سے اس مقام پر پہنچا دیا کہ یہ یونیورسٹی پاکستان کی ''کیمبرج'' سمجھی جانے لگی اور ملک کی سب سے بڑی یونیورسٹی بن گئی۔ اس کے قیام کے ساتھ ہی اس میں ''شعبۂ اردو'' کا قیام عمل میں آیا اور اوّلین برسوں میں مولوی عبدالحق کی سرپرستی میں رہا اور ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں اس کے سربراہ کے طور پر اس سے منسلک ہوئے۔ مگر جلد ہی سندھ یونیورسٹی کے قائم ہونے پر وہ اس کے شعبۂ اردو سے وابستہ ہو کر حیدرآباد منتقل ہو گئے۔ ان کی جگہ ۱۹۵۶ء میں ڈاکٹر ابواللیث صدیقی اس کے صدر نامزد ہوئے اور

۱۹۷۶ء تک اس عہدے پر فائز رہے۔ یوں یہ شعبہ تقریباً بیس سال تک ان کی سربراہی میں ممتاز و فعال رہا اور گرم و سرد زمانہ دیکھتا۔۔۔ یا نشیب و فراز کے دور سے گزرتا رہا۔ یہ الگ داستان ہے جس میں درس و عبرت کے بھی کئی مقامات ہیں۔ ۱۹۷۶ء میں ملازمت سے سبکدوشی کے بعد کراچی یونیورسٹی نے انھیں ان کی طویل علمی خدمات کے صلے میں پروفیسر ایمریطس کا اعزاز عطا کیا۔ شعبے سے ان کا مستقل تعلق تو نہ رہا لیکن گاہے گاہے وہ شعبے میں تشریف لاتے اور 'مجلس اعلیٰ تعلیم و تحقیق' کا تاحیات رکن رہنے کے سبب اس کے اجلاسوں میں بھی شریک ہوا کرتے تھے۔ ۷ ستمبر ۱۹۹۴ء کو ڈاکٹر صاحب نے رحلت فرمائی۔

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی جب تک اس شعبے سے بحیثیت صدر منسلک رہے، اس کی شناخت بنے رہے۔ ان کے دور میں کئی ایسے اساتذہ کا تقرر ہوا جو بعد میں اپنی علمی و تصنیفی سرگرمیوں کی وجہ سے خود بھی معروف ہوئے اور شعبہ کی شہرت کا بھی سبب بنے، لیکن ڈاکٹر ابواللیث کی شہرت اور ان کی عزت و توقیر ان سب کے مقابلے میں نمایاں رہی۔ اس میں ان کے جاہ و جلال کا بھی بڑا دخل رہا جس میں طلبہ سے ایک باوقار فاصلے کو برقرار رکھنا بھی شامل تھا۔ کراچی میں آباد ہونے سے پہلے ڈاکٹر صاحب ۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۶ء تک پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے وابستہ تھے اور اس سے قبل ۱۹۳۸ء سے ۱۹۴۸ء تک علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے ''شعبہء اردو'' میں بھی بحیثیت لیکچرر خدمات انجام دے چکے تھے۔ گویا کراچی یونیورسٹی سے وابستگی سے قبل ہی وہ ایک تجربہ کار اور صاحبِ ذوق و جستجو استاد کی حیثیت حاصل کر چکے تھے۔ ان کا پی ایچ ڈی کا تحقیقی مقالہ ''لکھنؤ کا دبستانِ شاعری'' ادبی و تحقیقی میدان میں ان کی شناخت بن چکا تھا اور کئی اہم و معروف تحقیقی مقالات اور متعارفہ و مرتبہ متون بھی ان کی شہرت کا ایک سبب تھے۔ اگرچہ وہ ۱۹۵۶ء سے ۱۹۷۶ء تک کراچی یونیورسٹی سے بحیثیت پروفیسر و صدر شعبہ اردو منسلک رہے لیکن اس عرصے میں انھوں نے بحیثیت مہمان پروفیسر کولمبیا یونیورسٹی (۱۹۵۹ء ۔ ۱۹۶۰ء) اور سیٹو کے بنکاک آفس میں بحیثیت مشیرِ لسانی و ریسرچ اسکالر خدمات انجام دیں۔

ڈاکٹر صاحب کا آبائی وطن بدایوں تھا' لیکن ان کی پیدائش ۱۵ جون ۱۹۱۶ء کو آگرہ میں ہوئی [۱]، جہاں ان کے والد مظفر علی بحیثیت رجسٹرار عدالتِ خفیفہ خدمات انجام دے رہے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کی ابتدائی تعلیم ''وکٹوریہ ہائی اسکول''، آگرہ؛ ''مشن اسکول'' اور ''اسلامیہ ہائی

اسکول'' بدایوں میں ہوئی۔ پھر وہ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخل ہوئے جہاں سے ۱۹۴۴ء میں انھوں نے پروفیسر رشید احمد صدیقی کی نگرانی میں پی ایچ ڈی کی تکمیل کی۔ رشید احمد صدیقی صاحب بلاشبہ اپنے وقت کے ممتاز ادیب نقاد اور ساتھ ہی مزاح نگار کی شہرت بھی رکھتے تھے، لیکن تحقیق ان کا امتیاز نہ تھا۔ اس اعتبار سے، اگرچہ انھوں نے رسمی طور پر ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کے پی ایچ ڈی کے مقالے کی نگرانی و رہنمائی کی، لیکن لیث صاحب کے اس تحقیقی و تنقیدی مزاج کے مقالے کی ساری تحقیقی خصوصیات خود لیث صاحب کی ذاتی دل چسپی و جستجو کی ہی جا سکتی ہیں۔

تصنیف و تالیف کے زمرے میں ڈاکٹر لیث زمانۂ طالب علمی ہی سے مضامین و مقالات لکھنے لگے تھے جو ''جامعہ'' (دہلی) ''علی گڑھ میگزین'' (علیگڑھ) ''ہمایوں'' (لاہور) ''معارف'' (اعظم گڑھ) اور ''نگار'' (لکھنؤ) میں شائع ہوتے رہے۔ تنقید اور تحقیق دونوں ہی میں ڈاکٹر صاحب کی دل چسپی یکساں تھی۔ بعد میں لسانیات اور خاص طور پر اردو لسانیات ان کا محبوب موضوع بن گیا۔ ان کے پی ایچ ڈی کے تحقیقی مقالے نے' جو شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کا پہلا پی ایچ ڈی کا تحقیقی منصوبہ تھا، انھیں اسی زمانے میں شہرت سے ہم کنار کیا۔ یہ مقالہ دو تین بار شائع ہوا ہے۔ اسی عرصے میں کہ وہ ابھی مستقل کتابوں کی تصنیف کی جانب نہیں آئے تھے اور ابھی مضامین ہی لکھ رہے تھے، ایک مبسوط مقالہ ''انیسویں صدی میں اردو صحافت'' لکھا جو ''مصنف'' (علیگڑھ) میں شائع ہوا جو کتابی صورت میں بھی شائع ہوا [۲]۔ پھر ان کی تصانیف: ''لکھنؤ کا دبستانِ شاعری'' [۳]؛ ''مصحفی اور اس کا عہد'' [۴]؛ ''جرأت، اس کا عہد اور شاعری'' [۵]؛ ''غزل اور متغزلین'' [۶]؛ ''اسباب بغاوت ہند (سرسید احمد خاں)'' [۷]؛ ''نظیر اکبرآبادی اس کا عہد اور شاعری'' [۸]؛ ''روایت اور تجربے'' [۹]؛ ''بنیادی اردو'' [۱۰]؛ ''اردو کی ادبی تاریخ کا خاکہ'' [۱۱]؛ ''ادب اور لسانیات'' [۱۲]؛ ''جامع القواعد'' [۱۳]؛ ''اقبال اور مسلک تصوف'' [۱۴]؛ ''ملفوظاتِ اقبال، ترتیب و حواشی'' [۱۵]؛ ''آج کا اردو ادب'' [۱۶]؛ ''تہذیب و تاریخ'' [۱۷]؛ ''تاریخِ زبان و ادب اردو'' [۱۸]؛ ''بیسویں صدی کا اردو ادب'' [۱۹]؛ ''اردو میں سائنسی ادب کا اشاریہ'' [۲۰]، ان کی نمائندہ تصانیف اور معروف کاوشیں ہیں۔

ڈاکٹر صاحب شعبۂ اردو جامعہ کراچی کے میرے ان اساتذہ میں شامل ہیں' جن کی علمیت' شفقت اور سرپرستی میرے لیے ایک اعزاز و افتخار ہے۔ میں نے ۱۹۶۵ء میں آنرز میں داخلہ لیا تھا

اور ۱۹۷۵ء میں ڈاکٹر صاحب کی نگرانی وسرپرستی میں پی ایچ ڈی کے مقالے ''تحریک آزادی میں اردو کا حصہ'' کی تکمیل کی۔ جب کہ قبل ازیں ڈاکٹر صاحب کی نگرانی میں ۱۹۶۹ء میں ایم اے کی تکمیل کے لیے مقالہ بعنوان: ''تحریک پاکستان کا لسانی پس منظر'' تحریر کیا اور پھر ایم اے کی کلاسوں میں ان سے درس لیے۔ کلاسوں میں ان کے لیکچرز بے حد معلوماتی اور پرمغز ہوا کرتے تھے۔ وہ لیکچر کے موضوعات میں ڈوب کر لیکچر دیتے اور کلاس میں مجھ جیسے طلبہ ایک سکتے کے عالم میں ان کے الفاظ میں کھوئے رہتے۔ مجھے خوشی ہے کہ یونیورسٹی کے اساتذہ میں مجھے نامور اساتذہ کی شاگردی کا شرف حاصل ہوا لیکن لیث صاحب کی بے نیازی اور خودداری کی صفات میرے لیے بہت متاثر کن اور قابل رشک اور مؤثر تھیں، اس لیے اب پیچھے پلٹ کر دیکھتا ہوں تو مجھے وہ یونیورسٹی کے دیگر تمام ہی اساتذہ کے مقابلے میں' اپنی چند بہت عام سی دیدہ وشنیدہ انسانی کمزوریوں کے باوجود' ایک برتر اور بالاتر مقام پر نظر آتے ہیں۔ انھوں نے اپنا وقار اور جلال ہمیشہ برقرار رکھا اور طلبہ سے متانت وسنجیدگی کے ایک فاصلے پر رہے لیکن جب بھی حوصلہ افزائی اور رہنمائی کا موقع آیا انھوں نے بڑی وسعتِ قلب اور شفقت ومحبت کا ثبوت دیا۔ جب میں ایم اے کا طالب علم تھا تو اس کی تکمیل کے لیے مقالہ لکھنے کا خواہش مند ہوا۔ اس وقت شعبہ میں اس کی روایت' جو کبھی ماضی میں موجود تھی، اس وقت کئی برسوں سے منقطع تھی۔ میرے علاوہ اس وقت میرے ساتھیوں میں کوئی اور تحقیقی مقالہ لکھنے کے حق میں نہ تھا اسی لیے مجھے بہت امید نہ تھی کہ مجھے مقالہ لکھنے کی اجازت مل جائے گی۔ مگر لیث صاحب نے اجازت دے دی اور میرا ہی منتخب کردہ موضوع: ''تحریکِ پاکستان کا لسانی پس منظر'' مقالے کے لیے پسند بھی کیا۔ آج کل یا پہلے بھی ایسا کم ہی ہوتا ہے کہ صدرِ شعبہ یا تحقیقی منصوبوں کے نگران طلبہ کو اتنی آزادی دیں جو لیث صاحب نے دونوں ہی مقالات برائے ایم اے اور پی ایچ ڈی کے لیے موضوعات منتخب کرنے اور ان پر اپنی ہی مرضی اور اپنے نقطۂ نظر کے مطابق کام کرنے کی مجھے دے رکھی تھی۔ انھوں نے دونوں مقالات کے مکمل ہونے تک نہ کہیں کسی معاملے میں دخل دیا' نہ باز پرس کی اور نہ میرے خیالات، میرے طریقۂ کار، اسلوب یا مباحث ومطالب پر کوئی اعتراض کیا۔ یہ ان کی وسعتِ قلبی اور بُردباری وشفقت ہی تھی کہ میرے اس طرح کے کاموں کو وہ پسند کرتے رہے اور جب بھی انھیں کہیں موقع ملتا میرے کاموں کو لفظاً یا تحریراً سراہتے بھی رہتے۔

لیث صاحب کے ساتھ میرا نیاز مندانہ اور عقیدت مندانہ رشتہ مارچ ۱۹۹۳ء تک برقرار رہا پھر میں جاپان چلا گیا۔ میرے جاپان ہی کے قیام کے عرصے میں ستمبر ۱۹۹۴ء میں ان کا انتقال ہوگیا۔ ۱۹۷۵ء میں پی ایچ ڈی کی تکمیل کے بعد بھی ڈاکٹر صاحب سے میرا ارادتمندانہ رشتہ برقرار رہا۔ وہ پروفیسر ایمریطس کی حیثیت میں گاہے گاہے شعبے میں تشریف لاتے رہے۔ ۱۹۷۶ء میں سبکدوشی کے بعد کچھ عرصے تک انھوں نے تدریس بھی کی لیکن شعبہ کا زوال آمادہ اور بگڑتا ماحول اب ایسا نہ رہا تھا کہ وہ بخوشی یہاں آتے یا بہ اصرار انھیں بلایا جاتا کہ شعبہ کے طلبہ ان سے استفادہ کر سکتے۔ سارا شعبہ اور اس وقت شعبہ کے سینئر اساتذہ سب ہی حقیقتاً اگرچہ ان کے مرہونِ منت تھے لیکن بظاہر کوئی نہ تھا جو ڈاکٹر صاحب کا حقیقی قدر شناس ہوتا اور انھیں ایک اثاثہ سمجھ کر کسی طرح شعبہ سے عملی طور پر وابستہ رکھنے کے جتن کرتا۔

ڈاکٹر صاحب کی محبت وشفقت سے میری ذات ہمیشہ علمی فیض پاتی رہی۔ ڈاکٹر صاحب کی شعبہ سے عملی سبکدوشی کے وقت اور بعد میں کئی سال تک میں نے جزوقتی طور پر روزنامہ ''جسارت'' کے ادبی صفحے کی ادارت کی ہے۔ اس ضمن میں کئی ایسے موضوعات' عنوانات کو اس صفحے پر جگہ دی جس کی وجہ سے کئی سال تک یہ صفحہ پاکستان بھر میں شوق ودلچسپی سے پڑھا جاتا رہا۔ اس سلسلے میں میں نے اس صفحے کے لیے ڈاکٹر صاحب سے قسط وار اپنی خودنوشت لکھنے کی درخواست کی جو انھوں نے قدرے تامل کے بعد منظور کر لی اور نہ صرف لکھنا شروع کر دیا بلکہ ہر ہفتے باقاعدگی سے انھوں نے تقریباً ڈیڑھ سال تک اپنی ساری مصروفیات میں سے وقت نکال کر ہفتہ وار اپنی خودنوشت ''رفت و بود'' کے نام سے وہ لکھتے رہے۔۔۔۔ جو شائع ہونے لگی تو بہت مقبول بھی ہوئی اور اطلاع ہے کہ کم از کم علیگڑھ اور کراچی کے دو رسائل میں نقل بھی ہوتی رہی۔

ڈاکٹر صاحب اپنی زندگی میں اس خودنوشت کو کتابی صورت میں دیکھنے کے خواہاں تھے۔ وہ ایسا کر سکتے تھے اور اس عرصے میں ان کی کئی کتابیں منظر عام پر بھی آئیں اور آخر وقت تک وہ لکھتے پڑھتے رہے لیکن انھوں نے کتابی صورت میں اس خودنوشت کی اشاعت کے لیے مستقل مزاجی سے کوئی اہتمام نہ کیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس خودنوشت پر نظر ثانی کرنا چاہتے تھے یا غالباً وہ اس میں کچھ اضافہ بھی کرنا چاہتے تھے جس کا انھیں موقع نہ مل سکا۔ اگر ایسا ہوسکتا تو یقیناً یہ خود

نوشت اور زیادہ مبسوط ہوجاتی لیکن اب اس صورت میں بھی یہ بڑی حد تک مکمل ہے اور نہ صرف ڈاکٹر صاحب کی زندگی اور ان کی مصروفیات کی حد تک بلکہ خاص طور پر ان کی ابتدائی اور علی گڑھ کی زندگی کے احوال وکوائف اور وہاں کے ماحول وشخصیات کے لیے ایک دل چسپ اور معلوماتی ماخذ کی حیثیت میں بے حد اہم اور ایک حد تک ناگزیر بھی ہے۔ علیگڑھ سے متعلق کئی اہم و غیر اہم شخصیات کی خودنوشت سوانح عمریاں اب تک منظرِ عام پر آ چکی ہیں جن میں علیگڑھ کا ماحول اور وہاں کی زندگی اور شخصیات کا احوال ہمارے لیے پرکشش بھی ہے لیکن ڈاکٹر صاحب کی خودنوشت: ''رفت و بود'' ان میں کئی اعتبار سے زیادہ معلوماتی اور دل چسپ و مفید ہے۔ اس میں ڈاکٹر صاحب کے بے ساختہ اسلوب کا بھی بڑا دخل ہے۔ ان کا حافظہ بڑا قوی اور حاضر تھا اور حالات اور واقعات کی جزئیات تک انھیں خوب یاد تھیں۔ خودنوشت کا سارا مسودہ قلم برداشتہ وہ تحریر کرتے رہے جس میں کانٹ چھانٹ یا ردوبدل شاذ ہی کہیں نظر آتا ہے۔ علیگڑھ کے تعلیمی و علمی ماحول' وہاں کی شخصیات کے روز وشب اور پھر ایک ہمہ صفت انسان' ایک اسکالر کی زندگی کے مطالعے لیے' جو اس نے مختلف معاشروں اور مختلف دنیاؤں میں' بھرپور انداز سے گزاری ہے' یہ تصنیف ایک دل چسپ اور منفرد خودنوشت کے طور پر اس صنفِ ادب میں بھی ممتاز اور نمایاں رہے گی۔

شعبۂ اردو میں اپنی تدریسی و انتظامی مصروفیات کے علاوہ ڈاکٹر لیث صاحب یونیورسٹی کی انتظامی اور علمی مجلسوں میں بھی شریک رہ کر اہم علمی و تعلیمی امور کی انجام دہی میں سرگرم رہے۔ ایسی ہی سرگرمیوں میں ان کا ایک اہم کارنامہ شعبۂ اردو میں ایک ذیلی شعبۂ اردو لسانیات کا قیام بھی تھا، جو ۱۹۶۴ء میں قائم ہوا۔ اس کے قیام کا فیصلہ اور اس کا تصور وہ امریکہ کے دوران قیام کولمبیا یونیورسٹی سے لے کر آئے تھے۔ پاکستان کی کسی بھی یونیورسٹی میں اس وقت تک لسانیات کی تدریس کی کوئی مثال نہ تھی، چہ جائے کہ اردو لسانیات کا شعبہ۔ اسے دیکھتے ہوئے کراچی یونیورسٹی ہی کے شعبۂ انگریزی کے لائق اور مخلص صدر شعبہ ڈاکٹر علی اشرف نے بھی اپنے شعبے میں ایسا ہی شعبہ قائم کیا جو اب تک جیسے تیسے جاری ہے۔

حواشی:

۱۔ جب کہ بدایوں کے معروف ادبی رسالے ''ذوالقرنین'' نے اطلاع دی کہ ''ابواللیث بن مظفر علی (رجسٹرار عدالت خفیفہ' آگرہ) ۲۲ر فروری ۱۹۱۷ء بوقت صبح چھ بج کر بیس منٹ پر بمقام آگرہ پیدا ہوئے''۔ ''ذوالقرنین''، (بدایون)، ۲۷ر فروری ۱۹۱۷ء

۲۔ اس پر سن اشاعت درج نہیں لیکن یہ ۱۹۳۵ء اور ۱۹۴۱ء کے درمیان کسی وقت شائع ہوا۔

۳۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ۱۹۴۴ء

۴۔ شیخ مبارک علی اینڈ سنز، لاہور، سن ندارد

۵۔ اردو مرکز، لاہور، ۱۹۵۲ء

۶۔ اردو مرکز، لاہور، ۱۹۵۴ء

۷۔ اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۵۷ء

۸۔ اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۵۷ء

۹۔ اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۵۹ء

۱۰۔ مرکزی اردو بورڈ، لاہور، ۱۹۶۵ء

۱۱۔ اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۷۰ء

۱۲۔ مرکزی اردو بورڈ، لاہور، ۱۹۷۱ء

۱۳۔ اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۷۱ء

۱۴۔ اقبال اکیڈمی پاکستان، لاہور، ۱۹۷۷ء

۱۵۔ اقبال اکیڈمی پاکستان، لاہور، ۱۹۷۷ء

۱۶۔ رہبر پبلشرز، کراچی، ۱۹۹۰ء

۱۷۔ غضنفر اکیڈمی، کراچی، ۱۹۹۲ء

۱۸۔ رہبر پبلشرز، کراچی، ۱۹۹۸ء

۱۹۔ اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۸۸ء

۲۰۔ مقتدرہ قومی زبان، کراچی، ۱۹۸۱ء

پروفیسر احمد شاہ پطرس بخاری

ڈاکٹر عبدالواجد تبسم

اردو کے صاحب طرز مزاح نگار، شاعر، نقاد اور مترجم پطرس بخاری نے ۱۸۹۸ء میں پشاور کے ایک علمی و ادبی خانوادے میں آنکھ کھولی۔ اُن کے بزرگ کشمیر سے ہجرت کر کے پشاور وارد ہوئے تھے۔ والد کا نام سید عبداللہ تھا جو پشاور میں خواجہ کمال الدین وکیل کے منشی تھے۔ پطرس کے والد اور بڑے بھائی سید محمد شاہ رفعت دونوں شاعر تھے۔ چنانچہ گھر کے اس ادبی ماحول کی بدولت پطرس بخاری اور ان کے چھوٹے بھائی سید شاہ ذوالفقار بخاری نے بھی شعر کہنے شروع کر دیئے مگر والد کی ناراضی کی وجہ سے اکثر شعر کہہ کر ضائع کر دیتے۔

پطرس ابھی آٹھ برس کے تھے کہ ماں کا سایہ عاطفت سر سے رخصت ہوا اور والد کو بچوں کی دیکھ بھال کی فکر دامن گیر ہوئی اور انھیں دوسری شادی کرنا پڑی۔ پطرس کی ابتدائی تعلیم و تربیت گھر پر ہی ہوئی۔ انھوں نے قرآن شریف، ابتدائی دینی کتب، فارسی قواعد کے ساتھ ساتھ گلستان و بوستان بھی پڑھیں۔ نو سال کی عمر میں مشن اسکول پشاور میں داخلہ لیا۔ گھر کے ادبی ماحول اور اپنے ذوق و شوق کی بدولت انھیں ابتدا ہی سے پڑھنے لکھنے کا شوق پیدا ہو گیا۔ چنانچہ انھوں نے اپنے اسکول کے ابتدائی زمانہ ہی میں شاعری سے لگاؤ کی بدولت متعدد انگریزی نظمیں زبانی یاد کر لیں۔ اسکول کے ایک سالانہ جلسے کی تقریب میں جب انھوں نے صوبے کے چیف کمشنر سر جارج روس کیپل کے سامنے انگریزی کی ایک نظم پڑھی تو انھوں نے خوش ہو کر انعام کی کتاب میں لکھا ''اے کاش! میں پشتو اتنی اچھی طرح بولنے لگوں، جتنی اچھی طرح چھوٹا پیر، پیر احمد شاہ انگریزی بولتا ہے۔'' ۱۹۱۳ء میں میٹرک کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا اور اسلامیہ کالج پشاور میں داخلہ ہوئے، جہاں سے انھوں نے ۱۹۱۵ء میں ایف اے کا امتحان پاس کیا۔ ایف اے کرنے کے بعد ۱۹۱۶ء میں انھوں نے گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لیا۔ گورنمنٹ کالج لاہور کی علمی و ادبی فضا میں

ان کی طبیعت کے خوب جوہر کھلے۔ گورنمنٹ کالج کی محبت ان کے رگ و پے میں سما گئی۔ وہ اس درس گاہ کے طالب علم بھی رہے، استاد اور پرنسپل بھی۔ ان کی علمی و ادبی زندگی کا آغاز بھی یہیں سے ہوا۔ ان کی طبع رسا نے انھیں فکر و نظر کے نت نئے جہان سے روشناس کرایا اور وہ اس ادارے سے نکل کر ایک عالم پھرے مگر اس کالج کی محبت نے انھیں ہمیشہ اپنی جانب کھینچے رکھا۔

۱۹۱۷ء میں بی اے کرنے کے بعد انھوں نے ایم ایس سی فزکس میں بھی داخلہ لیا مگر سائنس سے طبعی مناسبت نہ ہونے کی وجہ سے انھوں نے ایم اے انگریزی ادبیات میں داخلہ لے لیا جو ان کی دلچسپی کا اصل محور تھا۔ اس مضمون میں وہ یونیورسٹی بھر میں اول رہے اور انھیں طلائی تمغا دیا گیا۔ ادبیات سے دلچسپی کی بنا پر ۱۹۱۹ء میں انھیں کالج کے میگزین ''راوی'' کا مدیر بھی مقرر کیا گیا۔ اس دوران میں انھوں نے سول اینڈ ملٹری گزٹ میں اپنے استاد پیٹر واٹکنز (Peter Watkins) کے قلمی نام سے مضامین لکھے مگر پطرس کا قلمی نام انھوں نے ''کہکشاں'' کے ایک سلسلہ مضمون ''یونانی حکما اور ان کے خیالات'' کے لیے اختیار کیا۔

گورنمنٹ کالج لاہور سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد وہ ۲۶۔۱۹۲۵ء میں مزید تعلیم کے لیے انگلستان چلے گئے اور وہاں کے عمانویل کالج کیمبرج میں داخلہ لے لیا جہاں انھیں انگریزی ادبیات کے نامی گرامی اساتذہ سے کسبِ فیض کا موقع ملا، جن میں بینٹ (Bennet) اور ڈاکٹر لیوس (Lewis) جیسے اکابر اساتذہ شامل ہیں۔ پطرس کیمبرج یونیورسٹی کی عظمت کے سحر میں ہمیشہ گرفتار رہے اور محرومی کا احساس انھیں ہمیشہ دامن گیر رہا۔ اس کا ذکر ان کے ہاں مختلف حوالوں سے ملتا ہے۔ یہ ان کی کسر نفسی تھی حالاں کہ ان کے اساتذہ کی ان کے بارے میں رائے یکسر مختلف تھی کہ ''بخاری کا علم اس قدر فراخ اور وسیع و بسیط ہے کہ ایک انگریز کے لیے بھی اتنا علم اس عمر میں رکھنا کم و بیش ناممکن ہے۔'' کیمبرج سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد پطرس وطن واپس لوٹے تو انھیں پہلے سنٹرل ٹریننگ کالج اور پھر گورنمنٹ کالج لاہور میں انگریزی ادبیات کا پروفیسر مقرر کیا گیا۔ ان کی درس و تدریس اور راہنمائی نے گورنمنٹ کالج کی علمی، تہذیبی اور ادبی فضا میں ایک نئی روح پھونک دی۔ کالج میگزین نئے معیار سے آشنا ہوا۔ انھوں نے مذاکروں، علمی و ادبی مباحثوں، مشاعروں میں حصہ لیا اور ڈراموں میں نہ صرف ہدایت کاری کی بلکہ اداکاری بھی کی۔ ادبی سوسائٹیوں میں نئی جان ڈالی اور ایک الگ سے ''اردو مجلس'' بھی قائم کی جس کے ہفتہ وار

اجلاس ان کے گھر پر ہوتے، جس میں مخصوص احباب اور طلبہ شریک ہوتے۔ طلبہ کے تنقیدی اور ادبی ذوق کو جلا دینے کے ساتھ ساتھ عملی زندگی میں ان کی مشفقانہ راہنمائی کا فریضہ بھی انجام دیا۔

انھوں نے درس و تدریس کے ساتھ ساتھ خالصتاً تعلیمی کاموں میں بھی حصہ لیا۔ ۱۹۲۴ء میں پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی کے قیام کے بعد وہ اس کے ایسوسی ایٹ ایڈیٹر اور بعد ازاں اس کے ایڈیٹوریل بورڈ کے ممبر رہے جو ''پنجاب ایڈوائزری بورڈ'' کہلاتا تھا۔ اس بورڈ کا کام انگریزی کی بعض مفید اور معلوماتی کتب کا انتخاب اور ان کا ماہر اساتذہ سے اردو، ہندی اور پنجابی میں ترجمہ کرانا تھا۔

۳۲۔۱۹۳۱ء میں پطرس بخاری کو پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی کا سیکرٹری مقرر کیا گیا اور وہ اپنے فرائض منصبی کے علاوہ اس خدمت پر بھی متمکن رہے اور بعض امور انجام دیے۔ ۱۹۳۷ء میں آل انڈیا ریڈیو کے محکمے کے قیام کے بعد مسٹر فیلڈن کنٹرولر نے پطرس بخاری کی خدمات مستعار لیں اور انھیں اپنا نائب مقرر کیا۔ وہ سات برس تک ریڈیو سے منسلک رہے۔ ۱۹۴۰ء میں انھیں کنٹرولر جنرل آل انڈیا ریڈیو مقرر کیا گیا۔ اس عہدے کی بدولت انھیں متعدد کانفرنسوں میں شرکت کا موقع ملا اور عالمی سطح پر بھی ان کی قدر و منزلت میں اضافہ ہوا۔ قیام پاکستان سے قبل وہ گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل مقرر ہوئے پھر یہیں سے وہ لندن بھیجے گئے جہاں انھوں نے پاکستانی نمایندے کی حیثیت سے انڈیا آفس کی املاک کی تقسیم کے مذاکرات میں حصہ لیا۔ ۱۹۴۸ء میں میکسیکو میں ایک بین الاقوامی کانفرنس میں پاکستان کی نمایندگی کی۔ ۱۹۴۹ء میں اقوام متحدہ کی انسانی حقوق کی کمیٹی میں آپ نے دولت پاکستان کی طرف سے شرکت کی۔ ۱۹۵۰ء میں لیاقت علی خان کے دورۂ امریکہ میں ان کے ساتھ رہے اور ان کے لیے بیشتر تقاریر بھی لکھیں۔ اس تاریخی اور اہم دورے میں انھوں نے نہایت جانفشانی سے کام کیا اور اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ ان خدمات کے اعتراف میں ۱۹۵۲ء میں اقوامِ متحدہ کے مستقل نمایندے کے طور پر ان کا تقرر ہوا اور وہ ۱۹۵۴ء تک اس عہدے پر فائز رہے۔ ۱۹۵۵ء میں ان کی خداداد صلاحیتوں کے پیشِ نظر اقوامِ متحدہ کے سیکرٹری جنرل ڈاگ ہیمر شولڈ کی خواہش پر انھیں اقوامِ متحدہ کے شعبہ اطلاعات کا ڈپٹی سیکرٹری جنرل منتخب کیا گیا۔ وہ پہلے ایشیائی تھے کہ جن کا اس اہم عہدے پر تقرر ہوا۔ انھوں نے اپریل ۱۹۵۹ء میں اس عہدے سے سبکدوش ہونے پر کولمبیا یونیورسٹی میں انگریزی ادبیات کے پروفیسر

کی حیثیت سے کام کرنے کی پیشکش قبول کر لی تھی مگر زندگی نے وفا نہ کی اور ۵ دسمبر ۱۹۵۸ء کی صبح کو نیویارک میں حرکت قلب بند ہونے سے دنیا سے خالق حقیقی سے جا ملے۔

(۲)

پطرس بخاری اپنی بے پناہ خداداد صلاحیتوں کی بدولت مختلف انتظامی عہدوں پر رہنے کی وجہ سے کوئی زیادہ علمی و ادبی سرمایہ نہیں چھوڑ سکے البتہ جو لکھا وہ اپنے اعلیٰ معیار کی بدولت قدر کا حامل ہے۔ انھوں نے ادب کی متعدد اصناف پر طبع آزمائی کی اور ہر ایک پر یکساں مہارت سے لکھا اور انھیں نئے معیار سے آشنا کیا۔ ان میں سرفہرست مزاح نگاری ہے۔ پطرس بخاری نے مزاح کے حوالے سے ''مضامین پطرس'' کی صورت میں نہایت قلیل سرمایہ چھوڑا ہے مگر یہ بہ قیمت بہتر کے مصداق ہے۔ اس مجموعے میں کل گیارہ مضامین شامل ہیں جن کی بدولت وہ شہرت عام اور بقائے دوام کے منصب پر فائز ہوئے۔ انھوں نے انگریزی ادب کی روح کو مشرقی مزاج سے آشنا کرتے ہوئے ایک نئی تر و تازگی، ندرت اور نفاست پیدا کی اور اردو مزاح نگاری کی روایت میں ایک نئے کا اضافہ کیا۔

پطرس نے پنجاب ٹیکسٹ بورڈ کمیٹی کی انگریزی کتب کے تراجم کی اسکیم کے ممبر اور بعد ازاں اس کے سیکرٹری کی حیثیت سے بعض اہم رپورٹیں مرتب کیں۔ اس دوران میں انھوں نے متعدد انگریزی کتب کے اردو تراجم بھی کیے جو ترجمہ سے زیادہ طبع زاد معلوم ہوتے ہیں۔ انھوں نے برٹرینڈ رسل کی کتاب کا ترجمہ ''تعلیم خصوصاً اوائلِ طفلی میں'' (۱۹۳۵ء)، ہنڈرک فان لون کی کتاب Story of Man Kind کا ترجمہ ''نوع انسانی کی کہانی''، ایف ایل برین کی کتاب کا ترجمہ غلام عباس کی مدد سے ''دیہات میں بوائے سکاؤٹ کا کام'' (۱۹۳۴ء) کے نام سے کیا جبکہ آر ایل اسٹوینس کی شہرۂ آفاق کتاب مارخائیم بھی ان کے اہم تراجم میں سے ہے۔ ان کے علاوہ پطرس نے انگریزی ادب کے بعض شہکار افسانوں اور ڈراموں کے ترجموں سے اردو تراجم کی روایت کو ثروت مند کیا ہے۔

پطرس بخاری کے تنقیدی مضامین اور دیباچے بھی اہمیت کے حامل ہیں۔ تنقیدی مضامین میں موضوع اور فن کی باریکیوں تک رسائی، پھر بنظرِ غائر اس موضوع کی تمام جزیات کو بیان کر دینے کا ملکہ پطرس ہی کو حاصل تھا۔ ''نیا ادب''، ''ہمارے زمانے کا اردو ادیب''، ''یو پی کے تنقید

نگاروں کی خدمت میں''، ''انارکلی''، ''مخلص صاحب اور ہم نیاز مند'' اور ''کچھ عصمت چغتائی کے بارے میں'' ان کی تنقید کا شہکار ہیں۔ جہاں تک دیباچوں کا تعلق ہے تو اس میں بھی ان کے ہاں ایک طرح کا نیا اور انوکھا پن نظر آتا ہے۔

پطرس نے اردو اور فارسی دونوں میں شعر کہے مگر شاعری کو کوئی خاص اہمیت نہ دی اور زیادہ تر کلام ضائع کر دیا۔ جس سے ان کے شاعرانہ مرتبے کا تعین نہیں ہو سکا۔

(۳)

پطرس بخاری پہلو دار شخصیت کے مالک تھے۔ وہ صاحب طرز ادیب، عہد ساز استاد، بے بدل عالم اور سخت گیر منتظم تھے۔ اپنی خداداد ذہانت اور محنت سے انھوں نے وہ مقام و مرتبہ حاصل کیا جو کم ہی کسی کو نصیب ہوتا ہے۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں بحیثیت استاد اور پرنسپل، آل انڈیا ریڈیو کے ڈائریکٹر جنرل اور پھر سیاست کے خارزاروں میں اقوامِ متحدہ میں پاکستانی نمایندے کی حیثیت سے غرض جہاں کہیں بھی رہے دوسروں سے الگ، منفرد اور ممتاز رہے۔

پطرس بخاری کو گفتگو میں خاص ملکہ حاصل تھا۔ محفل خواہ کمرۂ جماعت کے طلبہ کی ہو، دوست احباب کی ہو یا نجی جہاں بیٹھتے محفل کو زعفران زار کر دیتے۔ ان کی شخصیت مشرقی و مغربی تہذیبوں کی پروردہ تھی۔ مگر اس میں تضاد کی بجائے ایک طرح کا امتزاج تھا۔ ان کی بظاہر چال ڈھال، وضع قطع، اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے، کھانے پینے اور لباس سے مغربیت ٹپکتی تھی۔ مگر دوستوں کی محفل یا گھر میں مشرقیت سانس لیتی ہوئی نظر آتی تھی۔

پطرس بخاری نے تمام عمر مستعدی سے کام کیا اور بے تکان کام کیا۔ دوستوں کی محفلیں رات گئے جمی رہتیں اور پھر راتوں کو سڑکوں کی خاک چھاننا اور دوستوں سے گپیں ہانکنا ان کا محبوب مشغلہ تھا مگر دن بھر فرائض منصبی ادا کرنا اور کام میں جُتے رہنا اور اس میں کسی قسم کی کوتاہی نہ ہونے دینا ان کی عملی زندگی کا ایک اور رخ تھا۔ وہ کام کے وقت ڈٹ کر کام کرتے تھے اور کام کے بعد ڈٹ کر گھومتے پھرتے تھے۔

پطرس کی زندگی جہدِ مسلسل اور کشمکش سے عبارت تھی۔ جہاں نو کی تگ و دو نے انھیں ہمیشہ متحرک کیے رکھا اور اسی تگ و دو میں وہ دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔

پروفیسر ڈاکٹر ادیب الحسن رضوی

ڈاکٹر آصف فرّخی

ادیب صاحب کا نام میں نے پہلے سُن لیا تھا، ان کو دیکھا بعد میں۔ یہ ناممکن تھا کہ سول اسپتال کی راہداریوں میں آتے جاتے وہ نظر نہ آئیں۔ دور سے پتہ چل جاتا تھا۔ لباس کے اوپر سفید کوٹ پہنے ہوئے اور بال جو اس وقت بھی سفید تھے۔ بات تیکھی اور چال کڑی کمان کا تیر جس سے ہر معاملے میں ان کا مصمّم ارادہ ٹپکتا تھا۔ چہرے پر بردبار سنجیدگی۔ آگے پیچھے دو چار طالب علم یا جونیئر ڈاکٹر احترام کے ساتھ چلتے ہوئے۔ دور سے پتہ چل جاتا کہ ادیب صاحب آ رہے ہیں اور ہم ایسے طالب علم جو ابھی تھرڈ ایئر میں نہ پہنچے تھے مگر سفید کوٹ پہننے اور ڈاکٹر کہلانے کا شوق تھا، چپکے سے اِدھر اُدھر سٹک جاتے۔ ادیب صاحب کچھ کہتے بھی نہیں مگر ان کا رعب ایسا تھا۔

ادیب صاحب کا رعب دبدبہ ان کے نام کی وجہ سے تھا۔ جب میں کالج میں آیا تو ان کا نام آج کی طرح بچّے بچّے کی زبان پر نہیں تھا لیکن ان کے کارناموں کی داغ بیل پڑنا شروع ہو چکی تھی۔ ان کے کارنامے آہستہ آہستہ نمایاں ہوتے چلے گئے مگر اس وقت ان سے بہت ڈر لگتا تھا (سچ تو یہ ہے کہ آج بھی لگتا ہے!) سب کو معلوم تھا کہ وہ طالب علموں کو ذرا سی بات پر جھاڑ دیتے ہیں۔ خود مجھے بھی آگے چل کر ان سے ڈانٹ کھانے کا اعزاز حاصل ہوا۔ (اس کے بغیر ڈاؤ میڈیکل کالج کی سند کیسے مکمّل ہوتی؟) مگر ان کے بے پناہ شخصی احترام کی وجہ سے ان کے مزاج کی تیزی نہیں تھی بلکہ سارے طالب علموں کو پتہ تھا کہ سول اسپتال میں انھوں نے اپنے چھوٹے وارڈ کو کیا بنا دیا ہے۔ ایسے ماحول میں جہاں اسپتال کے وارڈ مریضوں اور ہر مریض کے درجن بھر تیمارداروں سے ابلے پڑتے، ایک ہجوم کی سی کیفیت رہتی، صفائی کا انتظام کبھی ہوتا بھی تو اس کو برقرار رکھنا مشکل۔ پھر در و دیوار سے اٹتی ہوئی غربت، ناداری، دواؤں کا اور دوسری سہولتوں کا

فقدان، بے بسی، لاچاری، موت سے ہمہ دم لڑتی ہوئی زندگی ___ تھرڈ ایئر میں آنے کے بعد چند دن کے لیے ادیب صاحب کے وارڈ میں پوسٹنگ ہوئی تو دیکھا کہ انھوں نے قواعد وضوابط کا سخت گیر نظام بنا رکھا ہے۔ مریضوں کو دوائیں بھی ملتی ہیں اور وقت پر کھانا بھی۔ کام کے معاملے میں کسی طالب علم کو آنا کانی کرنے کا موقع نہ ملتا مگر سرگوشیوں میں ایک دوسرے سے کہتے، اسپتال کے بعض بڑے افسران کے برخلاف یہ اپنے مریضوں کو پرائیویٹ معالجے کی طرف ڈھکیل کر پیسے اینٹھنے کا کام نہیں کرتے۔ الٹا اپنے اثر ورسوخ سے پیسے حاصل کر کے اس وارڈ پر لگا دیتے ہیں۔ ہمیں اندازہ ہو گیا تھا کہ مریضوں کی یلغار کے سامنے سرکاری گرانٹ کم ہونے کے باوجود اتنی کم بھی نہیں تھی مگر ادیب صاحب کے پاس نہ جانے کون سا الٰہ دین کا چراغ تھا کہ ان کے وارڈ میں رسائی کی کمی نہیں رہتی۔ پھر ہمیں یہ بھی پتہ چل گیا کہ اس کے پیچھے کوئی اور جادو نہیں تھا، ان تھک محنت اور اپنے کام سے لگن۔ دن کے چوبیس گھنٹے میں سے وہ پچیس گھنٹے کام کرنے کے لیے تیار رہتے اور دوسروں سے بھی اسی کی توقّع رکھتے۔ تھڑدلے بے اعتبار اور قنوطیت زدہ لوگ ان کے ساتھ نہیں چل سکتے تھے۔ ان کا ساتھ دینے کے لیے ان کی رفتار پر چلنا پڑتا تھا، جو کسی طرح ا؟سان کام نہ تھا۔ اس کے باوجود وہ طالب علموں کے لیے مثالی نمونہ یا رول موڈل بن گئے۔

ادیب صاحب سول اسپتال کے امراضِ گُردہ والے وارڈ کو اس کامیابی سے چلاتے رہتے ___ وہاں علاج کرانے والے مریضوں کی تعداد اسی وقت ہزاروں میں نہیں، لاکھوں میں پہنچ رہی تھی ___ تب بھی یہ کوئی معمولی کارنامہ نہ ہوتا۔ مگر ان کا اصل کام تو ادارے تعمیر کرنا ہے۔ اس میدان میں ان کے جوہر ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے کُھلے اور پھر ہم نے کیا، دُنیا نے دیکھا۔ ان کی شہرت چار دانگ پھیل گئی۔

وہ چھوٹا سا وارڈ ایک بڑی شان دار عمارت اور پھر عمارتوں کے کمپلیکس میں تبدیل ہو گیا۔ باقاعدہ اسپتال بن گیا اور اس کے ساتھ تربیت گاہ۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک شان دار ادارے نے فخر کے ساتھ سر اٹھایا۔ سب کچھ بدل گیا۔ نہ بدلے تو ادیب صاحب۔ وہی رعب، طنطنہ۔ وقت سے زیادہ کام کرنے کی لگن۔ تن دہی ایسی کہ کوئی مثال بھی ڈھونڈے سے نہیں ملتی۔ پہلے اوروں سے سنا پھر خود بھی بارہا دیکھا۔ دن بھر اسپتال والے کپڑے پہنے گھومتے رہتے ہیں۔ نیند آئے تو وہیں سو جاتے ہیں۔ مریضوں والا کھانا ہی کھاتے ہیں۔ آج کل کے دور میں جب معمولی عہدے دار بھی

فرعونِ بے سامان بنا پھرتا ہے، ادیب صاحب پروٹوکول اور وی آئی پی رویّے سے حد درجے دور رہتے۔ ان کا احترام ان کی شخصی خوبیوں کی وجہ سے تھا۔ اس لیے زیادہ دیرپا بھی رہا۔

ادیب صاحب نے خطروں کا سامنا بھی اسی طرح کیا۔ جس زمانے میں ان کو دھمکیاں مل رہی تھیں اور ان کے خیر خواہوں کو تشویش لاحق ہو گئی تھی، ادیب صاحب نے ایسی کسی بات کی پرواہ نہیں کی۔ انھوں نے اپنے ساتھ باڈی گارڈ رکھنے کا جھنجھٹ نہیں پالا۔ اپنے معمولات پر اسی طرح ڈٹے رہے۔ استقامت ہو تو ایسی! انھوں نے مُلک چھوڑنے کا اعلان کیا اور نہ کسی فورم پر واویلا۔ وہ بڑی سے بڑی بات کے لیے بھی تیار رہتے۔

ادیب صاحب کے کارنامے دیوقامت معلوم ہوتے ہیں۔ میں نے وہ وقت بھی دیکھا ہوا ہے جب سول اسپتال کی عمارت کے ایک حصّے میں ان کا وارڈ چل رہا تھا، اور اب یہ عمارتوں، اداروں کے ایک سلسلے میں تبدیل ہو چکا ہے۔ تازہ ترین صورت حال (مارچ ۲۰۱۸ء) کچھ اس طرح ہے کہ نئی عمارت کے افتتاح کے بعد ایس آئی یو ٹی میں آپریشن تھیٹرز کی تعداد ۴۲ ہو گئی ہے۔ ادیب صاحب نے ایک حالیہ تقریب میں ذکر کیا کہ ان کے ادارے میں روزانہ تقریباً ۸۵۰ ڈائی لیسز کیے جاتے ہیں اور مریضوں کی تعداد کے اعتبار سے یہ جنوبی ایشیا میں سب سے بڑا ڈائی لیسز سینٹر ہے۔ اتنی تعداد میں کیسز اگر نجی شعبے میں جاتے تو اندازہ یہ ہے کہ اس میں تقریباً ۵۷ کروڑ روپے کی لاگت آتی۔ کینسر کے موذی امراض اور سرجری کی سہولیات اس کے علاوہ ہیں۔ ٹرانس پلانٹ سینٹر میں کئی اعضاء کی پیوندکاری کی جارہی ہے۔ اس پورے سفر میں ادیب صاحب کے حوصلے بلند رہے۔

ادیب صاحب کے اعزازات اور کارنامے بیان کرنے کے لیے ایک مضمون کافی نہیں۔ اس کے لیے پوری کتاب ہو تو بات بنے۔ ایس آئی یو ٹی کی طویل جدوجہد کی کہانی زبیدہ مصطفیٰ جیسی باشعور اور مشاق صحافی نے تحریر کی ہے۔ (میری بڑی آرزو ہے کہ اس کتاب کے اردو ترجمے کی سعادت مجھے حاصل ہو) اس سے کچھ اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ بہرحال، سفینہ چاہئے اس بحر بے کراں کے لیے۔ یہاں چند ذاتی مشاہدات پر اکتفا کرنا چاہوں گا۔

ادیب صاحب اپنے زمانۂ طالب علمی میں کراچی کی سیاسی تحریکوں سے ہم دردی رکھتے تھے جو واضح شراکت تک جا پہنچی تھی۔ ان کا ایک واقعہ میرے چچا انور احسن صدیقی نے بیان کیا اور

ان ہی کی خودنوشت ''دلِ پُرخوں کی اک گلابی سے'' میں انھوں نے حسن عابدی مرحوم کے حوالے سے لکھا ہے:

''حسن عابدی صاحب نے بتایا کہ اپنی زندگی کے آخری حصے میں نواب مشتاق احمد گورمانی کافی بیمار ہوگئے تھے۔ انھیں گردوں کی تکلیف ہوگئی تھی۔ انھوں نے ملتان میں کافی علاج کروایا تھا لیکن وہ پوری طرح سے صحت یاب نہیں ہو رہے تھے۔ آخر انھوں نے کراچی کے مشہور و معروف یورولوجسٹ ڈاکٹر ادیب رضوی کو، جن کی سارے ملک میں شہرت تھی، ملتان بلانے کا فیصلہ کیا۔ ڈاکٹر ادیب رضوی مریض کو دیکھنے کے لیے ملتان گئے۔ گورمانی سے ملاقات اور بات چیت کے دوران ڈاکٹر ادیب رضوی نے ان سے پوچھا کہ آیا انھیں یاد ہے کہ ۸ جنوری ۱۹۵۳ء کو کراچی میں صدر کے علاقے میں ان کی کار جلائی گئی تھی۔ گورمانی نے جواب دیا کہ ہاں انھیں یہ واقعہ یاد ہے۔ ڈاکٹر ادیب رضوی نے پوچھا ''کیا آپ کو معلوم ہے کہ آپ کی گاڑی میں آگ کس نے لگائی تھی؟'' گورمانی نے نفی میں جواب دیا۔ ڈاکٹر ادیب رضوی نے مسکراتے ہوئے کہا، ''وہ طالب علم میں تھا جس نے آپ کی گاڑی میں آگ لگائی تھی۔'' گورمانی حیرت سے کچھ دیر تک ان کی طرف دیکھتے رہے اور پھر ہنس پڑے۔''

گہری نظریاتی وابستگی والے لوگوں کی طرح انور چچا کی نفرت اور محبّت عمیق تھی۔ ان میں خودداری بھی بہت تھی چناں چہ جب اس بیماری کا شکار ہوئے جو بالآخر جان لیوا ثابت ہوئی تو انھوں نے میرے ضد کرنے پر کراچی کے سب سے بڑے اسپتال کے ماہر ڈاکٹر کو دکھا لیا مگر علاج کے لیے ادیب صاحب کے ایس آئی یو ٹی کو ترجیح دی۔ وہ ایک عام آدمی کی طرح او پی ڈی میں دکھانے جاتے اور وقت آنے پر جنرل وارڈ میں داخل ہوگئے۔ اس دوران میں نے ان سہولیات کو بہت قریب سے دیکھا جو ایس آئی یو ٹی نے عوام الناس کے لیے فراہم کر دی ہیں۔ اسپتال بھی ایسا کہ بقول ہمارے ایک ڈاکٹر دوست کے، خود بیمار پڑ جانے کو جی چاہے۔ انور چچا تو علاج کے باوجود جاں بر نہ ہو سکے مگر اسپتال کی کارکردگی کے بارے میں، مَیں نے جو کچھ لکھا ہے وہ آنکھوں دیکھی باتیں ہیں، سُنی سُنائی نہیں۔ بہتر علاج کا پورا نظام ہے جو ادیب صاحب نے قائم کر دیا ہے اور اس کی سہولت سے فائدہ اٹھانے کے لیے جان پہچان کی ضرورت ہے، نہ سفارش کی اور نہ پرچی کی۔ ذرا سوچیے پاکستان میں ایسا کتنی جگہ ممکن ہے؟

ایس آئی یو ٹی سے منسلک جو ادارے قائم کیے گئے ہیں، ان میں ٹرانس پلانٹ سینٹر سے بہت لوگ واقف ہیں مگر میں ایک اور ادارے کا ذکر کرنا چاہوں گا__ سینٹر فار بائیومیڈیکل ایتھکس__ صحت کے شعبے سے وابستہ اخلاقیات کی تربیت دینے والا یہ ادارہ اپنی قسم کا واحد مرکز ہے جو تجارتی مفادات اور ترجیحات کے اس دور میں ضابطۂ اخلاق کی تربیت دیتا ہے۔ اس ادارے میں ڈاکٹر فرحت معظّم (میری قابلِ احترام سینئر اور تقریباً میرے اساتذہ کی طرح) اور ڈاکٹر عامر جعفری (جو بڑے لائق والدین کے فرزند ہیں__ ادا جعفری اور نورالحسن جعفری) نے مجھے کئی بار وہاں لیکچر دینے کے لیے بلایا جو میرے لیے بڑے اعزاز کی بات ہے۔ ایس آئی یو ٹی کے شان دار چمکتے ہوئے فرش پر میں یوں بھی پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہوں۔ ایک مرتبہ اسی انداز میں گیا اور گفتگو شروع کرنے والا تھا کہ روسٹرم سے مجھے نظر آیا، ہال کا باہر والا دروازہ آہستہ سے کھلا اور ایک سبز سایہ اندر داخل ہوا۔ اسی طرح نامحسوس انداز میں حرکت کرتے ہوئے وہ پچھلی نشست کی طرف جا کر سنبھل گیا۔ وہ ادیب صاحب تھے، جو حسبِ معمول آپریشن تھیٹر کا لباس پہنے ہوئے تھے۔ ان کو وہاں دیکھ کر میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ کپکپاتی آواز میں ان کو سلام کیا۔ وہ آگے تو نہیں آئے مگر ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا میں نے تمہارا نام دیکھ لیا تھا، اس لیے تمہاری بات سننے کے لیے آ گیا۔ بس مجھ پر سکتہ نہیں طاری ہوا۔ جیسے تیسے گفتگو سمیٹی اور اس کے بعد ان کو باضابطہ سلام کرنے کے لیے گیا تو انھوں نے میری طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ میں نے اپنے استاد کے احترام میں سر جھکا لیا۔

ان کا نام آتا ہے تو میرا سر اسی طرح جُھک جاتا ہے، اور وہ طالب علموں والی پرانی عقیدت لوٹ کر واپس آ جاتی ہے۔ حال ہی میں (۲۰۱۸ء) حکومت پاکستان نے ڈاکٹر پروفیسر ادیب الحسن رضوی کی خدمات کے اعتراف میں انھیں پاکستان کے سب سے بڑے سول ایوارڈ ''ہلال پاکستان'' سے نوازا ہے۔

پروفیسر اُرملا سراج الدین

پروفیسر عفت سعید

مسز ارملا سراج الدین پروفیسر جی ڈی سوندھی کی دو بیٹیوں میں سے بڑی بیٹی تھیں۔ پروفیسر جی ڈی سوندھی متحدہ ہندوستان میں گورنمنٹ کالج کے پرنسپل تھے۔ چھوٹی بیٹی کا نام سوہنو سراج الدین تھا، جنھیں ان کی بھتیجیاں، لاکاس (Lacas) کے طلباء پیار سے سوہنو اور انگلش سپیکنگ یونین آنٹ (Aunt) کہتی تھیں۔ گورنمنٹ کالج میں سوندھی ٹرانسلیشن سوسائٹی کا قیام پروفیسر جی۔ڈی۔سوندھی صاحب کے بڑے کاموں میں ایک کام ہے۔ ارملا سراج الدین ایک ہونہار طالب علم تھیں، جنھوں نے بی اے اور ایم اے کے امتحانات میں صوبہ بھر میں اوّل پوزیشن لی اور گولڈ میڈل حاصل کیا۔ انھیں رسالے ''راوی'' کی پہلی خاتون مدیر ہونے کا بھی اعزاز حاصل ہے۔ انھوں نے مسٹر سراج الدین سے شادی کی، جو آکسفرڈ کے پڑھے ہوئے نوجوان اور نہایت اعلیٰ لیکچرار تھے۔ ان کی کلاسیں قابل مثال ہوتی تھیں۔ ارملا کا تعلق ہندوؤں کے اعلیٰ خاندان سے تھا۔ نوجوان ارملا نے اسلام قبول کیا اور مسلمان نام امراؤ اپنایا۔ اپنے طالب علموں اور سرکاری ضرورت کے لیے وہ مسز۔یو۔سراج الدین (Mrs. U. Sirajjudin) کے نام سے معروف تھیں۔

زندگی میں عموماً گردش ایام پیچھے کی طرف نہیں پلٹتی، مگر خوش قسمتی سے مجھے یہ موقع ملا۔ ۲۰۰۰ء میں میں نے پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ انگریزی میں ایم فل پروگرام میں داخلہ لیا۔ اس وقت مسز۔یو۔سراج الدین کی بیٹی شائستہ سراج الدین سربراہ شعبہ تھیں۔ شائستہ سراج الدین اپنی والدہ کی اعلیٰ اقدار اور وقار کو لے کر آگے بڑھ رہی تھیں۔ نوجوانی کے دنوں میں مسز ارملا سراج الدین نے میرے دل میں ادب، کتاب اور تحریری لفظ کی محبت جگائی تھی۔ شائستہ سراج الدین نے

میری تینتالیس برس کی پختہ عمر میں اس چنگاری کو میرے دل میں دوبارہ جگا دیا۔ لفظ کی حرمت کا خیال مسز شائستہ کی طرف سے اپنے والدین کو خراج عقیدت ہی کی شکل ہے۔ ان کی کلاس میں بطور طالب علم (اپنی دیگر ہم جماعتوں سے عمر اور تجربے میں سب سے بڑی) مجھ سے ایک ہی مرتبہ سختی کا برتاؤ کیا گیا۔ جب میں لائبریری کی کتاب انتظامی دفتر میں چھوڑ آئی اور مسز شائستہ کی نظر پڑ گئی۔ مسز شائستہ کے نزدیک لائبریری کی ہر کتاب ان کے بچوں کی مانند تھی۔ مسز شائستہ لائبریری کے ہر ذخیرے کو قیمتی خزانے کی مانند سمجھتیں۔ کتاب سے یہ محبت انہیں اپنے والدین سے ورثے میں ملی تھی۔ مجھے پروفیسر ارملا سراج الدین کی لاہور کالج فار ویمن کی لائبریری یاد ہے۔ انھوں نے حقیقتاً اپنے ہاتھوں سے لائبریری کا ذخیرہ بنایا اور اپنی لکھائی میں کتابوں کا ریکارڈ مرتب کیا۔ ایک بھاری بھرکم پرانے رجسٹر میں اپنے ہاتھوں سے اور توجہ اور پیار سے اندراج کرتیں۔ بعد میں اس خزانے کی دیکھ بھال میں میری دیگر اساتذہ مسز زاہدہ منیر، مسز فریدہ حسن اور مسز سلمیٰ محمود نے بھی اپنا اپنا حصہ ڈالا۔ مگر ان دو برسوں میں جب میں ایم اے کی طالبہ بھی ہر کتاب کو ان کی موجودگی میں دیا جاتا تھا وہ خود اس کا اندراج کرتیں اور ہر دو ہفتوں کے بعد ہم کتاب ان کے ہاتھوں میں لوٹاتے۔ اس طرح کتاب لینے اور لوٹانے کی یہ رسم باقاعدگی سے چلتی رہی۔ بعد میں جب میں خود عملی زندگی میں تدریس سے وابستہ ہوئی تو اس وقت کی جبری کتاب بینی نے مجھے کئی گنا زیادہ فائدہ دیا اور یہ سب کچھ میری مربّی کی بدولت تھا، یہ اسی بدولت تھا کہ میں نے تعلیمی شعبے کو اپنا کیریئر بنایا اور ایم فل کی ڈگری حاصل کی اور پھر پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ زبان و ادب انگریزی کی فیکلٹی کا حصہ بنی۔

بظاہر وہ الگ تھلگ اور لاتعلق سی دکھائی دیتیں مگر ایسی چوکنا رہتیں کہ کمرہ جماعت میں معمولی سا خلل ان کی نظروں سے اوجھل نہ رہتا۔ دراز قد، پروقار اور سجل ساڑی میں ملبوس تیز تیز قدم اٹھاتی چلتیں۔ اس وقت کے لاہور کالج برائے خواتین راہداریاں درختوں کے پتوں سے اٹی ہوتیں۔ وہ پورا سال موجود رہتیں اور بروقت آتیں، یہاں تک کہ ہم ان کی آمد سے اپنی گھڑیوں کے اوقات درست کرتیں۔ جن ایام میں ہمارا پروفیسر صاحبہ سے تعلیمی واسطہ تھا وہ سیاسی اعتبار سے انتشار کا زمانہ تھا۔ اگرچہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ بعد کے دنوں میں کوئی بہتری آ گئی۔ ہم آج بھی گردن گردن اسی افراتفری اور میڈیا ہائیپ میں پھنسے ہوئے ہیں۔ جب میں ماضی میں جھانک کر دیکھتی

ہوں تو محسوس کرتی ہوں کہ مسز سراج الدین کی پرسکون اور اور نا مضطرب موجودگی کا سبب پبلک اور پرائیویٹ زندگی کی حدود میں امتیاز قائم رکھنا تھا۔ آج جبکہ ہر شخص اپنی ذات کے لیے سب کچھ چاہتا ہے، تو مجھے اپنی استاد، اپنی مربی یاد آتی ہیں، جنہوں نے 80-1970ء کے خوش وخرم آقاؤں کو نہ صرف عزت بخشی بلکہ ان کے لیے گنجائش پیدا کی۔ باوجود اس کے کہ ہمیں مسز سراج الدین سے رابطے میں کوئی دقت نہیں تھی مگر ہمیں حدود پھلانگنے کی جرات نہیں تھی، جس کے ہم عادی تھے۔ ہم ایک حد سے زیادہ ان کے قریب نہیں آ سکتے تھے۔ یہاں تک کہ ہمیں ان کی تاریخ پیدائش بھی معلوم نہیں۔ مگر وہ اپنے تمام شاگردوں کے دلوں میں بستی ہیں۔ اپنی استاد کی یادوں کو زندہ کر کے میرا اس بات پر یقین پختہ ہو گیا ہے کہ وہ لوگ جو سر اٹھا کر جیتے ہیں اس کا سبب یہ ہے کہ وہ خاندانی پس منظر، رابطوں اور سماجی تعلقات کے چنگل سے بچ کر چلتے ہیں۔ طویل رفاقت کے باوجود مسز سراج الدین نے اپنے گھرانے کے شاندار علمی پس منظر کی کبھی بات نہ کی۔ عمدہ، تراشیدہ اور شستہ کوئینز انگریزی، جو روایتی برطانوی لہجے کی چغلی کھاتی، سے کمروں کی فضا بنتی، چاسر اور شیکسپیئر کی شاعری کی پڑھت، بائرن کے مسحور کن کینٹوز، وجودیت کا کرب، انگریزی زبان میں مابعد نوآبادیات ادب کی نامناسب نمائندگی کی گونج کمرہ جماعت میں سنائی دیتی۔

مجھے اپنی استاد کا تصورات میں واضح پن اور روانی اچھی طرح یاد ہے۔ جب وہ لارڈ بائرن کی پیچیدہ نوعیت کے پہلوؤں پر بات کرتیں اور جن کا اطلاق تمام بڑی ادبی شخصیات پر کیا جا سکتا تھا۔ یعنی ایک طرف رومانوی شعراء پر اور دوسری طرف سخت لا اخلاقی شعراء پر۔ کمرہ جماعت میں ہونے والے مباحثے، گفتگو، میری ادبی سرگرمیوں کا کولاژ بناتے ہیں۔ ادبی علم دینے کے علاوہ ہماری استاد نے ہماری ادبی حسیت کو نکھار بخشا۔ انہوں نے ہمیں ذہنی طور پر اثر پزیر ہونا سکھایا، جس سے ہم اس قابل ہوئے کہ پیچیدہ جذباتی اور جمالیاتی اثرات جذب کر سکیں اور سب سے اہم بات یہ کہ مسز سراج الدین نے ہم میں وہ عناصر پیدا کر دیے جن کی وجہ سے مذہب ہمارے لیے محض میکانکی انداز میں اور بے روح رسومات کی بجا آوری بن کر ہی رہ گیا۔ ایک سہانی صبح انہوں نے ہمیں بتایا کہ جس لمحے ہم نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو ہم اپنے آپ کو قادر مطلق کے سامنے پیش کر دیتے ہیں اور جب ہم سجدے میں سر جھکاتے ہیں تو مکمل حوالگی ہوتی ہے جو کہ کامل عاجزی اور اطاعت کا اظہار ہے۔ ایسی اطاعت جو آپ کو توانائی فراہم کرتی ہے اور جونہی آپ سجدے سے

سر اٹھاتے ہیں تو آپ کی شخصیت کے تمام منفی رویے ختم ہو جاتے ہیں۔

مسز۔ یو۔ سراج الدین ۲۶۔ ستمبر ۱۹۲۴ء کو پیدا ہوئیں۔ انھوں نے نوجوان خواتین کی کئی نسلوں کو تعلیم دی اور ذہنی آبیاری کے لیے اپنی زندگی وقف کی تا کہ وہ اچھی بیویاں، مائیں، پروفیشنل اور سب سے بڑھ کر بہتر انسان بن سکیں۔ وہ اچانک ابدی نیند سو گئیں۔ بخار کا بہانہ بنا اور مئی ۱۹۹۱ء کو اس جہان فانی سے کوچ کر گئیں۔

ڈاکٹر اسلم انصاری

ڈاکٹر محمد افتخار شفیع

بہار رخصت ہو چکی تھی، آم کے درختوں پر کوئل کی نغمہ سرائی کا موسم آنے والا تھا، پیرانہ سالی کے دکھوں کی ماری فصیل شہر خود کو نئے سرے سے موسم کی شدتوں کو سہنے کے لیے تیار کر رہی تھی، بہاء الدین زکریا رحمہ اللہ علیہ کے روضے کی جالیوں سے جھانکتی کرنوں سے سورج بار بار آ کر منہ دھوتا تھا۔ اسی دوران ۳۰ اپریل ۱۹۳۹ء کے ایک روپہلے اور خوش گوار دن میں ملتان کے قدیم علاقے پاک گیٹ کی ایک حویلی میں حاجی قاسم علی انصاری کے ہاں ایک بیٹے نے جنم لیا، نومولود کا نام اسلم رکھا گیا۔ یہی اسلم بعد میں ادبی حلقوں میں ڈاکٹر اسلم انصاری کے نام معروف ہوا۔ انصاری صاحب کے اجداد ملتان کے قدیم باشندے تھے۔ جس مکان میں بچپن گزرا وہ گرد ونواح کے علاقے میں پھولوں والی حویلی کے نام سے مشہور تھا۔ خبر نہیں ریاست لوہارو کی اونچی ممٹی والی حویلیوں کی طرح اس پھولوں والی حویلی کے صحن میں پھولوں سے لدے پودوں پر پنکھا جھلنے کا رواج تھا کہ نہیں البتہ یہ طے ہے کہ گھر کے مکیں گہری نیند کے جلو میں معطر خواب دیکھیں یا کتابوں کے لازوال خزانے سے اپنی باتوں کو خوشبو سے آراستہ کریں، ان کی نفاستیں ضرور مثال بنتی ہیں۔ اسلم انصاری کہتے ہیں: میں نے شعور کی آنکھ کھولی تو میرا گھر ہر قسم کی علمی، ادبی اور تاریخی کتابوں سے اٹا ٹوٹ بھرا پڑا تھا۔ لیکن جس پہلی کتاب کو بغیر استاد کی مدد کے خود بہ خود پڑھنا شروع کیا وہ دارالاشاعت پنجاب (لاہور) کی شائع کردہ داستان امیر حمزہ کی ایک دل چسپ تلخیص تھی جو ابوالحفیظ جالندھری کے زورِ قلم کا نتیجہ تھی (۱)۔

اسلم انصاری نے ۱۹۵۵ء میں میٹرک کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔ ۱۹۵۷ء میں ایمرسن کالج ملتان سے ایف۔اے اور ۱۹۵۹ء میں اسی تاریخی درس گاہ سے بی۔اے (آنرز)

کیا۔ اعلیٰ تعلیم کے حصول کی خواہش انھیں لاہور کھینچ لائی، آغاز میں انھوں نے ایم۔اے انگریزی کے طالب علم کی حیثیت سے ایف۔سی کالج لاہور میں داخلہ لیا لیکن اسے ادھورا چھوڑ کر اورینٹل کالج پنجاب یونی ورسٹی چلے آئے، یہاں ایم۔اے اردو کے دوران میں ڈاکٹر سید عبداللہ اور سجاد باقر رضوی جیسے اساتذہ غیر معمولی ذہانت، وسعت مطالعہ اور ادبی ذوق کو دیکھتے ہوئے انھیں اپنے شاگرد خاص کا درجہ دیا۔ بہ قول ڈاکٹر خورشید رضوی:

> اس وقت کے پرنسپل اور صدر شعبہ اردو ڈاکٹر عبداللہ اپنے علمی اور تنقیدی مضامین کچی پنسل سے لکھا کرتے تھے اور پھر مختلف نشانوں سے مربوط کرتے ہوئے، بین السطور اور حاشیوں پر پیچ وخم عبارتوں کا اضافہ کرتے چلے جاتے تھے۔ ان مضامین کی عبارتوں اور اضافوں کے ربط ضبط کو سمجھ کر سید صاحب کے حسب منشا انھیں صاف کر کے لکھ دینا عام کے کسی طالب علم کے لیے ممکن نہ ہو سکتا تھا۔ یہ کام اسلم انصاری کے سپرد ہوا کرتا تھا۔ وہ اپنے موتیوں سے جڑے سواد خط میں اس خوبی سے ان مضامین کی تبییض کر دیا کرتے تھے کہ سید صاحب کا جی خوش ہو جاتا تھا۔ (۲)

اورینٹل کالج لاہور میں اسلم انصاری وولنر ہاسٹل میں قیام پذیر رہے۔ انھی دنوں میں ان کی ملاقات ناصر کاظمی سے ہوئی، یہ رسم راہ جلد دوستی میں بدل گئی، ناصر کاظمی کے مجموعہ کلام پہلی بارش کا عنوان اسلم انصاری کا تجویز کردہ ہے۔ اس مجموعے کی مسلسل غزلیں بھی ناصر کاظمی نے نوجوان اسلم انصاری سے متاثر ہو کر کہیں۔ ۱۹۶۲ء میں اورینٹل کالج لاہور سے ایم۔اے اردو کے امتحان میں اسلم انصاری نے دوسری پوزیشن حاصل کی۔ کچھ عرصہ وہاں بہ طور لیکچرار کے تدریسی امور انجام دیے، اس دوران انھوں نے پی۔سی۔ایس کا امتحان پاس کر لیا لیکن تقرر نہ ہو سکا۔ ۱۹۶۶ء میں پنجاب پبلک سروس کمیشن کی کی طرف سے انھیں لیکچرار شعبہ اردو منتخب کیا گیا۔ اس دوران میں وہ گورنمنٹ کالج مظفر گڑھ اور گورنمنٹ کالج بھکر میں متعین کیے گئے۔ ۱۹۷۵ء سے ۱۹۷۹ء تک وہ ملتان آرٹس کونسل کے ریزیڈنٹ ڈائریکٹر بن گئے، ۱۹۷۶ء میں ان کی بہ طور اسسٹنٹ پروفیسر ترقی ہوئی۔ ۱۹۷۹ء میں انھیں ایمرسن کالج ملتان بھیج دیا گیا۔ اپنی ریٹائرمنٹ تک وہ اسی کالج میں تدریسی امور انجام دیتے رہے۔ اسی دوران انھوں نے اردو زبان وادب میں بہ امتیاز ایم۔فل اور پھر پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ ملازمت سے سبک دوشی کے بعد

کچھ وقت سرائیکی ری سرچ مرکز میں بھی گزرا۔۲۰۰۹ء میں اسلم انصاری کی علمی وادبی خدمات کو دیکھتے ہوئے حکومت پاکستان نے انھیں تمغہ امتیاز سے نوازا۔ ڈاکٹر اسلم انصاری کی شخصیت کی بہت سی جہتیں ہیں۔ان کی دل چسپی کا وسیع میدان ہے۔انھوں نے شاعری،تنقید وتحقیق،ترجمہ نگاری اوراقبالیات کے شعبے میں تخصص حاصل کیا۔نئی نسل کی تربیت کا فریضہ بھی انجام دیا۔ان کے اہم شاگردوں میں خالد مسعود خان،سید ذوالکفل بخاری،ڈاکٹر وحید الرحمٰن خان،ڈاکٹر جاوید اصغراور (بہ زعم خود) فقیر افتخار شفیع شامل ہیں۔ملتان میں مقیم اسلم انصاری کی علمی حیثیت کو بین الاقوامی سطح پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ان کی منظر عام پر آنے والی کتابوں کی ایک غیر حتمی فہرست یہ ہے:

۱۔kafeez کے عنوان سے خواجہ غلام فرید کی منتخب سرائیکی کافیوں کا اردو ترجمہ (بہ اشتراک جیلانی کامران)

۲۔خواب وآگہی (شعری مجموعہ)

۳۔اقبال عہد آفریں (اقبالیات)

۴۔نقش عہد وصال کا (شعری مجموعہ)

۵۔فیضان اقبال (منظوم اقبالیات)

۶۔چراغ لالہ (فارسی مثنوی)

۷۔Lotus and the sand waves (Poems and Plays)

۸۔شعروفکر اقبال (اقبالیات)

۹۔تکلمات (علمی،ادبی اور تہذیبی کالم)

۱۰۔بیڑی وچ دریا (سرائیکی ناول)

۱۱۔نگار خاطر (فارسی مثنوی)

۱۲۔ادبیات عالم مین سیر افلاک کی روایت (تنقیدی مضامین)

۱۳۔اردو شاعری میں المیہ تصورات: مقالہ پی۔ایچ۔ڈی (تنقید وتحقیق)

۱۴۔چودھری افضل حق اوران کی تصنیف زندگی :سوانح اور فکری وفنی جائزہ (تنقید وتحقیق)

ڈاکٹر اسلم انصاری کی شاعری کا آغاز دور طالب علمی سے ہوا،اورینٹل کالج میں دوران تعلیم وہ مختلف مشاعروں میں شرکت کرتے رہے،ان دنوں کی ایک خوش کن یاد شمع تاثیر مشاعرہ

میں انور مسعود کے ساتھ اورینٹل کالج کی نمائندگی کرنا تھا۔اس مقابلے میں انور مسعود نے نظم اور اسلم انصاری نے غزل کے مقابلے میں حصہ لیا اور کامیاب رہے۔اسلم انصاری کی اس غزل کا ایک شعر دیکھیں:

شرار زندگی بھی کیا چراغ زیر داماں ہے
بہاروں میں بھی گل شعلہ بجاں معلوم ہوتے ہیں

اسلم انصاری نے غزل کی صنف کو شاید ساٹھ کی دہائی میں بہ طور شاعر قبول کیا۔ان دنوں ہر طرف نظم کا شہرہ تھا۔اسلم انصاری نے چڑھتے سورج کو سلامی دینے کی بجائے وقتی دھندلکوں کو قبول کیا۔اسلم انصاری نے اردو اور فارسی غزل کہتے ہوئے کسی وقتی میلان کو قبول نہیں کیا۔ان کا شمار قدیم وجدید کے رجحانات کا اتصال کرنے والے شاعروں میں ہوتا ہے۔ان کے ہاں غزل کا نیا طرز احساس زندگی کے مہذب اور سلجھے ہوئے انداز کا رچاؤ بھی نمایاں ہے۔اسی الگ تشخص کی وجہ سے راہ ومنزل کا شعور آغاز ہی سے ان کی شاعری کا بنیادی عنصر ہے۔وہ عدمیت ونیستی کے تصور سے آشنا ہیں،اوران کا یہ احساس تیسری دنیا کے مسائل ومعاملات سے لے کر خود ان کے داخلی کرب تک پھیلا ہوا ہے۔آگہی کے تجربات سے آشنا ہونے کے باوجود خوابوں کی فسوں کاری کے تجربات ان کے ہاں ایک نامیاتی کل بن جاتے ہیں۔نمونے کے چند اشعار دیکھیں:

وہ ملا تھا سرراہے پہ بہت لوگ تھے ساتھ
آج کی شام تو وہ شخص اکیلا ہوتا

عدم کی سمت سے سوئے وجود آتا ہوا
نیا جہاں ہو کوئی چشم دوربیں کے لیے

ہم بھی چند کھڑکیوں سے خواب چرا سکتے تھے
ہم بھی اس شہر کے کچھ چیدہ مکاں جانتے ہیں

اردو زبان وادب کے ایک استاد کی حیثیت سے اسلم انصاری نے لفظوں کی خوشبو کو قائم رکھا ہے۔ان کی نظموں میں فلسفیانہ تشکیک اور کرید محض واقعاتی نہیں بل کہ اس کو برصغیر کے ہندالمانی

کلچر کے تناظر میں دیکھنا چاہیے، وہ ایک طرف تو میراجی، ن۔م۔راشد اور مجید امجد کے سلسلے کے شاعر ہیں دوسری سمت سے ان پر بیدل عظیم آبادی اور علامہ محمد اقبال کے واضح اثرات محسوس کیے جاسکتے ہیں۔انصاری صاحب کی نظمیں ان کی غزل کا تکلمہ یا منظوم حاشیہ نہیں۔اقبال کے وسیلے سے تو ایک الوہی انا کی جھلک بھی اس شاعری کے بطن میں دیکھی جاسکتی ہے۔ایک نظم تمام دکھ ہے میں گوتم بدھ کے ذریعے سے شاعر نے اپنا فلسفہ حیات پیش کیا ہے۔سدھارتھ مشرق کی اہم ترین شخصیات میں شامل ہے۔اس نظم کا خطاب عام لوگوں سے نہیں بل کہ الم آفریں تکلم سے من کی دنیا کو روشن کرنے والی نسل سے ہے۔شاعر زندگی کی دکھ بھری حقیقتوں کو بہ تفصیل بیان کرنے کے بعد گوتم کے ابدگیر لہجے میں زندگی کے اس راز کو یوں فاش کرتا ہے۔یہاں شاعری کا انداز دیکھیں:

جدائی تو خیر آپ دکھ ہے۔ملاپ دکھ ہے
کہ ملنے والے جدائی کی رات میں ملے ہیں، یہ رات دکھ ہے
یہ زندہ رہنے کا، باقی رہنے کا شوق یہ اہتمام دکھ ہے
سکوت دکھ ہے کہ اس کے کرب عظیم کو کون سہ سکا ہے
کلام دکھ ہے کہ کون دنیا میں کہہ سکا ہے جو ماورائے کلام دکھ ہے
یہ ہونا دکھ ہے، نہ ہونا دکھ ہے، ثبات دکھ ہے دوام دکھ ہے
مرے عزیزو! تمام دکھ ہے

اردو میں رباعیات معریٰ کا تجربہ اسلم انصاری کی ایک عمدہ کاوش ہے۔فارسی شاعری میں اسلم انصاری نے مختلف اصناف میں سخن گوئی کی ہے۔عالمی ادب میں شعرا کے فکری و تخیلی سفر کو موضوع سخن بنایا گیا ہے۔ورجل کی منظوم داستان انیڈ، واقعہ معراج واسریٰ، ابوالعلا المعری کے رسالہ الغفران، شیخ محی الدین ابن عربی کی تصنیف فتوحات مکیہ، عبدالکریم الجیلی کی الانسان الکامل، محمد حسین آزاد کی نیرنگ خیال، سجاد انصاری کے غیر مکمل ڈرامے روز جزا اور علامہ محمد اقبال کی جاوید نامہ جیسی کتابوں نے ایک خاص روایت کی بنیاد رکھی ہے۔اسلم انصاری کے ہاں اسی کا تسلسل نظر آتا ہے۔ان کی فارسی شاعری میں سیر افلاک کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔اس کے علاوہ ان کی غزل میں فارسی کے اساتذہ کا خاص رنگ نمایاں ہے:

ایک جگہ مکالماتی انداز کی ایک فارسی غزل کے اشعار دیکھیے:

گفتمش : آخر چرا برہم شدی اے یار گفت
پرسشت بیجا ست ، گفتم :ایں چنیں رفتار؟ گفت
دیدن ما بس بود اہل ہوس کا گفتمش
عشق ما پیداست از گفتار واز کردار گفت

علامہ اقبال کے ذکر اور فکر کا مطالعہ بھی اسلم انصاری کے لیے ہمیشہ سے قابل کشش رہا ہے۔اقبال سے وابستگی کی یہ صورت منظوم ومنثور، دونوں حوالوں سے ہے، نظم گوئی میں انھوں نے تمثیلی اور نیم تمثیلی انداز کو چنا ہے۔کہیں کہیں انھوں نے منظوم ریڈیائی تشکیل کو بھی اظہار کا وسیلہ بنایا ہے۔ناقدین وشارحین اقبال کے افکار وتصورات بھی ان کی شاعری کا موضوع بنے ہیں۔اسلم انصاری نے تفہیم اقبال کے لیے ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، یوسف حسین خان، پروفیسر آرتھر آربری، ڈاکٹر عبدالوہاب عزام، الیزاندر بوسانی اور ڈاکٹر این میری شمل جیسی شخصیات سے استفادہ کیا ہے۔اقبال کی مسلم الثبوت شاعری رجائیت کی علم بردار ہے۔اپنی تحریروں میں ڈاکٹر اسلم انصاری نے فکر اقبال کے متعدد مخفی گوشوں کی تلاش کی ہے۔اقبال کی شاعری سے المیہ عناصر کی دریافت جسے وہ قومی تنزل کے باعث وجود میں آنے والی بیساختہ آہ سرقرار دیتے ہیں۔اس پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر این۔میری۔شمل کہتی ہیں:

> پروفیسر انصاری نے علامہ اقبال سے بہت گہرا اثر قبول کیا ہے۔جو مثنوی چراغ لالہ میں ظاہر ہوا ہے۔یہ ایک دل چسپ بات ہے کہ ان میں دوسرے شاعروں میں میرزا بیدل بھی شامل ہیں۔جنھیں اقبال اپنے پسندیدہ شاعروں میں شمار کرتے ہیں۔یہ مثنوی جدید موضوعات کو زیر بحث لاتی ہے اور ان معاصرین پر نکتہ چینی کرتی ہے جو اپنے آپ کو سکون محض اور مرگ آفریں جدید فنون میں گم کر دیتے ہیں۔یہ مثنوی نسل نو کو آمادہ کرتی ہے کہ وہ تاب ناک ماضی میں پیوست اپنی جڑوں کی طرف رجوع کرے۔(۳)

ڈاکٹر صاحب نے طویل عرصے تک ملک کے ایک قومی روزنامے میں ادبی کالم بھی لکھے، ان کالموں کو علمی حلقوں میں بہت پذیرائی ملی۔ان کالموں کا اسلوب شان دار اور عالمانہ ہے۔عام تر موضوعات کی اس انداز میں کی گئی مفصل تشریح ایک بالغ نظر انسان کو چونکا دینے کے

لیے کافی ہے۔ایک معلم کی زندگی کے مختلف پہلو ہمیشہ دوسروں کے لیے مشعل راہ ہونے چاہیں۔ڈاکٹر اسلم انصاری نے تعلیم وتعلم کے سلسلے کو عبادت کے طور پر اپنایا، اور ایک خاموش طبع اور ہر دل عزیز استاد کا مقام حاصل کیا۔ہمارے اساتذہ کی اکثریت پڑھتی ہے نہ لکھتی ہے بس پڑھاتی ہے۔اساتذہ کے معاملے میں دو انتہاؤں کا مشاہدہ ہوتا ہے۔بعض اساتذہ تدریسی نصاب کو ثانوی مرتبہ دیتے ہیں تو بعض اسی سے وابستہ ہو کر زندگی گزارتے ہیں۔اسلم انصاری کے ہاں جس معلم کا سراغ ملتا ہے وہ دونوں میں ایک حد اعتدال پیدا کرتا ہے۔اتنا باکمال شاعر، صاحب علم ودانش مبتدیانہ سطح پر تعلیم دیتے ہوئے نصاب کو جس طرح دیکھتا ہے اس کی مثال دیکھیں:

> ایک معلم کی تدریسی زندگی کے کئی پہلو چپکے ہی چپکے اس کے دل ودماغ پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔اعلیٰ ثانوی مدارج کے اردو لازمی کے نصاب میں جب بھی زندگی (از: چودھری افضل حق) کی کوئی کہانی شامل رہی مجھے ایک ان جانی سی مسرت حاصل رہی۔یہ کہانیاں میں نے برسوں نصاب میں پڑھائی ہیں۔اور ہر بار پڑھاتے ہوئے ایک عجیب سا لطف محسوس کیا ہے۔ہر بار میرا ذہن زندگی کی ادبی اور فکری قدر وقیمت کی طرف مبذول ہو جاتا رہا ہے۔میں نے ہمیشہ محسوس کیا کہ اس کتاب کے اسلوب کا تجزیہ ہونا چاہیے اور اس کے فکری مافیہ کو اچھی طرح سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے (۴)

ایک مصاحبے کے دوران سوال کا جواب دیتے ہوئے اسلم انصاری استاد، معلم اور مرشد کے مابین فرق کو کچھ اس طرح سے واضح کرتے ہیں:

> دیکھا جائے تو معلم، مرشد اور مرشد، معلم ہوتا ہے۔یہ اور بات کہ اصطلاحی مرشد کا دائرہ تعلیم تربیت اپنے مسترشدین (مریدین) کی اخلاقی اصلاح اور روحانی ترقی تک محدود ہوتا ہے۔اس اعتبار سے معلم ایک عمومی تصور اور مرشد ایک خاص صورت ہے۔اگر استاد میں ایک خاص قسم کی خوبی ہو تو وہ استاد سے معلم اور معلم سے مرشد کا درجہ حاصل کر سکتا ہے (۵)

یہاں یہ بات بھی اہم ہے کہ خود اسلم انصاری کے ہاں اقبال کا اثر ونفوذ ایک مرشد کے انداز میں دکھائی دیتا ہے، ان کے اہم اساتذہ میں ڈاکٹر سید عبداللہ، سجاد باقر رضوی، تاج محمد خان

اور ملک بشیر الرحمٰن خان کے بعد جن استاد نے ان کو سب سے زیادہ متاثر کیا وہ سید علی عباس جلال پوری ہیں۔طالب علم کلاس روم کے ماحول سے ایک خاص قسم کا لطف کشید کرتا ہے۔ایک مثالی طالب علم ہی بعد میں قابل تقلید استاد کا درجہ اختیار کر سکتا ہے۔انصاری صاحب کی بی۔اے کی کلاس میں استاد علی عباس جلال پوری جب اپنی پوری فلسفیانہ تھیوری کے ساتھ آن کھڑے ہوئے تو شاگرد اسلم انصاری اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا، یہاں تک کہ اردو زبان وادب کے ساتھ ساتھ فلسفہ بھی اس کا پسندیدہ مضمون ٹھہرا:

> کلاس روم میں علی عباس صاحب (سید علی عباس جلال پوری) کے حضور ہم بہت دیر سے آئے، پہلے دن انھوں نے ہمیں دیوان غالب کی ردیف ی کی یہ غزل پڑھائی: سرگشتگی میں عالم سے یاس ہے / تسکیں کو دے نوید کے مرنے کی آس ہے۔فلسفے کا پس منظر رکھنے والے استاد کے لیے غالب کی غزل کی تدریس کچھ اور ہی معانی رکھتی ہے۔سید صاحب نے ہمیں یہ غزل کچھ اس انداز سے پڑھائی کہ ہم ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ادب اور شاعری کی تدریس میں پہلی بار نفسیات اور فلسفے کی اصطلاحات کا استعمال ہمارے لیے حیرت کا باعث بھی تھا اور انشراح خاطر کا سبب بھی (۶)

ہمارے نظام تعلیم کے محاسن ومعایب اپنی جگہ لیکن مادیت پرستانہ معاشرے کا ایک تحفہ استاد اور شاگرد کا کمزور ہوتا ہوا رشتہ بھی ہے۔ڈاکٹر اسلم انصاری اس کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> شاگرد احترام استاد کے بغیر استاد کے فیضان نظر سے محروم رہتا ہے۔اس طرح استاد بھی شاگردوں کے لیے عمومی شفقت کے رویے کے بغیر اس روحانی لذت اور قلبی راحت سے بہرہ اندوز نہیں ہو سکتا جو پڑھانے کے عمل کا لازمی ثمرہ ہوتا ہے۔معلم اور متعلم کے معدوم ہوتے رشتوں کی بحالی کی صورت یہی ہے کہ شفقت اور احترام کے دو طرفہ توازن کو بحال کیا جائے (۷)

ڈاکٹر اسلم انصاری کی شخصیت کی ان مختلف زاویوں کو چند صفحات پر سمیٹنا ممکن نہیں۔ان کا پھیلاؤ دور رس اور ادراک گہرا ہے۔وہ اپنے عہد کی ذاتی اور اجتماعی صداقتوں کے ترجمان

ہیں۔ان کے ہاں گہری عصری بصیرت دکھائی دیتی ہے۔مشرقی اقدار کے رسیا اور مذہبی افکار کے شیدا اسلم انصاری مسلم تہذیب وتمدن اور اسلامی آئیڈیالوجی سے گہرا شغف رکھتے ہیں۔انھوں نے بڑی خاموشی سے شعروسخن کی دنیا میں نیل نامی حاصل کی ہے۔ان کا تعلق ملتان سے ہے لیکن ان کے افکار ونظریات کے اثرات قومی سطح پر محسوس کیے جاسکتے ہیں۔ملکی منظر نامے میں تاریخ وثقافت کے حوالے سے جو مقام ملتان کو حاصل ہے،اسلم انصاری کو اپنے ہم عصروں پر وہی فوقیت حاصل ہے۔

حوالہ جات

۱۔اسلم انصاری،تکلمات،لاہور:فکشن ہاؤس،۲۰۰۰ء،ص ۱۸

۲۔جاوید اصغر،ڈاکٹر،گفتگو کا چراغ،لاہور؛فکشن ہاؤس،۲۰۰۲ء،ص ۱۲

۳۔افتخار شفیع،محمد،اسلم انصاری،شخصیت اور فن،اسلام آباد:اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۱۰ء،ص ۱۳۵

۴۔اسلم انصاری،تکلمات،ص ۱۸

۵۔ایضا،ص ۱۸

۶۔ایضا،ص ۱۸

۷۔ایضا،ص ۱۸

ڈاکٹر اسلم فرخی

ڈاکٹر انوار احمد زئی

کتابوں کی عمریں کون پوچھتا ہے بلکہ اب تو کتابوں ہی کو کون پوچھتا ہے،مگر جو جانتے ہیں وہ مانتے ہیں کہ کتابوں کی بھی عمریں ہوتی ہیں۔یہ عمریں ان کی تاریخِ تصنیف یا تاریخِ تخلیق سے مشروط نہیں ہوتیں۔کتابوں کی عمریں ان کی تاریخِ تسلیم تک شمار کی جاتی ہیں اور یہ بات جس حسن تازہ سے اردو کے سدا بہار دانش مند مولانا محمد حسین آزاد نے ادا کی ہے،وہ سو سال گزرنے کے باوجود ابھی ابھی کی لگتی ہے۔تازہ بہ تازہ،نو بہ نو.....وہ کہتے ہیں۔

> ''حق پوچھو تو جس طرح ہر جان دار کی عمر ہے اسی طرح کتاب کی بھی عمر ہے، شاہنامہ کو نو سو برس ہوئے (ان عمروں میں مزید سو سو سال شامل کرتے جائیں) سکندر نامہ کو سات سو،گلستان بوستان کو چھے سو،زلیخا کی عمر تقریباً تین سو کے لگ بھگ ہوئی.....مگر اب تک سب جوان ہیں۔اردو میں باغ وبہار اور بدر منیر جوان ہی تو ہیں۔فسانۂ عجائب جاں بلب ہوگیا،بہت سی کتابیں اول شہرت پاتی ہیں،پھر گم نام ہوجاتی ہیں۔یہ گویا بچے ہی تھے کہ مر گئے..... بہت سی تصنیف تو ہوتی ہیں اور چھپتی بھی ہیں مگر کوئی پوچھتا بھی نہیں..... یہ بچے مرے ہوئے پیدا ہوتے ہیں۔''

کتابوں کی عمر کو جانچنے والا زمانے کی رفتار کو سمجھنے والا ہوتا ہے۔ایسے نابغۂ روزگار پر جو تحقیق کرے اور اس کی امر کتابوں اور تحریروں کو گھڑیال دکھائے،اس کی دانش تابندہ کتابوں جیسی ہوتی ہے۔جی ہاں محمد حسین آزاد پر پی ایچ ڈی کرنے کی سعادت حاصل کرنے والے،عہدِ موجود میں کتابوں کی عمروں کے شناور و شناسا ہیں،ان حوالوں سے کون نہیں جانتا کہ ان کا نام ہے،ڈاکٹر

اسلم فرخی۔

دبلے پتلے، دراز قامت، گوری رنگت، غلافی آنکھیں، متبسم ہونٹ، کشادہ پیشانی، سنجیدہ چہرہ جس پر ہر وقت علمی تبحر کا غازہ ملا محسوس ہوتا ہے، حافظہ ایسا کہ کمپیوٹر لگیں، سنین یاد، اشعار ازبر، ضرب الامثال کے لیے معیار، محاوروں کے لیے سند، ادب کے لیے حوالہ، تحریکات کی تفہیم کے لیے شرح، اکابر کے کارناموں کے حافظ، ادبی معرکوں کے گواہ اور تہذیبی روایات کے امین.....لگتا ہے کہ اتنے گن اور ایک فرد شاگردوں کے لیے بے چین و بے قرار اور اداروں کے لیے فکر مند اور کبیدہ، پھر بھی جو چیز ان کے تعلق سے عجیب لگتی ہے اور وہ یہ کہ ادبار اور انتشار کے اس ماحول اور شکست و ریخت کی اس فضا میں بھی ان کی اندرون کی آنکھ میں رجائیت دیکھی جاسکتی ہے۔ وہ خاکستر سے نیا جنم لینے والے پرندے کو نظر میں رکھتے ہیں اور پھر اپنے طلبہ کو بتاتے ہیں کہ ادبی روایات میں زیر و بم آتے رہتے ہیں، ان پر دل شکستہ، دل گرفتہ یا دل برداشتہ ہونے کی بجائے دل دار اور دل نواز ہونا ہی قدرت کی اس خلاقی کا استحسان ہے جو تمھیں ادب کی تخلیق و تشکیل کے لیے ودیعت ہوئی ہے!!

ایک وقت تھا کہ ہر گھر تہذیبی چراغ سے روشن رہتا تھا مگر اب یہ تخصص مختصر تر گھروں کا حوالہ بن گیا ہے۔ کراچی شہر میں کئی گھر ایسے تھے جہاں ماہانہ، ہفتہ وار یا پندرہ روزہ ادبی نشستیں ہوتی تھیں، مکالمہ ہوتا تھا، مباحث ہوتے تھے اور ان کے نتیجے میں تخلیق کے چہرے پر نئے نئے ستارے چمکتے تھے، دمکتے تھے۔ ان گھروں میں سلیم احمد، حسن عسکری، شمیم احمد، مشفق خواجہ، ڈاکٹر منظور الدین احمد، جوش ملیح آبادی، رئیس امروہوی، صہبا لکھنوی، شاہد احمد دہلوی اور ابوالخیر کشفی کے آستانے خصوصی طور پر آراستہ نظر آتے تھے۔ ان میں سے بہت سے تو اب قصۂ پارینہ ہوئے باقی بھی زیبِ طاق نسیاں ہوگئے۔ اس خرابے میں اب کوئی گھر ہنستا بستا ملتا ہے، جاگتا آباد نظر آتا ہے تو وہ ڈاکٹر اسلم فرخی کی قیام گاہ ہے۔ دعا ہے کہ خدا اس گھر کو سدا آباد رکھے۔ یوں تو ہر روز اس گھر کے آنگن میں میلا سجتا ہے اور وقفے وقفے سے اس گھر کے فون کی گھنٹی بجتی ہے تو کوئی نہ کوئی علم کا طالب، علم کی پیاس بجھانے کے لیے سوال کرتا اور جواب پاتا ہے اور اس رابطے میں سدا ہنستی مسکراتی، محبتیں بکھیرتی اور مامتا کی سی شفقت لٹاتی تاج آپا اپنا قیمتی وقت پیشانی پر شکن لائے بغیر کھپاتی ہیں۔ یہ ڈاکٹر اسلم فرخی کی رفیقۂ حیات تو ہیں ہی مگر اپنی گھریلو ذمہ داریوں سے بڑھ کر جو کام کرتی ہیں اس سے تو یہ ڈاکٹر اسلم فرخی کی پرائیویٹ سیکریٹری ہی لگتی ہیں۔ ہاں تو اس گھر میں

روزانہ کے ان معمولات کے ساتھ ہر اتوار کو ایک خاص میلا لگتا ہے جس میں عام لوگ شریک ہوتے ہیں۔ عجب کیفیت ہوتی ہے اس اجتماع کی، لوگ آرہے ہیں، اپنی اپنی جگہ تلاش کر رہے ہیں اور ایسے بیٹھ رہے ہیں جیسے ہر ایک میزبان ہو کوئی مہمان نہ ہو۔ کوئی مہمان بل کہ مہمانِ خصوصی ہے تو ڈاکٹر اسلم فرخی..... صاحبِ خانہ بھی، صاحب فسانہ بھی!!

اُدھر تاج باجی سب کی دل جوئی کے لیے دیدہ و دل فرش راہ کیے ہوئے ہیں۔ چائے چل رہی ہے، باتیں چل رہی ہیں، بحثیں چل رہی ہیں، پی ایچ ڈی اور ایم فل کے طلبہ کی غیر رسمی کلاسیں چل رہی ہیں اور جو بھی یہاں موجود ہے وہ دل و ذہن کے دریچے وا کیے لبوں کو ہلائے بغیر یہ کہتا چلا جارہا ہے کہ

ایسا لگتا ہے کہ پیروں سے لپٹ آئی ہے
ایک زنجیر بھی اسبابِ سفر کے ہم راہ

ایسے ہی ایک اتوار کا حال صرف اس گھرانے کی عظمت کے تعلق سے یاد آرہا ہے، دیکھیے تو اس بات کے پیچھے اس گھر کے چراغ نے کتنے بے عمل، بے علم، بے مقصد اور بے توقیر افراد کی توقیر کی ہے، عزت بڑھائی ہے، علم دیا ہے، مقصدیت سے آشنا کیا ہے اور عمل کی تلقین کے صرف ایک جملے کو سہارا بنایا ہے۔ ہوا یوں کہ میں برادرِ خورد ڈاکٹر مسرور احمد زئی کے ساتھ اس ایوان ادب میں حاضر ہوا..... دن وہی اتوار کا تھا۔ صدر دروازے پر بیل بجا کر صدا لگائی، اندر سے تہذیب و شائستگی کا حوالہ گھر کی مالکن، ڈاکٹر صاحب کی اہلیہ اور پرائیویٹ سیکریٹری جو خود علم کا استعارہ اور تدریس کی تمثیل ہیں.....یعنی پروفیسر تاج بیگم فرخی تشریف لائیں۔ سلام دعا ہوئی اور ہم دونوں اندر چلے، کمرے کے باہر ڈھیر سارے جوتے رکھے تھے جس سے اندازہ ہوسکتا تھا کہ اندر کتنے سارے لوگ ہیں، میں نے جھک کر جوتا اتارنا چاہا تو تاج بیگم فرخی نے انتہائی محبت سے کہا کہ ''نہ.....نہ آپ جوتے نہ اتاریئے، ایک عالم کے جوتوں کی دھول اس گھر کی رونق میں اضافہ کرے گی۔'' میں چونک گیا، یہ جملہ میری عزت افزائی کے لیے تھا، میں نے جوتے اتارے اور اندر آگیا مگر یہ جملہ بھی میرے اندر آگیا جو آج تک باہر نہیں نکل سکا ہے۔ میری بساط کیا اور حیثیت کیا، مگر اس جملے نے کتنا کچھ سکھا دیا کہ اگر علمی گھرانے کا تعارف بھی حاصل ہوجائے تو ہر آنے والا علم سے کتنا قریب ہوجاتا ہے۔ اس جملے میں میرے لیے آگے بڑھنے کا کتنا درس تھا، اس کا اظہار

مشکل ہے!!

شاید بیگم تاج فرخی نے یہ بات اس لیے بھی کہی کہ ان کا تعلق اس خانوادے سے ہے جس نے اردو کو اردو بنایا ہے، جس نے اردو ناول، اردو نثر اور اردو تہذیب کو متشکل کیا ہے کہ ان کا تعلق ڈپٹی نذیر احمد اور شاہد احمد دہلوی کے گھرانے سے ہے!!

ڈاکٹر اسلم فرخی کا ایک اور حوالہ ان کا صوفی ہونا ہے۔ صوفی بھی وہ جو چُھپتا ہے اور ہزار انداز سے چُھپتا ہے مگر ظاہر ہو ہی جاتا ہے اس لیے کہ اس کے انداز کا تصرف اسے ظاہر کر دیتا ہے۔ ڈاکٹر اسلم فرخی، صاحبِ سلسلہ صوفی ہیں۔ حضرت نظام الدین اولیاؒ کو سلطان جی کہتے ہیں تو لفظوں کی ادائی سے پہلے نگاہوں کی سجدہ ریزی محسوس ہوتی ہے لیکن اس تذکرے سے قبل یہاں تو صرف یہ بتانا ہے کہ ایک دن میں ان کے یہاں حاضر ہوا، بیل دی، تو ڈاکٹر صاحب اپنے چھوٹے سے گیراج میں چہل قدمی کرتے ہوئے نظر آئے۔ دروازہ خود کھولا تو میں نے پوچھ لیا..... ''چہل قدمی فرما رہے تھے؟'' کہنے لگے ''یوں ہی سمجھ لیجیے، مگر دراصل یہ تقلید تھی میرے حضرت کی، جو ہر بدھ کو سلطان جی کے یہاں حاضری کے لیے پیدل جایا کرتے تھے۔ ہمیں یہ اعزاز کہاں نصیب، ہم تو بس تصور ہی میں حاضری دیتے ہیں اور یہ سعی اس لیے کر رہے ہیں کہ آج بدھ کا دن ہے!!

ڈاکٹر اسلم فرخی کو ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں سے خاص نسبت تھی۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں، ڈاکٹر اسلم فرخی کے استاد بھی تھے اور آئیڈل بھی۔ عقیدت کا یہ عالم تھا کہ جب ان سے ملنے جاتے تو آب دیدہ ہو جاتے اور جب مل کر آتے تو سیر چشم دکھائی دیتے تھے۔ ان کے خود لکھتے ہیں کہ

> ''جو باتیں ان کی صحبت میں رہ کر سیکھیں اور جو علم کلاس روم اور کلاس روم سے باہر حاصل کیا، مجھے اس پر بڑا فخر ہے۔''

ایک اور جگہ رقم طراز ہیں۔

> ''اساتذہ میں ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب ایسے ہیں جن سے میں سب سے زیادہ متاثر ہوں، واقعی ڈاکٹر صاحب ایسی شخصیت ہیں جن کی شفقت اور کردار سے زندگی کے مقصد کا تعین ہوا اور زندگی کی تشکیل نو میں مدد ملی۔''

مزے کی بات یہ ہے کہ سب سے زیادہ قابلِ فخر استاد پر جب تحقیقی مقالہ لکھا جانے لگا اور

یہ اعزاز عزیزی مسرور احمد زئی کو حاصل ہوا تو پی ایچ ڈی کی سند کے لیے اس کے نگراں بھی ڈاکٹر اسلم فرخی ہی قرار پائے اور اس کے لیے اشارہ بھی ملا تھا تو حضرت ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کی جانب سے!!

ڈاکٹر اسلم فرخی شاعر بھی ہیں۔ متعدد مشاعرے پڑھے مگر پھر وقت کے تصرف کو جدا انداز کی غرض سے مشاعروں میں جانا چھوڑ دیا۔ تاریخ نگاری کے فن میں اس وقت جو کمال انھیں حاصل ہے کم کو ہوگا۔ حضرت ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں اور ان کے فرزندوں کے مزاروں پر جو کتبے آویزاں ہیں ان پر انھی کے کہے گئے تاریخ سے آراستہ اشعار ہیں جن کے پڑھنے سے مرحومین کی رحلت کی تاریخوں کے ساتھ شخصیت اور مزاج کا ادراک بھی ہوتا ہے۔

ڈاکٹر اسلم فرخی سے میری پہلی ملاقات کچھ عجب سے انداز میں ہوئی تھی۔ یہ 1969ء کی فروری کی پندرہ تاریخ تھی، موقع تھا غالب کی صد سالہ برسی کا..... ادارہ یادگارِ غالب، حیدرآباد کے تحت غالب صدی کے مختلف پروگراموں کا اہتمام کیا گیا تھا۔ میں اس وقت یونیورسٹی میں پڑھ رہا تھا مگر بڑے بڑے نام ور ادیبوں اور شاعروں کی اس تنظیم میں خاصی اہم جگہ کا حامل انھی بزرگوں کی عنایتوں سے تھا۔ میرا پہلا افسانوی مجموعہ ''درد کا رشتہ'' چھپ چکا تھا جس کا پیش لفظ صاحبِ اسلوب نقاد، ناول نگار اور افسانہ نویس ڈاکٹر احسن فاروقی نے لکھا تھا اور ان دنوں حیدرآباد سے چھپنے والے اِس پہلے افسانوی مجموعے کا بڑا چرچا تھا۔ اس دن جناح ہال، بلدیہ حیدرآباد میں غالب سیمینار تھا جس میں اکابر ادباء، نقاد اور دانش نور حصہ لینے والے تھے۔ لاہور سے سجاد باقر رضوی بھی آئے تھے جن کے ایک فقرے نے اسی سیمینار میں ''مشاعرہ'' لوٹ لیا تھا۔ ان کا فقرہ تھا کہ ''غالب کا انتقال 1869ء میں ہوا اور غالب 1969ء میں پیدا ہوئے۔'' ڈاکٹر اسلم فرخی اس وقت بھی مستند دانش ور اور نقاد مانے جاتے تھے۔ انھیں لینے کے لیے میں اور قاصد عزیز ریلوے اسٹیشن حیدرآباد پہنچے تھے۔ ہم گاڑی میں کسی سفید بالوں والے تنومند دانش ور کو تلاش کرتے رہے اور جب ہمیں ایسا کوئی شخص نہ ملا تو یہ سوچ کر اسٹیشن سے باہر آ گئے کہ ڈاکٹر صاحب شاید نہیں آ سکے ہیں۔ ہم اس موٹر کی طرف آئے جس میں ڈاکٹر صاحب کو لے جانا تھا تو دیکھا کہ ایک قدرے جوان اسمارٹ سا شخص سفاری سوٹ میں کھڑا ہے، ہم جب گاڑی کا دروازہ کھولنے لگے تو اس شخص نے پوچھا کہ آپ ادارۂ غالب کی طرف سے آئے ہیں۔ ہم نے کہا ''جی'' فرمایا

''مجھے بھی گاڑی میں بٹھالیں۔ میں ان کے سیمینار میں شرکت کے لیے کراچی سے آیا ہوں۔'' ہم نے کہا ''اسم گرامی؟'' کہنے لگے ''اسلم'' پھر رک کر کہا ''اسلم فرخی''.....ہم صرف ''اوہ'' کہہ کر رہ گئے، انھیں بتایا کہ ہم انھیں اس عمر اور اس حلیے میں دانش ور ماننے میں کچھ تامل کر رہے تھے، ڈاکٹر صاحب اس وقت 45 سال کے تھے مگر مرتبے کے لحاظ سے معمر.....یعنی بزرگی بہ عقل است نہ بسال۔ ہم نے گاڑی کا دروازہ کھولا تو بیٹھتے ہوئے بولے ''اچھا ہوا، ہم نے گاڑی کے پیچھے لگا بینر پڑھ لیا تھا ورنہ ہم تانگہ کر کے بلدیہ پہنچنے کا سوچ رہے تھے۔'' اور یوں انھوں نے خود ہمارے اس سوال کا جواب دے دیا جو ہم سے ادا بھی نہیں ہوا تھا کہ انھیں کیسے خبر ہوئی کہ ہم ادارۂ غالب سے متعلق ہیں، اور پھر وہ گاڑی میں کیا بیٹھے، ہمارے دل میں بیٹھ گئے اور آج تک وہیں بیٹھے ہیں!!

میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر اسلم فرخی کی جائے پیدائش معلوم کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ان کی نزاکتِ طبع سے لے کر ان کی نرم رو گفت گو تک سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ ان کا تعلق اسی شہر سے ہے جس کے لیے جوش ملیح آبادی کے اتالیق حضرت مانی جائسی کے فرزند اقبال الظفر نے یہ کمال فقرہ کہا تھا: ''لکھنؤ اس شہر کا نام ہے جہاں قدم رکھتے ہی جی چاہتا ہے کہ محبت کیجیے۔'' جی ہاں، اسی محبت نگر لکھنؤ کے محلّہ سبحان نگر میں ڈاکٹر صاحب 23 اکتوبر 1924ء کو پیدا ہوئے۔ ان کا سلسلہ نسب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ملتا ہے، یوں یہ نسبی اعتبار سے صدیقی ہیں اور قلمی حوالے سے فرخی۔ ان کا گھرانا علمی اور دینی تھا، والد گرامی مولوی محمد احسن صدیقی تھے جن کے یہ اکلوتے فرزند ہیں۔

ڈاکٹر اسلم فرخی نے ابتدائی تعلیم مولوی محمد شفیع سے حاصل کی، ان سے قرآن پاک، اردو کا قاعدہ، فارسی کی مشہور کتاب فردوسی کا شاہنامہ، سعدی کی گلستان، بوستان، حافظ کا کلام اور عمر خیام کی رباعیات پڑھ ڈالیں تو رسمی تعلیم (یا غیر رسمی جو چاہیں کہیں) کی طرف متوجہ ہوئے۔ یو پی بورڈ سے میٹرک اور انٹر کیا، آگرے سے بی اے اور فارسی میں ایم اے۔ 5 ستمبر 1947ء کو پاکستان آئے۔ 1965ء کی جنگ اسی لیے 6 ستمبر کو شروع کی گئی کہ یہ آرام سے 5 ستمبر کو اپنی پاکستان آمد کی اٹھارویں سال گرہ بلیک آؤٹ کے بغیر منا سکیں۔ یہاں آ کر کراچی یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے کیا اور 1963ء میں پی ایچ ڈی۔

شاہد احمد دہلوی تو ڈاکٹر صاحب کے سسرالی عزیز ٹھہرے جن سے ڈاکٹر صاحب کے گھریلو

مراسم کے ساتھ قلمی تعلقات رہے لیکن کون ایسا بڑا ادیب و شاعر، مدبر اور دانش ور ہوگا جن سے ان کے تعلقات اور وہ بھی خوش گوار نہ رہے ہوں۔ تعلق اس لیے کہ یہ ادب کے سکہ بند نقاد اور استاد تھے تعلقات کیسے نہ ہوتے اور خوش گوار اس لیے کہ ان کی طبیعت اور مزاج کا تقاضا یہی تھا اور ہے۔ مگر ان میں خصوصیت کے ساتھ ان کے مراسم غلام ربانی تاباں، اپنے وقت کے بڑے ادبی رسالے ''نقش'' کے ایڈیٹر شمس زبیری، ساحر ہلگرامی، ضمیر الدین احمد، مرزا نسیم اللہ بیگ، قاری عباسی حسینی، علی محسن صدیقی، بہزاد لکھنوی، سلیم احمد، شمس الدین بٹ، ڈاکٹر الیاس عشقی، اختر انصاری اکبر آبادی، بابائے اردو مولوی عبدالحق، ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ابوالخیر کشفی اور حسن عسکری جیسی نابغۂ روزگار شخصیتوں سے رہے ہیں۔

مزے کی بات یہ ہے کہ اس مستند ادیب و نقاد نے اپنی سرکاری ملازمت کا آغاز کراچی پورٹ ٹرسٹ سے کیا تھا۔ بعد ازاں وہ ریڈیو سے وابستہ ہو گئے جہاں سے مختلف تعلیمی اداروں میں تدریس کی ذمہ داری نباہتے ہوئے جامعۂ کراچی پہنچے اور یہاں استاد مقرر ہوئے اور وہاں سے ہوتے ہوئے انجمن ترقی اردو اور وفاقی اردو یونیورسٹی تک کا سفر طے کیا، ہر جگہ اپنی علمیت اور قابلیت سے وہ جگہ بنائی جو کم کم کے نصیب میں آتی ہے۔

ڈاکٹر اسلم فرخی نے افسانے بھی لکھے ہیں اور خاکے بھی.....ڈاکٹر صاحب کی خاکہ نگاری میں خاکہ اور افسانہ ساتھ ساتھ چلتا ہے مگر وہ افسانہ جو بے بنیاد نہ ہو بل کہ جس کی بنیاد خاکہ کے مرکزی کردار کی زندگی کے متنوع واقعات اور پہلوؤں سے ہو، شاید اسی لیے ڈاکٹر صاحب کی خاکہ نگاری پر ''صریر'' کراچی نے تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''اسلم فرخی خاکہ نگاری یا شخصیت نگاری کے فن پر ایسا عبور رکھتے ہیں کہ ان کا خاکہ پڑھتے وقت بیک وقت تاریخ اور افسانے کا لطف آ جاتا ہے۔ ان کا اظہاریہ کلاسیکی اور داستانی اسلوب کو مَس کرتا ہوا آگے بڑھتا ہے اور دورِ حاضر کی نثر کے تمام لوازمات پورے کرتا ہوا ایک ایسا تاثر چھوڑتا ہے جیسے ہم نثر نہیں نثری نظم کی کتاب پڑھ رہے ہوں۔''

اس تبصرے میں نثری نظم کے حوالے سے اختلاف کی گنجائش بہر حال ہے تاہم میرا خیال ہے اب جب کہ خاکہ نگاری مکمل طور پر نثری صنف بن چکی ہے اس کی حیثیت کا تعین کر لیا جائے اور اس کے لیے ڈاکٹر صاحب کے خاکوں کے ساتھ ڈاکٹر ابوالخیر کشفی، رشید احمد صدیقی، سعادت حسن منٹو،

مولوی عبدالحق اور محمد طفیل کے خاکوں کو سامنے رکھا جانا چاہیے۔ کسی کی ایسی قلمی تصویر جس میں اس کے صوری خدوخال کے ساتھ سیرت کے نقوش بھی ابھرتے چلے جائیں خاکہ ہے۔ اس ضمن میں مجھے یہ مثال بیان پر مجبور کر رہی ہے کہ جس طرح کسی کیمرے کی تصویر محض ظاہر کی آنکھ سے تماشے کی تشکیل ہوتی ہے جب کہ مصور کی تصویر میں دیدۂ دل بھی وا کرنا پڑتا ہے تب چیز مصور ہوتی ہے گویا مصور کی تصویر میں جذبوں کا پرتو بھی نظر آتا ہے۔ اسی طرح خاکے میں صاحبِ خاکہ کے انداز سے افکار اور پھر زندگی کے تعلق سے ان کے اقرار اور انکار کی کیفیت مصور ہو تو خاکہ بنتا ہے۔ اس تناظر میں ڈاکٹر اسلم فرخی کے خاکے ممدوح سے لے کر اس کے زمانے کے احوال تک کے غماز نظر آتے ہیں اور اس کی ایک عجیب الوہیت نصیب تصویر کا حامل ان کا وہ خاکہ ہے جسے ''نظام رنگ'' کا نام دیا گیا ہے۔ یہ حضرت سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاؒ کا خاکہ ہے جو ان کے سالانہ عرس کے موقع پر 1987ء میں تحریر کیا گیا اور 1988ء میں کتابی صورت میں شائع ہوا۔ اس خاکے میں حقیقت کو عقیدت کے جذبوں سے گوندھ کر پیش کیا گیا ہے جسے پڑھنے سے سلطان جی کی محبت فاتح عالم جیسی تصویر بنتی ہے اور اس کے سامنے اس تصویر کو مصور کرنے والا جوگی، عقیدت کی دھونی رمائے بیٹھا نظر آتا ہے۔ اسی طرح ''صاحب جی، سلطان جی'' میں حضرت سلطان المشائخ کے ساتھ ان کے دور کے سلاطین کے حالات و واقعات بھی سامنے آتے ہیں جس میں سلطان جی کی آفتاب صفت صورت کے نور سے عالم آرائی کی گئی ہے۔

ڈاکٹر صاحب کا ایک اور خاکہ احمد فراز پر ہے۔ اس میں اس دور کا قصہ بیان ہوا ہے جب احمد فراز محض احمد شاہ تھا اور منتشر سے بالوں والے اس شاعر کے افکار بھی اس کے بالوں ہی کی طرح منتشر اور الجھے ہوئے تھے۔ اس خاکے میں احمد فراز کے ریڈیو کی نوکری سے الگ ہونے کے ارادے کو اس طرح سامنے لایا گیا ہے کہ احمد فراز معصوم بھی لگتا ہے اور شعلہ برکف، شرر بہ داماں شاعر بھی۔ اس خاکے سے گزرے بغیر احمد فراز کو جاننا شاید آسان نہ ہو۔ اس حوالے سے ان کے خاکوں کا مجموعہ ''گلدستۂ احباب'' گل دستہ تو ہے ہی یاروں کے اطوار کا طبلۂ عطار بھی ہے۔ اس میں حضرت ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاںؒ، شاہد احمد دہلوی، اشرف صبوحی، ڈاکٹر جمیل جالبی اور غلام ربانی تاباں جیسے افراد کو اس سادگی کے ساتھ مصور کیا گیا ہے کہ پڑھنے والا ان بڑے لوگوں میں گھل مل جاتا ہے اور اس منظر نامے میں ڈاکٹر اسلم فرخی ہر پڑھنے والے کا ہاتھ تھام کر ان سے ملواتے محسوس ہوتے

ہیں۔

ڈاکٹر اسلم فرخی نے مختلف زبانوں کی کہانیوں اور مضامین کو بھی اردو کے قالب میں اس خوبی سے ڈھالا ہے کہ ان کا ترجمہ اور بچنل تخلیقات کی ترجمانی بن جاتا ہے۔ بچوں کا ادب ان کی دست رس سے دور نہیں رہا۔ شاید ڈاکٹر صاحب کو اس بات کا ادراک شدت سے رہا ہے کہ اردو میں بچوں کے ادب میں بہت کم لکھا گیا ہے، دوسری طرف انھیں اس حقیقت کا بھی اندازہ ہو گیا کہ بچوں کا ادب لکھنا بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ 'سارا جو بن گھالے تو ایک بالک پالے' کے مصداق لکھنے والے کو لوٹ کر اپنے بچپن کی طرف جانا ہوتا ہے اور پلٹ کر پھر اپنی عمر کو پکڑنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ان دونوں مختلف بل کہ متضاد کیفیات کو یک رنگ کرنے کا نام بچوں کا ادب تخلیق کرنا ہے اور ڈاکٹر اسلم فرخی کے قلم نے یہ کام اس سلیقے سے کیا کہ انھیں اس میدان کا مردِ میداں بل کہ مردِ قلندر مانتے ہی بنتی ہے۔

وہ صبح میں نہیں بھول سکتا کہ میں ابھی دفتر آ کر کرسی پر بیٹھا ہی تھا کہ میری پرائیویٹ سیکرٹری نے بتایا کہ ڈاکٹر اسلم فرخی آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ زہے نصیب! خوش گوار صبح کا آغاز کس قدر خوش گوار تھا۔ میں نے فون لیا، سلام دعا کے بعد ڈاکٹر صاحب کی ناقابلِ فراموش میٹھی آواز سنائی دی، وہ فرما رہے تھے ''جناب رات میں نے آپ کی تازہ کتاب ''آنکھ کا سمندر'' کا پہلا افسانہ ''سنیچر کا دن'' پڑھا..... بھیا! یہ بہت بڑا افسانہ ہے۔ خدا کے لیے آپ فائلوں پر لکھنا کم کریں اور افسانوں کی طرف زیادہ رہیں، ہمارا ایک شان دار افسانہ نگار دفتری مصروفیات میں گم ہو رہا ہے''..... یہ ستائش بھی تھی، فرمائش بھی اور فہمائش بھی..... ایسے افراد چند جملوں میں زندگی کا نصاب پڑھا دیتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب صاحبِ دل بھی ہیں۔ جی ہاں، کئی بار دل نے انھیں چونکا دیا ہے، ڈاکٹرز نے باور کرایا ہے، مصروفیت کم کرنے کا بتایا ہے مگر یہ لوگ کیا جانیں کہ ڈاکٹر صاحب کے لیے یہ مصروفیات آکسیجن لینے کا ذریعہ ہے اور دل و دماغ دونوں کے لیے آکسیجن کتنا ضروری ہے یہ بات میڈیکل ڈاکٹر صاحبان ذرا دوسرے انداز میں لیتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ڈاکٹر اسلم فرخی کے گھر میں بھی ایک میڈیکل ڈاکٹر ہیں مگر ذرا مختلف سے، وہ میڈیکل ڈاکٹر سے زیادہ ادب کے ڈاکٹر ہیں..... جی ہاں آصف فرخی!! یہ ڈاکٹر صاحب اور اپنے خانوادے کے روشن چراغ اور

سرمایۂ فرخی کے قابلِ فخر امین جو ہیں۔

بات مولانا حسین آزاد کی تحریر سے شروع ہوئی تھی جن پر تحقیقی مقالہ لکھ کر اسلم فرخی، ڈاکٹر اسلم فرخی بنے، مگر بات آگے نہیں بڑھ سکتی اگر یہ نہ مان لیا جائے کہ ڈاکٹر صاحب نے آزاد پر تحقیق ہی نہیں کی انھیں اپنی ذات میں اتار بھی لیا ہے۔ اسلوب اور اصناف کا جو تنوع آزاد کے یہاں ہے انھی ادبی جہات کی آزادی ڈاکٹر صاحب کے یہاں ملتی ہے۔ یہاں تک کہ آزاد کی کتابوں کے حوالے سے سن وسال فہمی بھی ڈاکٹر صاحب نے حرزِ جاں بنالی ہے اس لیے وہ ہزار سال کی عمر رکھنے والی کتابوں سے لے کر سو دن پہلے چھپنے والی اچھی کتابوں کے قاری، حافظ اور حوالہ بنے ہوئے ہیں۔ اس طرح وہ بجائے خود ایک ایسی کتاب ہیں جس کی عمر کا تعین ابھی ہونا باقی ہے!!

۲۳؍اکتوبر ۱۹۲۳ء کو آسمانِ علم وادب پر طلوع ہونے والا یہ سورج اپنی ضوفشانی بکھیر کر ۱۵؍جون ۲۰۱۶ء کو ۹۲ برس کی عمر میں فطرتِ حقیقی کی سمت غروب ہوگیا اور وقت نے چشمِ حیرت سے ہر سمت یہ منظر دیکھا:

چشم پر نم تھی، قلم تھا اشک بار
جب کہ اسلم فرخی رخصت ہوئے

☆☆☆

پروفیسر ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی

پروفیسر ڈاکٹر معین الدین عقیل

ہمارے ملک کی اور ہماری قوم کی یہ خوش قسمتی رہی ہے کہ جب یہ ملک وجود میں آیا تھا تو ہر شعبۂ زندگی میں، چاہے وہ نظمِ مملکت کی تشکیل اور اس پر عمل درآمد ہو، عسکری مہارت ہو یا سائنسی وفنی سرگرمیاں اور یا علوم اور تعلیمات ہوں، مخلص و دیانت دار اور اہل و لائق افراد اس نئی اور بے وسیلہ مملکت کو اس طرح میسر آ گئے تھے کہ انھوں نے اپنی اپنی لیاقت اور اہلیت اور اپنے اپنے فرائض اس عمدگی سے انجام دیے کہ یہ مملکت بہت جلد اپنے پیروں پر اس طرح کھڑی ہوگئی کہ کسی بیرونی امداد اور مہارت کے بغیر بھی ملک کے متعدد گوشوں میں ضروری تعمیرات بہ مثل گدو بیراج اور تونسہ و تربیلا وغیرہ جلد ہی وجود میں آئے، سڑکوں کا جال پھیلا، کراچی میں یکسر نئی اور مثالی آبادیاں تعمیر ہوئیں اور پی آئی اے جیسا عظیم الشان ادارہ نہ صرف قائم ہوگیا، بلکہ اس نے چند ہی سالوں میں دنیا کی سب سے بہترین ہوائی خدمات کا ریکارڈ قائم کر کے دکھا دیا اور متعدد نئی غیر ملکی ہوائی کمپنیوں کی تربیت بھی کی۔ علمی اور تعلیمی سطح پر بھی ایسے ادارے قائم ہوئے جنھیں ایسے عالم و فاضل سربراہ بھی میسر آ گئے جو اپنے اپنے اداروں میں ایسے علمی و تحقیقی کام کر گئے جو آج کے لیے بھی ایک ایسی مثال ہیں، جواب نہ کسی ادارے میں سربراہوں کی صف میں کہیں نظر آتی ہے نہ اب کوئی ادارہ بہ ظاہر ایسا نظر آتا ہے جو اپنے تفویض کردہ فرائض دیانت داری اور کمالِ اخلاص و اہلیت سے انجام دیتا ہو۔ ہر ادارے میں تباہی و بربادی ہمارے سامنے ہے۔ تعلیم اور تعلیمات کا شعبہ بھی عبرت و زیاں کی ایک الم ناک مثال بن کر رہ گیا ہے۔

وہ بھی کیا دن تھے کہ جب ڈاکٹر ایم ایم شریف، ڈاکٹر فضل الرحمٰن اور ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی جیسے اعلیٰ تعلیم یافتہ علما و فضلا اور دانش ور اور ساتھ ہی صاحبِ تصنیف اکابر وزیرِ تعلیم اور مشیرِ تعلیم ہوا

کرتے تھے اور جن کی شہرت و وقعت ان کے علمی اور تصنیفی کارناموں کے سبب عالم گیر ہوتی تھی۔
ان اکابر میں سے تعلیمات میں، جو میرا اس وقت موضوع ہے، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے، اپنے زیادہ شان دار تعلیمی اور علمی پس منظر کے ساتھ، طویل عرصے تک اپنی لیاقت و دانش سے اور اپنی عمدہ نظامت سے جو فیض ملک و قوم اور خاص طور پر جامعہ کراچی کو پہنچایا ہے، وہ بھی ایک منفرد مثال ہے۔ تعلیمات سے ان کی تدریسی و انتظامی وابستگی قریب قریب نصف صدی پر محیط رہی جب کہ ۱۹۶۱ء سے ۱۹۷۱ء تک کا عرصہ انھوں نے جامعہ کراچی کے شیخ الجامعہ کے طور پر گزارا اور اس ادارے کو ایک عام یونی ورسٹی کی سطح سے اٹھا کر واقعتاً پاکستان کی کیمبرج یونی ورسٹی کے مقام تک پہنچانے میں مثالی کامیابی حاصل کی۔ اس سے قبل ان کی فضیلت ایک تخلیق کار مصنف، اردو کے اوّلیں جدید ڈراما نویسوں میں سے ایک، اور ایک ناول نویس اور اسلام کے ایک دانش ور مصنف اور پھر ملک کے ممتاز وزیرِ تعلیم اور کئی علمی اداروں کے ساتھ ساتھ مرکزی ''ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی'' کے ناظم کے طور پر مسلّم ہو چکی تھی، جب کہ اس سے قبل وہ کیمبرج یونی ورسٹی سے تاریخ میں ''سلطنت دہلی کا نظمِ مملکت'' کے وقیع مطالعے کی بنیاد پر ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کر چکے تھے اور ڈراما نگاری میں کم از کم ۱۱ طویل و مستقل اردو ڈراموں: ''صیدِ زبوں'' (۱۹۳۲ء)، ''نقشِ آخر'' (۱۹۳۳ء)، ''گناہ کی دیوار'' (۱۹۳۸ء)، ''بند لفافہ'' (۱۹۴۳ء)، ''کٹھ پتلیاں'' (۱۹۴۳ء)، ''ملاے اعلیٰ'' (۱۹۴۳ء)، ''نفرت کا بیج'' (۱۹۵۱ء)، ''مٹھائی کی ٹوکری'' (سن ندارد)، ''معلم اسود'' (سن ندارد)، ''نیم شب'' (سن ندارد)، ''ہمزاد'' (سن ندارد) اور دو ناولوں: (۱) ''افغانوں کی تلوار''، اور (۲) ''صبحِ ترکی یا ترکی دوشیزہ''، جو معروف اسکالر اور مترجم قران محمد مارما دیوک پکتھال کے انگریزی ناول The House of War (مطبوعہ ۱۹۱۲ء) کا ترجمہ تھی۔ ان کے علاوہ شاعری سے ان کے ذاتی شغف کی بھی ممتاز اردو رسائل میں چند مطبوعہ مثالیں، ان کی ابتدائی مطبوعہ تخلیقات میں شامل ہیں۔ وہ انگریزی میں اپنی تصانیف The Religion of Islam (۱۹۲۹ء)، Studies in the Quran (۱۹۳۱ء)، The Future Development of Islamic Culture in India (۱۹۴۴ء) اور پی ایچ ڈی کے لیے اپنے کیمبرج کے مقالے کی اشاعت کے توسط سے پاکستان آنے سے قبل ہی علمی دنیا میں توجہ اور منزلت کے مقام پر پہنچ چکے تھے۔ پاکستان آ کر وہ جلد ہی عالمی سطح پر ایک نمائندہ و ممتاز پاکستانی تاریخ نویس کے طور پر معروف

ہوئے۔ تاریخ نویسی میں انگریزی میں تصنیف کردہ: 'سلطنت دہلی کا نظم حکومت'، 'عہدِ مغلیہ کا نظم حکومت'، 'اکبر: عہد مغلیہ کا معمار' 'جدوجہد برائے پاکستان'، 'علماً، میدان سیاست میں' اور 'تعلیم پاکستان میں' ان کے محبوب موضوعاتِ مطالعہ و تحقیق پر مشتمل ان کی تصانیف رہی ہیں۔ ان کی ان مستقل انگریزی تصانیف کے علاوہ، جن کے موضوعات اوپر درج ہیں، ان کے غیر مدون انگریزی مقالات کے مجموعے: From Meraj to Doom اور Perspectives of Islam and Pakistan میں اور اردو میں ''اذکار و افکار'' میں شامل ہوئے، جو کراچی سے شائع ہوئے۔ ان کے سارے علمی و تحقیقی مطالعات کے تعارف اور جائزے کے لیے دفتر کے دفتر درکار ہیں (ان کی تصانیف اور ان کے بنیادی کوائف کا ایک اندازہ راقم کی مرتبہ ''کتابیاتِ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی'' شائع کردہ: مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۷ء سے لگایا جا سکتا ہے۔)، اس لیے فی الوقت میں قریشی صاحب کی خدمات کو محض تعلیم کے شعبے میں ان کے اثرات تک خود کو محدود رکھوں گا کہ اس وقت وہ میرے ایک معنوی استاد کے طور پر بطور ایک استاد اور اپنے معاصر مصنفین و مؤرخین و دانش وروں اور بے مثال منتظمین میں ایک پسندیدہ اور نمائندہ فرد کی حیثیت میں ایک بڑے تعلیمی ادارے، جامعہ کراچی کے ایک سب سے وقیع اور عظیم شیخ الجامعہ کی حیثیت میں میرے لیے ایک موضوع بنے ہیں۔ آج ہمارا معاشرہ تعلیم کی ابتری اور انتہائی زوال کے سبب ہی روز افزوں زوال پذیر ہے اور جب کہ ایک مختصر تحریر میں قریشی صاحب کی تعلیمات کے حوالے سے منفرد اور وقیع، بلکہ بے مثال خدمات کا تذکرہ بھی حق واقعتاً ادا نہ ہو سکے گا۔ تعلیمات کے زمرے میں قریشی صاحب کی فکر اور حکمت اور ان کی عملی خدمات کے جائزے و مطالعے میں ہماری رہنمائی کے لیے وہ سب کچھ موجود ہے جس کی آج ہمارے معاشرے اور قوم کو ضرورت ہے۔

تعلیمات کے ضمن میں ان کی تصنیف Education in Pakistan اپنی تصنیف و اشاعت کے وقت تک اپنے موضوع پر، دو ایک اردو کتابوں سے قطعِ نظر، انگریزی زبان میں واحد مستقل و مبسوط مطالعہ و تجزیہ پر مشتمل تصنیف ہے جو اپنے عنوان کی مناسبت سے نہایت اہم گوشوں پر مشتمل سامنے آئی تھی۔ اردو میں، اور اس مستقل تصنیف سے قطعِ نظر، تعلیمات کے زمرے میں قریشی صاحب متعدد مقالات بھی گاہے گاہے لکھتے اور اپنے تجربات، اپنے خیالات و افکار اور اپنے نظریات و نقطۂ نظر سے متعارف کراتے رہے، لیکن ان سب کا عملی اظہار اور ان کا نظری تجربہ

جامعہ کراچی میں ان کی بہ حیثیت شیخ الجامعہ وابستگی اور نظامت کے توسط سے سامنے آیا، جو ہر لحاظ سے جامعہ کراچی کی تاریخ کا سب سے ممتاز، مثالی اور منفرد دور ثابت ہوا۔ اگرچہ جامعہ کراچی سے قبل وہ تاریخ کی تدریس کے ضمن میں ۳۲ سال تک مختلف تعلیمی اداروں: 'سینٹ اسٹیفن کالج'، دہلی؛ 'دہلی یونی ورسٹی'؛ اور 'پنجاب یونی ورسٹی' سے بحیثیت استاد منسلک رہ چکے تھے، لیکن جامعہ کراچی سے ان کی وابستگی بہ طورِ شیخ الجامعہ رہی اور وہ یہاں اپنی بنیادی وابستگی کے شعبۂ تاریخ میں گاہے گاہے لیکچر بھی دیتے رہے، تاہم ان کی ساری توجہ یونی ورسٹی کی نظامت اور اس کو ایک بہترین جامعہ بنانے پر مرکوز رہی اور وہ اس میں اس حد تک کامیاب رہے کہ ان کے دور میں یہ جامعہ اپنے معیار اور اپنی وسعت کے لحاظ سے ملک کی سب سے وقیع جامعہ بن گئی۔

اگرچہ ڈاکٹر قریشی کو خاص مناسبت ابتدا میں اسلامی عقائد و نظریے، ڈراما نویسی، ناول نویسی اور شاعری سے اور پھر بعد میں علمِ تاریخ اور معاشرتی علوم سے رہی، لیکن یہ علم سے ان کی گہری نسبت تھی کہ جامعہ کراچی میں معاشرتی علوم کے ساتھ ساتھ بلکہ کہیں زیادہ توجہ ان کی کلیۂ سائنس کی بہتری اور ترقی کی جانب مرکوز رہی اور جہاں معاشرتی علوم کے شعبوں میں ان کے دور میں نہایت لائق اور باوقار اساتذہ کی کہکشاں جمع ہوگئی، وہیں کلیۂ سائنس کے مختلف اور نوتشکیل شعبوں میں بھی انھوں نے بڑے اہتمام اور جتن سے ایسے افراد کو جمع کرلیا کہ ان کے باعث سائنسی علوم کے شعبے بھی ملک بھر میں انتہائی باوقار شمار ہونے لگے۔ اس مقصد کے لیے بعض وہ افراد بھی جو اپنے اپنے شعبوں میں اپنی تحقیقات و مطالعات کے سبب عالمی شہرت کو چھو رہے تھے، انھیں جامعہ کراچی میں مدعو کیا، جن میں سے بعض کی آمد کے نتیجے میں ایسے نئے شعبے بھی یہاں قائم ہوئے جو ملک میں کسی یونی ورسٹی میں نہ اس وقت تک موجود تھے نہ بعد میں بھی کہیں وجود میں آئے۔ یہ ان کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی ہی تھی کہ ایسے لائق و فائق اور مخلص اساتذہ نے اس جامعہ سے منسلک رہ کر دیانت دارانہ تدریس کے ساتھ ساتھ اپنی تصنیفی و تحقیقی خدمات سے ایسے ایسے علمی کام علمی دنیا میں پیش کیے جو یہاں بعد میں کبھی پیش نہ کیے جاسکے۔

جامعہ کراچی کی ایسی سرگرمیوں اور محض معاشرتی علوم میں ایسے کاموں اور ایسے اساتذہ کا اندازہ اُس ڈائریکٹری کو دیکھ کر لگایا جاسکتا ہے جسے جامعہ کراچی میں شعبۂ لائبریری سائنس کی استاد ڈاکٹر نسیم فاطمہ نے ۱۹۸۵ء میں یہیں جامعہ کراچی کے اپنے اشاعتی منصوبے کے تحت ایک اور لائق اور

روشن خیال دانش ور شیخ الجامعہ ڈاکٹر جمیل جالبی کی تحریک و ہدایت پر مرتب و شائع کیا تھا یا اُس تصنیف سے بھی لگایا جاسکتا ہے جسے اُسی دور میں ڈاکٹر نصیب اختر نے ''تاریخِ جامعہ کراچی'' کے عنوان سے لکھا تھا۔ ایسے علمی کام، آج کے مقابلے میں نہایت محدود وسائل و قلتِ سرمایہ کے باوجود، کوئی ایسا بلند فکر اور دانش مند وائس چانسلر ہی سوچ سکتا تھا جیسے خود ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی تھے یا ڈاکٹر جمیل جالبی۔ چناں چہ یہ 'تاریخ جامعہ کراچی' یا مذکورہ ڈائریکٹری یا ایسا کوئی عالمانہ و مخلصانہ منصوبہ یا خیال بھی جالبی صاحب کے بعد میں آنے والے کسی شیخ الجامعہ کے ذہن میں بھی کیوں کر آسکتا تھا؟ جب جالبی صاحب کے بعد، بلکہ جالبی صاحب سے پہلے بھی، جامعہ کی دنیا ہی بدل گئی تھی اور ۱۹۷۲ء میں تعلیم کے قومی ملکیت میں لیے جانے کے بعد ہی سے سیاسی مداخلت اور سیاسی تقرریوں نے جامعہ کی ہر شائستہ و علمی روایت کو پسِ پشت ڈال کر جامعہ میں تحقیق و تصنیف ہی نہیں تدریس کے ماحول اور انتظامی نظم و ضبط کو بھی اس طرح نیست و نابود کیا ہے جس کا امکان بھی مثلاً ڈاکٹر قریشی کے زمانے میں نہ ہوسکتا تھا۔ بعد میں بالعموم ایسے شیخ الجامعہ، دیگر متعدد جامعات کی طرح، اس جامعہ کا مقدر بھی بنتے رہے کہ اُن میں کسی میں احساسِ زیاں بہ ظاہر بھی اپنی جھلک تک نہ دکھا سکا۔ ۱۹۷۲ء کے بعد، یعنی تعلیم کو بھی قومی ملکیت میں لیے جانے کے بعد سے علمی و تعلیمی اداروں اور جامعات میں علمی و تصنیفی روایات جس طرح نظر انداز اور پستی کی جانب رواں ہوئی ہیں اس کا محض ایک اندازہ جامعہ کراچی کے ''شعبۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ'' کو دیکھ کر لگایا جاسکتا ہے کہ قریشی صاحب کے دور میں، مالی تنگ دستی کے باوجود، اس کی کیا کیا سرگرمیاں تھیں، کیا کیا کارکردگی تھی، اور ان کے بعد جالبی صاحب کے زمانے میں کیا تھی، یہاں تک کہ ڈاکٹر ظفر سعید سیفی کے زمانے میں کیا تھی اور بعد کے برسوں میں کیا رہی ہے؟ اگر جواب طلب کیا جائے تو مالیات کا رونا رویا جائے گا، لیکن یونی ورسٹی کی مالی حالت فی کس تناسب سے، مہنگائی کی شرح کے تقابل کے باوجود، پہلے مذکورہ ادوار میں کیا تھی اور اب کیا ہے؟ اس طرح اس جامعہ کے سربراہوں کی اہلیتوں اور فرض شناسی اور اخلاص اور کارکردگی ہر چیز کی تصویر بھی سامنے آجائے گی۔

متعدد نئے شعبوں کے قیام کے علاوہ ڈاکٹر قریشی نے جامعہ کی نظامت میں انتظامی اور تعلیمی سطح پر متعدد ایسی کاوشیں کیں اور جامعہ میں اساتذہ اور طلبہ کو وہ مراعات دیں کہ جن کے سبب ہر سطح پر علمی اور تعلیمی سرگرمیوں کا ایک سلسلہ بندھا رہتا تھا جس میں آئے دن اضافہ تو ہوتا، لیکن وہ ٹوٹنے نہ

پاتا تھا۔ طلبہ کی انتہائی مثبت سرگرمیاں اور صحت مند تقاریب ان کے زمانے میں سال بھر اپنے عروج پر رہتیں جو طلبہ کی تربیت کا سبب بنتیں۔ ان تقریبات اور سرگرمیوں کے طفیل کیسے کیسے ذہین اور لائق طلبہ معاشرے کو میسر آتے اور خود جامعہ میں تدریس سے بھی منسلک ہوتے رہے۔ جب یہ سلسلہ نہ رہا تو خام ذہن اور نااہل افراد سفارشوں، سیاسی اثر اور اقربا پروری کے تحت بہ حیثیت استاد تعینات ہونے لگے جن کی وجہ سے تعلیم اس پستی میں گر گئی جسے ڈاکٹر قریشی کے دور کے مقابلے میں تحت الثریٰ کہنا زیادہ مناسب ہے۔ یہاں ایک دوسری جانب سے جواباً یہ کہا جا سکتا ہے کہ اب سیاسی حالات اور ماحول بدل گیا ہے اور اب وہ سرگرمیاں ممکن نہیں، لیکن یہ کہتے ہوئے یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہیے کہ حالات قریشی صاحب کے زمانے میں بھی یکسر پرسکون نہ تھے، ایک دو سیاسی طبقات ان کے لیے ہر وقت مسائل پیدا کیے رہے اور ذوالفقار علی بھٹو نے تو اپنے ایک انتخابی جلوس میں جامعہ کے قریب سے گزرتے ہوئے علی الاعلان جامعہ کراچی کو ڈاکٹر قریشی کی ''آمریت'' سے نجات دلانے تک کا نعرہ لگایا تھا، جو ریکارڈ پر ہے، لیکن قریشی صاحب کے پاس حکمت اور فرض شناسی تھی اور اخلاص بے پناہ تھا، اس لیے وہ رکاوٹوں اور مخالفتوں کے باوجود اس جامعہ کو وہ کچھ دے گئے جو بعد میں کسی سے ممکن نہ ہو سکا۔ اس لیے کہ اُن کے زمانے میں اساتذہ اپنی اخباری تحریروں، عام سے ماہنامہ رسالوں میں اپنے چھپے ہوئے مضامین، یہاں تک کہ بچوں کے رسالوں میں چھپی اپنی تحریروں کو ''تحقیقی مقالات'' کے طور پر پیش کر کے ترقی نہیں پاتے تھے اور تحقیق و تدریس سے بے نیاز نہ رہ سکتے تھے جب کہ آج یہی سب کچھ عام اور مروج ہے۔ اس لیے وہ سارے اعزازات، جن سے جامعہ کراچی ملک بھر میں سرفراز تھی، رفتہ رفتہ اس سے چھنتے رہے اور یوں جامعہ بانجھ ہوتی رہی ہے۔

یہاں میری معروضات کا زیادہ تر تعلق میری ذاتی مناسبت کے سبب بالخصوص جامعہ کے معاشرتی علوم میں اس کے کردار اور سرگرمیوں سے ہے۔ ملک بھر کی جامعات میں جامعہ کراچی کے شعبۂ لسانیات کا قیام بھی ڈاکٹر قریشی کے زمانے کا ایک اہم واقعہ تھا، جس کی نظیر نہ اس وقت نہ آج تک ملک کی کسی اور جامعہ میں نظر آئی۔ یونیسکو اور کولمبیا یونی ورسٹی کا اس ضمن میں تعاون ڈاکٹر قریشی اور ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کے سبب ممکن ہوا تھا، جو دونوں کے کولمبیا یونی ورسٹی سے کبھی منسلک رہنے کے سبب ممکن ہوا تھا، لیکن بعد میں اس شعبے کو ترقی دینا تو ایک طرف ایک ایسے شیخ الجامعہ کے دور

میں، جن کی شہرت کسی علمی فوقیت کی بنیاد پر نہیں، اردو کے ایک مقامی شاعر ہونے ہی پر منحصر رہی، اور ایک ایسے صدرِ شعبہ کی علمی کم مائیگی سے، جن کی زیادہ شہرت اپنی تحریروں میں سرقے اور اخلاقی و مالی بدعنوانیوں کے طفیل رہی، ملک بھر میں قائم لسانیات کا واحد شعبہ ذاتی فیصلوں سے اس طرح بند کر دیا گیا کہ کسی سطح کی بھی کسی مجلس سے از روئے قانون منظوری تک نہ لی گئی۔ اب کس سربراہ کو یہ توفیق ہوگی کہ یہ شعبہ پھر بحال ہو سکے؟

جامعہ کراچی کو اس کا ایک قومی اور ملی تشخص عطا کرنے کے ضمن میں ڈاکٹر قریشی کا ایک بڑا امتیاز یہ بھی تھا کہ جامعہ میں اور اس کے تحت اس سے ملحقہ تمام تعلیمی اداروں میں اردو زبان کو اور اسلامیات کو گریجویشن کی سطح تک ہر کلّیے: فنون، تجارت اور سائنس میں، بہ طور لازمی مضامین نصاب میں داخل کیا گیا۔ ان مضامین کے نصاب میں شامل ہونے کے جو فوائد طلبہ کو پہنچ سکتے تھے اور پہنچ رہے ہیں ان سے ہر ذی فہم و ذی شعور شخص واقف بھی ہے اور مشاہد بھی ہے۔ یہ سلسلہ کوئی پچاس سال سے رواج میں ہے، لیکن بہ صد افسوس کہ ڈاکٹر قریشی کی قائم کردہ روایات میں آج جہاں قومی مصالح اور علمی فوائد کو نظر انداز کرتے ہوئے محض اپنی ذاتی مصلحت، سہل پسندی اور کج فہمی کا رویہ عام ہے کہ جامعہ کے کئی شعبوں میں بہ طور لازمی مضمون اردو خارج ہوتی چلی گئی یہاں تک کہ کچھ سالوں کے لیے شعبۂ تجارت سے یکسر خارج کر دی گئی۔ حالاں کہ اس منفی فیصلے سے چند سال قبل، ۲۰۰۳ء کے آغاز میں، اُس وقت کے شیخ الجامعہ ڈاکٹر ظفر سعید سیفی نے تو اردو کو، جو ایم بی بی ایس کے نصاب میں شامل نہ تھی، شامل کرنے کے لیے صدرِ شعبۂ اردو اور ناظم شعبۂ تصنیف و تالیف کی حیثیت میں میری تجویز کو قبول کرتے ہوئے میری تیار کردہ دستاویز پر، جس کی ایک نقل میرے پاس اب تک محفوظ ہے، نہ صرف دستخط کر دیے تھے بلکہ اس دستاویز کو اکیڈمک کونسل سے منظوری لینے کے لیے ایجنڈے میں شامل کرنے کے لیے متعلقہ میز پر ارسال کر دیا گیا تھا، لیکن اس کے کچھ ہی دن بعد اگلے شیخ الجامعہ، مقامی اردو شاعر کا دورِ سربراہی شروع ہوا تو وہ دستاویز جس کی منظوری سے اردو زبان ایم بی بی ایس کے طلبہ کے لیے بھی لازم ہو سکتی تھی، وہ اکیڈمک کونسل میں پیش ہی نہ کی گئی! ڈاکٹر قریشی کے بعد قومی زبان کے ساتھ ان کے دور میں ہونے والے انتہائی مثبت و تعمیری فیصلوں کا یہ جو حشر ان چند سالوں میں ہوا، یہ جامعہ کے عہدِ حاضر کے سربراہوں کے رویوں کو ہمارے سامنے لاتا ہے۔

قومی زبان کو تعلیمی زبان بنانے اور اعلیٰ تعلیم میں بھی بہ طور ذریعۂ تعلیم رائج کرنے میں ڈاکٹر قریشی نے جو دل چسپی لی اور جو انقلابی فیصلہ کیا تھا، وہ سارے ملک کے دردمند اور مخلص طبقات میں نہایت قابلِ تعریف اور قابلِ رشک قرار دیا گیا جس کے مثبت اثرات بھی بعض مقامات پر نظر آنے لگے۔ ڈاکٹر قریشی نے اسی پر بس نہ کیا بلکہ اسے اعلیٰ سطحی تدریس میں ذریعۂ تعلیم بنانے کے لیے عملی اقدامات بھی کیے اور سائنس کے متعدد اساتذہ کو آمادہ کرلیا کہ وہ اپنے لیکچر اردو زبان میں دیں اور اگر متعلقہ نصاب پر مواد اردو میں موجود نہ ہو تو خود اپنے لیکچر اردو میں تحریر کریں جنھیں جامعہ کے ''شعبۂ تصنیف وتالیف وترجمہ'' نے شائع کرنا شروع کیا اور طلبہ کو نہایت کم قیمت پر وہ لیکچر فراہم ہونے لگے۔ ایسے کاموں کے لیے ''شعبۂ تصنیف وتالیف وترجمہ'' کو ڈاکٹر قریشی نے مزید مستعد و فعال بنا دیا، جہاں نہایت مستقل مزاجی اور تن دہی سے ان مضامین کی اصطلاحات کے ترجموں یا نئی اصطلاحات کے وضع کرنے کے لیے ہر مضمون کے ماہرین پر مشتمل مجالس تشکیل دے کر ان کی ہفتہ وار نشستوں کا اہتمام کیا گیا تاکہ وہ باہمی مشاورت سے اصطلاحات کا یہ کام انجام دے سکیں، لہٰذا ایسے کام بڑے پیمانے پر شروع ہوئے اور منظرِ عام پر بھی آنے لگے۔ پھر اس کام کے لیے صرف شعبے کی تشکیل کردہ مجالس ہی پر انحصار نہ کیا گیا، بلکہ یہاں تیار کردہ اصطلاحات کی صحت ومعیار کے تعین کے لیے ماہ دو ماہ بعد انھیں شائع کرنے کا اہتمام کیا گیا تاکہ انھیں بیرونِ جامعہ اور بیرونِ کراچی کے ماہرین کے پاس بھیجا جائے اور ان کی رائے طلب کی جائے۔ اس خاص مقصد کے لیے ایک مجلّہ ''جریدہ'' جاری کیا گیا جو ڈاکٹر قریشی کے وقت تک باقاعدگی سے نکلتا رہا، لیکن ان کے بعد بند ہوگیا اور ایک عرصے بعد جب اس شعبے کی نظامت ڈاکٹر سیفی نے میرے سپرد کی تو میں نے ان کی منظوری سے ۱۹۹۹ء میں اسے دوبارہ جاری کیا اور اس میں باقی ماندہ اصطلاحات اور مفیدِ تدریس مواد کو دوبارہ شائع کرنا شروع کیا۔ ''جریدہ'' کا یہ دوسرا دور ڈاکٹر ظفر سعید سیفی کے وقت تک جاری رہا، لیکن اب یہ بھی دیگر متعدد علمی منصوبوں کی طرح یکسر موقوف ہے۔

جامعہ کی ترقی اور وسعت اور اس کے لیے نظامت کی عمدگی کے جو تقاضے ہوسکتے تھے، ڈاکٹر قریشی نے انھیں نہایت روشن خیالی، اپنی علمی فضیلت اور عالمانہ بصیرت کے ساتھ، جس میں ان کے بین الاقوامی تجربات ومشاہدات اور ان کا ذاتی اخلاص ان کے معاون بنے، اس جامعہ کو حقیقتاً پاکستان

کی کیمبرج یونیورسٹی بنا دیا تھا۔ جامعہ کے انتظامی معاملات اور انتظامی دفاتر کی کارکردگی ومستعدی بھی قابلِ رشک تھی۔ گاہے ہم نے ڈاکٹر قریشی کو جامعہ کے مختلف شعبوں اور وہاں کے انتظامات اور وہاں کی صورتِ حال کا معائنہ کرنے کے لیے دورے کرتے بھی دیکھا۔ ان کے دور میں دیواریں شفاف اور فرش صاف ستھرے ہوتے تھے، لیکن اب یہ حال ہے کہ ساری جامعہ میں کوئی عمارت اور کوئی کمرہ ایسا نہیں جس میں مرمت کا ڈھیر سارا کام موجود نہ ہو۔ تقریبات کا نظم وضبط بھی دیدنی ہوتا تھا۔ خاص طور پر جلسۂ تقسیمِ اسناد ایک مثالی نظم وترتیب اور شائستگی کی تمام تر صفات کے ساتھ اب تک ہمارے ذہنوں میں اپنے بہترین تأثرات کے ساتھ محفوظ ہے۔ ان میں ڈاکٹر قریشی کے خطبات اپنی فکری معنویت اور بلند خیالی کا ایک مرقع ہوتے تھے، جن کا اسلوب اور پیرایۂ بیاں بھی اپنی علمیت اور عالمانہ شائستگی کی ایک مثال ہوتا تھا۔ ڈاکٹر قریشی کی شاید سب ہی تصانیف شائع ہوچکیں اور ان کے غیر مدون مقالات ومضامین بھی بڑی حد تک مرتب وشائع ہو چکے ہیں، لیکن افسوس ان کے وہ خطبات جو جلسۂ تقسیمِ اسناد میں وہ ہر سال پیش کیا کرتے تھے، اور جو تعداد میں محض دس ہیں، اپنی علمی وتاریخی حیثیت کے سبب کتابی صورت میں شائع ہونے چاہیے تھے جو شائع نہ ہوسکے۔ اس بارے میں جب ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب شیخ الجامعہ تھے، میں نے ان خطبات کے جامعہ کراچی کی جانب سے شائع کرنے کی تجویز پیش کی تو انھوں نے اسے بے حد پسند کرتے ہوئے یہ ذمے داری خود میرے سپرد کردی، لیکن میں ان ہی دنوں بیرونِ ملک تدریس کے لیے اٹلی چلا گیا اور اس وقت یہ کام نہ کرسکا۔ وہ خطبات، جنھیں ان کی علمیت ودردمندی کی صفات کی وجہ سے میں جمع کیا کرتا تھا، میرے پاس محفوظ ہیں۔ اسی طرح ڈاکٹر قریشی کے متعدد عالمانہ وتحقیقی مقالات بیرونی دنیا کے ممتاز تحقیقی مجلّوں میں شائع ہوتے رہے ہیں جن کو یک جا کرنے اور شائع کرنے کا کام بھی اس جامعہ پر قرض سمجھا جانا چاہیے۔

ڈاکٹر قریشی نے جہاں اپنے دور کے آغاز ہی سے نام ور اور نہایت لائق ماہرین اور ممتاز اساتذہ کو اس سے منسلک کرکے ایک مثالی جامعہ بنا دیا تھا اور نئے شعبوں کے قیام اور ان میں بہترین نصابات کی ترویج کی تحریک عام کرکے اور تدریس کو منظّم اور باقاعدہ بنا کر اسے ہر طرح سے ایک معیاری جامعہ بنا دیا تھا، وہیں تحقیقات اور مطالعات کے لیے ایک مناسب ماحول اور وسائل فراہم کرنے کی کامیاب کوشش بھی کی تھی۔ اس کوشش کے ذیل میں انھوں نے جامعہ کے مرکزی کتب

خانے پر بھی کما حقہٗ توجہ دی اور اسے ایک بڑے پیمانے پر ضروری مآخذ اور کتب و رسائل کی فراہمی سے ایک بہت باثروت کتب خانہ بنا دیا۔ اس کے لیے انھوں نے ڈاکٹر محمود حسین کو اس کام پر خاص طور پر مامور کیا جنھوں نے انتہائی توجہ اور جستجو سے اسے ایک عمدہ کتب خانہ بنانے میں حد درجہ کامیابی حاصل کی۔ اسی لیے یہ کتب خانہ ''ڈاکٹر محمود حسین لائبریری'' کے نام سے موسوم ہوا۔ ڈاکٹر قریشی کے دور میں اس کے مہتمم ڈاکٹر عبدالمعید تھے اور ان کے رفیقِ کار اور ماہر کتاب داری ڈاکٹر انیس خورشید تھے، جنھوں اس کتب خانے کو اپنی لیاقت اور اپنی محنت سے ڈاکٹر قریشی ہی کے دور میں مثالی ترقی دی۔ ممتاز عالم مولانا عبیداللہ قدسی اس میں علومِ شرقیہ کے مہتمم تھے، جنھوں نے اس دور میں اس میں نایاب کتابوں، مخطوطات اور قدیم رسائل کی کم یاب فائلوں کو اس طرح اہتمام سے جمع کیا کہ یہ کتب خانہ اپنے ایسے نوادارات کے طفیل ملک کے اہم کتب خانوں میں شمار ہونے لگا۔ اس وقت اس میں ضروری کتابوں کے ساتھ بیرونی دنیا سے ممتاز اور اہم تحقیقی مجلّے بھی جمع کیے جاتے تھے۔ ''ڈان'' اور ''جنگ'' اخبار کی مکمل فائلوں کو بھی یہاں جمع کرنے کا اہتمام کیا جاتا تھا اور انھیں مائیکرو فلم میں منتقل کر کے بھی محفوظ کیا جانے لگا تھا۔ ہماری دل چسپی اور ضرورت کے ہمارے بہت قیمتی نوادر اور مخطوطات جو یورپ کے کئی شہروں کے کتب خانوں میں محفوظ ہیں، ان میں سے ہماری ضرورتوں کے نوادر خاص طور پر انڈیا آفس لائبریری سے ایک اہتمام سے مائیکرو فلم کی صورت میں حاصل کر کے بھی یہاں جمع کیے گئے۔ ان سے استفادے کے لیے مائیکرو فلم ریڈر اور پرنٹر بھی درآمد کیے گئے جو بعد میں اس طرح بے توجہی کا شکار ہوئے کہ قابلِ استعمال ہی نہ رہے۔ صرف ڈاکٹر جمیل جالبی کے زمانے میں اردو و فارسی کے اہم و نادر دو سو دس مخطوطات کی مائیکرو فلمیں انڈیا آفس لائبریری سے منگوائی گئیں اور بعض اہم نوادر یہاں ذاتی کتب خانوں سے خریدے گئے، لیکن اب یہ سب ماضی کی باتیں ہیں۔

ڈاکٹر قریشی کی شخصیت اور حیثیت ہی تھی کہ شہر کے بزرگ اکابر اپنے اپنے ذاتی کتب خانے بھی اس کتب خانے کو ہدیہ کرنے لگے اور ذاتی ذخیروں کا ایک بہت بڑا خزانہ اس کتب خانے میں یک جا ہو گیا۔ ان سب پر مستزاد مسلم لیگ کے جوائنٹ سیکریٹری محمد شمس الحسن کراچی میں مقیم تھے جن کے پاس مسلم لیگ کا انتہائی قیمتی اور نادر بہت بڑا اور وقیع ذخیرہ اور مسلم لیگ کا دفتری ریکارڈ محفوظ تھا جو انھوں نے اپنی اواخرِ عمر میں ڈاکٹر قریشی کی خواہش پر اس ذخیرے کے تحفظ و استفادۂ عام کے

خیال سے جامعہ کراچی کو ہدیہ کر دیا۔ یہ ایک بہت بڑا علمی اور قومی تحفہ تھا جو دراصل مسلم لیگ نے جامعہ کراچی کی نذر کیا تھا۔ اس ذخیرے کی شہرت نہ صرف ملک میں ہر طرف پھیل گئی بلکہ بیرونِ ملک تک پہنچی۔ اس کی اہمیت اور تاریخی حیثیت ہی تھی کہ قومی محفوظات (نیشنل آرکائیوز)، اسلام آباد نے اس کی ایک عکسی نقل اپنے پاس رکھنا چاہی جو اس نے اپنے وسائل سے حاصل کر لی۔ دیگر متعدد نادر و قیمتی ذخیروں کی طرح یہ ذخیرہ جامعہ کراچی کے کتب خانے کا ایک ایسا اعزاز و امتیاز تھا جو افسوس کہ اب اس سے رفتہ رفتہ چھن رہا ہے۔

ڈاکٹر قریشی نے اپنی بلند نظری اور اپنے خلوص و مستعدی سے جو ورثہ ہمارے لیے چھوڑا تھا، افسوس ہم اس میں اضافہ کیا کرتے اور اسے مزید ترقی اور وقعت کیا دیتے، ہم اس ورثے کو سنبھالنے کے قابل بھی نہ رہے، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ہم اسے تباہ و برباد ہی کرتے آئے اور مزید برباد کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر قریشی نے اپنی جامعہ کو جس مقام پر پہنچایا اور اسے جو حیثیت دی، پھر قومی زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانے اور اسے لازمی نصاب میں شامل کرنے کی ان کی مصلحت ملک کی تاریخ میں ایک مثالی اقدام تھا اور اسی ذیل میں اسلامیات کو بھی گریجویشن کے نصاب میں لازمی حیثیت دینے کا ان کا اقدام بھی ان کی اس بصیرت کا اظہار تھا کہ وہ اپنے طلبہ کو اسلام سے قریب رکھنے کی کیا اہمیت سمجھتے تھے۔ میں نے دورانِ طالبِ علمی اپنے ان رفقا کو، جو اس وقت کے مروّجہ نظریاتی رجحان (فیشن) اشتراکیت اور مذہب گریز خیالات کو اپنی زندگی میں سرایت کیے ہوئے تھے، اس نصاب کو جو پروفیسر خورشید احمد کی مرتبہ کتاب ''اسلامی نظریۂ حیات'' کو، جسے قریشی صاحب ہی کی تحریک پر جامعہ کے ''شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ'' نے شائع کیا تھا، نصاب میں پڑھتے اور اسلام کی طرف آتے اور اس میں جذب ہوتے ہوئے خود دیکھا ہے۔

جامعہ میں جدید اور مفید نئے شعبوں کے قیام اور بہترین اساتذہ کے اضافوں اور عمدہ تدریسی ماحول کی فراہمی اور بہترین انتظامی نظم و ضبط کے علاوہ طلبہ اور تعلیم کو قومی زبان اور اسلام سے قریب کرنے کے ضمن میں قریشی صاحب کے احسانات ایسے ہیں جن کے طفیل ڈاکٹر قریشی کو ہمیں کبھی فراموش نہیں کرنا چاہیے۔ آج جامعہ کراچی اگر ملک میں اپنے ماضی کی سی وقعت و امتیاز کے ساتھ نمایاں نہیں، لیکن اس میں واقع دو تعلیمی ادارے: ایچ ای جے اور آئی بی اے کبھی جامعہ کراچی ہی کے جزوِ لازم تھے اور قریشی صاحب ہی کے زمانے میں اپنے قیام و ارتقا کی جانب اس طرح بڑھے

تھے کہ آج بین الاقوامی شہرت کی بلندیوں پر فائز ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ ایسے کیوں بنے اور ان کی مادرِ علمی جامعہ کراچی کیوں تحت الثریٰ میں پہنچ گئی؟ واقعہ یہ ہے کہ مجھ جیسے اُن افراد کے لیے، جو اس جامعہ سے کسی حیثیت میں کبھی منسلک رہے ہیں، اس سے وابستگی کا کم از کم وہ زمانہ، جب ڈاکٹر قریشی اس کے سربراہ تھے، قابلِ افتخار اور باعثِ سرخ روئی رہا ہے۔ اُس کے بعد کا آج کا دور اُس افتخار و اعزاز کے چھن جانے کا دور ہے اور یہ ہمارے لیے ہی نہیں، قوم کے لیے بھی ایک بڑا المیہ ہے کہ جامعہ کراچی کو ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کے ورثے کی حفاظت اور اسے ترقی دینا تو ایک طرف، اسے سنبھالنے تک کی توفیق نہ ہوئی اور جو لوگ ڈاکٹر قریشی کے بعد، ان کے جو حقیقی وارث: ڈاکٹر محمود حسین، ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی، ڈاکٹر احسان رشید جیسے شائستہ اور مخلص وائس چانسلروں کی صورت میں جامعہ کراچی کے نصیب میں آتے رہے، ان کا عشر عشیر بھی بعد میں کسی میں نظر نہ آیا۔ جو لوگ بعد میں اس منصب پر آتے رہے وہ اس حد تک علم اور تعلیم سے بے نیاز رہے کہ کبھی جو ''مسندِ اشتیاق حسین قریشی'' (ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی چیئر) جامعہ کراچی میں قائم ہوئی تھی اسے تادیر قائم بھی نہ رکھ سکے اور نہ اس کی بحالی کا شعور بعد میں کسی میں دیکھنے میں آیا!

جامعہ کراچی سے سبک دوشی کے بعد ڈاکٹر قریشی نے کسی اور ادارے سے وابستگی اختیار نہ کی۔ وہ بڑے مخلص، سنجیدہ اور حلیم الطبع انسان تھے اور وسیع القلب بھی تھے لیکن ان کی مثالی علمی و تعلیمی خدمات اور اخلاص کے باوجود جب ذوالفقار بھٹو نے جامعہ کراچی میں انھیں دس سال تک شیخ الجامعہ رہنے پر ''آمر'' کا خطاب دیا تو ان کا دل ٹوٹ گیا اور وہ کسی ادارے سے منسلک ہونے سے گریزاں رہے لیکن جب صدر مملکت ضیاالحق نے قومی زبان کے نفاذ اور رواج کے لیے ''مقتدرہ قومی زبان'' قائم کیا تو اس کی سربراہی کے لیے ملک بھر میں انھیں ڈاکٹر قریشی سے زیادہ موزوں کوئی شخص نظر نہ آیا، چنانچہ قومی زبان کی اہمیت اور اس کے فروغ و نفاذ سے اپنی شدید دل چسپی کے احساس کے تحت انھوں نے صدر ضیاالحق کی پیش کش قبول کر لی اور مقتدرہ کے صدر نشین کی حیثیت سے جامعہ کراچی میں اپنے ایک دست راست اور اردو کے مجاہد میجر آفتاب حسن کو مقتدرہ کو معتمد نامزد کر کے مقتدرہ کے قیام کے تمام ابتدائی مراحل کی تکمیل اور اس کے تحت نفاذ اردو کی سفارشات کی تیاری کا وہ بے نظیر کام کیا جو مقتدرہ کی مستقبل کی سرگرمیوں کے لیے محرک و رہنما بنا۔ ان کی تیار کردہ سفارشات پر اگر سنجیدگی و اخلاص کے ساتھ عمل کیا جاتا تو صرف تین سال کے عرصے

میں قومی زبان تمام سرکاری و انتظامی اور عدالتی امور میں نفاذ میں آ جاتی لیکن نوکر شاہی کو یہ منظور نہ تھا چناں چہ کابینہ کے اجلاس میں ان سفارشات کو ضیاالحق کی تاکید کے باوجود ایجنڈے میں کبھی نہ آنے دیا گیا یہاں تک کہ ضیاالحق اس دنیا ہی سے رخصت ہو گئے۔ قریشی صاحب اپنے انتقال ۱۹۸۱ء تک مقتدرہ کے صدر نشین رہے۔ اس دوران کہ جب وہ جامعہ کراچی کی نظامت سے سبک دوش ہوئے اپنے انتقال تک وہ اپنے تصنیفی کاموں میں مصروف رہے اور ان کی تعلیمات پر کتابیں اور مقالات کے تین مجموعے اس دوران شائع ہوئے۔ اپنی علمی دل چسپیوں میں بنیادی طور پر وہ ایک مؤرخ زیادہ تھے، تاریخ نویسی میں جن کی تصانیف و مطالعات نے انھیں پاکستان کا ممتاز اور نمائندہ مؤرخ بھی تسلیم کروایا لیکن وہ خود اپنی خدمات کے سبب ایک تاریخ ساز بھی نظر آئے۔

پروفیسر ڈاکٹر اقتدا حسن

ڈاکٹر امین اللہ وثیر

پروفیسر ڈاکٹر اقتدا حسن جن کا برین ٹیومر کے آپریشن کے بعد مختصر علالت سے انتقال ۱۸ اپریل ۱۹۹۷ء کو ہوا، ہمارے ملک کے ایک نامور فاضل استاد، علم دوست انسان اور معروف مصنف تھے۔ تعلیم و تعلّم کے سلسلے میں کراچی یونیورسٹی کے علاوہ کینیڈا کی مشہور عالم درسگاہ میک گل یونیورسٹی سے بھی ان کا تعلق رہا لیکن انھوں نے اپنی تعلیمی سرگرمیوں کا زیادہ تر وقت اٹلی کی نیپلز یونیورسٹی کے اورینٹل انسٹی ٹیوٹ میں گزارا جو یورپ میں مشرقی علوم کی قدیم اور معروف درس گاہ ہے۔ نیپلز کے اس اورینٹل انسٹی ٹیوٹ میں ڈاکٹر اقتدا حسن مرحوم تقریباً بیس سال تک (۱۹۵۹ء تا ۱۹۷۹ء) اردو زبان و ادب اور تاریخِ پاکستان و ہند کے معروف استاد کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے۔ تاریخِ ہند کے مغلیہ دور سے انھیں خصوصی دلچسپی تھی اور وہ اس عہد کے بارے میں ایک مستند کتاب کی تیاری میں اپنے انتقال تک مصروف رہے۔

نیپلز یونیورسٹی اور اس کے ادارہ علومِ شرقیہ سے انھیں عقیدت کی حد تک محبت تھی، چناں چہ انھوں نے اپنی گراں قدر انگریزی تصنیف ''مغل دور زوال اور اردو ادب'' کا انتساب اسی ادارے، اس کے نامور استاد اور عالمِ مشرقیات پروفیسر بوزانی کے نام کیا۔ ''مغل دورِ زوال اور اردو ادب'' کا بیش تر حصہ انھوں نے اپنے قیامِ اٹلی کے دوران ہی قلم بند کیا تھا۔

ڈاکٹر اقتدا حسن ۲ جولائی ۱۹۳۴ء کو خورجہ ضلع میرٹھ، صوبجات متحدہ بھارت میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق اطبا و حکما کے ایک مشہور و معروف خاندان سے تھا۔ ان کے والد الحاج حکیم سیّد حسن اور دادا حکیم احمد حسن تھے۔ پردادا حکیم محمد حسن اور ان کے والد حکیم عبدالخالق مغلیہ سلطنت

کے آخری دور میں شاہی طبیب تھے اور انھیں ایک جاگیر بھی ملی تھی۔ اس خاندان کا سلسلہ نسب میزبان رسول ﷺ حضرت ایوب انصاری تک پہنچتا ہے۔ تاریخِ اسلام کی ایک معروف شخصیت حضرت خواجہ عبداللہ ہراتی بھی اس خاندان کے اجداد میں سے تھے۔ یہ خاندان کئی صدیاں پیشتر ہرات، افغانستان سے نقل مکانی کر کے ہندوستان آیا اور پانی پت اور خورجہ میں آباد ہوا۔

اقتدا حسن مرحوم اپنے محلے میں قرآن پاک ناظرہ ختم کرنے کے بعد وہیں ایک مکتب میں داخل ہوئے۔ تیسری جماعت کے بعد جے ایس ہائی سکول خورجہ میں داخلہ لیا، جہاں نویں تک تعلیم حاصل کی تقسیم کے وقت جب خورجہ میں ہندو مسلم فسادات عروج پر تھے ان کے والد نے انھیں گورنمنٹ ہائی سکول بلند شہر بھیج دیا۔ ۱۹۴۹ء میں انہوں نے الہ آباد تعلیمی بورڈ سے امتیازی طور پر میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۵۰ء میں وہ اپنے بڑے بھائی مجتبیٰ حسن کے ساتھ ہجرت کر کے پاکستان چلے آئے اور سرگودھا میں مقیم رہے۔ نامساعد حالات کی بنا پر کسی معروف کالج میں تعلیم کا سلسلہ جاری نہ رہ سکا، تاہم انھوں نے پرائیوٹ طور پر پنجاب یونیورسٹی سے ادیب عالم، ادیب فاضل، انٹرمیڈیٹ اور بی اے کی سندیں حاصل کیں۔ ۱۹۵۶ء میں انہوں نے یونیورسٹی اورینٹل کالج سے ایم اے اردو کیا اور پروفیسر ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کے زیرنگرانی ''اردو زبان اور شاعری کی نشوونما اور ارتقاء ۱۷۵۰ء تک'' کے موضوع پر مقالہ لکھا۔ ۱۹۵۷ء میں ان کا نام بطور ریسرچ سکالر کراچی یونیورسٹی میں رجسٹر کیا گیا تاکہ وہ اپنے لسانی تحقیقات کے سلسلے کو مزید آگے بڑھا سکیں لیکن یورپ روانگی کی وجہ سے یہ تحقیقی کام پایہ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔

ڈاکٹر اقتدا حسن نے اپنی تحقیقی و تعلیمی زندگی کا آغاز کراچی یونیورسٹی کے شعبہ تالیف و ترجمہ میں ۱۹۵۷ء میں ''معاون محقق'' کی حیثیت سے کیا۔ یہ ادارہ میجر آفتاب حسن کی زیرنگرانی قائم کیا گیا تھا۔ دو سال بعد ڈاکٹر صاحب عالمی شہرت کے حامل اطالوی مستشرق پروفیسر اے بوزانی کی دعوت پر نیپلز یونیورسٹی کے اورینٹل انسٹی ٹیوٹ میں اردو زبان و ادب کے لیکچرر کی حیثیت سے خدمات انجام دینے کے لیے اٹلی چلے گئے اور وہاں تدریس اردو کے علاوہ پروفیسر بوزانی کی زیرنگرانی تحقیقاتی سرگرمیوں میں مصروف رہے۔ نیپلز کا یہ تعلیمی ادارہ اٹلی میں مشرقی علوم کی قدیم ترین اور اس ملک کی واحد سرکاری جامعہ ہے جہاں ڈاکٹریٹ کی سطح تک اردو ادبیات کی تعلیمی و تحقیقی سہولتیں میسر ہیں۔ پروفیسر بوزانی وہ مشہور و معروف شخصیت ہیں جنھیں اردو کی عظیم الشان خدمات

کے سلسلے میں حکومتِ پاکستان کی طرف سے ''ہلالِ امتیاز'' کا تمغہ عطا کیا گیا۔

ڈاکٹر اقتدا حسن ۱۹۶۳ء میں پروفیسر ولفریڈ سمتھ کی دعوت پر ادارہ علومِ اسلامیہ، میک گل یونیورسٹی مانٹریال، کینیڈا تشریف لے گئے جہاں آپ نے ریسرچ ایسوسی ایٹ اور لینگویج ایکسپرٹ کے طور پر قابلِ قدر خدمات انجام دیں۔ وہ یہاں اردو زبان سے متعلق ایک عظیم منصوبے پر کام کرتے رہے جسے امریکی حکومت کے تعاون سے شروع کیا گیا تھا۔ بعد میں یہ تحقیقی مواد مانٹریال سے شائع ہوا۔

ایک سال بعد ڈاکٹر اقتدا حسن مشرقی السنہ و ادبیات کے پروفیسر کی حیثیت سے نیپلز یونیورسٹی میں واپس چلے آئے اور ۱۹۷۹ء تک اس عہدہ جلیلہ پر فائز رہے۔ اس دوران آپ نے حسبِ ذیل شعبوں میں استاد اور تحقیقاتی سرگرمیوں کے نگران کی حیثیت سے خدمات انجام دیں:

''اردو و ہندی زبان و ادب، پاکستان کی السنہ و ادبیات اور ادبیات فارسی (پاک و ہند میں)۔ ۱۹۶۹ء سے ۱۹۷۶ء تک اس یونیورسٹی میں آپ شعبۂ تاریخ ہند کے پروفیسر انچارج بھی رہے۔ اسی زمانے میں آپ اردو ادبیات اور تاریخ پاک و ہند کے پوسٹ گریجویٹ شعبے کے ڈائریکٹر بھی تھے اور ان کی زیرِ نگرانی ان شعبوں میں چالیس کے قریب پی ایچ ڈی کے مقالے کامیابی سے پایہ تکمیل کو پہنچے۔

ڈاکٹر اقتدا حسن نے ۱۹۶۷ء میں اردو (اردو ہندی میں) روم سے ڈاکٹر آف لٹریچر (D.Lit) کی ڈگری حاصل کی۔ یہ ڈگری آپ کے ۱۹۶۵ء تک کے مطبوعۂ تحقیق کام کی بنیاد پر عطا کی گئی۔ ۱۹۷۳ء میں آپ اس یونیورسٹی سے ڈاکٹر آف لٹریچر کی دوسری ڈگری کے حق دار قرار پائے جو ۱۹۶۶ء سے ۱۹۷۳ء کے مطبوعہ علمی و تحقیقی مواد کے سلسلے میں حسن کارکردگی اور پہلی ڈگری کی توثیق کے طور پر دی گئی۔

یورپ کے بعض ممالک مثلاً جرمنی، فرانس، آسٹریا، اٹلی اور ترکی میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری کا یہ انوکھا سسٹم رائج ہے۔ ترکی میں اسے ''دو چند'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ پہلی ڈگری تحقیقی کام پر دی جاتی ہے اور دوسری ڈگری دیتے وقت تحقیقی کام کے ساتھ پیشہ ورانہ اہلیت (یعنی تدریسی امور میں کام یابی) کا لحاظ بھی رکھا جاتا ہے۔ فرانس میں اسے ''اسٹیٹ ڈاکٹریٹ'' کہتے ہیں۔ ڈاکٹر اقتدا حسن بھارت اور پاکستان کے پہلے محقق تھے جنھیں یہ ڈگری

عطا ہوئی۔

اٹلی کے طویل قیام کے دوران ڈاکٹر صاحب کو پروفیسر بوزانی جیسے مسلمہ محققین استشراق کی رہنمائی حاصل رہی، جس کے طفیل جدید یورپی طریقہ تحقیق سے ان کی شناسائی ہوئی اور یورپ کے علمی حلقوں میں ان کا نام معروف ہوا۔ وہ ۱۹۶۴ء میں رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن فیلو منتخب ہوئے۔ اردو اور انگریزی کی طرح انھیں اطالوی زبان پر بھی عبور حاصل تھا۔ وہ فارسی، ہندی، ہسپانوی، فرانسیسی اور عربی زبانوں سے بھی اچھی خاصی واقفیت رکھتے تھے۔ انھیں کینیڈا، برطانیہ اور اٹلی کی شہریت کے حقوق بھی حاصل تھے، لیکن انھوں نے ایک لمحے کے لیے بھی پاکستانی شہریت کے حقوق سے دست برداری گوارا نہ کی۔ انھوں نے یورپ، ایشیا اور شرق اوسط کے بہت سے ملکوں کی سیاحت بھی کی۔

ڈاکٹر اقتدا حسن نے ۱۹۷۷ء میں خرابی صحت کی بنا پر اٹلی کو خیر باد کہا اور لاہور میں مقیم ہو گئے۔ انھوں نے اپنی سیاحت کا تذکرہ ''داستان چھوڑ آئے'' اور ''داستان ساتھ لائے'' کے عنوان سے کئی قسطوں میں اردو ڈائجسٹ کے مختلف شماروں میں (۸۲۔۱۹۷۸ء) میں تفصیل سے کیا ہے جو حلقہ قارئین میں بہت پسند کیا گیا۔ وہ ۸۲۔۱۹۸۰ء میں اردو ڈائجسٹ کے نائب مدیر کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دیتے رہے اور کچھ عرصہ پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف نیشنل افیئرز کے ایگزیکٹو ڈائریکٹر کے عہدے پر بھی فائز رہے۔

اقتدا حسن صاحب اپنے بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے۔ ان کے والد حکیم سید حسن اپنے دوسرے فرزند حکیم ارتضیٰ حسن کے ہم راہ ۱۹۵۳ء میں ملتان آئے اور دونوں وہاں مطب کرتے رہے۔ حکیم سید حسن نے ۹۳ سال کی عمر میں وفات پائی۔ اقتدا صاحب شفقت ماوری سے دس سال کی عمر میں محروم ہو گئے تھے اور اس محرومی کا احساس انھیں تا زندگی رہا۔ والدہ تعلم یافتہ نہ ہونے کے باوجود بچوں کی تعلم و تربیت کے معاملے میں بہت سخت تھیں اور اقتدا صاحب کے بقول ''اگر ان کی سخت نگرانی نہ ہوتی تو ہم بہن بھائی تعلیم حاصل نہ کر سکتے۔''

بچپن میں اقتدا صاحب بہت شریر اور کھیل کود کے شائق تھے، تاہم اللہ تعالیٰ نے ذہانت بدرجہ اتم دی تھی اور حافظہ غضب کا تھا۔ ان کے پسماندگان میں اہلیہ (سابق پروفیسر لاہور کالج، ان کا حال ہی میں انتقال ہو چکا ہے)، ایک بیٹی (لیڈی ڈاکٹر) اور ایک بیٹے عامر حسن ہیں جنھوں نے

سول انجینئر ہوتے ہوئے ۱۹۹۴ء میں مانچسٹر سے ایم اے اکنامکس کیا (آج کل قومی تاریخ وادبی ورثہ ڈویژن کے سیکرٹری کے عہدہ پر فائز ہیں)۔ مسز ثمینہ حسن، سیکرٹری قومی ادارہ برائے تحفظِ حقوقِ نسواں، ڈاکٹر اقتدا حسن کی بہو ہیں۔

ڈاکٹر اقتدا حسن کا نام تصنیف وتالیف کے میدان میں بڑی شہرت اور ناموری کا حامل ہے۔ مستقل تصانیف کے علاوہ ان کے علمی وتحقیقی مقالات پاکستان اور اٹلی کے مشہور مجلّات کی زینت بنے جن کی ایک جھلک فہرست درجِ ذیل میں دیکھی جاسکتی ہے:

بزبان انگریزی: اردو شاعری میں متاخر مغلوں کی نمائندگی (دوحصوں میں) اسماعیل میرٹھی، کتابیاتِ غالب، حیدری کی گلشن ہند۔ (مجلّہ۔ANNALI نیپلز، اٹلی)

واقعات اظفری (مجلّہ خاص بیادگار پروفیسر الیگزینڈر بوزانی نیپلز یونیورسٹی جرنل)

جرات کی بصارت سے محرومی (یادگاری مجلّہ، روم/نیپلز)

بزبان اردو:۔ شمالی ہند میں اصلاح زبان کی تحریک، میر ومرزا سے پہلے (انجمن اسلامیہ میگزین، کراچی، دوشمارے)

اسماعیل میرٹھی، حیدری کا تذکرہ گلشن ہند (سہ ماہی اردو، کراچی)

قائم چاندپوری کا شہرآشوب (سہ ماہی ادبی دنیا، لاہور)

محسن لکھنوی اور تذکرہ سراپا سخن (سہ ماہی صحیفہ، لاہور)

قائم چاندپوری: زندگی اور شاعری (اورینٹل کالج میگزین لاہور)

کتب:

کلیات قائم (دوجلدوں میں)، تذکرہ محزن نکات (ترقی ادب بورڈ، لاہور)

تذکرہ سراپا سخن (اظہار سنز، لاہور)

کلیات جرات (تین جلدوں میں۔۔۔۔ اورینٹل انسٹی ٹیوٹ، نیپلز یونیورسٹی)

اردو کورس (تین اجزاء)

اردو صحافت، جدید اردو شاعری کا مطالعہ۔ (آخری تینوں کتابیں، ایک ریسرچ پراجیکٹ کے طور پر تصنیف ہوئیں، جب ڈاکٹر صاحب میک گل یونیورسٹی میں مدعو تھے اور بعد میں یونیورسٹی پریس، مانٹریال سے امریکی حکومت کے زیر اہتمام طبع ہوئیں۔)

مغلیہ دور زوال اور اردو ادب (فیروز سنز، لاہور)

تاریخ مغلیہ (یہ انگریزی تصنیف ڈاکٹر صاحب کی علالت اور بالآخر وفات کے باعث نامکمل رہی)

مضامین مطبوعہ در ماہنامہ اردو ڈائجسٹ:

☆ داستان چھوڑ آنے (سفرنامہ) مئی ۱۹۷۸ء تا اگست ۱۹۷۸ء چار اقساط میں۔

☆ اپنوں کی گھاتیں (پاکستانی یونیورسٹیوں کے پرلطف تجربات، اکتوبر ۱۹۷۸ء)

☆ آیت اللہ خمینی (ایران میں اسلامی انقلاب دسمبر ۱۹۷۹ء)

☆ کشمکش حیات (چرچل کے ذاتی معالج لارڈ موران کا روزنامچہ جنوری ۱۹۸۰ء)

☆ کیسنجر کا خفیہ دورہ چین (میرے وائٹ ہاؤس کے شب وروز) مارچ ۱۹۸۰ء

☆ جنگ ۱۹۷۱ء کے انکشافات (وائٹ ہاؤس کے شب وروز۔۔ ہنری کیسنجر) جون ۱۹۸۰ء

☆ اندرا نکسن مذاکرات کی رام کہانی جولائی ۱۹۸۰ء

☆ مشرقی پاکستان کے آخری لمحات، اگست ۱۹۸۰ء

☆ داستاں ساتھ لائے (سفرنامہ) ستمبر ۱۹۸۰) نومبر ۱۹۸۰ء مارچ ۱۹۸۱، جولائی ۱۹۸۴، جون ۱۹۸۹ء اپریل ۱۹۹۴ء نومبر ۱۹۹۶ء۔

☆ امریکہ ہشیار باش (دی رینل وار: کیسنجر کی تلخیص) فروری ۱۹۸۱ء مارچ ۱۹۸۱ء

☆ کارلوس (پُراسرار دہشت پسند) مئی ۱۹۸۱ء

☆ شمع ہر رنگ میں (آپ بیتی) اگست ۱۹۸۱ء

☆ ایک اور فوجی انقلاب ستمبر ۱۹۸۱ء

☆ جب تاریخ نے آنکھ جھپکی (آغا شاہی) جنوری ۱۹۸۵ء

☆ شان استغنا (اسلامی زندگی) مئی ۱۹۸۵ء

☆ اک نقش بقا (ڈاکٹر سیّد عبداللہ) ستمبر ۱۹۸۶ء

☆ الیگزینڈر بوزانی مئی ۱۹۸۸ء

☆ ڈاکٹر عبدالقدیر خاں، اگست ۱۹۸۹ء

پروفیسر انجم رومانی

کرِن رُباب نقوی

انجم رومانی ۲۸۔ستمبر ۱۹۲۰ء کو سلطان پور لودھی (سابق ریاست کپورتھلہ، ہندوستان) میں پیدا ہوئے۔ ماں باپ نے ان کا نام فضل الدین تجویز کیا۔ان کی تعلیمی اسناد پر ان کا نام فضل الدین چغتائی اور شناختی کارڈ پر فضل الدین انجم جب کہ تاریخ پیدائش ۴ فروری ۱۹۲۰ء درج ہے۔

انجم رومانی کا تعلق چغتائی خاندان سے ہے۔ان کے آباؤ اجداد نے ۱۷۸۸ء کے قریب سلطان پور لودھی میں رہائش اختیار کی جو اس وقت کی ریاست کپورتھلہ کا مشہور شہر تھا۔انجم رومانی کے جدِّ امجد کا تعلق دہلی کے لال قلعے سے تھا۔۱۷۸۸ء میں غلام قادر روہیلہ نے شاہ عالم سے اپنے خاندان پر توڑے گئے ظلم وستم کا بدلہ لینے کے لیے دہلی کے لال قلعے پر قبضہ کر لیا اور شاہ عالم کے خاندان کو ذلیل ورسوا کیا۔غلام قادر کے ظلم وستم سے گھبرا کر چند شہزادے لال قلعے سے فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے۔ان شہزادوں میں ایک شہزادہ عبدالکریم تھا۔عبدالکریم نے افراتفری کے اس دور میں سلطان پور لودھی کے ایک باسی اسماعیل کے ہاں پناہ لی،لیکن کسی کو بھی یہ نہ بتایا کہ وہ شاہی خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔اسماعیل معماری کا کام کرتا تھا۔اس نے یہی کام عبدالکریم کو بھی سکھا دیا،جس کی عمر اس وقت سولہ سترہ برس تھی، بعدازاں اُس نے اس کی شادی بھی اپنے ہی خاندان میں کروادی۔اس طرح معماری کا کام انجم رومانی کا آبائی پیشہ ٹھہرا۔عبدالکریم کے ہاں پیدا ہونے والی اولاد کی صحیح تعداد کا تو علم نہیں ہوسکا۔ بہرحال ان کے ایک پوتے کا نام قادر بخش تھا۔قادر بخش کے دو بیٹے دولو اور الٰہی بخش تھے۔

الٰہی بخش کے تین بیٹے تھے۔امام دین، قطب الدین اور شہاب الدین۔قطب الدین کے ہاں واحد اولاد عطا محمد تھے۔عطا محمد کی شادی دولت بی بی سے ہوئی۔ وہ عالم فاضل خاتون تھیں۔ جب کہ عطا محمد بالکل اَن پڑھ تھے۔ان کے ہاں تین بیٹوں عزیز الدین،علم الدین اور فضل الدین نے جنم لیا۔فضل الدین (انجم رومانی) سب سے چھوٹے تھے۔عطاء محمد ۱۸۹۴ء میں پیدا ہوئے اور ۱۲ستمبر ۱۹۴۷ء کو شہید ہوئے۔

انجم رومانی کا بچپن نہایت پرسکون ماحول میں بسر ہوا۔ وہ بچپن ہی سے خاموش طبع اور سنجیدہ شخصیت کے مالک تھے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم پر مجیت ہائی سکول سلطان پور لودھی، ریاست کپورتھلہ سے حاصل کی۔میٹرک کے امتحان میں ان کا سینٹر کپورتھلہ میں بنا۔انجم رومانی نے ریاست میں پوزیشن حاصل کی اور میڈل کے حق دار قرار پائے۔۱۹۳۷ء میں ایف اے کے بعد انجم رومانی نے رندھیر کالج کپورتھلہ میں داخلہ لے لیا۔انجم رومانی اس دور میں ''ثاقب چغتائی'' کے نام سے لکھا کرتے تھے۔۱۹۳۹ء میں ایف اے کا امتحان انھوں نے درجہ اوّل میں پاس کیا اور مزید تعلیم کے لیے لاہور چلے آئے۔ یہاں آکر اسلامیہ کالج لاہور میں بی۔اے میں داخلہ لے لیا۔۱۹۴۱ء میں انھوں نے بی۔اے کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا اور اپنی ذاتی دلچسپی کی وجہ سے ریاضی میں آنرز کی ڈگری کا اعزاز بھی حاصل کیا۔انہیں اسلامیہ کالج میں ۴۲۔۱۹۴۱ء کے رول آف آنر سے بھی نوازا گیا۔۱۹۴۱ء میں انھوں نے اسلامیہ کالج کے شعبہ ریاضیات میں ایم اے میں داخلہ لیا۔۱۹۴۳ء میں انھوں نے ریاضیات میں ماسٹر کی ڈگری نمایاں کامیابی لے کر حاصل کی۔ ۲۳ستمبر ۱۹۴۴ء کو بطور صدر شعبہ ریاضی، اسلامیہ کالج جالندھر میں ان کا تقرر ہوا۔اس کالج میں وہ ۱۳جولائی ۱۹۴۷ء تک رہے۔ قیام پاکستان سے ایک ماہ قبل ان کا تقرر پنجاب یونیورسٹی لاہور کے شعبہ فلکیات میں ہوا۔ جب یہ بات واضح ہوئی کہ مسلمانوں کی اکثریت کے باوجود جالندھر پاکستان میں شامل نہ ہوسکے گا تو آپ نے جالندھر کی ملازمت پر لاہور کو ترجیح دی اور پنجاب یونیورسٹی لاہور چلے آئے۔۱۴جولائی ۱۹۴۷ء کو ان کا تقرر شعبہ فلکیات میں ہوا۔ جہاں وہ ۱۹اکتوبر ۱۹۴۷ء تک تعینات رہے۔اس کے بعد وہ گورنمنٹ ملازمت میں چلے گئے اور ایمرسن کالج ملتان میں بطور لیکچرار ریاضی ۱۰۔اکتوبر ۱۹۴۷ء کو ان کا تقرر ہوا۔ وہاں وہ ۲۵ فروری ۱۹۴۸ء تک رہے۔ یہاں سے ان کی ٹرانسفر گورنمنٹ کالج

منٹگمری (موجودہ ساہیوال) میں کر دی گئی۔ اس کالج کے پرنسپل ڈاکٹر جہانگیر خان تھے۔ انجم رومانی یہاں سے صرف سات ماہ بعد ۳ ستمبر ۱۹۴۸ء کو استعفیٰ دے کر واپس لاہور چلے گئے۔ اس کے بعد دیال سنگھ کالج کے پرنسپل سیّد عابد علی عابدؔ نے انھیں اپنے کالج میں ملازمت کی دعوت دی جو انھوں نے قبول کر لی۔ دیال سنگھ کالج ان دنوں پرائیویٹ کالج ہوا کرتا تھا۔ یہاں وہ یکم اکتوبر ۱۹۴۸ء کو بطور صدر شعبہ ریاضی تعینات ہوئے اور ۱۹۷۲ء تک اسی عہدے پر فائز رہے۔ ۱۹۷۲ء میں انھیں وائس پرنسپل کے عہدے پر ترقی دے دی گئی۔ اس عہدے پر وہ ۱۱ جنوری ۱۹۷۷ء تک فائز رہے۔ پھر ان کی خدمات شعبہ ریاضی کے صدر کی حیثیت سے اسلامیہ کالج سول لائنز (پرانا ڈی۔اے۔وی کالج) کے سپرد کر دی گئیں۔ تین سال تک وہ اس عہدے پر فائز رہے اور یوں ۴ جنوری ۱۹۸۰ء میں ان کی ملازمت کا دور اختتام پذیر ہوا۔ اپنی وفات سے کچھ عرصہ پہلے تک وہ پنجاب یونیورسٹی کے Space Science کے شعبے میں ہفتے میں پانچ دن تک لیکچر دیتے رہے۔

انجم رومانی کی شخصیت جن خوبیوں سے ترتیب پاتی ہے۔ ان میں سب سے نمایاں خصوصیت ان کی اصول پسندی ہے اور اصولوں پہ سمجھوتہ وہ بالکل پسند نہیں کرتے تھے۔ تمام عمر انھوں نے اپنے اصولوں کی پاسداری میں گزار دی اور ان اصولوں کی آبیاری نوخیز جذبوں کی طرح کرتے رہے۔ جن اصولوں پر انھوں نے اپنی زندگی کی بنیاد رکھی اسے عمر بھر نبھایا۔

انجم رومانی صاحب کی شادی محترمہ سعیدہ اختر صاحبہ سے انجام پائی۔ شادی کے بعد ایک فرزند سرود انجم اور ایک دُختر یاسمین انجم نے اس خاندان کو مکمل کر دیا۔ سرود انجم آرٹسٹ ہیں اور فن پارے تخلیق کرتے ہیں، اُن کے فن پاروں کی نمائش قومی اور بین الاقوامی سطح پر منعقد ہوتی رہتی ہیں۔ جبکہ بیٹی یاسمین انجم جاوید، نامور شاعر، محقق، اور مزاح نگار پروفیسر ڈاکٹر انعام الحق جاوید کی زوجہ ہیں۔ جن کی مرتبہ کُتب میں کلیات انجم رومانی بھی شامل ہے۔ ۱۳ اپریل ۲۰۰۱ء کو انجم رومانی نمازِ فجر کے وقت اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے۔ ان کی تدفین قبرستان گلشن راوی لاہور میں کی گئی۔

انجم رومانی کی ادبی زندگی کا نفسیاتی پسِ منظر علم و ادب کا وہ گھرانہ تھا جس کا ہر فرد صوفی منش ہونے کے ساتھ شعر و شاعری سے خاص شغف رکھتا تھا۔ بطور خاص ان کے نانا، ماموں،

والد اور والدہ کے ماموں، سبھی کا رجحان ادب خصوصاً شاعری کی جانب بہت زیادہ تھا۔ اپنی ابتدائی تعلیم کے دوران ہی انجم رومانی کے اندر شعر و ادب سے گہری دلچسپی اور وابستگی پیدا ہو گئی تھی۔ انجم رومانی کا تعلق ایک پڑھے لکھے مذہبی گھرانے سے تھا۔ ان کے والد عطا محمد بھی صوفی صفت انسان تھے۔ تصوف سے ایسا خصوصی لگاؤ انھیں اپنے اجداد سے ورثے میں ملا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں انھوں نے نعت کمال کی کہی۔ تصوف کا رنگ انجم رومانی کی شخصیت پہ اتنا گہرا تھا کہ اگر اسے ان کی شخصیت سے نفی کر دیا جائے تو شاید باقی کچھ نہ بچے۔ یہی تصوف ان کی زندگی کو ہی نہیں تمام شاعری کو بھی اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے ہے۔

قیام پاکستان سے پہلے انجم رومانی کی طبیعت پہ اختر شیرانی نے بہت گہرا اثر ڈالا۔ وہ اختر شیرانی سے اس قدر متاثر ہوئے کہ ان کے پرچے ''رومان'' کی مناسبت سے اپنا قلمی نام انجم رومانی رکھ لیا۔ پھر آزاد نظم کی طرف بڑھے کہ اس زمانے میں آزاد نظم میراجیؔ اور راشدؔ کے ہاتھوں نت نئے تجربات سے ہمکنار ہو رہی تھی۔ انجم رومانی نے بھی اس میدان میں قدم رکھا۔ انجم رومانی جہاں دوسروں کی تخلیقات پہ قلم زنی سے باز نہیں آتے تھے۔ وہاں اپنی تخلیقات کو بھی اس سان پہ چڑھا دیتے۔ انجم رومانی ہمہ جہت شاعر تھے۔ تقریباً ہر صنف سخن میں قلم آزمائی کی اور کامیاب قرار پائے کیوں کہ وہ بہترین سے کم پہ راضی ہوتے ہی نہ تھے۔

''ثنا اور طرح کی'' انجم رومانی کے نعتیہ مجموعہ کلام کا نام ہے جس میں نعتوں کے ساتھ چند سلام بھی شامل ہیں۔ انجم رومانی کی مذہبی وابستگی آگے جا کر ان کی نعت گوئی میں کمال مہارت کا باعث بنی۔ مذکورہ کتاب میں بعض نعتیں تو ایسی ہیں جو ان کی واردات قلبی اور عشق نبیؐ کے شدید جذبات کی مظہر ہیں۔ نعت کہتے ہوئے انجم رومانی مکمل طور پر ایک بے خودی کی کیفیت میں ہوتے ہیں جہاں وہ نعت ارادتاً نہیں کہتے بلکہ یوں لگتا ہے جیسے ان سے نعت کہلوائی جا رہی ہے۔

''کوئے ملامت'' ان کی غزلوں کا پہلا مجموعہ ہے۔ انجم رومانی کی غزل کے موضوعات میں زندگی سے پیار اور زندگی سے فرار دونوں شامل ہیں۔ ان کی غزلوں میں معاشرتی مسائل کی عکاسی بھی بخوبی ہوتی ہے۔ ''پس انداز'' ان کی نظموں کا پہلا مجموعہ ہے۔ ترقی پسند تحریک کی بے باکیاں، فطرت، روایت سے انحراف قطعی پسند نہیں آیا تھا۔ اسی لیے ان کی نظم صاف احتجاج کرتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ ''دُنیا کے کنارے سے'' انجم رومانی کی آزاد نظموں کا مجموعہ ہے، جو پہلی مرتبہ ۱۹۹۸ء میں منظر

عام پر آیا۔ انجم رومانی کی نظمیں آزاد نظم کے تمام تر تقاضے پورے کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ تخیل کی بلند پروازی انہیں تخلیق کے دشوار گزار راستوں سے بھی نہایت کامیابی سے گزارتی ہے اور لفظوں کو ان کے رائج معنی کے علاوہ ان کی روح کی گہرائیوں تک جا کر جانچتے ہیں۔ شاید اس مجموعہ کلام کے دیر سے منظر عام پر آنے کی وجہ بھی یہی تھی کہ خوب سے خوب تر کی تلاش انھیں لفظوں کی بھول بھلیوں میں ایک عالم حیرت میں لیے پھرتی ہے۔ وہ نہایت سادہ لفظ چنتے ہیں اور نہایت سیدھے مصرعے بنتے ہیں جن پر خود لفظ بھی سر دھنتے ہیں۔ انجم رومانی لفظوں کو برتنے کا ہنر تو جانتے ہیں۔ لیکن لفظوں سے کھیلنا انھیں نہیں آتا۔ وہ نہایت سادگی سے اپنی سادہ فطرت کے عین مطابق آزاد نظم کی بے جا آزادی کو دائرہ اختیار میں لے آتے ہیں۔ آزاد نظم کہنے میں تو شاید آسان محسوس ہو لیکن اس کی روح کی تازگی کو مجروح نہ ہونے دنیا ہی دراصل اصل فنکاری ہے اور آزاد نظم لکھنے سے پہلے اس کے تمام تر اسلوب کا گہرا مطالعہ اور مشاہدہ از حد ضروری ہے۔ تبھی اس کو اس کی تمام تر خوب صورتی کے ساتھ قلمبند کیا جا سکتا ہے اور انجم رومانی یہ فن جانتے ہیں۔ ''اقبال کا منتخب فارسی کلام۔۔۔ منظوم اردو ترجمہ'' ان کی کلام اقبال کے اردو ترجمے پر مشتمل کتاب ہے۔ انجم رومانی نے مذکورہ کتاب میں کلیات اقبال (فارسی) میں سے پیام مشرق اور زبور عجم کے چند صفحات کا ترجمہ منظوم شکل میں کیا ہے۔

ان کی صاحبزادی یاسمین انجم جاوید نے لکھا ہے:

''ابو نے اپنی ساری زندگی ان زرّیں اصولوں کے مطابق گزاری جو اب صرف کتابوں تک محدود ہو کر رہ گئے اور اس کے باعث بے شمار نقصانات اٹھائے۔ طرزِ بود و باش کے اعتبار سے وہ بلاشبہ ایک منفرد شخص تھے۔ ہمیشہ سچ اور حق کا ساتھ دیتے اور اس سلسلے میں کسی دوستی، تعلق، رشتے، خوف اور لالچ کو آڑے نہ آنے دیتے۔ رفتارِ زمانہ کے حساب سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ دوست دار تو تھے اور دوستوں سے محبت بھی بہت کرتے تھے مگر دوست نواز نہیں تھے اور کسی کو ناجائز فائدہ پہنچانے کی بجائے ہر بات کا فیصلہ میرٹ پر کرتے تھے۔ بدلے میں دوستوں کی طرف سے بھی انہیں جو کچھ ملا وہ میرٹ پر ہی ملا۔ اس میں خصوصی تعلق داری کام نہ آ سکی۔ بحیثیت استاد بھی انہوں نے استادی کا پورا حق ادا کیا۔ جو علم ان کے پاس تھا اسے ایک فرض سمجھ کر اپنے طلبہ کو منتقل کیا۔ اسلامیہ کالج سے بطور وائس پرنسپل ریٹائرڈ ہونے کے بعد جب انہیں Pension نہ ملی کہ کالجوں کے نیشنلائز ہونے کے بعد ان کی سرکاری سروس کم بنتی تھی، تو انہوں نے گھر میں میتھ کی کلاسیں لینا شروع کر دیں۔

اس موقع پر بھی انہوں نے قناعت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ صرف چھ سات لڑکوں کے گروپ کو پڑھاتے۔ غریب طلبہ کا خاص خیال رکھتے اور امیر طلبہ سے بھی ان کی حیثیت کے مطابق نہیں بلکہ اپنی ضرورت کے مطابق فیس لیتے۔ جن دنوں ایم ایس سی، بی ایس سی وغیرہ کے پیپر چیک کر رہے ہوتے اس خیال سے ملنا جلنا اور گھر سے باہر نکلنا ترک کر دیتے کہ مبادا کوئی نمبر بڑھانے کے لیے نہ کہہ دے۔ ایک مرتبہ ڈاکٹر انعام الحق جاوید (میرے شوہر اور انجم صاحب کے اکلوتے داماد) نے قدیر شیدائی کے کہنے پر کسی طالب علم کے نمبر بڑھانے کی سفارش کر دی۔ اس وقت ابو اپنے کمرے میں پرچے مارک کر رہے تھے۔ وہ پہلے تو خاموش رہے اور پھر آہستہ سے بتا دیا کہ یہ بات میرے مزاج کے خلاف ہے۔ تھوڑی دیر میں جمعے کا وقت ہو گیا اور ابو مسجد چلے گئے۔ ڈاکٹر انعام چپکے سے ان کے کمرے میں گئے کہ یہ ہی دیکھ لیں کہ اس لڑکے کے کتنے نمبر ہیں لیکن وہاں جا کر انہیں سخت مایوسی کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ انجم صاحب تمام پرچے الماری کے سپرد کر کے اور اسے موٹا سا تالا لگا کر جمعہ پڑھنے گئے تھے۔ اصول پرستی اور اس کے لیے ایسی احتیاط پسندی ان کی زندگی کا عام چلن تھا۔ احتیاط پسندی کا ذکر آیا ہے تو یہ بتاتی چلوں کہ وہ خوفزدگی کی حد تک محتاط شخص تھے۔ ان کی چھٹی حِس انہیں آنے والے خطرات سے ہمیشہ آگاہ رکھتی تھی اور وہ اس کی پیش بندی کر کے ہی ہر قدم اٹھاتے تھے۔ آخری عمر میں جب قویٰ مضمحل ہو گئے تو یہ عادت مزید سخت راسخ ہو گئی۔ جو مسئلہ ان کے ذہن میں آ جاتا، اڑ کر رہ جاتا۔ انہیں خود بھی اس کا احساس تھا لیکن انہیں اپنے آپ پر اختیار نہیں تھا۔ وہ شروع ہی سے بہت حسّاس تھے۔ ۱۹۷۱ء میں جب ملک دو ٹکڑے ہو گیا تو اس کا انہوں نے اتنا اثر لیا کہ اس صدمے کو ساری عمر نہ بھلا سکے۔ پس منظر یہ تھا کہ انہوں نے پاکستان بنتے دیکھا تھا اور اس کے لیے اپنے خاندان کی قربانی دی تھی۔ ان کے والد، والدہ اور ایک بھائی شہید کر دیے گئے تھے۔ ۱۹۷۱ء کے بعد سے ان کی زندگی درویشی میں بدلتی چلی گئی۔ نفاست پسند تو شروع سے ہی تھے، ہاتھ کو ذرا سی مٹی لگ جاتی تو دس بار دھوتے مگر اب صرف سادگی پسند رہ گئے تھے۔ جز رس نہیں تھے مگر سوچ سمجھ کر خرچ کرنے والوں میں سے تھے۔ گھر کا سودا سلف خود لاتے، روزانہ کا باقاعدہ حساب کتاب رکھتے اور مہینے کے آخر میں اس کا ٹوٹل کر کے خود ہی آڈٹ کر کے دیکھتے کہ انہوں نے جو ماہانہ تخمینہ بنایا تھا خرچ اس کے مطابق ہوا ہے یا نہیں اور پھر خاموشی سے کاپی ایک طرف رکھ کر اگلے مہینے کے لیے نئی کاپی نکال لیتے

۔ساری عمر کسی کا احسان نہیں اٹھایا۔صرف اپنے زورِ بازو پر اکتفا کیا۔رسم ورواج اور لین دین کے خلاف تھے۔ بیٹے کی شادی کی تو جہیز لینے سے باقاعدہ انکار کر دیا۔ وفات سے قبل وصیت کر گئے کہ سوم اور چہلم نہ کیا جائے۔تحفہ آسانی سے قبول نہیں کرتے تھے بلکہ سرے سے ہی قبول نہیں کرتے تھے۔صرف اس خیال سے پتہ نہیں کس قسم کی آمدنی کا ہو اور کس مقصد کے لیے پیش کیا جا رہا ہو۔خدا ترس اور سچے مسلمان تھے۔ پانچ وقت نماز اور دو وقت قرآن خوانی روزانہ کا معمول تھا۔ بھائی (سرور انجم) کے بچوں عمر، عثمان اور آمنہ کو خود ہی قرآن پڑھایا۔ ہر چند کہ انہوں نے سائیکل موٹر سائیکل اور کار کا زمانہ دیکھا مگر سفر ہمیشہ ویگنوں اور بسوں میں ہی کیا۔ پیدل چلنے کو ترجیح دیتے تھے۔سحر خیز تھے۔صبح اُٹھ کر ہلکی پھلکی ورزش بھی ضرور کرتے۔انڈیا کے سخت خلاف تھے اور پاکستان سے محبت کو اپنی زندگی کا اثاثہ سمجھتے تھے۔چنانچہ ہمارے گھر میں امرتسر ٹی وی، دُوردرشن اور انڈین فلمیں مکمل طور پر بین تھیں اور وہ اس پر کڑی نگاررکھتے تھے‘‘۔

(سعداللہ شاہ (مرتب): منتخب کلام؛ انجم رومانی، ۲۰۱۷ء، نیشنل بُک فاؤنڈیشن اسلام آباد، ص ۲۱ تا ۲۴)

ڈاکٹر انعام الحق کوثر

فیصل ریحان

یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ دنیا میں تعمیری انقلاب اور مثبت تبدیلی لانے میں استاد کا کردار ہمیشہ منفرد اور ممتاز رہا ہے۔ ہر ملک اور قوم کی اصلاح میں استاد ایک نہایت موثر قوت بن کر سامنے آئے ہیں۔اسی لیے استاد کا رتبہ سب سے بڑا ہے اور اسے نہایت تعظیم کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ بلوچستان کے معروف محقق اور استاد ڈاکٹر انعام الحق کوثر کا شمار بھی ایسے لوگوں میں ہوتا ہے۔ بلوچستان میں تعلیم و تدریس اور تصنیف و تحریر کی ترویج و اشاعت میں ان کا کردار بنیادی ہے۔ بلوچستان، پاکستان کے باقی صوبوں کے مقابل آج بھی تعلیم کے شعبے میں بہت پیچھے ہے وہاں جو تھوڑی بہت شرح تعلیم ہے، اس میں ڈاکٹر انعام الحق کوثر کی خدمات کا بڑا عمل دخل ہے وہ نہ صرف خود ایک بہت اچھے استاد تھے، بلکہ مختلف اعلیٰ سرکاری عہدوں پر فائز رہ کر تعلیم کی ترویج و اشاعت میں بھی شامل رہے۔متعدد تصنیفات و تالیفات کے باعث بلوچستان میں تحقیق کے شعبے میں سب سے نمایاں کام انھی کا ہے، جو دوسروں کے لیے ایک عمدہ مثال ہے، یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ انھوں نے تن تنہا کئی اداروں کے برابر کام کیا ہے۔وہ ساری زندگی تعلیم و تدریس اور انتظامی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ اپنے بنیادی کام یعنی تحقیق و تنقید میں مشغول رہے۔

ڈاکٹر انعام الحق کوثر مشرقی پنجاب کے ایک اہم علاقے جالندھر کی تحصیل نکودر میں ۱۹۳۱ء کو پیدا ہوئے۔انھوں نے اپنی ابتدائی تعلیم اپنے علاقے ہی میں حاصل کی، ایف۔اے اور بی۔اے پنجاب یونیورسٹی سے پرائیویٹ، جبکہ ایم۔فارسی ریگولر کیا۔بعد میں پنجاب یونیورسٹی ہی سے انھوں نے فارسی میں پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی۔فارسی میں ایم۔اے کرنے کے فوراً بعد

ہی وہ کوئٹہ کے کالج میں فارسی کے لیکچرر تعینات ہوئے، جہاں ان کے بڑے بھائی انور رومان پہلے ہی تاریخ کے لیکچرر مقرر ہو چکے تھے۔ انعام الحق کوثر ۱۹۴۸ء میں کوئٹہ آئے اور پھر ہمیشہ کے لیے یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ دونوں بھائیوں نے بلوچستان میں علم ادب کی ترویج کے لیے خود کو گویا وقف کر دیا۔ ان کے شاگردوں کی تعداد سینکڑوں میں نہیں ہزاروں میں ہے۔ بلوچستان کے کئی نمایاں شاعر، محقق، ادیب، اساتذہ، بیوروکریٹ، سیاستدان اور وکلاء ان کے شاگردوں میں سے ہیں۔

ڈاکٹر انعام الحق کوثر کوئٹہ سمیت بلوچستان کے مختلف شہروں کے کالجز میں ایک بڑا عرصہ استاد اور پرنسپل کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ ۱۹۸۵ء میں انھیں ناظم تعلیمات ادارہ نصابیات و مرکز توسیع محکمہ تعلیم، بلوچستان بنا دیا گیا۔ ان کی علمی و ادبی خدمات اور ان کے علم و تجربے سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی خاطر انھیں یہ عہدہ پیش کیا گیا تاکہ وہ بلوچستان میں تعلیم کے فروغ کے لیے اپنا کردار زیادہ بہتر طور پر ادا کر سکیں، اور ان کی صلاحیتیں صوبے میں تعلیم کی بہتری میں مددگار ہوں۔ عرصہ دراز سے محکمہ تعلیم سے وابستگی کی بناء پر وہ اس کی خوبیوں اور خامیوں پر گہری نظر رکھتے تھے، مسائل کے ادراک اور ان کے حل کیلئے مختلف تجاویز بھی رکھتے تھے۔ لہٰذا یہ ذمہ داری انہیں سونپ دی گئی۔

بلوچستان کے طلبہ میں علم کی تلاش اور جستجو کا جذبہ پیدا کرنے اور انھیں علم و ادب کی طرف راغب کرنے کے جتنے بھی ذرائع دستیاب ہوئے، ڈاکٹر کوثر نے ان کا بھرپور استعمال کیا۔ نصاب کی تدوین و ترتیب، اور اصلاح کے ساتھ ساتھ انھوں نے پوری توانائی کے ساتھ سکولوں اور کالجوں کی سطح پر نیم نصابی اور ہم نصابی سرگرمیوں کو رواج دیا۔ مختلف سائنسی نمائشیں منعقد کیں، تحریری و تقریری مقابلے کرائے، حسن قرأت اور حسن نعت کی مجالس کا اہتمام کیا۔ ڈاکٹر انعام الحق کوثر کی ان غیر نصابی سرگرمیوں کے باعث بلوچستان کے طلبہ میں پاکستان، اسلام، علامہ اقبال اور قائداعظم سے محبت و عقیدت کا رشتہ استوار ہوا۔ ان کے سینکڑوں شاگرد نہ صرف بلوچستان بلکہ پاکستان بھر میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے اور ان کا علم و ادب سے بھی مضبوط تعلق قائم رہا اور وہ اپنی کامیابیوں اور کامرانیوں کا سہرا اپنے اس عظیم استاد کے سر باندھتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے طلبہ میں تعلیم کا شوق پیدا کرنے کے لیے جو سائنسی نمائشیں منعقد کرائیں اس کے

بارے میں ان کے ایک رفیق لکھتے ہیں:

> ''مجھے ڈاکٹر صاحب کا چیئرمین نصابیات کا زمانہ کبھی نہیں بھولے گا۔ ڈاکٹر صاحب کا تعلق اگرچہ آرٹس ادب سے تھا تاہم آپ نے اپنی چیئرمین شپ کے زمانے میں ہر جگہ نہایت مشکلات کے باوجود کامیاب ترین سائنسی نمائشیں منعقد کروائیں۔ ڈاکٹر صاحب کے بعد بلوچستان میں کسی نے بھی آج تک سائنسی نمائش کا اہتمام پھر کبھی نہیں کرایا۔''[۱]

ڈاکٹر انعام الحق کوثر کے دور کی یہ تعلیمی نمائشیں نہ صرف بلوچستان بلکہ ملک بھر میں مشہور ہوئیں۔ وہ مسلسل نو سال تک یہ نمائشیں منعقد کراتے رہے جن میں صوبہ بھر کے طلبہ اور اساتذہ اپنی اختراعی اشیاء نمائش کے لیے پیش کرتے اور انعام پاتے۔ ڈاکٹر صاحب ان نمائشوں میں کامیاب ہونے والے طلبہ کو اپنی کتب بھی بطور انعام دے کر ان کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ ان نمائشوں کے انعقاد کے لیے مرکزی حکومت پچاس ہزار روپے کی رقم فراہم کیا کرتی تھی لیکن چونکہ یہ نمائشیں مختلف سکولوں میں اور مختلف علاقوں میں ہوا کرتیں ان پر کثیر سرمایہ خرچ ہوتا۔ یہ ڈاکٹر صاحب کے حسن انتظام کی صلاحیت تھی کہ وہ اس ادنیٰ رقم سے ایسی نمائشیں منعقد کرانے میں کامیاب رہتے اور پھر ہر نمائش سے پہلے بروشر اور بعد میں تفصیلی رپورٹ کی اشاعت ہوا کرتی تھی۔ اس سے تعلیمی اداروں کو راہنمائی اور آگاہی حاصل ہوتی اور ان میں آئندہ ہونے والی نمائشوں میں شرکت کا جذبہ پیدا ہوتا، جس سے تعلیمی اداروں کی کارکردگی پر نہایت اچھے اثرات مرتب ہوتے۔ مسابقت کا جذبہ انھیں تعلیم کی طرف راغب کرتا اور ان کی توجہ علم اور سائنس کی طرف پہلے سے زیادہ ہو جاتی۔ یہ ڈاکٹر انعام الحق کوثر کا بلوچستان کے طلبہ پر ایسا اکرام ہے کہ جس کی مثال نہیں ملتی۔ انھوں نے صحیح معنوں میں استاد ہونے کا حق ادا کر دیا۔ ان کے ایک اور ماتحت اس بارے میں رقمطراز ہیں:

> ''مجھے ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ادارہ نصابیات کوئٹہ میں ماہر مضمون کی حیثیت سے کام کرنے کا اعزاز حاصل ہے۔ ڈاکٹر صاحب ادارے کے ناظم بلکہ یوں کہیے کہ روح رواں تھے۔ بلوچستان کے کسی بھی دور افتادہ علاقے میں تربیتی کورس ہو رہا ہوتا یا سائنسی نمائش، شرکائے کورس اور اراکین نمائش ڈاکٹر صاحب کو اپنے قریب

محسوس کرتے تھے۔ آپ کے تحت ہر فرد پوری تندہی سے تفویض کردہ فرائض کی ادائیگی میں مصروف رہتا اور ایسا کسی خوف کی وجہ سے نہ تھا۔''[۲]

بلوچستان کے طول وعرض میں ہونے والی ان سائنسی نمائشوں کے طلبہ پر مثبت اثرات مرتب ہوئے اور ان سے طلبہ وطالبات کی اختراعی صلاحیتیں اور تخلیقی جوہر کھل کر سامنے آئے۔ جس نے مجموعی تعلیمی ماحول میں مثبت تبدیلی لانے اور اسے بہتر بنانے میں مدد کی۔ اس طرح ڈاکٹر کوثر صرف نام کے یا صرف نظریے کے طور پر ہی ماہر تعلیم نہ رہے بلکہ وہ ایک ایسے منفرد، عملی اور سرگرم ماہر تعلیم بن کر سامنے آئے، جنھوں نے صوبے کی تعلیمی صورتحال کو یکسر بدل کر رکھ دیا۔ وہ گنتی کے ان چند لوگوں میں سے ایک ثابت ہوئے جن کے نظریات اور اعمال میں بُعد نہیں پایا جاتا۔

ڈاکٹر محمد انعام الحق کوثر کی توجہ صرف طلبہ پر ہی مرکوز نہ تھی، نہ ہی انھوں نے اپنا سارا وقت صرف سائنسی نمائشیں منعقد کرانے میں گزارا۔ وہ بخوبی یہ جانتے تھے کہ تعلیم کے عمل میں طلبہ اور اساتذہ یکساں اہمیت رکھتے ہیں اور بہترین اساتذہ ہی اچھے طالب علم پیدا کر سکتے ہیں۔ تعلیمی پسماندگی کا حامل صوبہ ہونے کے باعث وہ بلوچستان کے اساتذہ اور ان کے معیار تدریس کے بارے میں کسی غلط فہمی کا شکار نہ تھے۔ وہ اس پہلو پر گہری نظر رکھتے تھے اور جانتے تھے کہ تعلیمی صورتحال میں بہتری لانے کے لیے اساتذہ کی تربیت ازبس ضروری ہے۔ انھوں نے اپنی توجہ اس امر پر مرکوز کی اور اساتذہ کی ٹریننگ اور تجدید تعلیم وتدریس کے کئی پروگرام بنائے اور ان پر عمل کرایا۔ اس مقصد کے حصول کی خاطر انھوں نے ادارہ نصابیات اور توسیع تعلیم کے ڈائریکٹر بننے کے بعد بلوچستان کے غیر تربیت یافتہ اساتذہ کے لیے مختلف ہائی اسکولوں میں کورسز ترتیب دیے۔ بہت سے اساتذہ کو تربیت دینے کے بعد انھیں بلوچستان کے مختلف سکولوں میں پھیلا دیا تاکہ وہ بچوں کی تعلیم وتربیت میں اپنا صحیح کردار ادا کر سکیں۔ ہر ایلیمنٹری کالج میں مضامین کے ماہر اساتذہ کی تقرری کی گئی اور پھر ان کی زیر نگرانی سمعی و بصری معاونات تیار کر کے بلوچستان کے تمام پرائمری سکول اساتذہ کو تربیت دی جانے لگی تاکہ وہ اپنے اپنے اسکولوں میں جا کر چھوٹے بچوں کو صحیح تعلیم دے سکیں۔ ان ماہرین اساتذہ میں اپنے مقصد سے لگن کا جذبہ پیدا کرنے کے لئے ایک اور قدم اٹھاتے ہوئے ان اساتذہ کے لیے صلہ کے طور پر انعام اور گولڈ میڈل رکھے گئے تاکہ ان کی توجہ اپنے مقصد پر رہے اور وہ پوری کوشش اور انہماک سے اپنے کام میں مصروف رہ کر صوبے کی

علمی تشنگی دور کر سکیں۔ ڈاکٹر انعام الحق کوثر نے اوائل عمر سے ہی سخت محنت کی عادت اپنا لی تھی جو تمام عمر ان کے ساتھ رہی انھوں نے قائداعظم کے قول کام، کام اور صرف کام کو حرز جاں بنا لیا تھا اور یہی ان کا ماٹو تھا۔ انہوں نے بلوچستان کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنے کے لیے ان تھک کوشش کی وہ نہ خود آرام کرتے نہ دوسروں کو آرام سے بیٹھنے دیتے بلکہ ہر وقت اپنے ساتھ دیگر لوگوں کو بھی مصروف کار رکھتے۔ چنانچہ توسیع تعلیم کا جتنا کام ان کے دور میں ہوا پھر کبھی نہ ہوا۔ ان کے ایک ہم منصب کہتے ہیں:

''ادارہ نصابیات کے ناظم کے طور پر آپ نے اساتذہ کے تربیتی پروگراموں کو نہ صرف وسیع تر بنیادوں پر استوار کیا بلکہ انھیں جدید تقاضوں سے پوری طرح ہم آہنگ کیا۔ تربیتی پروگراموں میں بذات خود شریک ہوتے اور اس سلسلے میں آپ صوبے کے دور دراز مقامات تک بھی گئے اور اساتذہ میں پیشہ ورانہ لگن پیدا کرنے کے لیے ان میں گھل مل جاتے اور ان سے مخاطب ہوتے ہوئے عالمانہ گفتگو کی بجائے ان کی علمی سطح کے مطابق باتیں کرتے۔ ڈاکٹر صاحب کا خطاب سننے کے قابل ہوتا۔ ڈاکٹر صاحب اس موقع پر چند اشعار بھی پڑھتے جو اتنے فکر انگیز، حسب حال اور پر آہنگ ہوتے کہ اساتذہ انھیں ازبر کر لیتے اور اکثر دہرایا کرتے۔''[۳]

ڈاکٹر محمد انعام کوثر نے نہ صرف بلوچستان کے طلبہ وطالبات کی بہتری کے لیے اقدامات اٹھائے بلکہ جس قدر ہو سکا انھوں نے حتی الوسع ان طلبہ کو تعلیم دینے والے اساتذہ کی راہنمائی بھی کی اور انھیں بھی تعلیمی شعور دینے میں اپنی حد تک کوشش کی۔ اساتذہ کے معیار میں بہتری لانے اور انھیں تدریسی مہارت میں طاق کرنے کے لیے اندرون صوبہ کے علاوہ ملک کے دیگر حصوں اور بیرون ملک بھی ورکشاپ اور ٹریننگ کا بندوبست کیا۔ انھوں نے اپنے دور میں برٹش کونسل کے تعاون سے کالج اساتذہ کی بیرون ملک تربیت کا اہتمام کیا جس سے کئی اساتذہ نے فائدہ اٹھایا اور کئی ایک اساتذہ باہر سے ٹریننگ حاصل کر کے بلوچستان آئے اور یہاں اپنی خدمات زیادہ بہتر انداز میں سرانجام دیتے رہے۔ اس دوران ان کی زیر نگرانی صوبہ کے اساتذہ نے مختلف مضامین اور درجات کی دس درسی کتب کی تصنیف وتدوین میں حصہ لیا۔ چار راہنمائے اساتذہ تیار کیے گئے۔ ہر سطح کے اساتذہ کے لیے الگ الگ تربیتی پروگراموں پر عمل ہوا۔ ڈاکٹر انعام الحق کوثر ان

پروگراموں کی تیاری پر آنے والی لاگت کو کم سے کم رکھتے اور نہایت کفایت شعاری سے تمام بندوبست کرتے تھے۔اس سے یہ فائدہ ہوتا کہ کم پیسوں میں بہت سارا کام ہو جاتا،حکومت کی طرف سے اس مد میں بہت تھوڑی رقم ہوا کرتی لہٰذا،انھیں یہ سب کچھ خود کرنا پڑتا۔ان کی زیرنگرانی سب کچھ بہتر طور پر انجام پاتا بلکہ بعض دفعہ تو کچھ رقم آئندہ ہونے والے پروگراموں کے لئے پس انداز بھی کر لی جاتی۔ان کے ایک ماتحت لکھتے ہیں:

''ایک بار مرکزی حکومت نے ڈاکٹر صاحب کو صرف تیرہ سو اساتذہ کو آبادی کی منصوبہ بندی کی تربیت کے لیے وسائل مہیا کیے لیکن ڈاکٹر صاحب نے انہی وسائل کے ذریعے تقریباً تین ہزار اساتذہ کی تربیت کا کام مکمل کر لیا۔''[۴]

ڈاکٹر انعام الحق کوثر جہاں انتظامی امور میں مصروف تھے۔صوبے میں تعلیمی انقلاب لانے کے لیے کمر بستہ تھے،اور اس سلسلے میں عملی اقدامات اٹھا رہے تھے۔ظاہر ہے کہ یہ سب وقت طلب کام ہے اور ان کی مصروفیات بہت زیادہ تھیں اپنے دفتری اوقات میں وہ ہمیشہ اپنے دفتر میں پائے جاتے تھے۔ان سب باتوں کے باوجود انھوں نے اپنا تحقیقی اور علمی کام جاری رکھا۔ لہٰذا ان سارے برسوں کے دوران بھی ان کی علمی و تحقیقی کتب ایک تواتر کے ساتھ سامنے آتی رہیں اور ان میں ان کی کافی اہم کتابیں شامل ہیں۔مثلاً ''بلوچستان میں اردو کی قدیم دفتری دستاویزات''، "علامہ اقبال اور بلوچستان"، "اقبالیات کے چند خوشے"، "جدوجہد آزادی میں بلوچستان کا کردار" اور "بلوچستان میں بولی جانے والی زبانوں کا تقابلی مطالعہ" جبکہ ان کے علاوہ ایک کتاب "مرزا غالب (توضیحی کتابیات)" وغیرہ۔ان کے علاوہ انہوں نے بلوچستان میں اقبال شناسی کے حوالے سے لکھے جانے والے متعدد لوگوں کے مضامین کے انتخاب پر مبنی کتب کی ترتیب و تالیف بھی کی۔اس کے ساتھ ساتھ ان کے متعدد موضوعات پر لکھے گئے مقالات بھی مختلف اخبارات و رسائل کی زینت بنتے رہے۔جبکہ سیرت النبیؐ، علامہ اقبال اور قائداعظمؒ کی مناسبت سے ہونے والی صوبائی اور قومی سطح کی تقاریب میں ان کی شرکت بھی جاری رہتی تھی۔انھیں مختلف کانفرسوں میں مدعو بھی کیا جاتا، جہاں وہ مقالے پڑھتے تھے۔ان کا شمار قومی سطح کے ادیبوں اور دانشوروں میں ہوتا تھا،لہٰذا ملک بھر میں جہاں بھی کوئی ادبی کانفرنس یا جلسہ ہوتا تو وہ بلائے جاتے اور ایسے جلسوں میں بلوچستان کی نمائندگی کرتے تھے۔ ان کی قریباً ساری

کتابیں بلوچستان سے متعلق تھیں لہٰذا وہ بلوچستان پر اتھارٹی سمجھے جانے لگے اور انکی رائے ایک حوالے کا درجہ اختیار کر گئی تھی۔ڈاکٹر محمد انعام الحق نے خود کو بلوچستان کے لیے وقف کر دیا تھا۔ان کی ہر تحقیقی کتاب کا تعلق کسی نہ کسی حوالے سے بلوچستان سے ہے۔ان سے پہلے بلوچستان میں ادبی تحقیق نہ ہونے کے برابر تھی۔وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے بلوچستان میں ادبی تحقیق کا آغاز کیا اور یہاں موجود قدیم ادبی اور علمی آثار کو اپنی تحریروں میں محفوظ کر لیا۔یقیناً یہ بات صحیح ہے کہ وہ بلوچستان میں ادبی تحقیق کے بنیادگزار ہیں۔انھوں نے یہاں ادبی اور علمی تحقیق کی پہلی اینٹ رکھی، جس پر آج ایک شاندار عمارت کھری نظر آتی ہے۔ان کی انہی خدمات کے پیش نظر ایک معروف صحافی رقمطراز ہیں:

''اگر میں یہ کہوں کہ علمی و قلمی محاذ پر ڈاکٹر انعام الحق کوثر وہ واحد آدمی ہیں جنھوں نے بلوچستان میں اسلام، سیرت، پاکستان، اقبال اور اردو پر جاندار کام کیا ہے تو مجھے کسی جانب سے اس دعوے کی تردید کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔''[۵]

یکم اپریل ۱۹۹۱ء کو ڈاکٹر انعام الحق کوثر باضابطہ طور پر سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہو گئے اور پھر چار ماہ بعد آپ کو ایک بار پھر اعزازی ڈائریکٹر بلوچستان بہبود فنڈز سکیم محکمہ تعلیم کوئٹہ بنا دیا گیا جہاں آپ پنشنرز کی فلاح و بہبود کے امور کی نگرانی کرتے رہے۔یوں وہ پوری ایمانداری اور فرض شناسی سے ریٹائرمنٹ کے بعد بھی اپنے فرائض انجام دیتے رہے اور اساتذہ کی فلاح و بہبود کے لیے مختلف منصوبے تکمیل تک پہنچائے۔انھوں نے اپنی نگرانی میں بلوچستان کے متعدد اساتذہ پر مختلف مدات میں قریباً چالیس لاکھ روپے خرچ کیے اور جب اس نگرانی سے خود ہی دستبردار ہوئے تو تقریباً ایک کروڑ ۱۰ لاکھ روپے کی نقد رقم باقی چھوڑی تھی۔انھیں اس عہدے کی کوئی تنخواہ نہیں ملتی تھی۔صرف برائے نام اعزازیہ دیا جاتا تھا جو پہلے ۵۰۰۰ روپے تھا جو آخر میں بڑھا کر دس ہزار روپے کر دیا گیا تھا۔ لیکن ڈاکٹر انعام الحق کوثر یہاں اپنے فرائض کسی معاوضے یا مشاہرے کے لالچ میں انجام نہیں دے رہے تھے بلکہ وہ محنت، خدمت اور کام کرتے رہنے کے جذبے سے سرشار تھے اور بلوچستان بھر میں تعلیمی خدمات سرانجام دینے والے اساتذہ کرام کے حقوق اور ان کی فلاح و بہبود کے لیے کوشاں تھے۔اس لیے اس عہدے پر تعیناتی کے لیے رضامند ہوئے تھے اس کا ثبوت یہ ہے کہ ان کے کام سے مطمئن ہو کر جب حکومت نے گرانٹ کے طور پر ایک خطیر رقم

بینو ویلنٹ فنڈ میں جمع کرائی تو وہ ازخود اس ادارے سے یہ کہہ کر علیحدہ ہو گئے، کہ وہ اپنا کردار ادا کر چکے اب نئے لوگ آئیں اور اسے آگے لے جائیں۔ وہ پھر سے اپنے اصل کام یعنی تصنیف و تحقیق میں مصروف ہو گئے۔ اب ایسے لوگ کہاں ملتے ہیں۔

ڈاکٹر انعام الحق کوثر کی مختلف تصنیفات کے سرسری جائزے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ تحریر و تصنیف میں ان کی دلچسپی کا دائرہ کار کافی وسیع ہے۔ وہ بلوچستان میں زبان و ادب کی تحقیق سے اپنے کام کا آغاز کرتے ہیں لیکن بعد میں صرف اسی موضوع تک محدود نہیں رہے۔ انہوں نے اپنے کام کو حتی الوسع وسعت دی جس سے ان کے تحقیقی کام میں تنوع پیدا ہوا۔ وہ تاریخ صحافت اور سیاست و معاشرت کے ساتھ ساتھ مذہب و تصوف کی طرف بھی مائل ہوئے۔ ان کی آخری کتب میں زیادہ تر کتابیں قائداعظم، علامہ اقبال اور تحریک پاکستان کے موضوعات پر ہیں۔ انھوں نے ان سب موضوعات کو بلوچستان کے تناظر میں دیکھا اور پرکھا ہے۔ یوں بلوچستان ایک الگ عنصر کی حیثیت سے ان کی تحریروں میں ابھرا ہے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس طرح گویا انھوں نے بلوچستان میں رہنے کا حق ادا کر دیا۔ ان کے ایک شاگرد اور پشتو کے مشہور ادیب اور محقق پروفیسر ولی محمد سیال کاکڑ نے ان کے بارے میں بہت صحیح لکھا ہے کہ:

> ''انصاف تو یہ ہے کہ جناب ڈاکٹر انعام الحق کوثر نے بلوچستان کے علمی اور تحقیقی میدانوں میں وہ ابدی نقوش چھوڑے ہیں کہ مستقبل میں محققین آپ کے قیمتی اور پیش بہا آثار کا حوالہ دیے بغیر نہیں رہ سکتے اور آنے والی نسلیں آپ کے فراہم کیے ہوئے مضبوط بنیادوں پر علم و ادب کے عظیم الشان عمارات تعمیر کر سکیں گے۔''۶

ڈاکٹر انعام الحق کوثر ساری عمر تعلیم و تدریس اور تحقیق سے وابستہ رہے چاہے وہ ان کی اپنی تحقیقی سرگرمیاں ہوں یا پھر ملک کی مختلف جامعات کے ایم فل اور پی ایچ ڈی کے سکالر ہوں۔ ڈاکٹر صاحب نے تحقیق کے حوالے سے ان کی نگرانی اور راہنمائی کی۔ لہٰذا ان کے ماتحت مختلف سکالرز نے تحقیقی مقالے لکھ کر ایم فل جبکہ ایک اسکالر نے پی ایچ ڈی کی سطح کی اعلیٰ ڈگری بھی حاصل کی۔

ڈاکٹر انعام الحق کوثر نے اندرون ملک بے شمار سفر کیے، مذاکروں اور سیمینارز میں شرکت کی اور مختلف موضوعات پر بیسیوں بلکہ سینکڑوں تقاریر کیں۔ انھیں بیرون ملک سفر کے مواقع بھی

حاصل ہوئے۔ جب وہ ناظم تعلیمات ادارہ نصابیات تھے تو انھیں کئی ممالک کے تعلیمی دوروں پر جانے کا اتفاق ہوا وہ تھائی لینڈ، ملائشیا اور سنگاپور سمیت چھ ملکوں میں گئے جہاں وہ کئی دن قیام پذیر رہے۔ انھیں ان ممالک کی سیر کے ساتھ وہاں کے لوگوں سے ملنے اور ان کے طرز زندگی کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اسی طرح وہ پندرہ روزہ دورہ پر انگلستان بھی گئے۔ وہاں سے واپسی پر وہ کچھ دن سعودی عرب رک گئے اور عمرہ ادا کرنے کی سعادت حاصل کی۔ اس طرح وہ مندوب کی حیثیت سے کئی بار ایران تشریف لے گئے جہاں انھوں نے مختلف تقاریب میں شرکت کی۔ ایک بار فردوسی پر مقالہ پڑھا اور جلسہ میں نائب صدر کے طور پر بلائے گئے۔ وہ ایک بار انڈیا بھی گئے تھے جہاں نئی دہلی میں منعقد ہونے والی دوسری بین الاقوامی قرآن کانگریس میں انھوں نے بزبان انگریزی اپنا مقالہ بعنوان ''دی قرآن اینڈ سسٹم آف ویلیوز'' پڑھا۔

اسی طرح ڈاکٹر انعام الحق کوثر مختلف اوقات میں مختلف اداروں سے وابستہ رہے۔ کہیں بانی رکن کی حیثیت سے تو کہیں ایک عام کارکن کی طرح اور کہیں کسی ذمہ دار عہدے پر۔ ایسے تمام ادارے علمی و ادبی سطح پر ملک بھر کے سرکردہ اداروں میں شامل ہیں۔ ان میں سے چند معروف اداروں اور ان میں ان کے عہدوں کی فہرست کچھ یوں ہے:

پاکستان انٹر بورڈ کمیٹی اسلام آباد کے چیئرمین، بحیثیت ممبر مجلس ادارت بولان کوئٹہ، چلتن کوئٹہ، منتظم اعلیٰ رگ سنگ لورالائی، اعزازی مدیر و مہتمم اعلیٰ بلوچستان ایجوکیشن جرنل کوئٹہ، وائس چیئرمین قلم قبیلہ، ممبر قومی سیرت کمیٹی اسلام آباد، رکن نیشنل بک فاؤنڈیشن، رکن سٹیڈیکٹ، اکیڈمک کونسل بورڈ آف سٹڈیز بلوچستان یونیورسٹی کوئٹہ، اعزازی رکن ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی، رکن پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی اور رکن ریسرچ سوسائٹی آف پاکستان پنجاب یونیورسٹی لاہور۔

ڈاکٹر محمد انعام الحق کوثر کی صحت بچپن سے جوانی تک بلکہ ادھیڑ عمر تک بہت اچھی رہی۔ وہ شروع سے کم خوراک واقع ہوئے تھے۔ جس کی وجہ سے بہت سی بیماریوں سے بچے رہے۔ البتہ ۸۰ء کی دہائی کے اوائل میں انھیں شوگر کا مرض لاحق ہو گیا لیکن پھر سخت پرہیز اور ادویات کے باقاعدہ استعمال کے باعث وہ کافی حد تک اس مرض کو کنٹرول میں رکھنے پر قادر ہو گئے تھے۔ وہ اکثر اوقات پیدل چلتے تھے۔ اور اپنے روزمرہ کے کاموں بشمول نماز وغیرہ کو جانے کے لیے بھی گھر سے دور واقع مسجد تک پابندی سے پیدل جاتے لہٰذا انھیں زیادہ تکلیف کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

وہ پیرانہ سالی کے باوجود وہ بڑے عزم اور حوصلے سے اپنی زندگی جیتے رہے اور تادمِ آخر تحریر و تصنیف میں مشغول رہے۔

ڈاکٹر انعام الحق کوثر کی گراں قدر ادبی اور علمی خدمات کے اعتراف کے طور پر حکومت پاکستان نے انھیں ۱۹۹۷ء میں صدارتی تمغہ برائے حسن کارکردگی عطا کیا، جبکہ ۱۹۷۸ء میں انجمن ترقی اردو لاہور کی جانب سے اردو کی ترویج و اشاعت کے سلسلے میں نمایاں اور اہم خدمات سرانجام دینے پر خصوصی سند سے نوازا گیا۔ تعلیم کے شعبے میں ان کی نمایاں خدمات کے پیشِ نظر حکومت کی طرف سے ۱۹۹۱ء میں اعزازِ فضلیت دیا گیا۔

ایک استاد ہونے کے ساتھ ساتھ بلوچستان کے حوالے سے علم و ادب کا کوئی شعبہ ایسا نہیں رہا ہوگا جسے انعام الحق کوثر نے اپنی تحریر کا موضوع نہ بنایا ہو۔ بلوچستان میں تحقیق کی عمارت کے خدوخال اجاگر کرنے میں ان کا حصہ سب سے زیادہ اور سب سے نمایاں ہے۔ آج بلوچستان میں تحقیق کے حوالے سے جتنا کام ہو رہا ہے۔ اس کی شروعات انھوں نے کی تھیں۔ بلوچستان کے حوالے سے تحریر و تحقیق کا کوئی شعبہ ہو، ڈاکٹر کوثر کی کتابوں سے استفادے بغیر ایک قدم آگے بڑھنا مشکل ہے۔ اس حوالہ سے اگر انھیں بلوچستان کا بابائے اردو کہا جائے تو نامناسب نہ ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے اپنے ولولے اور عزم سے چمنستان ادب کی خوب آبیاری کی اور درجنوں تحقیقی کتابیں اور سینکڑوں مقالے سپردِ قلم کیے۔ اپنے ان روشن کارناموں کے باعث ڈاکٹر انعام الحق کوثر کا نام اردو زبان و ادب کی تاریخ میں بلوچستان کے حوالے سے ہمیشہ زندہ رہے گا۔ حافظ شیرازی نے سچ کہا ہے کہ:

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است برجریدۂ عالم دوام ما

حوالہ جات

درج ذیل تمام حوالہ جات مختلف اوقات میں لکھے گئے مضامین سے اخذ شدہ ہیں۔ ان تمام مضامین کو احتشام الحق نے ترتیب دے کر کتابی شکل میں ''ڈاکٹر انعام الحق کوثر، حیات و خدمات'' کے عنوان سے شائع کیا۔

۱۔ محمد اقبال قاضی، ادبی اور تحقیقاتی دنیا کا مجاہد، مشمولہ ''ڈاکٹر انعام الحق کوثر، حیات و خدمات''، مرتبہ: محمد احتشام الحق، ادارہ تصنیف و تحقیق بلوچستان، کوئٹہ، ۲۰۰۸، ص ۱۱۵

۲۔ محمد نواز، ایک ہمہ جہت شخصیت، مشمولہ، ایضاً، ص ۱۴۳

۳۔ محمد رفیق، چلنا چلنا مدام چلنا، مشمولہ، ایضاً، ص ۱۵۳

۴۔ محمد انور، ڈاکٹر انعام الحق کوثر بہ طور منتظم، مشمولہ، ایضاً، ص ۱۳۸

۵۔ خورشید احمد گیلانی، سفیر اسلام اور نقیب پاکستان، مشمولہ، ایضاً، ص ۱۰۰

۶۔ ولی محمد سیال کاکڑ، دنیائے علم ادب کی ایک مثالی شخصیت، مشمولہ، ایضاً، ص ۱۳۴

پروفیسر انیتا غلام علی

مہتاب اکبر راشدی

کچھ لوگ اپنی ذات میں اتنے الگ اور اتنے منفرد ہوتے ہیں کہ ان کی شخصیت کا احاطہ کرتے ہوئے، ان کو کسی ایک زاویے سے دیکھنا اور ایک مخصوص خانے میں محدود کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ انیتا غلام علی بھی اسی طرح کا ایک کردار تھیں، جنہیں ہم ہمہ جہت کہہ سکتے ہیں۔ کہنے کو تو وہ بنیادی طور پر ایک اُستاد ہیں۔ تعلیم کے پیشے سے ان کی وابستگی ان کی اپنی پسند اور علم سے بے پناہ لگاؤ کا اظہار ہے۔ ان کا جس خاندان سے تعلق رہا اور جن والدین کے ہاں ان کا جنم ہوا، اس خاندان کی فرد ہوتے ہوئے انہیں کسی بھی قسم کی ملازمت کرنے کی کوئی ضرورت ہونی ہی نہیں چاہیے تھی لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان کا ددھیال اور ننھیال، دونوں خاندان ہی علم و ادب، شعور اور آگہی کے پروردہ روایات کے امین تھے۔

پروفیسر انیتا غلام علی کے دادا خان بہادر نور الدین احمد غلام علی تھے، تقسیم ہند سے پہلے، انگریزوں کے دورِ حکومت میں گورنمنٹ آف انڈیا میں تعلیم کے شعبے میں ان کی بہت خدمات رہیں اور درس و تدریس سے ان کی وابستگی رہی۔ انیتا آپا، اپنے دادا کی بڑی لاڈلی تھیں۔ وہ ان کی شخصیت سے بھی متاثر تھیں۔ ۱۹۷۴ء میں نوے برس کی عمر میں ان کے انتقال تک وہ ان کے بہت قریب رہیں۔ انیتا غلام علی کے پڑنانا مرزا قلیچ بیگ کا شمار سندھی ادب اور تحقیق کے جدید معماروں میں ہوتا ہے، اور سندھی ادب میں ان کا بہت اونچا مقام ہے۔ ان کے نانا مرزا نادر علی بیگ بھی ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ادب سے شغف رکھتے تھے۔ حیدر آباد میں ٹنڈو یوسف کے نام سے معروف بستی میں آج بھی مرزا قلیچ بیگ کے خاندان سے تعلق رکھنے والے، اُن کے ورثے کے

امین کے طور پر بہت عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ آپا انیتا کی والدہ شیریں کا تعلق اسی پڑھے لکھے خاندان سے تھا اور ان کے والد فیروز نانا قانون دان تھے۔ علی گڑھ سے انہوں نے قانون کی ڈگری حاصل کی اور سندھ ہائی کورٹ میں جج کے فرائض انجام دیئے۔ اسی روشن خیال اور پڑھے لکھے خاندان میں ۲، اکتوبر ۱۹۳۴ء میں انیتا غلام علی نے کراچی میں جنم لیا۔ اپنے دادا سے دلی قربت کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ انہوں نے اپنے نام کے ساتھ والد کے نام کے بجائے دادا کا نام جوڑا اور دادا کے تدریس کے پیشے سے وابستگی اور پڑھنے اور جاننے کے شوق نے انیتا غلام علی کو بھی اسی پیشے سے وابستہ کیا۔

ابتدائی تعلیم مہاراشٹر، انڈیا سے حاصل کی۔ کراچی آنے کے بعد کراچی کے علاقے گارڈن ایسٹ کے محلے کے ایک بڑے سے گھر میں زندگی کا ایک طویل عرصہ گزارا۔ ان کے گھر سے کچھ ہی فاصلے پر سینٹ لارنس کانونیٹ اسکول تھا، جہاں سے انیتا غلام علی اور ان کی دو بہنوں نے تعلیم حاصل کی۔ والدہ شیریں نانا ایک تعلیم یافتہ خاتون تھیں، جنہوں نے مشرقی روایات اور مغرب کی جدیدیت کے درمیان قابلِ رشک توازن قائم رکھا۔ انہوں نے اپنے بچوں کو اپنی خاندانی قدروں، مشرقی روایات سے بھی جوڑے رکھا اور جدید مغربی تعلیمی نظام سے بچوں کو مستفید کیا۔ انیتا غلام علی، کراچی کے اُس سنہری دور میں پلی بڑھیں، جب یہ شہر مختلف ثقافتوں، مذہبی عقائد رکھنے والوں کا شہر تھا، گارڈن ایسٹ کے علاقے میں، مسلمان، عیسائی، یہودی، پارسی اور ہندو اپنے مختلف مذہبی ثقافتیں اور زبانیں بولنے کے باوجود، اعلیٰ انسانی قدروں میں یقین رکھتے تھے اور محلے میں ایک ہی خاندان کے افراد کی طرح رہتے تھے۔ ۱۹۵۰ء میں شعور کی دنیا میں قدم رکھنے والی انیتا، اسی مذہبی رواداری، بے غرض دوستیوں، ایک دوسرے میں یقین اور برداشت اور حوصلے کے ماحول میں بڑی ہوئیں اور پوری زندگی انی قدروں کی سفیر رہیں۔

انیتا غلام علی کی اُٹھان بہت عجیب رہی۔ میں نے ''ہم'' ٹی وی کے پروگرام ''میری کہانی، میری زبانی'' کے لیے ان کا بڑا طویل انٹرویو کیا تھا۔ اُن کی زندگی کی کتاب سے جب ماضی کے ورق پلٹے تو وہ اپنے بچپن کا ذکر بڑے مزے لے لے کر سُنایا کرتیں۔ بتا رہی تھیں کہ اپنی بہنوں اور بھائیوں کے مقابلے میں وہ بہت شریر تھیں، بہن بھائیوں اور محلے کے بچوں پر رعب ڈالتی تھیں۔ بقول اُن کے اُن کی بہنیں، پڑھائی میں سب سے زیادہ نمبر لے کر پاس ہوتی تھیں، جبکہ یہ کلاس

سے باہر رہنے میں خوش رہتیں۔ پڑھائی سے خاص شغف نہ تھا۔ پیدائشی لیڈر تھیں، کھیل کود کی شوقین۔

میٹرک کے بعد کراچی کے مشہور ڈی۔ جے دیارام جیٹھ مل میں داخل کروائی گئیں۔ جہاں ہفتے کے روز باٹنی (Botny) کی کلاس سے بھاگ کر دوستوں کے ساتھ اسٹوڈنٹس کے لیے رعائتی قیمت پر ملنے والے سستے ٹکٹ لے کر کسی فلم کا شو دیکھنا ضروری تھا۔ کھیلوں میں بیڈمنٹن، ٹیبل ٹینس کھیلتیں۔ ایتھلیٹ رہیں اور اپنی یونی یورسٹی کی نیٹ بال ٹیم کی کیپٹن تھیں۔ آؤٹ ڈور سرگرمیاں ان کی پڑھائی پر حاوی ہوتیں تھیں۔

طبیعت میں اکھڑ پن، غلط بات اور جھوٹ ان کی برداشت سے باہر تھا، کوئی کتنا بڑا ہو، سچ بات ان کے منہ پر کہنا ان کے مزاج کا خاصہ تھا۔ اس ''باغی'' بچی کو بیگم شیریں نانا نے بڑے تحمل سے سنبھالا۔ لاابالی انیتا غلام علی نے اُس وقت اپنے دوستوں اور احباب کو حیران کر دیا جب کراچی یونی ورسٹی سے مائیکرو بیالوجی میں ماسٹر میں اول پوزیشن حاصل کی۔

۱۹۵۰ء سے لے کر دو دہائیوں تک ریڈیو پاکستان سے انگریزی خبریں پڑھتی رہیں۔ اُن کی خبریں لوگ اس لیے سُنتے تھے کہ اُسے سن کر انگریزی کا تلفظ اور لہجہ درست کریں۔ یہ سلسلہ اُس وقت ختم ہوا جب پاکستان کا دارالخلافہ، کراچی سے اسلام آباد منتقل ہوا اور خبریں اسلام آباد شہر سے نشر ہونے لگیں۔

بحیثیت معلم انہوں نے سندھ مسلم سائنس میں ۱۹۶۱ء سے پڑھانا شروع کیا اور ۲۴ سال اپنے اس پسندیدہ پیشے سے وابستہ رہیں۔ اس سلسلے میں ایس۔ ایم سائنس کالج میں جانے کے بعد کھلے دل سے ہنس ہنس کے کہتی تھیں کہ ''یہ کہنے میں مجھے کوئی عار نہیں کہ ایک تھرڈ کلاس شاگرد، ایک فرسٹ کلاس ٹیچر بن سکتا ہے۔'' اور بلاشبہ یہ ایک حقیقت ہے کہ انیتا غلام علی کا شمار بہترین اساتذہ میں ہوتا ہے۔ وہ بارعب اور سخت گیر اُستاد تھیں، لڑکوں کے کان بھی پکڑتی تھیں اور ہلکی پھلکی ٹھکائی بھی کر دیتی تھیں لیکن اُن کے شاگرد ان کی بے انتہا عزت کرتے اور اس سے زیادہ ان سے محبت کرتے تھے۔ میں نے اکثر ان کے دفتر میں ڈی ایس پی، ایس پی، رینک کے اعلیٰ پولیس آفیسر، وردیوں میں حاضری دیتے دیکھے۔ معلوم ہوا کہ وہ انیتا آپا کے شاگرد تھے۔ حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر بھی ان کے بے شمار شاگرد تھے، تو بیرونِ ملک بھی اُن کے شاگردوں کی بڑی تعداد موجود

ہوگی۔ وہ بہت فخر سے کہتی تھیں ''میرے وارثوں میں میرے خاندان کے علاوہ میرے ہزاروں شاگرد ہوں گے۔'' اپنے شاگردوں کو بہت اپنائیت سے پکارتیں اور محبت سے یاد کرتیں۔ تدریس کا شعبہ اور اُستاد ہونا اُن کے دل کے قریب تھا۔ بہت فخر سے کہتی تھیں، ''اُستاد بادشاہ ہوتا ہے۔ بننا ہے تو اچھے اُستاد بنو یہ تو پیغمبروں کا پیشہ ہے۔'' پھر بہت مزے سے بتاتیں ''سب سے زیادہ شریر اور غنڈے شاگرد مجھے بڑے عزیز ہوتے تھے اور میرے قریب ہوتے تھے۔''

اُن کے پروفیسر ہونے اور کالج کا دور بھی ہنگامہ خیز تھا۔ پیدائشی لیڈر تو وہ تھیں لیکن وہ پاکستان ٹیچرز ایسوسی ایشن کی پریذیڈنٹ بھی بنیں۔ اساتذہ کے حقوق کے سلسلے میں مظاہروں کی قیادت کرتے ہوئے پولیس کی لاٹھیاں بھی کھائیں، گرفتار بھی ہوئیں اور مختصر وقت کے لیے جیل کی سلاخوں کے پیچھے بھی گئیں۔ وقت کے وزرائے اعلیٰ اور گورنرز کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتی تھیں۔ ان سے بات کرتے ہوئے اچھے اچھوں کے پسینے چھوٹ جاتے تھے۔

معاشرے میں مجبور اور ضرورت مند لوگوں کی مدد کا سلسلہ بچپن سے سیکھا ہوا تھا۔ گرلز گائیڈ کی اسکول کے زمانے میں رکن تھیں اور ایک وقت ایسا آیا کہ وہ اسی تنظیم کی صدر بنیں۔ ریڈ کراس لیاری کی بھی صدر رہیں اور دیر تک اس سے وابستہ رہیں۔

۱۹۸۵ء سے سندھ ایجوکیشن فاؤنڈیشن کی مینیجنگ ڈائریکٹر، اس کی ابتدا سے ہی رہیں۔ اپنی اعلیٰ انتظامی صلاحیتوں سے، اس ادارے کو ایک مضبوط بنیاد فراہم کی۔ سندھ بھر کے دیہاتوں میں اسکول کھلوائے، خواتین کو اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کی ترغیب کے طور پر ہنر سکھانے اور ان کی ہاتھ سے بنائی ہوئی چیزوں کو مارکیٹ کرنے کا انتظام کیا۔ دنیا کے مالیاتی ادارے انہی کی کوششوں سے، ایس ای ایف کے لیے منصوبے لے کر آئے۔ سندھی اُن کی مادری زبان تھی۔ مجھ سے جب بھی باتیں کرتیں سندھی میں کرتیں۔ حیدرآباد میں اپنے ننھیال سے ہمہ وقت رابطے میں رہتیں۔ اپنے کالج کے دور کے اساتذہ ساتھیوں سے ان کی طویل رفاقتیں رہیں۔ اپنے رشتے ناتے سنبھالنا خوب جانتی تھیں۔ شستہ اُردو بولتی تھیں اور انگریزی تو ویسے ہی ان کے در کی غلام تھی۔

۱۹۹۶ء میں سندھ میں ممتاز بھٹو کی نگران حکومت میں تین ماہ کے لیے، وزیر تعلیم بنائی گئیں اور پھر دوبارہ ۱۹۹۹ء میں جنرل مشرف کے صدر بننے کے بعد، وزیر تعلیم بنیں۔ اُس دور میں مَیں نے اُن کے ساتھ بحیثیت سیکرٹری تعلیم کام کیا۔ اُن کا رویہ، میرے ساتھ ہمیشہ مشفقانہ اور

دوستانہ رہا۔ ان کے ایس ٹی ایڈ کے دفتر میں جانا ہوتا تو وہ اپنے کیمرے سے (جو ہر وقت ان کے پاس موجود ہوتا تھا) تصویر کھینچتیں۔ پھر دو رتین دن میں وہ تصویر ایک ہاتھ سے بنے کارڈ پر چسپاں، اُن کے دستخطوں اور کسی خوبصورت جملے کے ساتھ گھر پر مل جاتا۔

وہ مختلف تقاریب میں بحیثیت مقرر بلائی جاتیں۔ تعلیم اُن کا شوق اور جنون تھا۔ اُن کی تقاریر، مقالے اور تحریریں نہایت ہی مدلل اور اعلیٰ پائے کی ہوتی تھیں۔ متعدد بین الاقوامی کانفرنسوں میں پاکستان کی نمائندگی کرتیں۔ ایسی ہی ایک کانفرنس میں جو کہ آکسفورڈ یونی ورسٹی میں منعقد ہوئی، میں مَیں بھی اُن کے ساتھ تھی۔ اُن کے سیشن معلوماتی اور دلچسپ ہوتے تھے۔ ہم دونوں نے لندن، آکسفورڈ اور برمنگھم کا سفر ایک ساتھ کیا، ہمارے ساتھ بیلا رخ جمیل بھی تھیں جو ''ایس ٹی ایف'' میں کسی پروجیکٹ سے وابستہ تھیں (آج کل چلڈرن لٹریچر فیسٹیول کی صدر ہیں)۔ آپا انیتا کے ساتھ میرا یہ سفر، زندگی کا یادگار سفر رہا۔

تعلیم کے شعبے میں ان کی خدمات کے صلے میں ۲۰۰۴ء میں حکومتِ پاکستان نے انہیں ستارۂ امتیاز سے نوازا تھا۔ انیتا آپا گھٹنوں میں جوڑوں کے درد کے باعث ویل چیئر تک محدود ہوگئی تھیں۔ اس اعزاز کو وصول کرنے خود اسلام آباد نہیں گئیں اور انہوں نے مجھے یہ اعزاز بخشا کہ اُن کی بجائے میں اُن کا تمغہ وصول کروں۔ اسی سال مجھے بھی تمغۂ حسنِ کارکردگی ملا تھا تو میرے لیے یہ دوہری خوشی تھی۔

گنٹھیا کی بیماری کی وجہ سے انیتا آپا کے ہاتھوں کی انگلیاں ٹیڑھی ہوگئی تھیں۔ ان انگلیوں سے بھی وہ مسلسل لکھتی رہیں اور ان کی تحریر میں رتی بھر بھی فرق نہ آیا۔

انیتا غلام علی، بلاشبہ سندھ اور پاکستان کی ایک قابلِ فخر بیٹی تھیں۔ ملک سے بے حد محبت کرنے والی، اعلیٰ پائے کی ماہرِ تعلیم اور منتظم تھیں۔ بااصول اور دلیر، کھری اور سچی بات سننے اور سنانے والی۔ یہ تھی ہماری بہت ہی پیاری انیتا آپا، جو ۸، اگست ۲۰۱۴ء کو ۸۰ سال کی عمر میں ہم سے جدا ہوگئیں۔

پروفیسر حمید احمد خاں

میرزا ادیب

آج صبح سے آندھی چل رہی ہے اور مجھے ایک خیال بُری طرح ستا رہا ہے۔ آندھی یا تیز ہوا سے میں بالعموم پریشان نہیں ہوتا۔ ہوا تیز و تند ہو تو اس سے حرکت و عمل کا احساس ہوتا ہے مگر میری آرزو یہ ہے کہ آج ہوا تھم تھم کر چلے۔ اس میں گرد و غبار بالکل نہ ہو۔ کچھ دیر کے بعد ہوا کتنی ہی تیز کیوں نہ ہو جائے اور کتنا ہی گرد و غبار کیوں نہ اُڑنے لگے، مجھے کوئی فکر نہیں ہوگی۔ اس وقت تو لازماً فضا کو پُرسکون ہو جانا چاہیے کیونکہ گھنٹے آدھے گھنٹے کے بعد ایک ایسے شخص کو وادیِ خاموشاں کی طرف اپنے سفر کا آغاز کرنا ہے جس کی زندگی ہمیشہ بے داغ رہی ہے۔ اگر ایسے شخص کا کفن میلا ہو جائے تو یہ کو وی اچھی بات نہیں ہوگی۔ پروفیسر حمید احمد خاں نے کل ۲۲ مارچ کو دوپہر کے بعد اس دنیا میں آخری سانس لیا تھا اور آج ہم جو ان کے شاگرد احباب عزیز، ان کے نئے اور پُرانے ساتھی ہیں۔ انھیں آخری منزل پر پہنچانے کے لیے ان کی کوٹھی کے وسیع لان میں جمع ہو گئے ہیں۔

مجھے پروفیسر حمید احمد خاں کو قریب سے دیکھنے کا بارہا موقع ملا تھا اور کئی بار ان کے دل و دماغ میں جھانکنے کی کوشش بھی کی تھی۔ اگر میں یہ کہوں کہ میرے اُستاد مجسمہ نفاست تھے، تو اس میں قطعاً کوئی مبالغہ نہیں ہوگا۔ اُجلا لباس پہننا، صاف ستھری جگہ پر رہنا، گرد و پیش کے ماحول میں صفاوی رکھنا، یہ نفاست پسندی ضرور ہے مگر بڑی محدود قسم کی۔ میرے محترم اُستاد میں تو نفاست پسندی کے لیے بے شمار روپ تھے اور واقعہ یہ ہے کہ انھیں نفاست پسندی کا ہر روپ بے حد عزیز تھا۔ اس قدر عزیز تھا کہ وہ اسے کسی حالت میں بھی مجروح صورت میں نہیں دیکھ سکتے تھے۔ ان کی نفاست پسندی کا یہ عالم ہے کہ مرنے سے کچھ روز پیشتر وصیت کر گئے ہیں کہ ان کے جسد خاکی کو

گلبرگ کے قربان میں دفن کیا جاوے۔ کیونہ وہ صاف ستھرا ہے۔ نفاست کو معنویت کی وسیع تر سطح پر لا کر دیکھیں تو یہ عبارت ہے۔ زندگی کی اُجلی اور داغ دھبے سے پاک اور منزہ قدروں سے۔ یہ نظام اقدار پر مشتمل ہے، خلوص، راست بازی، راست گوئی، سلیقہ مندی، بے ریا محبت، نیک نیتی، نیک نفسی، اور باہمی اعتماد پر کہتے ہیں کہ آرٹ سے زندگی میں حسن پیدا ہوت اہے۔ مجھے اس نظری کے تسلیم کرنے میں کوئی اعتراض نہیں ہے مگر میں سمجھتا ہوں کہ وہ انسان زیادہ قابلِ احترام ہے جو آرٹ سے زندگی میں حسن پیدا نہیں کرتا۔ بلکہ زندگی ہی کو آرٹ بنا دیتا ہے اور پروفیسر حمید احمد خاں کی زندگی واقعی ایک آرٹ ہے۔ وہ سلیقہ مندی سے زندگی بسر کرنا جانتے تھے اور انھوں نے یہ ستر برس جو اس دنیا میں گزارے ہیں، آرٹ کی تمام پابندیوں پر عمل پیرا ہو کر گزارے ہیں۔ ان کے اس آرٹ کا کمال یہ ہے کہ وقت کا جو لمحہ بھی ان کی زندگی کا جزو بنتا تھا۔ جب ان سے الگ ہوتا تھا تو ان کے سانس کی عطر فشانی سے نسیم بہار کا جھونکا بن جاتا تھا۔ ایسے لوگ خوشبوئیں پھیلاتے ہوئے آتے ہیں اور خوشبوئیں پھیلاتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔

ان کی نفاست پسندی کو اگر کسی مثال کے ذریعے واضح کرنے کی کوشش کروں تو یوں کہہ سکتا ہوں کہ زندگی کے خوبصورت قالین پر چلتے ہوئے اگر ان کے پاؤں پر کانٹا چبھ جاتا تو انھیں پاؤں پر زخم لگنے کا افسوس ہرگز نہ ہوتا۔ افسوس ہوتا تو فقط اس بات کا کہ اس زخم سے نکلے ہوئے لہو کے قطروں نے قالین کی نفاست تباہ کر دی ہے۔

وہ سر سے پاؤں تک نفاست تھے۔ نفاست میں نرمی اور ملاومت ہوتی ہے مگر کبھی کبھی وہ نرم اور ملائم نہیں ہوتے تھے۔ دیکھنے والے محسوس کرتے تھے کہ وہ سخت ہو گوے ہیں۔ ان کا رویہ کرخت ہو گیا ہے لیکن یہ بالکل عارضی کیفیت ہوتی تھی۔ برف کے تودے پر ہاتھ رکھیں تو وہ کتنا کرخت معلوم ہوتا ہے مگر کچھ لمحوں ک ےبعد ہی وہ پگھل کر پانی بن جاتا ہے۔ یہی کیفیت پروفیسر حمید احمد خاں کی بھی تھی۔ وہ جتنی جلدی گرمی گفتار کا اظہار کرتے تھے اتنی جلدی ملائمت بھی اختیار کر لیتے تھے۔ ان کے اندر تو ''کرختگی'' تھی ہی نہیں، ان کے باطن میں پنکھڑیوں کی سی لطافت اور شبنم کی سی معصومیت تھی۔ کسی کے ساتھ سخت کلامی سے پیش آتے تھے تو تھوڑی دیر بعد ہی انھیں احساس ہو جاتا تھا کہ ان کی زندگی کے صاف ستھرے دامن پر ایک داغ سا پڑ گیا ہے اور یہ داغ ان کی طبع نفاست پسند کسی طرح بھی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ گرمی کلام ایک

دم ختم ہو کر نرمیٔ گفتار بن جاتی تھی! جس سے اُلجھتے تھے اس سے بعض اوقات معافی مانگ لیتے تھے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ جب وہ پہلی مرتبہ ہماری کلاس میں انگریزی کمپوزیشن سکھانے آئے تھے تو طلبہ نے اُن کے ساتھ اسی بدتمیزی کا مظاہرہ کیا تھا جو وہ ہر نئے پروفیسر کے ساتھ پوری باقاعدگی سے روا رکھتے تھے۔ پروفیسر حمید احمد خاں کا چہرہ یک لخت سرخ ہو گیا تھا۔ انھوں نے لڑکوں کو مخاطب کر کے خوب ڈانٹ پلائی تھی مگر جب لڑکوں نے خاموشی اختیار کر لی تو ان کے وطیرے میں ایک ایسی تبدیلی آ گئی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ انھیں اپنی تلخ گوئی پر دکھ ہے اور وہ اس احساس کو ختم کر دینا چاہتے ہیں کہ وہ کوئی سخت گیر اُستاد نہیں۔

ٹیوٹوریل میٹنگ میں وہ میری نظمیں سنتے تھے اور میری ہر طرح ہمت افزائی کرتے تھے۔ ایک بار بھی انھوں نے نہ بتایا کہ وہ علم وادب کے ایک مشہور خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں اور خود بھ یبہت اچھے افسانہ نگار تھے۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ میں اس زمانے میں نظمیں لکھتا تھا اور پروفیسر حمید احمد خاں افسانے۔ اس دور میں انھوں نے ایک نہایت خوبصورت افسانہ لکھا تھا جس کا عنوان تھا ''مصور'' اور یہ افسانہ ''ہمایوں'' میں چھپا تھا۔ کسی کو بھی یہ بات معلوم نہیں تھی کہ اس افسانے کے مصنف وہی حمید احمد خاں ہیں جو ایف اے کی ایک کلاس کو انگریزی کمپوزیشن سکھاتے ہیں۔ کافی مدت بعد مجھے اس حقیقیت کا علم ہو گیا۔ میں نے جب ان سے ''مصور'' کا ذکر کیا تھا تو انھوں نے ایک لمحہ توقف کیے بغیر یوں نفی میں سر ہلا دیا تھا جیسے یہ افسانہ انھیں پسند نہیں اور وہ اس تصنیف سے دستبردار ہونا ضروری خیال کرتے ہیں۔ وہ کون سی نفاست خیالی تھی جس سے ان کا یہ افسانہ محروم تھا؟ اس کا کبھی انھوں نے ذکر نہیں کیا۔ وہ چاہتے تھے کہ لوگ اسے یکسر فراموش کر دیں۔ پروفیسر حمید احمد خاں کی نفاست ان کی خوننابہ گر کی کشیدگاہ میں پرورش اور ترتیب پاتی تھی۔ غالبیات سے متعلق کوئی مقالہ اور غزل کے ارتقائی مراحل پر مبنی کوئی مضمون ہو، دیوان غالب کے نسخہ حمیدیہ کا دیباچہ ہو یا خواجہ الطاف حسین حالی کے حیات وکلام کا جائزہ ہو، وہ جگہ ہر مقام پر اسی خونِ جگر سے آمیز کی ہووی نفاست سے کام لیتے تھے۔ انھوں نے بہت کم لکھا ہے مگر جو کچھ لکھا ہے وہ ان کے نفاست کے مقررہ معیار پر ہر لحاظ سے پورا اُترتا ہے۔ ان کی ساری تخلیقات ضخیم جلدوں سے دامن کشا چند سو صفحات میں سمٹ کر رہ گئی ہیں مگر یہی چند سو صفحات ادب کے اُفق پر چاندنی کا روپ دھارے بڑی

نفاست سے سجی ہوئی ہیں۔

نفاست ان کی پوری زندگی پر حاوی ہوگئی تھی۔ یہ ہر کام میں باقاعدگی، یہ خود کو ہر وقت چست و چوبند رکھنے کی پابندی اسی نفاست پسندی کے مظاہر تھے اور یہ بھی نفاست ہی کا ایک رُخ تھا کہ وہ طے شدہ پروگرام میں ایک منٹ کی بے قاعدگی بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ اگر کسی کو اپنے دفتر میں یا گھر میں پانچ بجے ملنے کے لیے کہا ہو تو آنے والے کو لازمی طور پر اس وقت ان کے پاس آنا چاہیے، جب گھڑی کی گھنٹے کی سوئی پانچ کے ہندسے پر پہنچ جائے۔ اس میں ایک لمحے کی کمی بیشی بھی انھیں ناگوار ہوگی۔ یہ الگ مسئلہ ہے کہ دیر سے آنے والے کی پذیرائی بھی کر دیتے تھے۔ گوشکن آلود پیشانی کے ساتھ!

تو یہ ہیں پروفیسر حمید احمد خاں میرے محترم، میرے شفیق اُستاد، جنھوں نے نفاست کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا تھا جنھوں نے نفاست کو گہری معنویت بخشی تھی اور جو آج دنیا سے ہمیشہ کے لیے رُخصت ہو رہے ہیں اور مجھے فکر ہے کہ گرد آلود ہوا ان کا کفن میلا نہ کر دے۔ کوئی اس آندھی کو روک نہیں سکتا۔ کون روکے گا۔ ایک جاپانی شاعر تھا جس نے کہا تھا:

باغ کے تختے پر لکھا ہے کہ پھول مت توڑو
مگر ہوا یہ بات نہیں پڑھ سکتی

اور آندھی کو کون سمجھائے کہ تو اس شخص کا کفن میلا نہ کر اس کی زندگی سراپا نفاست تھی۔

کاش آندھی یہ بات سمجھ سکے۔

خلیفہ عبدالحکیم

ڈاکٹر محمد آصف اعوان

برصغیر میں اسلامی قومیت اور تشخص کی نشاۃ الثانیہ کے حوالے سے جن افراد نے کام کیا ان میں علامہ محمد اقبال کے بعد انہیں کی روش پر عمل پیرا لوگوں کی فہرست میں بجا طور پر ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کا نام اولیت کا مستحق قرار دیا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کو قدرت کی جانب سے ایسی تخلیقی و تعمیری صلاحیتیں ودیعت کی گئی تھیں جنھیں بروئے کار لا کر انھوں نے ادب مذہب اور فکر و فلسفہ میں نیک نامی بھی کمائی اور عصری فکری ضروریات کے تحت عوام الناس کی تشنگی کو کم کرنے کا سامان بھی کیا۔ خلیفہ صاحب ہمہ گیر اور کثیر الجہت شخصیت کے مالک تھے۔ وہ بیک وقت روشن خیال، مفکر و فلسفی، صاحبِ طرز شاعر، ممتاز نقاد، ماہرِ اقبالیات، محقق، بلند پایہ مترجم اور معلم تھے۔ ان کی ذات کا ایک اور حوالہ اُردو اور انگریزی زبانوں پر عبور بھی تھا۔ ان کی زندگی فکر و نظر سے مالا مال رہی اور اسی میدان میں عزمِ مصمم، ان تھک محنت و جستجو اور کچھ کر گزرنے کی لگن نے انہیں اربابِ عقل و عقد میں اہم مقام سے بھی نوازا۔

سوانحی حالات:

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم نے یکم جولائی ۱۸۸۳ء کو پنجاب کے شہر لاہور میں اندرونِ اکبری دروازہ کے ایک محلے ''چہل بیبیاں'' میں آنکھ کھولی۔ ان کے اجداد کشمیری الاصل ڈار خاندان سے تعلق رکھتے تھے لیکن بعد میں وہ ڈوگر مظالم سے تنگ آ کر لاہور کی جانب ہجرت کر گئے تھے۔ خاندانی پیشہ پشمینے اور ڈوری بافی کے کام کے ماہر اُستاد ہونے کی وجہ سے نام کے ساتھ ''خلیفہ'' کا سابقہ لگا دیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے خاندان کے اکثر مرد حضرات خلیفہ کہلائے۔ ان کے سوانحی

حالات کے بارے میں ڈاکٹر تسکینہ فاضل لکھتی ہیں:

''خلیفہ صاحب کشمیر کے ایک ڈار خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ان کے والد بزرگوار کا نام خلیفہ عبدالرحمان تھا جو پرانی وضع کے آدمی تھے اور مذہب کے بہت پابند تھے۔''(۱)

ان کے شجرہ نسب پر غور کیا جائے تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے جدامجد یحییٰ ڈار رانکٹر تحصیل پلوامہ سے تعلق رکھتے تھے۔ان کے پانچ بیٹے تھے،جن میں سے جعفر ڈار خلیفہ عبدالحکیم کے پڑدادا بنے۔جعفر ڈار کی اولاد میں سے صرف ایک بیٹا رمضان ڈار تھا۔اللہ تعالیٰ نے رمضان ڈار کو تین بیٹوں سے نوازا جن میں سے خلیفہ عبدالرحمان مرحوم کی شادی محترمہ رحیم بی بی سے ہوئی۔رحیم بی بی کے بطن سے اولادِ نرینہ میں خلیفہ عبدالحکیم اور ان کے دو بھائیوں خلیفہ عبدالغنی اور خلیفہ عبدالواحد نے جنم لیا۔ان کے والد محترم خلیفہ عبدالرحمان ان کے بچپن ہی میں انتقال کر گئے جس کے بعد انہیں زندگی کی مشکلات نے آگھیرا۔

خلیفہ عبدالحکیم کی تعلیم کا آغاز دینی تعلیم کی صورت میں گھر سے ہوا جب کہ دنیاوی تعلیم کا آغاز بھی لاہور ہی سے کیا اور میٹرک کرنے کے بعد ۱۹۱۳ء میں علی گڑھ سے ایف اے کا امتحان پاس کیا۔اس کے بعد گریجویشن اور ماسٹر کی تعلیم کے لیے ان کا تعلق دہلی کے سینٹ اسٹیفن کالج سے جڑ گیا۔ چنانچہ انہوں نے بی اے اور ایم (فلسفہ) کی تعلیم سینٹ اسٹیفن کالج (دہلی یونیورسٹی) سے حاصل کی۔ بعد ازاں لاہور سے ایل ایل بی کی ڈگری لی لیکن اپنے مزاج سے ہم آہنگی نہ ہونے کے باعث اس میدان کو چھوڑ دیا۔اس حوالے سے ان کے ''شریمد بھوت گیتا'' کے منظوم ترجمے میں جو تعارف پیش کیا گیا ہے اس میں تحریر ہے:

''پھر لاہور واپس آ کر ایل ایل بی کی سند حاصل کی لیکن انہیں وکالت سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔جلد ہی اپنے رجحان کے مطابق کام مل گیا۔''(۲)

۱۹۱۹ء میں علامہ محمد اقبال کی سفارش پر حیدر آباد، دکن میں نئی قائم شدہ عثمانیہ یونیورسٹی میں فلسفے کے اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہوئے۔۱۹۹۲ء میں جرمنی کی ہائیڈل برگ یونیورسٹی کا رخ کیا جہاں رومی کے مابعد الطبیعیات Metaphysics of Rumi کے موضوع پر ۱۹۳۵ء میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری عطا کی گئی۔حیدر آباد واپسی پر وہ پروفیسر اور صدر شعبہ مقرر ہوئے لیکن ۱۹۴۹ء

میں ملازمت سے سبکدوش ہو گئے۔ ۱۹۴۹ء میں وہ پاکستان تشریف لے آئے اور یہاں ادارہ ثقافت اسلامیہ کی بنیاد رکھی۔وہ اس ادارے کے ڈائریکٹر کی خدمات انجام دیتے رہے۔

شاہد حسین رزاقی نے اپنے مقالی ''تاثرات'' میں ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کی زندگی کو تین ادوار میں تقسیم کیا ہے جس میں پہلا دور طالب علمی کا زمانہ وہ زمانہ ہے جو ان کی پرائمری کی تعلیم سے سینٹ اسٹیفن کالج دہلی تک ختم ہوتا ہے۔ دوسرا دور جامعہ عثمانیہ میں شعبہ فلسفہ کے مدرس سے شروع ہو کر اگلے تیس سال پر محیط ہے اور تیسرا دور پاکستان آنے اور ادارہ ثقافت اسلامیہ کی سربراہی کے عرصے پر مشتمل ہے۔شاہد حسین رزاقی ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کے پہلے دور کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اس زمانہ میں خلیفہ صاحب ایک ذہین طالب علم،سحر بیان مقرر اور خوش گو شاعر کی حیثیت سے دوسرے تمام طلبہ سے ممتاز رہے جس کا اندازہ اس شمارہ میں خلیفہ صاحب کے بعض پرانے دوستوں کے مضامین سے ہوسکتا ہے۔''(۳)

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کی ازدواجی زندگی کی تفصیلات کی جانب جائیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کی شادی ۳۱ جنوری ۱۹۲۰ء کو خدیجہ بیگم سے ہوئی۔شادی کے وقت خلیفہ صاحب کی عمر ۲۷ سال اور ان کی زوجہ خدیجہ بیگم کی عمر ۱۹ سال تھی۔اللہ تعالیٰ نے انہیں پہلی نرینہ اولاد میں عارف حکیم سے نوازا۔اس کے بعد بیٹی صوفیہ کی پیدائش ہوئی پھر دوسری بیٹی رفیہ حسن دنیا میں آئیں۔ ڈاکٹر صاحب نے تینوں بچوں کے لیے اعلیٰ تعلیم کے حصول کا انتظام کیا۔ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم نے بھرپور ازدواجی اور پیشہ ورانہ زندگی گزارتے ہوئے ۳۰ جون ۱۹۵۹ء کو ۶۵ سال کی عمر میں لاہور میں وفات پائی۔

شخصیت اور کردار:

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم پہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔وہ صحت مند، مناسب ڈیل ڈول کے ساتھ نسبتاً بلند قامت اور کھلتے رنگ کے مالک تھے۔انکے حوالے سے ماہنامہ ''ثقافت'' کے خصوصی نمبر میں جن مقالہ نگاروں نے اظہار خیال کیا ہے ان میں سے ایک ایران سے تعلق رکھنے والی ڈاکٹر لچکینہ کاظمی اپنے مقالے ''پاکستان کا ایک عظیم ترین فرزند'' میں لکھتی ہیں کہ ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم ایک:

''معمر شخص تھا جس کے تروتازہ چہرے پر مسکراہٹ رہتی اور چہرے بشرے سے وقار ٹپکتا اور اس کی شخصیت کچھ ایسی اثر آفریں تھی کہ ایرانی اس کی تعظیم اور پیشوائی کے لیے سروقد کھڑے ہوگئے۔'' (۴)

ممتاز اختر ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کے بارے میں لکھتی ہیں کہ وہ ایک متجر عالم ہونے کے باوجود ایک محفل آرا، شگفتہ بیاں، بذلہ سنج اور خوش طبع انسان تھے۔ ان کی شگفتگی اور خوش طبعی دراصل ان کی انسان دوستی اور انسان نوازی کی مظہر تھیں۔ طرافت اور بذلہ سنجی نے ان کی شخصیت میں ایک ایسی لچک اور لطافت پیدا کردی تھی جو ان کے وسیع اور دقیع علم کو ثقالت و یبوست کا شکار نہیں ہونے دیتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایک مثالی معلم تھے (۵)۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کے قد کاٹھ اور ڈیل ڈول پر روشنی ڈالتے ہوئے محمد وارث اپنے مقالے ''پہلی اور آخری ملاقات'' میں لکھتے ہیں کہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم:

''اچھے خاصے جسم وضخامت کے مالک اور چہرے بشرے سے شگفتگی ٹپکتی تھی۔'' (۶)

قاضی محمد اسلم کے مطابق جہاں خلیفہ صاحب کی شخصیت کے دیگر کئی اور پہلو بھی تھے، وہیں ان کا رنگ، لباس اور شکل بھی خوبصورتی کی علامات تھیں۔ لکھتے ہیں:

''خلیفہ صاحب خوش لباس، خوش شکل اور گورے چٹے نوجوان تھے۔'' (۷)

اختر حسین نے بھی ان کی ادبی وثقافتی خدمات کو سراہتے ہوئے تحریر کیا کہ وہ صاحبِ فضل و کمال اور ایک ایسے فلسفی تھے جن کے اعلیٰ کارناموں کی ان کے نزدیک بڑی وقعت ہے۔ قیام پاکستان کے بعد قلیل مدت میں موصوف نے ادبی وثقافتی میدان میں جو خدمات انجام دی ہیں وہ نہایت قدر و منزلت کی مستحق ہیں۔ (۸)

ڈاکٹر صاحب کی شخصیت و کردار پر روشنی ڈالتے ہوئے تسکینہ فاضل لکھتی ہیں:

''ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم ایک پہلودار شخصیت کا نام ہے۔ وہ ایک مشہور و معروف اعلیٰ پایہ کے مصنف، صاحبِ طرز ادیب، خوش فکر شاعر ہونے کے علاوہ ایک روشن خیال مفکر بھی تھے۔'' (۹)

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کی زندگی کے کوائف سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ علی الصبح اٹھنے کے عادی تھے۔ پھر چائے پینے کے بعد مطالعے میں مصروف ہوجاتے۔ صبح آٹھ بجے کے لگ بھگ ناشتے

کے بعد اخبار نویسی کرتے اور پھر دوبارہ مطالعے میں مصروف ہوجاتے۔ حیدرآباد قیام کے زمانے میں وہ جامعہ عثمانیہ کا دیر سے رخ کرتے اور جلد فارغ ہر کر گھر لوٹ آتے لیکن لاہور آنے کے بعد ان کی اس عادت میں خاصی تبدیلی آگئی تھی۔ اسی حوالے سے ممتاز اختر مرزا لکھتی ہیں:

''حیدرآباد میں تھے تو گیارہ بجے یونیورسٹی پہنچ کر ڈیڑھ بجے واپس آجاتے لیکن لاہور میں جب ادارہ ثقافت اسلامیہ کے ڈائریکٹر کے فرائض سنبھالے تو صبح نو بجے جو جاتے تو پورے ڈھائی بجے واپس آجاتے تھے۔ دوپہر کے کھانے کے بعد قیلولے کے بھی عادی تھے۔'' (۱۰)

سگریٹ نوشی بھی ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کی عادات میں شامل تھی۔ انہیں سرد موسم پسند تھا جبکہ گرمی اور شور دونوں ہی سے چڑ تھی۔ گھر پر بھی مطالعہ کرتے تو کوشش یہی ہوتی کہ خاموشی ہو اور کوئی تنگ نہ کرے۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کے حیدرآباد دکن میں قیام کو موضوع بناتے ہوئے ہارون خاں شروانی نے مقالہ تحریر کیا ہے جس میں انھوں نے ان کی طبیعت کے لاابالی پن پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کے لباس کے بارے میں لکھا ہے:

''بہت سے فلسفی نوجوان شعراء کی طرح خلیفہ صاحب کے مزاج میں لاابالی پن تھا مگر کپڑے وہ بہت نفیس پہنتے تھے۔ تازہ ولایت پاس قسم کے لوگوں کی طرح پتلون کی شکن، ٹائی اور کالر کا ہمیشہ خیال رکھتے۔'' (۱۱)

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم شلوار قمیض بھی پہنتے تھے اور شیروانی کے ساتھ سر پر مخصوص قسم کی ٹوپی بھی رکھتے تھے جس کا ثبوت ان کی تصاویر سے بھی ملتا ہے۔ ان کی شخصیت گل رنگ تھی اور ان کے باطن کا نور ان کے ظاہر سے بھی عیاں ہوتا تھا۔ خلیفہ صاحب کی زندگی کا ایک مضبوط حوالہ بطور مدرس خدمات بھی ہے۔ انہوں نے مدرس کے طور پر ہمیشہ شفقت، محبت اور لگن سے کام کیا۔ پڑھانے کا انداز ایسا جاندار، تحقیقی اور مسحور کن ہوتا کہ طالب علموں کو کسی قسم کی مشکل درپیش نہ آتی۔ فلسفہ اور منطق جیسے مضامین بھی ان کے ہاتھ میں موم کا کھلونا ثابت ہوتے۔

خلیفہ صاحب کی تصانیف:

خلیفہ صاحب ساری زندگی ادب، فلسفہ اور مذہب کی خدمات میں جتے رہے۔ ان کی

زندگی کو خادمِ ادب کی زندگی سے تعبیر کیا جائے تو بھی غلط نہیں۔

فکرِ اقبال:

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کی یہ کتاب انہیں اقبال شناسوں اور ماہرینِ اقبالیات میں اہم مقام بخشنے میں کامیاب ہو چکی ہے۔ فکرِ اقبال ایک ایسی کتاب ہے جو اجمالی طور پر اقبال کی نظم و نثر میں موجود فکر کا احاطہ کرتی ہے۔ اس کتاب کو بیس ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ان ابواب کے مندرجات ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کی فکرِ اقبال سے گہری شناسائی کے گواہ ہیں۔ خلیفہ صاحب نے نہایت عمیق نظری سے افکارِ اقبال کا تجزیہ کیا ہے۔ وہ چوں کہ خود ایک فلسفیانہ ذہن اور مزاج بھی رکھتے تھے اس لیے اقبال کی فکر کے فلسفیانہ مباحث کا جس مہارت اور محنت و کاوش سے انہوں نے احاطہ کیا ہے وہ انہیں کا حصہ تھا۔ کتاب کے آخر میں خلیفہ صاحب نے اقبال کے ساتھ انگریزی خطبات کا خلاصہ بھی شامل کر کے کتاب کی جامعیت میں اضافہ کر دیا ہے۔

تلخیص خطباتِ اقبال:

خلیفہ عبدالحکیم کی اس کتاب کو فکرِ اقبال کی ہی اگلی قسط کہا جا سکتا ہے۔ انہوں نے اپنی کتاب ''فکرِ اقبال'' میں صراحت کے ساتھ اقبال کے سات انگریزی خطبات "The Recconstruction of Religious Thought in Islam" کے بارے میں اظہارِ خیال کر دیا تھا۔ ان کی وفات کے بعد ''تلخیص خطباتِ اقبال'' کے عنوان سے ڈاکٹر طارق عزیز نے خلیفہ صاحب کی خطبات کی تلخیص کی کاوش کو تدوین کیا اور ڈاکٹر وحید قریشی نے بطور ناشر اسے بزمِ اقبال لاہور سے ۱۹۸۸ء میں شائع کیا۔ ساتوں خطبات کو سات ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ یہ کتاب خطبات کو سمجھنے کے حوالے سے نہایت کارآمد ہے البتہ کہیں کہیں بہتری کی گنجائش بھی موجود ہے۔

اقبال اور مُلا:

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کی یہ کتاب محض ۳۰ صفحات پر مشتمل ہے جس کی وجہ اسے کتاب کے بجائے کتابچہ کہنا زیادہ بہتر ہے۔ اس مختصر سی کتاب میں خلیفہ صاحب نے اقبال کے روایتی ملا کے بارے میں خیالات کو قلم بند کیا ہے۔ یہ کتاب بزمِ اقبال لاہور نے شائع کی ہے۔

حکمتِ رومی:

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کی یہ کاوش جو ادارہ ثقافت اسلامیہ کی جانب سے ۱۹۵۵ء میں شائع ہوئی ان کی رومی سے محبت اور ان کے کلام کے شارح ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ رومی کی مثنوی تشبیہات و استعارات کا خزینہ ہیں۔ اس مثنوی کو آسان کرنے اور عام فہم بنانے کے حوالے سے خلیفہ عبدالحکیم کی یہ کاوش بہت اہم ہے۔ کتاب ۲۹۷ صفحات پر مشتمل ہے جس میں سے پہلے ۲۲ صفحات پر دیباچہ دیا گیا ہے۔ کتاب چونکہ شرح کی طرز کی ہے اس لیے ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم نے اسے جا بجا مختلف فلسفیانہ مباحث اور قرآن و حدیث کے حوالوں سے مزین کیا ہے۔ خلیفہ صاحب کی اس کتاب کے بارے میں ممتاز اختر مرزا، خلیفہ عبدالحکیم کی فکر اور کوشش کے حوالے سے لکھتی ہیں کہ:

> ''حکمتِ رومی میں رومی کی مثنوی میں پوشیدہ اسرار کو آشکار کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ مثنوی مطالب کے لحاظ سے ایسا سمندر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں لیکن خلیفہ صاحب نے ان اسرار و رموز کی جو مفکرانہ تفسیر کی ہے وہ کسی دوسرے کے حصے میں نہیں آئی۔''(۱۲)

ڈاکٹر سید عبدالہ رومی سے خلیفہ عبدالحکیم کے تعلق اور حکمتِ رومی کے بارے میں رقم طراز ہیں:

> ''رومی سے خلیفہ صاحب کا تعلق بلا واسطہ بھی ہے اور اقبال کے واسطے سے بھی ہے۔ ان کی کتاب حکمتِ رومی پرانی ہے تشبیہاتِ رومی آخری زمانے میں لکھی ہونی چیز ہے۔ حکمتِ رومی اگرچہ رومی کے اسرار کو آشکار کرنے کی سعی ہے مگر اس میں بھی خلیفہ صاحب کا اپنا میلانِ فکر نمایاں ہو جاتا ہے۔''(۱۳)

تشبیہاتِ رومی:

یہ کتاب بھی ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کی رومی سے محبت اور ان کے علم سے فیض یابی کے ساتھ ساتھ اس پر گرفت کی دلالت کرتی ہے۔ اسے ادارہ ثقافت اسلامیہ کی جانب سے ۱۹۵۹ء میں شائع کیا گیا اور کتاب کی ضخامت ۵۵۳ صفحات تھی۔ یہ کتاب ان کی زندگی کی آخری کتاب بھی تھی۔ اس کتاب کے بارے میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے ممتاز اختر لکھتی ہیں:

''خلیفہ صاحب کی تصنیف تشبیہات رومی اپنے موضوع کے لحاظ سے ایک اچھوتی کشش رکھتی ہے اس کی وجہ وہ کشش ہے جو خلیفہ صاحب رومی کے لیے رکھتے تھے۔ رومی سے آپ کی دلچسپی باقی ساری دلچسپیوں پر حاوی رہی۔'' (۱۴)

کتاب کل چھ ابواب پر مشتمل ہے۔ سب سے پہلے بشیر احمد ڈار کی جانب سے پیش لفظ ہے، اس کے بعد ''تشبیہہ و تمثیل'' کے عنوان کے تحت خلیفہ عبدالحکیم کا تعارفی مضمون ہے۔ اس کے بعد پہلا باب ''دفتر اول''، دوسرا باب ''دفتر دوم''، تیسرا باب ''دفتر سوم''، چوتھا باب ''دفتر چہارم''، پانچواں باب ''دفتر پنجم'' اور چھٹا باب ''دفتر ششم'' کے عنوانات کے تحت ترتیب دیا گیا ہے۔ کتاب کا اسلوب ادبی اور فلسفیانہ ہے۔

Metaphysics of Rumi:

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کی یہ کاوش ان کا ڈاکٹریٹ کا تحقیقی مقالہ ہے جو ادارہ ثقافتِ اسلامیہ نے کتابی صورت میں شائع کیا۔ اس کا دیباچہ بھی بشیر احمد ڈار نے تحریر کیا ہے۔ انہوں نے رومی کے تعارف کے ساتھ ساتھ خلیفہ عبدالحکیم کی اس کاوش کو دل و جان سے سراہتے ہوئے لکھا ہے:

"Originally submitted as a doctorate thesis at the Heidlberg University (Germany) in 1925 for D.Phill degree, The Metaphysics of Rumi is an excellent attempt at explaining this basic thought of Rumi in the context of the ciltural achivements of Muslim Philosphers, mystics and scholastics".(۱۵)

کتاب کو دس ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

1. "Introduction", 2. "Nature of the Soul", 3."The Problem of the Creation", 4."Evolution", 5."Love", 6."Freedom of the Will", 7."The Ideal Man", 8."The Survival of Personality", 9."God", 10."Sufi Fantheism".

افکار غالب:

افکار غالب سے متعلق خلیفہ عبدالحکیم کی یہ کتاب دسمبر ۱۹۵۴ء میں شائع ہوئی۔ خلیفہ عبد الحکیم اُردو ادب کے ان معدودے چند شخصیات میں سے ہیں جنہوں نے بیک وقت دو مختلف فکر دھاروں کو قابو کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایک طرف وہ ماہرِ اقبالیات کی حیثیت میں سامنے آتے ہیں تو دوسری طرف انہوں نے ماہر غالبیات کے حوالے سے بھی اپنا لوہا منوایا ہے۔ اس کتاب کو خلیفہ عبدالحکیم نے چھ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ اس کتاب کا ''مقدمہ'' ۶۸ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ مقدمے کی ضخامت سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ اس کتاب کو تحریر کرنے کے پس منظر میں خلیفہ صاحب کے دماغ میں غالب کی محبت اور عظمت کے نقوش کس قدر گہرے اور مضبوط ہیں۔ کتاب ۵۲۱ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں غالب کے افکار پر جس طرح روشنی ڈالی گئی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اسے شروح غالب کے سلسلے کی نئی کڑی اور نئی توانائی سے بھی تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

Islam & Communism:

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کی یہ کتاب جدید معاشی نظام ''کمیونزم'' کا تعارف پیش کرتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اس معاشی نظام کے جدید دنیا]راثرات کا احاطہ بھی کرتی ہے۔ خود خلیفہ صاحب نے اس کتاب کے دیباچے میں کمیونزم کو دنیا میں مروج مذہبیات اور انسانی سطح پر سماجی تار پود کے لیے ایک چیلنج قرار دیا ہے۔ وہ رقم طراز ہیں:

"Since the time of the Russian Communist Revolution and more so since the consolidatation and the ever growing military strenght of Russia, Communism has been challenge to the established order of things, Religion, Ethics, Economics, Politics, in short the intire fabric of human relations".(۱۶)

اس کتاب کے مطالعے سے قاری کمیونزم کے مقابلے میں اسلامی معاشی تعلیمات کی افادیت اور خیر و برکات سے بخوبی آگاہ ہوجاتا ہے۔ اس کتاب کو پہلی دفعہ ادارہ ثقافتِ اسلامیہ نے ۱۹۵۱ء میں شائع کیا۔ چودہ ابواب پر مشتمل یہ کتاب ۲۵۳ صفحات پر مشتمل ہے۔

:Islamic Ideology

یہ کتاب ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کی اسلام سے گہرہ محبت کی نمائندگی کرتی ہے۔انہوں نے اشتراکیت کے عروج کا زمانہ دیکھا ہے۔صنعتی ترقی اوراس کے اثرات سے لوگوں میں بڑھتے ہوئے فکری اورنفسیاتی انتشار نیز مادہ پرستی کی وجہ سے انسانوں کی اسلام سے دوری کو بھی دیکھا اس کتاب کو ترتیب دینے سے ان کا مقصد یہ تھا کہ دورِ حاضر میں اسلام کی حقانیت اورضرورت و اہمیت کو اجاگر کیا جا سکے۔ اس کتاب کے اب تک کل دس ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ آخری ایڈیشن ادارہ ثقافتِ اسلامیہ نے ۲۰۰۶ء میں شائع کیا۔کتاب کو پندرہ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے اورصفحات کی تعداد۳۴۳ ہے۔ یہ کتاب اپنے خوبصورت عنوانات وموضوعات کی وجہ سے عصر حاضر میں بھی ویسی ہی ضرورت واہمیت کی مستحق ہے جیسی خلیفہ صاحب کے دور میں تھی۔

:The Prophet (PBUH) and His Message

یہ کتاب بھی خلیفہ صاحب کی دیگر انگریزی کتب کی طرح ان کی اسلام سے محبت کی غماز ہے اس کتاب کا موضوع سیرتِ رسول ﷺ ہے۔کتاب کا اسلوب فلسفیانہ ہے۔خلیفہ صاحب نے نہایت تفصیل کے ساتھ عرب معاشرے اوراس کی جزئیات کا احاطہ کیا ہے۔کتاب کے مطالعے سے قاری نہ صرف جناب رسالت مآب ﷺ کی حیاتِ اقدس سے آگاہ ہوتا ہے بلکہ جدید افکار کی روشنی میں سیرت کے فکری پہلوؤں کی تفہیم بھی حاصل کرتا ہے۔

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کی ترجمہ کردہ کتب میں پہلا نام ''مختصر تاریخِ فلسفۂ یونان'' کا ہے۔ یہ کتاب ڈاکٹر ویلہم نیسل کی تصنیف ہے۔خلیفہ صاحب نے اسے جرمن زبان سے اُردو میں ترجمہ کیا ہے۔دوسری اہم کتاب ہندوفکر وفلسفہ پر مشتمل ''شریمد بھگوت گیتا'' ہے۔اس کتاب کا منظوم اُردو ترجمہ کیا ہے۔معروف افسانہ نویس خاص طور پر اس کتاب کے ترجمے پر اظہار رائے کرتے ہوئے خلیفہ عبدالحکیم کو ان الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا ہے:

> ''اصل میں خلیفہ صاحب کی جیت یہ ہے کہ وہ افکار وتصورات کی دنیا کے آدمی ہیں اور فلسفہ کے شناور ہیں۔اور پھر اُردو زبان و بیان پر پوری قدرت رکھتے ہیں۔اور اگرچہ وہ اسلامی افکار وتصورات کے شارح کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں مگر قبیح حرکت انہوں نے کبھی نہیں کی ہے کہ ویدانتی فکر نے جو اپنی زبان بنائی ہے اور اپنی

> اصطلاحات وضع کی ہیں انہیں اندھا دُھند اسلامی نظامِ فکر کے تحت وضع کردہ اصطلاحات میں منتقل کرتے چلے جائیں اور سمجھ لیں کہ ترجمہ کا حق ادا ہو گیا۔''(۱۷)

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کی دیگر کتب میں ''نفسیات ورداتِ روحانی'' اور ''اسلام کی بنیادی حقیقتیں'' شامل ہیں۔ان کی ادبی اور علمی خدمات پر بہت سے کام ہو چکے ہیں۔ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی کی ''کلامِ حکیم'' شاہد حسین رزاقی کی ''مقالاتِ حکیم'' ممتاز اختر مرزا کا تحقیقی مقالہ ''خلیفہ عبدالحکیم سوانح وادبی خدمات'' اور ثقافتِ اسلامیہ کے مجلّہ ''ثقافت'' کا خصوصی نمبر اس حوالے سے خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

حوالہ جات

۱۔تسکینہ فاضل، ڈاکٹر، ''اقبال اوران کے معاصر شعرا وادباء''، سری نگر: فاضل پبلی کیشنز، س ن، ص۵۶۴

۲۔خلیفہ عبدالحکیم، ڈاکٹر، ''شریمد بھگوت گیتا'' منظوم ترجمہ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور۔۲۰۰۸ء، ص۱۶

۳۔ماہنامہ ثقافت، خلیفہ عبدالحکیم نمبر، مقالہ از شاہد حسین رزاقی، جون جولائی ۱۹۶۰ء، جلد۰۸، شمارہ نمبر۰۶۷، مدیر: ایم ایم شریف، لاہور: ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، ص۵

۴۔ایضاً، ثقافت ''پاکستان کا ایک عظیم ترین فرزند'' مقالہ ڈاکٹر لچکینہ کاظمی، ص۸۹

۵۔ممتاز، اختر، مرزا، ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم (سوانح وادبی خدمات) لاہور: ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، ۲۰۱۰ء، ص ح

۶۔محولا بالا نمبر۳، ''پہلی اور آخری ملاقات'' مقالہ از محمد وارث، ص۱۲۶

۷۔اقبال ریویو، جلد۶ ش رجنوری ۱۹۶۶ء، ''ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم مرحوم'' مقالہ از قاضی ایم اسلم، ص۱

۸۔محولا بالا نمبر۳، ''قدر ومنزلت کی مستحق خدمات''، مقالہ از اختر حسین، ص۲۱

۹۔تسکینہ فاضل، ڈاکٹر، ''اقبال اوران کے معاصر شعراوادباء، سری نگر: فاضل پبلی کیشنز، س ن، ص ۵۶۴
۱۰۔ممتاز اختر، مرزا، ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم (سوانح وادبی خدمات) لاہور: ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، ۲۰۱۰ء، ص ۴۴
۱۱۔محولا بالا نمبر ۳، ''خلیفہ عبدالحکیم کا حیدرآباد دکن میں قیام'' مقالہ از ہارون خاں شروانی، ص ۲۷
۱۲۔ایضاً، ص ۹۲
۱۳۔محولا بالا نمبر ۳، ''مرحوم ڈاکٹر خلیفہ کا حکیمانہ ادب'' مقالہ از ڈاکٹر سید عبداللہ، ص ۴۸
۱۴۔ممتاز اختر، مرزا، ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم (سوانح وادبی خدمات) لاہور: ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، ۲۰۱۰ء، ص ۱۳۳
۱۵۔ Khalifa Abdul Hakeem, Dr. "Metaphysics of Rumi", Lahore: The Institute of Islamic Culture, 1959, P-4
۱۶۔ایضاً، P-II۔
۱۷۔خلیفہ عبدالحکیم، ''شریمد بھگوت گیتا'' منظوم ترجمہ، پیش لفظ از انتظار حسین، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء، ص ۰۸

پروفیسر خلیل صدیقی

پروفیسر ڈاکٹر انوار احمد

اپنی کتاب 'زبان کا ارتقا' کی تعارفی تقریب منعقدہ ۱۹۷۸ میں ''میں اور میرا فن'' کے عنوان سے خلاف معمول خلیل صدیقی بہت تفصیل سے ہم کلام ہیں، اس لئے اس میں سے ایک طویل اقتباس پیشِ خدمت ہے:

''جنوبی ایشیا جو کبھی برطانوی ہند کہلاتا تھا، اس کے بیچوں بیچ، ایک خطہ زمردیں تھا، ایک وادی کا بالائی حصہ، شمالاً کوہ وندھیاچل، جنوباً کوہ ست پڑا کے سرسبز سلسلے، شرقاً امرکنٹک اور اس کے گھنے جنگلات دریائے نرندا کا دیس کہ کبھی گھنے درختوں سے ڈھکا ہوا تھا، قریب ہی امرکنٹک کے دامن میں وہ روایتی طلسم کدہ تھا، جس کی داستان نے تحفہ مجالس سلاطین (اردو مثنوی ۱۰۵۳ھ)، قصہ گل بکاؤلی (عزت اللہ بنگالی)، مثنوی باغ و بہار (ریحان لکھنوی)، مذہب عشق (نہال چند لاہوری) گلزار نسیم (دیا شنکر نسیم) کو جنم دیا۔۔ماقبل تاریخ دور میں برصغیر پر دراوڑوں کی یلغار ہوئی تو کول منڈا قبائل نے یہاں پناہ لی، آریوں نے یورش کی تو گونڈوں نے اس کے دامن میں امان پائی۔اکبری طالع آزماؤں نے رانی درگا وتی کو شکست دے کر گڑھ منڈلہ کو مسخر کیا تو ایک نئی تہذیب کا عمل دخل بھی ہوا۔ بھانت بھانت کے لسانی کنبوں کے صوتی مظاہر بکھرتے رہے، کول منڈا، دراوڑی اور ہند آریائی۔۔۔اس بین اللسانی گہما گہمی کے شہر (جبل پور) میں میں نے ہوش کی آنکھیں کھولیں، اولیں زبانیں جو سننے میں آئیں، وہ یہ تھیں، اردو، دکنی اور اُڑیا، پھر پوربیہ، مراٹھی، تلگو، چھتیس گڑھی، گجراتی اور پنجابی کی باری آئی، اس لسانی جنت نے عجیب سا

احساس پیدا کیا۔۔۔۔۔ میونسپل ڈسٹرکٹ لائبریری جبل پور کی اُردو، ہندی اور انگریزی کتابوں کے انتخاب اور فراہمی کے اعزازی فریضے نے ساحل مراد تک پہنچنے کے سامان فراہم کر دیئے۔ ''علم اللسان'' (سید احمد دہلوی) ''سخندان فارس'' (آزاد) ''لسان ومطالعہ لسان'' (ترجمہ از حمید اللہ) نے پہلی بار ''لسانیات'' سے آگاہ کیا۔ یہ تو بعد میں معلوم ہوا کہ موخر الذکر ناقص اور غیر مکمل ترجمہ ہے۔ وھٹنے کی کتاب کا اور غریب مصنف کے نام کو بگاڑنے میں بھی کوئی کسر نہ چھوڑی گئی تھی، پھر ''پنجاب میں اُردو'' (شیرانی) ہندوستانی لسانیات (زور) اور ''آریائی زبانیں'' (سدھیشو ورما) نے تشنگی اور بڑھائی بھنڈار کر اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ (پونا) کے کچھ کارناموں سے استفادے کا موقع ملا۔ بھنڈار کر اور سنیتی کمار چیٹر جی سے تھوڑی بہت خوشہ چینی کرنے کا اتفاق ہوا تو دنیائے لسانیات کی وسعت وجامعیت کا احساس ہوا اور لسانیات کی باقاعدہ تعلیم کا شوق چرایا۔ لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات، وسائل محدود، تشنگی بجھانے کے سرچشمے مقامی طور پر مفقود۔ سات سمندر پار رسائی نہیں جہاں تک رسائی ممکن ہوتی کتب خانے کھنگالتا۔ انباروں میں گوہر مراد کی تلاش زیادہ کامیاب نہ سہی، یکسر ناکام بھی نہ رہی، جو کچھ ہاتھ آیا، فرط اشتیاق سے چوما، سمجھنے کے جتن کئے، بادیہ پیمائی کے دوران کانٹے چبھتے تو کبھی کبھار کوئی گلِ مراد بھی ملتا۔ آخر میکس مُلر اور وھٹنے تک رسائی بھی ہوگئی، انہوں نے دھندلی راہوں میں کچھ اجالا کیا۔ تحصیلات نہاں خانۂ دل میں سینت سینت کر رکھتا رہا۔ کاغذ پر منتقل کرتا اور سرمۂ نظر بناتا رہا۔

پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے طفیل سپارگو، گراف، بلوم فیلڈ، ساپر، یسپرسن، کیرول، سوئیٹ، ہاکٹ، روبنس، ایبر کرومبی، سڈنی ایلین، ساسور اور بیسیوں دوسرے ماہرین لسانیات سے روشناسی ہوئی اور ان کی بدولت ریسک، گرم، بوپ، ہمبولٹ، شلیخر، شیگل، پال وغیرہ سے تعارف ہوا، پھر برصغیر کی زبانوں کے ذیل میں کاڈویل، بیمز، ہیورنلے، جیولز بلاک، اوبرین، ٹرمپ، مارس لیوی وغیرہ تک رسائی ہوئی۔ سنڈیمن لائبریری کوئٹہ نے گریرسن کے عظیم کارنامے سے براہ راست استفادے کا موقع دیا۔ ''بلیک ویلز'' اور ''لیوزاک اینڈ کو'' (لندن) کے وسیلے سے سنسکرت اور پراکرتوں سے متعلق معلومات کے موقع ملے پشل وولز، چیٹر جی، کاترے، سین، اے ایم گھٹاگے وغیرہ کی کتابیں ہاتھ آئیں اور ان سب سے بساط بھر خوشہ چینی کی۔ ڈاکٹر مسعود حسین خان، ڈاکٹر شوکت سبزواری، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور ڈاکٹر سہیل بخاری

کی فروزاں کی ہوئی لسانیاتی شمعوں نے بھی میری راہ میں اُجالا کیا لیکن لسانیاتی مسائل سے متعلق ایسی تحریریں بھی نظر سے گزریں جن سے یہ معلوم ہوا کہ لسانیات کی مبادیات، اس کے اصول اور مطالعہ زبان کے مناہج سے ناواقفیت کیا کیا گل کھلاتی ہے۔ ان تحریروں پر جن آراء کا اظہار کیا جاتا رہا ہے ان سے اندازہ ہوا کہ کسی علم کے مطالعاتی مواد کی کمی کی وجہ سے ذہنی وعلمی گمراہی کتنی آسان ہوجاتی ہے۔۔۔۔ راقم الحروف سے ایک کوتاہی ہوئی ہے جس کا اعتراف ضروری ہے چند نظریات مثلاً (Bow Wow Theory حکائی نظریہ) (Onomato Peotic Theory) اور (Sinious Theory) اہل مغرب سے سینکڑوں سال پہلے مسلم دنیا میں ابو ہاشم معتزلی یہ تحقیق پیش کر چکے تھے کہ زبان کا الٰہیاتی نظریہ درست نہیں بلکہ انسان نے اپنے نفس اور ماحول کے محرکات سے متاثر ہوکر اسے وضع کیا ہے۔ بعد میں ان کے متبعین نے اس کی تین صورتیں بیان کیں۔ اول یہ کہ انسان نے اردگرد کے حیوانات اور مظاہر قدرت کی آوازوں کو سن کر ان کی نقالی کی گویا اس صورت کو (Bow Wow Theory) اور حکائی نظریہ کا مجموعہ کہا جاسکتا ہے۔ دوسری صورت یہ کہ وضع اصوات کے فطری ملکہ نے وفورِ جذبات کے تحت صوتی اشارے وضع کئے جن کی بدولت زبان بتدریج وجود میں آئی۔ اسی نظریے کو جرمن ماہر لسانیات (W.H.J.Bleek) نے کئی سو سال بعد (Simious Theory) کے نام سے پیش کیا۔ تیسری صورت یہ ہے کہ مختلف خیالات کی ضربیں قوائے مدرکہ پر پڑتی رہیں تو ان کے باہمی تصادم نے آوازوں کی تحریک پیدا کی۔ گویا اس طرح زبان کے نفسیاتی محرکات اور آواز کی ادائی کی ابتدائی حالتوں کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے۔ علمی دیانت کا اقتضا یہ تھا کہ ان نظریات کا سہرا معتزلہ کے سر باندھا جاتا۔ زبان کے آغاز کے مسائل اور نظریات کے تحت جن مباحث کو سمیٹا گیا ہے ان سے متعلق سرسری باتیں اردو دنیا میں کہیں کہیں نظر آجاتی ہیں۔ راقم الحروف نے کوشش کی ہے کہ زیادہ سے زیادہ مغربی تحقیقات اور آراء سمیٹی جاسکیں۔'' (قلم قبیلہ جلد دوم۔ کوئٹہ ص: ۱۷۴ تا ۱۷۸)

۱۹۸۶ میں بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی ملتان میں پروفیسر خلیل صدیقی کے بارے میں تحقیقی مقالہ لکھتے ہوئے سیما صدیقی نے مندرجہ ذیل سوانحی معلومات فراہم کیں: ۱۔ والدین نے ان کا نام عبدالخلیل رکھا تھا ۲۔ پاکستان میں ملازمت کے لئے درخواست دی تو میٹرک کا سرٹیفکیٹ جبل پور میں رہ جانے کے سبب اندازے سے تاریخ پیدائش یکم جولائی ۱۹۲۰ لکھ دی، بعد میں میٹرک کا

سٹیفکیٹ ملا تو اس پر یکم جولائی ۱۹۲۲ درج تھا، مگر انہوں نے تصحیح کرانا مناسب خیال نہ کیا۔۳۔ والد عبدالشکور صدیقی اوسط درجے کے ٹھیکیدار تھے۴۔ خلیل صدیقی نے انٹر اور بی اے ہتھ کارنی سٹی کالج جبل پور سے کیا اور گریجوایشن ڈبل میتھس کے ساتھ کی۔ ۵۔ جبل پور سے ۵۷ میل دور کٹنی میں ایک سکول چند دوستوں کے ساتھ کھولا جہاں برائے نام تنخواہ پر ہیڈ ماسٹر رہے۶۔ ناگ پور یونیورسٹی سے پرائیویٹ امیدوار کے طور ایم اے فارسی اور ایم اے اردو اعزاز کے ساتھ کیا اور ہتھ کارنی سٹی کالج جبل پور میں ۱۹۴۴ میں لیکچرار ہو گئے اور ۴۷ تک یہیں پڑھایا ۷ یکم نومبر ۱۹۴۷ کو کراچی، پاکستان میں آ گئے۔ (پروفیسر خلیل صدیقی شخصیت وفن غیر مطبوعہ مقالہ)

پروفیسر خلیل صدیقی استاد، ماہر لسانیات، محقق، نقاد، شاعر اور بہت بڑے انسان تھے۔ جب کہ مجھ سمیت آج کے بیشتر اساتذہ جزوقتی ہیں۔ مسند ان سے محجوب ہے اور وہ اپنے منصب سے گریزاں یا معذرت خواہ، لیکن خلیل صدیقی حقیقت میں ان گنے چنے استادوں میں سے تھے جنہوں نے معلم کے تشخص کو حرمت اور اعتبار سے ہمکنار کیا۔ وہ ایک وسیع المطالعہ، ابلاغ پر قادر، سوالات کا حوصلہ دینے والے، سوالات کو اجزا میں تقسیم کر کے خود جواب تلاش کرنے کے قابل بنانے والے اپنے نقطۂ نظر کو بے باکی سے بیان کرنے والے، مشفق اور منکسر مزاج استاد تھے۔ مکالمے کا اشتیاق رکھنے والے شاگرد انہیں عزیز تھے، وہ گورنمنٹ کالج مستونگ، گورنمنٹ کالج خضدار، گورنمنٹ کالج فورٹ سنڈیمن (ژوب) اور گورنمنٹ کالج کوئٹہ کے پرنسپل، گورنمنٹ کالج بوسن روڈ ملتان کے صدر شعبہ اُردو اور وائس پرنسپل، ناظم تعلیمات بلوچستان، چیئرمین ثانوی تعلیمی بورڈ بلوچستان، ڈائریکٹر پاکستان سٹڈیز، بلوچستان یونیورسٹی اور وزیر اعلیٰ بلوچستان (نواب محمد اکبر بگٹی) کے امورِ تعلیم میں مشیر رہے، بلکہ جب پاکستان کی وزیرِ اعظم بے نظیر بھٹو اور اس وقت کے وزیر اعلیٰ بلوچستان، نواب اکبر خان بگٹی کے درمیان ۱۹۷۳ء کے آئین کی توضیح وتشریح کے حوالے سے جو خط کتابت ہوئی، اس میں بلوچستان کے مؤقف کو پروفیسر خلیل صدیقی نے ہی ڈرافٹ کیا، میں نے ان سے پوچھا تھا کہ انہوں نے اس تاریخی مراسلت کی کوئی نقل اپنے پاس رکھی، تو انہوں نے کہا بھئی یہ انتہائی خفیہ تھی، سو میں اپنا ڈرافٹ نواب بگٹی کو دینے کے بعد اسے جلا دیتا تھا۔

تاہم انہیں بلوچستان، ملتان اور پاکستان میں شاگرد احباب کی جانب سے جو عزت ومحبت

ریٹائرمنٹ کے بعد ملی وہ کرسیوں، دفتروں، گریڈوں دنیوی حشمت کے وسائل کے حرص میں مبتلا ہم ایسوں کے لیے ایک آئینہ ہے۔ بلوچستان سے ناواقف 'تجزیہ کار' جب وہاں 'تعصب' کی بات کرتے ہیں، تو بھول جاتے ہیں، کہ ۱۹۷۲ء میں جب نیشنل عوامی پارٹی کی حکومت بلوچستان میں قائم ہوئی، اور بلوچستان یونیورسٹی کا قیام بھی بی۔ ایس۔ او کی تحریک کے بعد عمل میں آیا، جیولاجیکل سروے آف پاکستان کی عمارت پر نوجوان لیڈر شپ نے یونیورسٹی کے نام کا بورڈ اور جھنڈا لگا دیا، تو جسٹس دراب پٹیل کو پہلے وائس چانسلر کا اضافی چارج دیا گیا، انہوں نے سب سے پہلے خلیل صدیقی صاحب کو بُلا کر اس یونیورسٹی کے ایکٹ کا ڈرافٹ بنانے کو کہا اور پھر یونیورسٹی کا کیلنڈر، اس کے بعد غوث بخش بزنجو، گورنر بلوچستان، کراچی گئے اور پروفیسر کرار حسین کو منا کر لائے کہ وہ اس نوزائیدہ یونیورسٹی کو سنبھالیں۔ پروفیسر کرار حسین اس سے پہلے گورنمنٹ کالج کوئٹہ کے پرنسپل تھے، اور انہوں نے مغربی پاکستان کے گورنر جنرل موسیٰ کے لئے عیدگاہ میں ہونے والے انتظار پر احتجاج کیا تھا، جس پر انہیں ملازمت میں وہ توسیع نہیں دی گئی تھی، جو اس وقت وہاں بہت سوں کو مل رہی تھی اور جس کے لئے وہاں کے طالبِ علم، استاد اور سیاست دان مطالبہ بھی کر رہے تھے۔ کرار صاحب جب رئیس الجامعہ کے طور پر آئے، تو انہیں ان کے لاڈ سہنے والے گورنر بزنجو کے ساتھ، ان کا احترام کرنے والا وزیرِ اعلیٰ عطاء اللہ مینگل، اور وزیرِ تعلیم گل خان نصیر بھی میسر تھے اور یہی وہ لوگ تھے، جنہوں نے ایک اور 'اردو اسپیکنگ' کو پورے صوبہ بلوچستان کا ناظمِ تعلیمات بنایا، اس سلسلے میں ایک لطیفہ یہ ہے کہ جب وزیرِ تعلیم نے چیف سیکرٹری سے پوچھا کہ صدیقی صاحب کی اس پوسٹ پر سلیکشن کے فیصلے کے باوجود نوٹیفکیشن کیوں نہیں ہوا؟ تو انہوں نے بڑے رازدارانہ انداز میں 'حساس' اداروں کی 'بے حس' رپورٹیں پیش کیں، جنہیں بلوچی کے شاعر اور قومی دانشور مرحوم گل خان نصیر نے پھاڑ کر ردّی کی ٹوکری میں پھینک کر پوچھا 'اب کوئی رکاوٹ؟' نوکر شاہ نے کہا 'نو سر'۔ اس عرصے میں صدیقی صاحب سکول، کالج اور یونیورسٹی کی سطح پر ساری تعلیمی منصوبہ بندی کے رُوحِ رواں تھے، میں نے ۱۹۷۱ء اور ۱۹۷۲ء کے برسوں میں ان کے ساتھ متواتر رہ کر مشاہدہ کیا کہ وہ کرسیوں سے محبت کرنے والوں کی طرح بااختیار لوگوں کی خوشامد نہیں کرتے تھے، اور نہ ہی کسی اتھارٹی سے خوف زدہ ہوتے تھے، انہیں بلوچ ان کی حق گوئی بلکہ تلخ نوائی کے سبب پسند کرتے تھے، اور بہت سے بلوچ طالبِ علموں کو میں نے خود یہ کہتے سنا 'خلیل

صدیقی بلوچ' اور وہ خود بھی ان سے والہانہ پیار کرتے تھے، بہت سی اصلاحات کی خاطر انہوں نے دشوار گزار علاقوں کا دورہ کر کے عجیب وغریب معلومات حاصل کیں، بعض علاقوں میں صدر معلم سردار کا کھانا پکاتا تھا، دیگر سٹاف بھی کام نہیں کرتا تھا، سکول مقفل تھا، مگر سکول کا سالانہ کرایہ اور سٹاف کی تنخواہیں وڈیرہ یا سردار لیتا تھا، ایک زنانہ سکول میں ہیڈ مسٹریس نے ایک مرد کو لیڈی ٹیچر ظاہر کر کے اپنا ڈرائیور رکھا ہوا تھا، اور وہ دو مرتبہ زچگی کی چھٹی بھی لے چکا تھا۔ انہیں اس بات کا دکھ ہوتا تھا کہ ورلڈ بینک اور اسی طرح کے اور ساہوکار بلوچستان میں بڑی سخاوت سے وسائل ضائع کرتے تھے، جہاں پیشہ ورانہ تعلیم کی نرسری نہیں تھی، وہاں انجینئرنگ یونیورسٹی بنا دیتے تھے، میرٹ کے بغیر ہر مقامی طالبِ علم کو وظیفہ دیتے تھے، جسے اس طالبِ علم کے گھر والے تنخواہ خیال کرتے تھے، سکول کے بعض اساتذہ ایک ہی صوبے کے دو حصوں میں بیک وقت ملازمت کر رہے تھے۔ (سبی اور قلات کے بعض علاقوں میں گرمیوں کی تعطیلات ہوتیں، جبکہ کوئٹہ اور بیشتر علاقوں میں سردیوں کی، یہ دوہری چھٹیاں ایسے اساتذہ کی پردہ داری کرتیں) نیپ حکومت کی برطرفی کے بعد نواب اکبر بگٹی گورنر بلوچستان ہوئے، انہوں نے تمام بڑے عہدوں پر فائز لوگوں کے خود دوبارہ انٹرویو لئے، انٹرویو کے دوران خلیل صدیقی صاحب کی کھری اور بے دھڑک باتیں ان کے دل میں اُتر گئیں اور پھر ایک عرصے کے بعد جب وہ دوبارہ وزیرِ اعلیٰ بنے، تو انہوں نے صدیقی صاحب کو تلاش کرایا، صدیقی صاحب اب ریٹائر ہونے کے بعد کوئٹہ میں مقیم تھے، بلوایا تو صدیقی صاحب نے کہا کہ ان کے مشیر کے طور پر وہ مراعات (گاڑی، بنگلہ، دفتر، فون یا تنخواہ) نہیں لیں گے، البتہ جب کبھی بگٹی صاحب کو مشاورت کی ضرورت ہوگی، وہ گاڑی بھیج دیں کہ ان کے پاس گاڑی نہیں تھی۔

ضیاء الحق کے مارشل لاء کے آغاز میں ہی صدیقی صاحب نے اپنی زندگی کے بدترین ایام دیکھے۔ وہ ڈائریکٹر تعلیمات تھے، مارشل لاء ہیڈ کوارٹر میں نمبر دو ایک بریگیڈیر صاحب تھے، جن کی بیگم گورنمنٹ گرلز کالج کوئٹہ میں اسسٹنٹ پروفیسر، اس سے سینئر کئی اساتذہ کالج میں تھیں، مگر باوردی شخص کا خیال تھا، کہ جیسے بہت سے کرسی نشیں اس کے سامنے گھگھیاتے ہیں یہ بھی کوئی ایسا شخص ہوگا، اس نے ایک آدھ دفعہ تو ملائمت سے فرمائش کی، بعد میں دھمکیوں پر اُتر آیا، ایسی ہی ایک ملاقات میں صدیقی صاحب نے کہا 'دیکھو میاں! پروموشن کوئی 'پڑیا تو ہے نہیں، اور نہ یہ

پرچون کی دکان ہے کہ میں آپ کو باندھ کر دے دوں، تب سارے ملک کے تعلیمی حلقوں میں ایک ناقابلِ یقین خبر سنی گئی کہ پروفیسر خلیل صدیقی کو بدعنوانی اور بے ضابطگی پر معطل کر دیا گیا ہے، اور یہاں سے ان کی زندگی کا ایک اور دور شروع ہوا۔ ان کے خلاف ایک انوکھی چارج شیٹ مرتب کی گئی، ایک یہ کہ وہ 'متعصب ہندوستانی' ہے اور 'ہندوستانیوں کو نوازتا ہے، دوسرا متضاد الزام یہ تھا کہ ۲۵ ہزار روپے فی کس لے کر مقامی لوگوں (بلوچوں، پٹھانوں) کو پروموشن دے دی اور تیسرے یہ کہ اگر ماضی میں کبھی کوئی بھی بے ضابطگی کی گئی ہو، تو اس کے بارے میں بھی کوئی بھی درخواست دے کر انکوائری میں شریک ہوسکتا ہے۔ انہیں جاننے والا ہر شخص صدمے کی حالت میں تھا، مگر سرگوشی میں کہتا تھا، کیا کیا جاسکتا ہے؟ شخصی فوجی نظام ہے، میں نے صدیقی صاحب کے دو مداحوں، مسعود اشعر (امروز ملتان کے ریذیڈنٹ ایڈیٹر) اور ڈاکٹر خواجہ اظہر حسن (سائنس کالج ملتان کے پرنسپل) کے بلوچستان میں مقیم بڑے فوجی افسروں کے نام سفارشی رُقعے لئے اور مارا ماری کرتا کوئٹہ پہنچا، صدیقی صاحب نے پڑھے بغیر یہ رقعے چاک کر دیئے اور کہا 'واہ انوار میاں، آپ نے ہمارے لئے ان افسروں کے درِ دولت پر سوالی بن کر جانے کی ترکیب خوب نکالی، اب ہم اس سب کا سامنا کریں گے۔' اس زمانے میں پہلی مرتبہ مجھے معلوم ہوا کہ وہ تواتر سے شعر کہہ بھی سکتے ہیں (اس سے پہلے ایمرسن کالج ملتان کے میگزین 'نخلستان' کی ادارت کے زمانے میں ان کی ایک دو چیزیں میں نے چھاپی تھیں، مگر انہوں نے کہا تھا کہ میں ترکِ سخن کر چکا ہوں۔) انہوں نے اپنا مقدمہ خود لڑا، اور ثابت کیا کہ یہ سب الزام متضاد اور بودے ہیں اور غالباً یہ اس زمانے کی کم یاب مثالوں میں سے ہے کہ انہیں انصاف ملا، وہ باعزت بحال ہوئے، اس کے بعد وہ تعلیمی ثانوی بورڈ کوئٹہ کے چیئرمین رہے۔

۱۹۶۷ء میں وہ گورنمنٹ کالج ملتان میں آئے اور ۱۹۷۰ء میں ون یونٹ ٹوٹنے کے بعد بلوچستان واپس چلے گئے مگر ساڑھے تین برس کے قیام میں ملتان میں اُردو ادب کے طالبِ علموں سے ان کا ناقابلِ شکست رشتہ قائم ہوا، ان کے قیام کے دوران پہلی مرتبہ پنجاب یونیورسٹی نے ایم۔اے اُردو کے (گورنمنٹ کالج ملتان کے) طالبِ علموں کو تحقیقی مقالہ لکھنے کی اجازت دی چنانچہ فخر بلوچ، نصرت فاطمہ، طلعت نشاط، عبدالرؤف شیخ اور میں نے مقالے لکھے، ہم سب کے زبانی امتحان اورینٹل کالج لاہور میں ہوئے، رؤف شیخ کے مقالے کا عنوان تھا 'جنگ ۶۵ء کا اردو

شعروادب پر اثر' اور اس کے ممتحن ڈاکٹر نصیر احمد ناصر تھے، جو اس بات پر برافروختہ تھے کہ رؤف نے اپنے ابتدائی باب میں ادب اور جمالیات پر بحث کرتے ہوئے، ان کی کتب سے استفادہ نہیں کیا، صدیقی صاحب نے مسکرا کے کہا 'ڈاکٹر صاحب آپ غضب کرتے ہیں۔' یہ بچہ آپ کی کتب کی فلسفیانہ نوعیت سے ازخود کیا استفادہ کرتا، اب میں ملتان واپس جا کر آپ کی تمام کتب سبقاً سبقاً پڑھاؤں گا' اور یوں یحییٰ امجد کے بعد پہلی مرتبہ شعبے کے دو طالبِ علموں نے درجہ اول میں ایم۔اے کیا (رؤف اور میں) اس کے بعد اصغر ندیم سیّد نے تحقیقی مقالہ لکھا اور پھر تحقیق وتنقید کا ایک سلسلہ جاری ہوگیا۔ اصغر ندیم کے ہم درس سیّد محسن نقوی مرحوم کے پہلے شعری مجموعے ''بند قبا'' کا دیباچہ جناب خلیل صدیقی نے لکھا، ۱۹۷۵ء میں جب زکریا یونیورسٹی قائم ہوئی تو صدیقی صاحب وزٹنگ پروفیسر کے طور پر کم وبیش ہر برس سہ ماہی قیام کے لئے یونیورسٹی میں آتے رہے اور لسانیات کے طالبِ علموں کو بالخصوص اُردو زبان وادب کے طالبِ علموں کو بالعموم درس دیتے رہے۔ ۴/نومبر ۱۹۹۵ء کو جب میں ملتان سے انقرہ کے لئے روانہ ہوا تو وہ یونیورسٹی میں لیکچرز کے سلسلے میں آئے ہوئے تھے اور ترکی زبان سے متعلق چند معلومات کے حصول کے لیے اشتیاق ظاہر کیا بلوچستان یونیورسٹی اور زکریا یونیورسٹی ملتان سے پی ایچ ڈی کے ایک ایک طالبِ علم نے ان کی نگرانی اور اعانت سے اپنی تحقیق مکمل کی ایم فل اور ایم اے کے درجنوں طالبِ علم ان کی تحقیق و تنقید سے فیض یاب ہوکر تحقیقی مقالات لکھنے کے قابل ہوئے۔ ایم اے میں وہ میرے مقالے بعنوان 'گئودان کا تجزیاتی مطالعہ' کے نگران تھے۔

اگرچہ وہ ماہر لسانیات کی بجائے خود کو لسانیات کا طالبِ علم کہنا زیادہ پسند کرتے تھے۔ تاہم حقیقت میں وہ پورے برصغیر کے گنے چنے علمائے لسانیات میں سے تھے وہ خود کو مستشرقین کا خوشہ چیں کہتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ ہمارے ہاں دوسرے اس کا اعتراف نہیں کرتے جب کہ میں ان سے استفادے اور فیض کشی کا معترف ہوں ''زبان کا مطالعہ''، ''زبان کیا ہے''، ''آواز شناسی''، ''زبان کا ارتقا'' اور ''لسانی مباحث'' ان کی کتب ہیں۔ ڈاکٹر نعمت الحق نے ان کی نگرانی میں اردو لسانیات سے متعلق پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھا۔ عبدالخالق بلوچ نے 'بلوچی شاعری کے ارتقاء' کے موضوع پر بلوچستان یونیورسٹی سے ان کی زیرنگرانی اور گرم جوش بلکہ دستگیر اعانت سے پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھا۔ ہم لوگ ان سے ملاقات سے پہلے ماہر لسانیات صرف اُسے خیال کرتے تھے جو

شاگردوں کو کافی بے عزت کرنے کے بعد یہ بتائے کہ کسی لفظ کا صحیح تلفظ کیا ہے۔ کسی بھی لفظ کے اشتقاق کی بحث کر کے وثوق سے بتا سکے کہ اردو زبان کا منبع اور مولد کیا ہے۔ مگر پروفیسر خلیل صدیقی نے بتایا:

۱۔ عربی، فارسی یا کسی اور زبان سے مستعار لیا ہوا لفظ اپنی زبان کے تلفظ کی حُرمت سے محروم ہوکر اُردو زبان کے صوتی نظام کا پابند ہوجاتا ہے اور یہ صوتی نظام جامد اور متعین نہیں اسے زبان بولنے والوں کی نطقی عادت تشکیل دیتی اور بدلتی رہتی ہے۔

۲۔ اُردو زبان کے مولد اور منشاء کے بارے میں قیاسی دلائل دیئے جاتے رہیں گے۔ جب تک اُردو کے ساتھ ساتھ دیگر بولیوں اور زبانوں کی بھی قدیم ترین تحریری شہادتیں میسر نہیں آتیں۔

۳۔ زبان مقدس گائے نہیں یہ اظہار کا وسیلہ ہے بولنے والے اس کا استحصال کرتے ہیں جب تک کوئی زبان سماجی اور تہذیبی ضرورتیں پوری کرتی ہے مروج رہتی ہے نہیں تو کتابوں کے گم شدہ اوراق اور اُن کے حافظوں کے برفیلے سینوں میں دفن ہوجاتی ہے۔

مجھے یاد ہے کہ میں نے پہلی ملاقات میں ان سے وہ جملہ کہا تھا، جسے پاکستان میں موجود ہر مہاجر سن کر خوش ہوتا ہے 'سر، پاکستان کے لئے آپ کی ہجرت بہت بڑی قربانی ہے۔' انہوں نے کہا 'میاں! وہاں میں فکری سرگرمیوں کے سبب بلیک لسٹ ہوگیا تھا، مسلمانوں کے لئے روزگار مشکل تر ہو رہا تھا، سو میں تلاشِ معاش اور اپنی صلاحیت کے اظہار کی بہتر جولاں گاہ کی تلاش میں پاکستان آیا تھا، قربانی دینے کا دعویٰ کیوں کروں؟'

یکم نومبر ۱۹۴۷ء کو کراچی پہنچنے سے پہلے وہ ہتھ کارنی سٹی کالج جبل پور میں پڑھا رہے تھے، کراچی پہنچ کر کچھ عرصہ ایک فرم میں اور پھر بینک میں کام کیا، یہاں ان کی گریجوایشن کے محبوب مضامین (ڈبل میتھ) کام آئے، بلکہ انہوں نے ذکر بھی نہ کیا ہوگا کہ وہ ناگپور یونیورسٹی کے ایم۔اے فارسی فرسٹ کلاس فرسٹ اور ایم۔اے اردو فرسٹ کلاس سیکنڈ ہیں۔

بنک کی ملازمت کے دوران وہ ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان سے ملے، جن کی تحریک پر وہ ایک صاحبِ دل علی شبیر حاتمی سے بھی ملے، جن کے پاس شاردا مندر کے تینوں بلاک تھے، دو وہ پہلے ہی انجمنِ ترقی اُردو کو دے چکے تھے، تیسرا بلاک بھی وہ اردو کالج کو اس شرط پر دینے کے لئے آمادہ

تھے، بشرطیکہ محمد عبدالغنی نیازی (صدیقی صاحب کے پھوپھا) اس کے پرنسپل ہوں، سو ایسا ہوا، یوں اُردو کالج کا آغاز ہوا، صدیقی صاحب نے ہاتھ سے اشتہار اور پوسٹر لکھ کر سڑکوں پر لگائے تاہم کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر اے۔ بی۔ حلیم نے اردو میڈیم کالج کے یونیورسٹی سے الحاق سے انکار کر دیا، صدیقی صاحب اور دیگر اساتذہ نے اس کالج میں منشی فاضل کی کلاسیں شروع کر دیں، جب صدیقی صاحب اردو کے لیکچرار کے طور پر کوئٹہ چلے گئے (ڈاکٹر غلام مصطفٰے خان پہلے ہی اسلامیہ کالج کراچی سے وابستہ ہو گئے تھے۔) تو یہ کالج انجمن ترقی اردو کے حوالے کر دیا گیا اور اب یہ کالج اُردو یونیورسٹی کہلاتا ہے۔ صدیقی صاحب کی وفات سے پاکستان میں تدریس اردو کا وہ باب بند ہوا ہے جو اڑتالیس برس سے کھلا تھا، پاکستان کے کسی سرکاری کالج میں اردو کے لیکچرار کی جو پہلی اسامی مشتہر ہوئی وہ اس پر منتخب ہو کر ۱۹۴۸ء میں گورنمنٹ کالج کوئٹہ سے وابستہ ہوئے تھے اور وفات سے چند ایام پہلے تک شعبہ اردو زکریا یونیورسٹی میں طالبِ علموں کے لیے سرچشمۂ فیض رہے یہاں یہ ذکر کرنا بے محل نہ ہوگا کہ ان کی رفیقۂ حیات محترمہ زبیدہ صدیقی نے اولاد کی تعلیم و تربیت اور خانہ داری کے جملہ امور بحسن و خوبی سنبھال کر انہیں قدرت کی نعمتوں کی طرح شاگردوں پر ارزاں کر دیا۔ صدیقی صاحب بھی پروفیسر کرار حسین کی طرح تقریر کے آدمی تھے، برسرِ محفل اس طرح بولتے اور حکمت کے موتی پروتے، جیسے وہ محنت سے لکھا ہوا مقالہ پڑھ رہے ہوں۔

پروفیسر خلیل صدیقی صاحب کا ۱۱/ مارچ ۱۹۹۶ء کی شام سات بجے انتقال ہوا، ان کا جگر سکڑ گیا تھا، اور اپنڈکس بھی پھٹ گیا تھا، علاج کے لئے کراچی لے جائے گئے، وہیں تدفین ہوئی، اپنے شعبے میں ایک ریسرچ لائبریری بنانے کے جنون میں مجھے اور میرے بعض ساتھیوں کو مبتلا دیکھ کر انہوں نے وصیت کی تھی کہ ان کا کتب خانہ ہمارے شعبے میں منتقل کر دیا جائے، چنانچہ ان کی وفات کے بعد ان کی بے مثال رفیقۂ حیات نے یہ تمام کتب ہمارے شعبے کو بھجوا دیں۔

پروفیسر خواجہ مسعود

ڈاکٹر روش ندیم

خواجہ مسعود کو عام لوگ ایک استاد کی حیثیت سے جانتے ہیں جبکہ پڑھے لکھے لوگوں میں وہ دانشور کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ وہ ایک مصنف اور مقرر بھی تھے۔ ان کی یہ سبھی حیثیتیں استادانہ ہیں کیونکہ ان سب کے طور پر وہ رسمی اور غیر رسمی طور پر علم کے ذریعے سے دیگر انسانوں کو ایک ذہنی تربیت سے گزار کر ایک نیا اور بہتر انسان بنانے کے لئے کوشاں تھے۔ رسمی سطح پر وہ بحیثیت استاد اور منتظم اعلٰی / پرنسپل گارڈن کالج راولپنڈی نصابی تعلیم کے ذریعے یہ فریضہ سرانجام دیتے رہے تھے اور غیر رسمی سطح پر ثقافتی و سیاسی سماجی حلقوں اور فورموں میں اپنی گفتگوؤں، تقریروں اور تحریروں کے ذریعے یہ ذمہ داریاں نبھاتے رہے۔ آخر الذکر طریقہ کار میں بطور دانشور، سیاسی ورکر اور مصنف وہ اپنے ترقی پسند، روشن خیال اور انسان دوست تصورات و خیالات کے لئے تاریخ و فلسفے کے علوم سے کام لے کر معاشرتی تعصّبات و توہمات کے خلاف سرگرم عمل رہے۔ اپنے اس بے لوث طرزِ عمل، استقلال اور تدریس کے ذریعے انہوں نے ہزارہا پاکستانیوں پر مشتمل دو نسلوں کو متاثر کیا اور انہیں ایک نئے انداز سے سوچنے، سمجھنے اور اپنانے کی متاثر کن ترغیب دی۔ ان کے شاگردوں میں زندگی کے تمام شعبوں سے تعلق رکھنے والے نامور ترین لوگ شامل ہیں جن میں وزیر اعظم پاکستان جناب شوکت عزیز، ماہر طبعیات ڈاکٹر اصغر قادر، کیبنٹ سیکریٹری اعجاز رحیم، ماہر قانون عابد حسن منٹو، اداکار راحت کاظمی اور مرتضٰی بھٹو جیسے ستارے شامل ہیں۔ ان خدمات کو سرکاری سطح پر سراہتے ہوئے انہیں پرائیڈ آف پرفارمنس کے

اعلیٰ تر اعزاز سے نوازا گیا۔

سیالکوٹ میں پیدا ہونے والے خواجہ مسعود کے دادا علامہ الف دین نفیس اپنے دور کی ایک نامور علمی شخصیت تھے۔ وہ پیشے کے اعتبار سے راولپنڈی کے وکیل تھے لیکن اپنی اردو فارسی شاعری، تصنیف و تالیف اور علم دوستی کے باعث انجمن پنجاب لاہور کے ان مشاعروں میں شریک رہے جو محمد حسین آزاد اور مولانا حالی وغیرہ کی کاوشوں کا نتیجہ تھے بعد ازاں وہ علامہ محمد اقبال کے احباب و عزیزوں میں شامل تھے۔ ۱۹۲۰ء میں ان کی مثنوی کی تقریظ اکبر الہ آبادی نے لکھی۔ وہ ہندستان میں پھیلے کشمیری مہاجرین کی انسانی حقوق کی تنظیم کے بھی سرگرم رکن تھے اور انجمن حمایت اسلام کے بھی۔ یوں وہ آل انڈیا مسلم کانفرنس اور آل انڈیا کشمیر کانفرنس سمیت ہندو مسلم اتحاد کے ساتھ ساتھ تحریک آزادی کے اہم رکن رہے۔ سرسید تحریک کا حصہ بن کر انہوں نے اپنے بیٹے خواجہ محمود کو علی گڑھ کالج میں وکالت کی تعلیم کے لئے بھیجا۔ خواجہ مسعود ان ہی کی اولاد تھے جو علامہ الف دین کے ۱۹۰۲ء سے ۱۹۲۳ء کے قیام کے دوران ۱۹۲۲ء میں اٹک میں پیدا ہوئے تھے جسے ان دنوں کیمبل پور کہا جاتا تھا۔ یوں خواجہ مسعود کو ان کے خانوادے کے تناظر میں دیکھا اور سمجھا جا سکتا ہے جو سرسید و اقبال کے آزادی و انقلاب اور رواداری وجدوجہد کے افکار و تصورات کا حامل تھا۔

خواجہ مسعود نے ابتدائی تعلیم سکاچ مشن سکول ڈسکہ رسیالکوٹ سے حاصل کرنے کے بعد گورڈن کالج راولپنڈی سے گریجویشن اور پھر ۱۹۴۴ء میں گورنمنٹ کالج لاہور جیسے معروف تعلیمی ادارے سے ایم ایس سی (ریاضی) کیا۔ اسی سے انہیں ریاضی کے لیکچرار کی ملازمت مل گئی اور وہ گورڈن کالج راولپنڈی سے منسلک ہو گئے۔ ۶۴۔۱۹۶۳ء میں فل برائٹ سکالرشپ پر ایجوکیشن ایڈمنسٹریشن کے ایک سالہ خصوصی کورس کے لئے سٹین فورڈ یونیورسٹی امریکہ گئے تھے۔ ۱۹۷۲ء میں انہیں اسی کالج کا پرنسپل بنا دیا گیا۔ جنرل ضیاء الحق کے مارشل لاء کے دوران انہیں سزا کے طور پر بہاولپور ٹرانسفر کر دیا گیا لیکن ان کے بیٹے سرمد خواجہ کے بقول انہوں نے وہاں جوائن کرنے کی بجائے بھاگ دوڑ کر کے اپنے ایک سابقہ طالب علم جو فوج میں جنرل کے عہدے پر تھا کی مدد پر کالج کہوٹہ کو جوائن کر لیا۔ کیونکہ جنرل کے بقول اوپر سے سخت آرڈر تھے کہ خواجہ مسعود کو راولپنڈی کی حدود میں نہیں آنے دینا۔ اور اسی دوران وہ اپنی مدت ملازمت پوری کر کے ریٹائر ہو گئے۔

ایک رسمی استاد، پروفیسر اور پرنسپل کی حیثیت سے وہ طلباء میں مقبول، ہمدرد اور نظم و ضبط

کے پابند تھے۔ کالج کے منتظم اعلیٰ کی حیثیت سے انہوں نے اپنے حسن انتظام سے کالج کو ملکی سطح پر روشناس کرایا۔ اپنے دراز قد، خوش لباسی اور بارعب شخصیت کے ساتھ وہ ہر صبح کالج کے صدر دروازے پر کھڑے ہو کر اپنے طلبا کا استقبال کرتے۔ وہ کالج کے کاموں میں خود شریک ہو کر بطور ماڈل کردار ادا کرتے۔ وہ اپنے رفقائے کار کا خیال رکھتے اور ان کی غمی خوشی میں شریک ہوتے۔ لیکن وہ اپنے نظم و ضبط کے معاملات میں کوئی سمجھوتہ نہ کرتے اور اپنی اس صلاحیت میں وہ شہرت رکھتے تھے۔ کیونکہ مارشل لاء اور دیگر نامساعد سیاسی حالات کے دوران ملکی دارالخلافہ کے علاقے کے ایک کالج کا نظم و نسق کو سنبھالے رکھا۔ انہوں نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ: ''میں نے کبھی کسی استاد یا طالب علم کے خلاف کوئی انضباطی ایکشن نہیں لیا۔ میں نے محض اپنے آپ کو ڈسپلن کا پابند کیا۔ تیس سال تک محنت شاقہ سے پڑھانے کے بعد مجھے سختی کرنے کا حق حاصل تھا۔ آخر میں اکثر جو طلبا میرے پاس تھے ان کے والد بھی میرے سٹوڈنٹ رہ چکے تھے۔''

خواجہ مسعود کے دور میں راولپنڈی اسلام آباد میں دو تعلیمی ادارے انتہائی اہمیت و شہرت کے حامل تھے: ایک تو گورڈن کالج جو ذوالفقار علی بھٹو کے دور حکومت تک مشنری ادارے کے طور پر کام کرتا رہا تھا جس میں کئی انگریز پروفیسر اور نامور ماہرین پڑھاتے تھے۔ دوسرا کالج راولپنڈی صدر کا سی بی کالج برائے خواتین تھا جس کی پرنسپل خواجہ مسعود کی بیگم سلمیٰ مسعود تھیں جنہوں نے اپنی لگن اور محنت سے اسے سکول سے کالج کے درجے تک پہنچانے میں انتہائی اہم کردار ادا کیا تھا۔ اس عہد کا شاندار ترین باصلاحیت نوجوان طبقہ ان ہی کے ہاتھوں تیار ہوا اور پاکستان کی ہر سطح اور شعبہ ہائے زندگی کا حصہ بنا۔ بطور اساتذہ اور منتظمین کالج ان دونوں میاں بیوی کی راولپنڈی کے علاقے میں بیسویں صدی کے نصف ثانی میں شاندار خدمات رہی ہیں۔ ان کی اولاد میں دو بیٹے ہیں: بڑے کا نام ڈاکٹر خواجہ یلدرم ہے جو بطور ماہر طبیعیات سیکریٹری نیشنل کمیشن آف سائنس اینڈ ٹکنالوجی اور چیئرمین پاکستان کونسل آف سائنس اینڈ ٹکنالوجی کے علاوہ کئی حیثیتوں میں کام کرتے رہے ہیں۔ ان کے چھوٹے بیٹے سرمد خواجہ ماہر اقتصادیات کے طور پر آئی ایم ایف وابستہ رہے ہیں اور آج کل سرائیکی علاقے میں پسماندہ طبقات کے لئے فلاحی منصوبوں پر رضا کارانہ سطح پر کام کر رہے ہیں۔ خواجہ مسعود ریٹائرمنٹ کے بعد بھی اپنی وفات تک پوری طرح متحرک و فعال رہے اور فکری و نظریاتی سرگرمیوں میں اپنی خدمات سرانجام دیتے رہے۔

پروفیسر خواجہ مسعود کی غیر رسمی استاد کی حیثیت بھی نہایت قابل احترام ہے۔ وہ کالج سے باہر ملک کے علمی حلقوں میں ایک نظریاتی دانشور، کثیر المطالعہ مفکر اور زیرک مصنف کے طور پر بھی پہچانے جاتے تھے۔ وہ مختلف تنظیموں، حلقوں، فورموں وغیرہ پر اپنے خیالات کا اظہار کر کے لوگوں کی ذہنی وفکری تربیت کرتے تھے۔ فکر وعلم کا یہ وہ انداز تھا جو جنرل ضیاالحق سے پہلے تک شہری زندگی کی ثقافتی سرگرمیوں کا اہم حصہ تھا۔ اس کے تحت شہر کے دانشور، استاد، مفکر، فنکار اور ادیب چائے خانوں اور دیگر پلیٹ فورم پر بیٹھ کر شامیں باہمی بحث مباحث اور مکالموں میں گزارتے تھے۔ یہ شہری ثقافتی انداز زندگی غیر رسمی سطح پر علم وادب، فکر ونظر اور فن ونقد کے حوالے سے معاشرے کی ذہن سازی اور نقطہ نظر کی تشکیل میں زندگی بخش کردار ادا کرتا رہا تھا۔ اس دور میں پاکستانی معاشرہ روشن خیالی اور ترقی پسندی کا حامل ایسا معاشرہ تھا جس میں آگے بڑھنے کی شدید آرزو متحرک تھی اور سرسید واقبال سے لے کر فیض ومنٹو تک کے افکار وتصورات کی حامل شاندار فکری روایت کا امین تھا۔ اس دور کا دنیا بھر میں جاری آزادی وانقلاب کی تحریکوں پر مبنی ہیجان خیز منظر نامہ برصغیر کی مسلم نوجوان نسل کو متاثر کر رہا تھا۔ خاص کر اشتراکی روس کے محنت کشوں کی تیسری دنیا کے محکوم عوام کے ساتھ مل کر استعمار وسامراج مخالف جدوجہد ان کا نصب العین بن گئی تھی۔ لہٰذا انجمن ترقی پسند مصنفین سے لے کر ذوالفقار علی بھٹو کے عوامی دور تک یہ لہر پاکستان میں عروج پر تھی۔ بقول اشفاق سلیم مرزا: ''انسانی آزادی اور برابری کے سوشلسٹ تصور نے خواجہ مسعود اور ان کے عہد کے بہت سوں کو ترقی پسند تحریک کا حصہ بنا دیا۔ پروفیسر مسعود کے لئے بھی، اس دور کے ہر پرعزم نوجوان کی طرح مارکسی فکر پر کشش تھی، انہوں نے اس کا باقاعدہ مطالعہ کیا اور مارکسزم کے بنیادی لٹریچر کے ساتھ ساتھ روسی ادب کے کلاسیکی اساتذہ چیخوف، دستوئفسکی، ٹالسٹائی اور میکسم گورکی کے شاہکار فن پاروں کو اپنے مطالعے کا حصہ بنایا۔''

انجمن ترقی پسند مصنفین کے سیکریٹری سجاد ظہیر قیام پاکستان کے بعد پاکستان کمیونسٹ پارٹی کے سیکریٹری جنرل ہو کر یہاں کام کرنے لگے۔ ان کی وفات کے بعد پروفیسر ایرک سپرین نے ان کی جگہ سنبھالی اور نوجوانوں کی فکری وتنظیمی قیادت کے لئے کمر بستہ ہوئے۔ یہ دور میجر اسحاق، میر غوث بخش بزنجو، امام علی نازش، محمد ابراہیم جویو، سبط حسن، علی عباس جلالپوری، شیخ ایاز، سوبھو گیان چندانی، جوش، فیض اور احمد ندیم قاسمی جیسے زعما کا تھا۔ چنانچہ پاکستان کمیونسٹ پارٹی

راولپنڈی کے جنرل سیکریٹری کی حیثیت سے خواجہ مسعود نے اس حوالے سے شہر میں سٹڈی سرکل قائم کئے، مزدور تحریک اور انجمن ترقی پسند مصنفین کو مستحکم کیا اور ڈیموکریٹک فیڈریشن قائم کی گئی۔ ان دنوں کمیونسٹ پارٹی کا دفتر کوہاٹی بازار راولپنڈی میں ہوتا تھا اور جمیل ملک اور افضل پرویز انجمن ترقی پسند مصنفین کے حوالے سے متحرک تھے۔ ایوب مرزا اور خواجہ مسعود کمرشل مارکیٹ کے قریب سیٹلائٹ ٹاؤن میں رہائش پذیر تھے اور پارٹی اجلاس ادھر ہی ہوتے تھے۔ اس حوالے سے احمد داؤد، ظہیر رضوی، عزیز خان اور صحافی الیاس بہت سرگرم تھے۔ گو مشہور زمانہ راولپنڈی سازش کیس کے بعد وہ اس طرح سے تو فعال نہیں رہے لیکن ان کا فکری ودانشورانہ سفر فعال رہا اور خواجہ مسعود نے فوجی آمریتوں کے دباؤ میں بھی علمی وسماجی جدوجہد کو جاری رکھتے ہوئے امام علی نازش اور سبط حسن جیسے سینکڑوں طلبا کو دائیں بازو کی ترقی پسند تحریک میں شامل کیا۔ اس حوالے سے انہیں اور ان کی بیگم کو سخت دباؤ کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ جس کے نتیجے میں بیگم سلمٰی مسعود کو تو ملازمت ہی ترک کرنا پڑی جبکہ خود خواجہ صاحب کو ٹراسفروں اور انکوائریوں میں الجھایا گیا۔ پاکستان کی ایک معروف مذہبی سیاسی جماعت کے جریدے میں چھپنے والی چوبیس پچیس ترقی پسند افراد کی فہرست شائع کر کے انہیں لبرل اور سوشلسٹ ہونے کے الزام لگا کر سزا دینے کی اپیل کی گئی۔ لہٰذا اس پر عمل درآمد ہوا اور پروفیسر سجاد شیخ اور پروفیسر سجاد حیدر ملک سمیت خواجہ مسعود کو شہر بدر کر دیا گیا۔ خواجہ مسعود پر کرپشن کے الزام میں انکوائری بٹھائی گئی لیکن انتہائی تگ ودو کے بعد جب کچھ بھی ہاتھ نہ آیا تو آخر کار یہ مضحکہ خیز الزام لگایا گیا کہ کالج لائبریری میں وہ مفت والی کتابیں کیوں رکھی گئی ہیں جو کالج کی طرف سے خریدی ہی نہیں گئیں۔ ضیاء دور میں ایسے پیشکنجے کا شکار ہونے والے قائداعظم یونیورسٹی کے ایک پروفیسر جمیل عمر لکھتے ہیں کہ: ''جنرل ضیاء الحق کے ہاتھوں پروفیسر خواجہ مسعود کے گارڈن کالج سے ہٹائے جانے کو ہو روایتی آخری تنکا قرار دیا جا سکتا ہے جس نے پاکستان میں لبرل معاشرے کی کمر توڑ ڈالی۔ خواجہ صاحب پاکستان کے دانشور اساتذہ کے اس مختصر مگر مؤثر قبیلے کے سالاروں میں سے تھے جنہوں نے ساری عمر لبرل تعلیم کے بہترین آدرش نوجوان نسل کو منتقل کئے۔ ان روشن فکر اساتذہ کی تعلیم اور تربیت ہی کی بدولت پاکستان کی ابتدائی دہائیوں میں ملک کے اعلیٰ تعلیمی ادارے بڑھتی ہوئی آمریت اور مذہبی بنیاد ہرستی کے خلاف مزاحمت کا اگلا مورچہ بنے رہے۔'' خواجہ مسعود نے سبط حسن کی طرح سائنسی و

جدلیاتی سوچ کو عام کرنے کا بیڑا اٹھایا اور ریٹائرمنٹ کے بعد خود انگریزی پریس کیذریعے زیادہ فعال کرلیا۔ ریاضی کے استاد ہونے کے باوجود انہیں سماجی سائنس اور فلسفے پر علمی حوالے سے ایک قاموسی کی طرح عبور حاصل تھا۔ حیرت انگیز علمی وسعت کے ساتھ وہ تاریخ و فلسفے کے ذریعے وہ سماجی تعصب و تنگ نظری کے خلاف عمل پیرا رہے۔ اپنی تقریروں، گفتگوؤں اور مکالموں کے علاوہ مختلف اخبار و جرائد میں ایک ہزار سے زائد تحریریں شائع کیں جن میں مذہب، ادب، ثقافت، سائنس، فلسفہ سیاست، سماجیات سمیت کئی ضابطے شامل تھے۔ مادر وطن میں ایک بڑی عوام دوست تبدیلی کے لئے وہ ایک ایسے فکر کی تخلیق کے لئے کوشاں دکھائی دیتے ہیں جو جدید پاکستانی شناخت اور قدیم اسلامی ورثے کی ہم آہنگی پر مبنی ہو۔ وہ مارکسی فکر، اقبالی تصور اسلام اوور تصوف کے آمیزے سے وحدت الوجود اور مارکسیت کی فکری کیمیا گری کے آرزومند دکھائی دیتے ہوئے جدید فکر کو پاکستانی تاریخ و سماج کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی کاوشوں میں مصروف دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی یہ روشن فکر کاوش رجائیت پسند عوام دوستی کے ساتھ ساتھ توہم پرستی، بنیاد پرستی اور دقیانوسیت کی مخالفت پر مبنی ہے۔ اس لئے وہ خرد افروزی و تعقل پسندی کے بہترین نمائندے اور شارح کے طور پر تحقیق و تشکیک کے لئے جدوجہد میں سقراط جیسے ایک دردمند استاد کا پرتو دکھائی دیتا ہے۔ ان کے بقول ان رجائیت اور پختہ تر حوصلے کے پس منظر میں ''محبت کی آرزو، علم کی جستجو اور انسانیت کے دکھوں کا گہرا احساس جاگزیں رہا ہے۔ وہ آخری دم تک اقبال اور قائداعظم کے متحرک، ترقی پسند اور عوام دوست نظریے کے حامل ریاست و سماج کے لئے سرگرم عمل رہے۔ مجموعی طور پر ایک جگت استاد کی حیثیت کا پوٹھوہار کی تہذیبی، تمدنی اور ثقافتی ترقی میں کردار ہمیشہ خراج تحسین کے لئے ناگزیر رہے گا۔

پروفیسر خواجہ منظور حسین

ڈاکٹر طارق ہاشمی

خواجہ منظور حسین کا شمار اُن اساتذہ میں ہوتا ہے جو سراپا بصیرت اور گنجینۂ علم و آگہی تھے۔ اُن کی شخصیت مشرق و مغرب کا ایک امتزاج بھی تھی کہ وہ انگریزی کے استاد تھے مگر اردو زبان و ادب کے بارے میں احساسِ کمتری پر مبنی کوئی رویہ نہیں رکھتے تھے بلکہ مشرقی ادبیات کے تخلیقی رویوں کے دلدادہ تھے۔ یہ اُن کی بصیرت تھی کہ وہ شعر و ادب کو خیال اور اسلوب کے پیمانوں سے دیکھتے تھے اور اُن کے ہاں زبردست وزیردست زبان کا تصور نظر نہیں آتا۔

دلّی میں کوچہ پنڈت (جو احمد علی کے افسانے ''ہماری گلی'' کے باعث اس نام سے مشہور ہوا) کے رہنے والے تھے مگر علمی و ادبی پرداخت علی گڑھ میں ہوئی۔ تقسیم کے بعد آپ لاہور آ گئے اور گورنمنٹ کالج لاہور سے تدریسی وابستگی اختیار کی۔ کالج کی تاریخ کی روشنی میں آپ ۱۹۴۸ء تا ۱۹۵۹ء اس ادارے سے وابستہ رہے جبکہ دوبار ۱۹۵۴ء تا ۱۹۵۵ء اور بعد ازاں ۱۹۵۸ء تا ۱۹۵۹ء اس عظیم علمی درس گاہ کی سربراہی کا اعزاز بھی حاصل ہوا۔

ادارے میں اُن کی شخصیت کو ان کی علمی بصیرت، خیال افروزی اور اصول پسندی کے باعث نہایت احترام سے دیکھا جاتا تھا۔ آپ کے شاگردوں کی ایک طویل فہرست ہے جس میں اسلوب احمد انصاری اور مظفر علی سیّد ایسے جید نقاد بھی شامل ہیں۔ اس سے قبل کہ خواجہ منظور حسین کی علمی و ادبی خدمات کا ذکر کیا جائے، ''خدمت گہِ استاد'' کے عنوان سے مظفر علی سیّد کے لکھے گئے خاکے میں سے چند اقتباسات سے استفادہ کیا جائے، جس سے خواجہ صاحب کے بطور استاد

اوصاف وکمالات سے کماحقہ آگاہی حاصل ہوتی ہے۔

''ان کے سامنے کوئی جذباتی بہانہ نہیں چلتا تھا نہ اپنے سپرد کسی کام میں کوتاہی قابلِ معافی تھی۔ یہ بات مشہور تھی کہ کوئی طالب علم خواجہ صاحب کے ماہانہ امتحان میں فیل ہو جائے یا ٹیوٹوریل میں پیپر پڑھنے نہ پہنچ سکے تو ڈانٹ کھانے کے سوا چارہ نہیں۔ اگر کوئی کہے کہ پچھلے ہفتے والد صاحب کا انتقال ہو گیا، گھر کا سارا بوجھ مجھ پہ آپڑا، رات کو اخبار کی نوکری کرنی پڑی اس لیے یہ کام نہ ہو سکا تو خواجہ صاحب کا ردِعمل یہی ہوتا کہ اب تو آپ کو زیادہ ذمہ داری کا ثبوت دینا چاہیے۔''

''ان سے وہ مصنف بھی پڑھے جا سکتے تھے جو اس وقت نصاب میں شامل نہیں تھے، جیسے ایلیٹ اور پاؤنڈ، ژیٹس اور آڈن، لارنس اور جوئس، فورسٹر اور ورجینیا وولف، آئی اے رچرڈز اور ایف آر لیوس وغیرہم۔ اصل میں ان کے پاس سکھانے پڑھانے کو اتنا کچھ تھا کہ آدمی برسوں تک زیرِ تعلیم رہے تو ختم نہ ہو۔ لیکن ان کے پڑھانے کا انداز ایسا تھا کہ طلبہ کو ادب پڑھنے کی ایسی بنیادی تربیت حاصل ہو جائے کہ اس کے بعد وہ جو کچھ بھی چاہیں، اپنے طور پر، طریقے سلیقے سے پڑھ سکیں اور اس کے بارے میں آزاد اور باخبر رائے بھی قائم کر سکیں، ایک ایسی رائے جس کی بین الاقوامی علمی و ادبی دنیا میں شنوائی بھی ممکن ہو۔''

''غالب، اقبال، عرفی، نظیری، حافظ اور امیر خسرو کے اشعار انگریزی ادب کے لیکچروں میں اتنی مناسبت کے ساتھ انہیں یاد آتے تھے کہ تقابلی ادبیات کا مطالعہ ہو جاتا تھا۔ یوں ان کے منہاج کا ایک بڑا حصہ اس حکمت کا حامل تھا کہ انگریزی تنقید سے حاصل کی ہوئی بصیرتوں کا اطلاق اردو اور فارسی ادب پر کیا جا سکے۔''

''خواجہ صاحب ناسازیٔ طبع کو چھوڑ کر، جو شاذ ہی کبھی ہوتی تھی، کسی دن کلاس سے غیر حاضر نہیں پائے گئے۔''

''ہمارا دستور یہ تھا کہ الٹی سیدھی باتیں لکھ کر خواجہ صاحب کو اشتعال دلایا جائے کہ وہ اپنے تحفظات سے باہر نکل کر بے ساختہ گفتگو کر سکیں۔ اس وقت ان کے ذہن اور زبان دونوں کی رفتار خاصی تیز ہو جاتی تھی اور تیار شدہ نوٹ بہت پیچھے رہ جاتے

تھے۔ ایک بار سویفٹ کو ہیملٹ سے مشابہ قرار دے کر انھوں نے ایک ایسا برجستہ تجزیہ صرف حافظے کی مدد سے سنایا تھا کہ بیالیس تینتالیس برس کے بعد آج بھی کانوں میں گونجتا ہے۔ گویا خواجہ صاحب سے کچھ غیر معمولی بصیرتیں حاصل کرنے کا ایک ہی طریقہ تھا کہ انہیں طیش دلایا جائے جس کے لیے ضروری تھا کہ طلبہ خود بھی کوئی دلچسپی لیں لیکن طلبہ سے ان کی اپنی توقعات کا حدوشمار نہیں تھا جو ایک تہائی یا ایک چوتھائی بھی پوری ہو جاتیں تو شاید ہم سب علامہ دہر بن جاتے۔''

''کتابوں کے علاوہ ناقدین اور علمائے ادب کے مجموعہ ہائے مقالات، مختلف اداروں کے شائع کردہ خطبات و مطالعات، یادگاری کتابوں کے مشمولات اور ستم بالائے ستم یہ کہ تازہ ترین رسائل و جرائد میں نکلے ہوئے تبصرے اور مضامین۔ خصوصی طور پر لیوس کا رسالہ ''سکروٹنی'' جو ابھی بند نہیں ہوا تھا، امریکہ کا بے نظیر رسالہ "Partisan Review" جو ٹرانسکی کے پیروکار شائع کرتے تھے۔ ایلن ٹیٹ کا رسالہ "Kenyan Review" اور ہفت روزوں میں "Times Literary Supplement" اور ''سیٹر ڈے ریویو آف لٹریچر'' کبھی کبھار ''نیوسٹیٹس مین'' اور ''آبزرور'' ویلی بھی غرض کہ ایک ناممکن الحصول ذخیرہ اور اس کے تفصیلی مطالعے کا تقاضا ہر وقت سر پر منڈلاتا رہتا تھا۔''

مظفر علی سیّد یہ بھی بتاتے ہیں کہ وہ ایک خانہ نشین بلکہ گھر میں بھی گوشہ نشین آدمی تھے جو ہمہ وقت اپنے کام میں لگا رہتا تھا۔ ان کے کام پر روشنی ڈالی جائے تو مقدار کے لحاظ سے اتنا زیادہ تو نہیں لیکن گہری بصیرت اور تحقیقی و تنقیدی ماحول میں اُن کے علمی کام کا تذکرہ زیادہ تر نظر انداز کیا جاتا رہا۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اُن کا بیشتر علمی کام اُن کی زندگی کے آخری برسوں میں آیا اور وہ کسی ادبی جتھے کا مضبوط حصہ نہ تھے۔

اقبال شناسی کے سلسلے میں اُن کی تصنیف ''اقبال اور بعض دوسرے شاعر'' ۱۹۷۷ء میں نیشنل بک فاؤنڈیشن سے شائع ہوئی۔ یہ کتاب کلامِ اقبال کو ایک الگ زاویے سے دیکھنے کی ایک کوشش ہے۔ اس تصنیف میں آپ نے اقبال کو فارسی اور اردو کی شعری روایت سے ہم آہنگ کر کے دیکھا ہے اور بعض اہم نتائج اخذ کیے ہیں۔ وہ اس کتاب کی غرض و غایت بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یہ کاوش اس نیت سے کی گئی ہے کہ اقبال کو سمجھنے سمجھانے کے علاوہ انھیں گویا غوطہ زنی کا تختِ مشق بنا کر، شعری کارگاہ کے اندر جھانکا جائے۔ شاعروں کی نفسی اور اخلاقی حسیت اور معاشرتی شعور کو ٹٹولا جائے۔ زبان و بیان کے پیرایوں میں امتیاز کیا جائے اور سخن فہمی کا ایسا قرینہ ڈھونڈا اور برتا جائے جس میں خود اقبال کی ہدایت کے بموجب لفظ اور آہنگ کے وسیلے اور تائید سے شعر کے مافیہ تک پہنچنے کا التزام ہو۔''

اقبال کے شعری آہنگ کی تلاش کے سلسلے میں انھوں نے فارسی اور اردو کے بعض شعرا کی علامات کے کلامِ اقبال میں تسلسل کی جستجو کی ہے اور یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اقبال کے اسلوب کی تشکیل میں اُن شعرا نے کیا کردار ادا کیا۔ اردو تنقید میں یہ پہلو تو بہت شد و مد سے بیان کیا جاتا ہے کہ اقبال، حافظ گریز تھے لیکن اسلوبِ اقبال میں حافظ کے کلام نے کیا کردار ادا کیا ہے، اسی سوال کا جواب خواجہ صاحب کی بصیرت دیتی ہے۔ اُن کے نزدیک اقبال نے حافظ کی خمریاتی علامات کو اپنے پیغام کی ترسیل کے لیے زیادہ مؤثر خیال کیا اور اُن کے آخری دور کا کلام اس امر کا ثبوت ہے۔

اس کتاب میں خواجہ منظور حسین نے اقبال کے بعض ذہنی تضادات کی تفہیم کے لیے غالب کی طرف رجوع کیا ہے۔ اُن کے مطابق غالب ہوں یا اقبال ان کی نفسی کشمکش کا ذکر اُن کے کلام سے قطعی طور پر غیر متعلق ہے اور اُن کی شاعری غیر شخصی اور غیر ذاتی ہے۔

خواجہ منظور حسین کی دوسری اہم تصنیف ''تحریک جدوجہاد بہ طور موضوعِ سخن'' ہے۔ ۱۹۷۸ میں نیشنل بک فاؤنڈیشن سے شائع ہونے والی اس کتاب میں انھوں نے اردو شاعری کے کلاسیکی ورثے کے بارے میں اپنی سخن فہمی اور گہری بصیرت کا ثبوت دیا ہے۔

اردو کے کلاسیکی شعرا خصوصاً غزل گویوں کے بارے میں یہ نظریہ عام ہے کہ وہ بہت دروں بیں تھے اور اپنی داخلی دنیا ہی اُن کی دلچسپی کا مرکز و محور تھی۔ نیز انھیں خارجی دنیا سے نہ کوئی علاقہ تھا نہ ہی غرض۔ خواجہ منظور حسین نے اس کتاب میں یہ ثابت کیا کہ کس طرح اردو شعرا اپنے خارجی مسائل و معاملات سے جڑے ہوئے تھے اور اپنے معاشرے میں رونما ہونے والا تغیرات سے فکری و عملی سطح پر شریک رہتے تھے۔

اس کتاب میں ان کا موضوع مولانا فضل حق خیر آبادی کی تحریک جہاد اور اردو شعرا کا اُس سے فکری و عملی انسلاک ہے۔ مومن، آتش، ذوق اور شیفتہ اس تحریک کے بارے میں اپنا ایک واضح موقف رکھتے تھے البتہ غالب کا رویہ ذو معنی تھا۔ یہ شعرا اس تحریک کے قائدین سے عقیدت بھی رکھتے تھے اور ان کے نظریے کی تائید بھی کرتے تھے۔

خواجہ منظور حسین نے اس تصنیف میں اردو غزل کو جس زاویے سے دیکھا ہے، اُس کے تناظر میں اسلوب احمد انصاری کا یہ تجزیہ قطعی درست ہے کہ:

''غزل کی تنقید کے سلسلے میں یہ تالیف ایک معرکتہ الآرا کارنامہ ہے کیونکہ اپنے مندرجات کے پیشِ نظر یہ برسوں کے از کار رفتہ مفروضات پر نئے سرے سے غور و تامل کرنے کی دعوت دیتی ہے اور ذہن میں ایک جودت اور تازگی پیدا کرتی ہے۔''

اردو غزل کی روایتی تعبیرات سے گریز کے سلسلے میں خواجہ منظور حسین کی اہم ترین تصنیف ''اردو غزل کا خارجی روپ بہروپ'' ہے۔ یہ کتاب مکتبہ کارواں، لاہور سے ۱۹۸۱ میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں اس تاثر کو زائل کرنے کی بھرپور اور مدلل کوشش نظر آتی ہے کہ غزل اپنے خارجی ماحول کی عکاسی سے معذور رہی ہے، کتاب کے آغاز میں اُن ناقدین کے اقتباسات دیے گئے ہیں جنھوں نے غزل گو شعرا کو داخلیت پسند اور دروں بیں قرار دیا۔ ان ناقدین کے مذکورہ خیالات سے خواجہ منظور حسین نے عدم اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے میر سے لے کر داغ دہلوی تک اُردو غزل کی داخلی شہادتوں کے ذریعے ایک بصیرت افروز جائزہ پیش کیا ہے۔

اس کتاب کے جملہ ابواب میں پیش کیا گیا اور نقد و نظر کی گہرائی اور تجزیے کی مہارت کے عکاس ہیں۔ لیکن ۱۸۵۷ء کے بعد کے حالات کو اردو غزل میں جس طرح شعرا نے سمویا ہے اُن کی نشان دہی جس طور سے کی گئی ہے، وہ ایک منفرد نقطہ نظر کے ساتھ حقائق کی درست عکاسی کا بھی مظہر ہے۔ اس سلسلے میں داغ دہلوی کے کلام کو خصوصی توجہ سے دیکھا گیا ہے اور یہ پہلو بہ دلائل واضح کیا گیا ہے کہ وہ اپنے عہد کے آشوب کے حقیقی عکاس تھے اور اُن کی غزل میں واسوخت کا اسلوب کسی محبوبِ مجازی کو جلی کٹی سنانے کے لیے نہیں تھا بلکہ بیرونی استعمار کے خلاف غم و غصے کا اظہار تھا۔ خواجہ منظور حسین اس کتاب میں اردو ناقدین کے اس رویے کے شدید شاکی نظر آتے ہیں کہ انھوں نے غزل اور غزل گوؤں کے بارے میں قطعی غیر سنجیدہ رویہ اختیار کیا۔ وہ لکھتے ہیں:

''جب اتنے پڑھے لکھے لوگ، اِکّا دُکّا اہلِ نظر کو چھوڑ کر اپنی شاعری بالخصوص غزل پر اتنے سنگین الزامات لگائیں۔۔۔تو لازم آتا ہے کہ ان الزامات کی چھان بین کی جائے، اس کا سب سے معقول طریقہ ہماری دانست میں یہ ہے کہ خود شعرائے کرام سے رجوع کیا جائے اور اپنے شعری مافیہ اور مزاج کے بارے میں جو شہادت انہوں نے اپنے کلام میں چھوڑی ہو، اُسے ایک بامعنی ربط و ترتیب کے ساتھ جوں کا توں پیش کر دیا جائے۔''

خواجہ منظور حسین کی علمی و ادبی خدمات میں بعض روسی ادیبوں کی کہانیوں کے ترجمے بھی شامل ہیں جو ''آسیا اور دوسری کہانیوں'' کے عنوان سے وین گارڈ بکس، لاہور سے ۱۹۸۴ میں کتابی صورت میں شائع ہوئیں۔ اس کتاب میں سہر مینوف، ترگنیف، چیخوف، سرلوکب، کیتاریف اور ایوانوف ایسے اہم ادیبوں کی کہانیوں کے تراجم شامل ہیں۔

خواجہ منظور حسین کی علمی و ادبی خدمات نہایت وقیع ہیں۔ وہ ادب کے ذہین ترین اساتذہ میں شمار ہوتے تھے اور اُن کے شاگرد اُن کی ذہانت سے متاثر بھی دکھائی دیتے ہیں۔ اپنے استاد کے لیے اُن کے جذبات میں ایک والہیت کا عنصر واضح اور تاباں نظر آتا ہے۔ اُن کی وفات (۱۹۸۷) سے دو سال قبل ان کے شاگرد اسلوب احمد انصاری نے بطور مدیر ''نقد و نظر'' کا خواجہ منظور حسین نمبر ترتیب دے کر حقِ شاگردی ادا کرنے کیا ایک احسن کوشش کی تھی، جس میں آل احمد سرور، فیض احمد فیض، سید وقار حسین، انتظار حسین، سید حامد، قاضی افضال حسین، زیڈ اے عثمانی، ابوالکلام قاسمی، شان الحق حقی، اسلوب احمد انصاری اور مقبول حسن خاں نے خواجہ صاحب کی فکری و تنقیدی جہتوں کا جامعیت کے ساتھ جائزہ لیا ہے۔

اس امر میں کوئی شک نہیں کہ بطور ایک عمرانی دانشور اُن کی تصانیف نہایت اہم اور منفرد ہیں۔ اُن کا اسلوبِ تحقیق اور اندازِ نقد بہت منفرد ہے۔ اپنی تنقیدی تصانیف میں انھوں نے اخذِ نتائج کے سلسلے میں تمام تر اختلافات کے باوجود جو قرینہ اختیار کیا وہ حیرت افزا ہے۔ خصوصاً اردو غزل کے بارے میں انھوں نے جن تاریخی دستاویزات اور عمرانی حقائق کی روشنی میں گفتگو کی وہ اردو تنقید کے تمام تر منظر نامے پر بہت منفرد نقش ہے۔

یہ امر افسوس ہے کہ اُن کے چھیڑے ہوئے مباحث پر سنجیدہ گفتگو بہت کم ہوئی اور اُن کا علمی سرمایہ بھی اب نایاب ہے۔ اردو تنقید میں متن کے متنوع مفاہیم کے جو بحثیں اب بہت مقبول

ہیں، خواجہ منظور حسین نے بہت پہلے ان کے عملی اطلاق کے ذریعے اردو غزل کی عمرانی جہت پر اہم سرمایۂ نقد فراہم کیا ہے۔

ڈاکٹر خورشید رضوی

ڈاکٹر ناہید قمر

اصل نام سید خورشید الحسن رضوی، ادبی دنیا میں خورشید رضوی کے نام سے معروف ہیں۔ عربی زبان و ادب کے نامور استاد، جلیل القدر محقق اور نقاد، چھ (۶) شعری مجموعوں کے خالق صاحبِ طرز شاعر۔ عربی، فارسی، اردو اور انگریزی چاروں زبانوں پر یکساں دسترس رکھتے ہیں۔ علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں حکومت پاکستان کی جانب سے ستارۂ امتیاز سے نوازا گیا ہے۔ ایم اے کا مقالہ امام بوصیری (قصیدہ بردہ شریف کے خالق) کے قصیدے ''ذخر المعاصر'' کی شرح کے طور پر تحریر کیا اور ابن الشعار کے تذکرۂ شعرائے معاصرین ''قلائد الجمان'' کے ابتدائی 120 صفحات پر ڈاکٹر رانا احسان الٰہی کے زیرِ نگرانی تحقیق کر کے پنجاب یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ بعد ازاں موصل یونیورسٹی عراق کی فرمائش پر قلائد الجمان کے مکمل چھٹے حصے کو مدون کیا اور شیخ زاہد اسلامک سنٹر پنجاب یونیورسٹی نے 850 صفحات پر مشتمل اس گرانقدر کام کو زیورِ طبع سے آراستہ کیا۔ عربی میں امتیازی تخصص کے حصول میں انہیں مولانا عبدالعزیز میمن اور ڈاکٹر صوفی ضیاء الحق (مولانا اصغر علی روحی کے فرزند) جیسے شہرۂ آفاق اساتذہ سے شرفِ تلمذ حاصل رہا۔

ڈاکٹر خورشید رضوی ۱۹۔مئی ۱۹۴۲ء کو امروہہ (انڈیا) میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق وہاں کے ساداتِ رضویہ سے ہے۔ ان کے جدِ اعلیٰ ''شاہ اَبن'' کے نام سے معروف ہیں، ان کا مزار امروہہ میں ہے۔ امروہہ میں اُن کے آباواجداد کرمان کے راستے ہندوستان آئے تھے۔ اکبری

عہد کے مشہور مؤرخ عبدالقادر بدایونی نے اپنی کتاب ''منتخب التواریخ'' میں ان کے جدِ امجد کا ذکر کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا زمانہ اکبری دور کا ہے۔ ان کا تعلق تصوف کے سلسلۂ چشتیہ سے تھا اور وہ ''بدرِ چشتی'' کے نام سے مشہور تھے۔ ان کا سلسلۂ بیعت حضرت بابا فرید گنج شکرؒ تک پہنچتا ہے۔ خورشید رضوی کے نانا کے نانا مولانا احمد حسن محدث امروہی حضرت قاسم نانوتوی کے براہِ راست شاگرد تھے اور ان کا شمار حضرت نانوتوی کے معروف ترین تلامذہ میں ہوتا ہے۔ مولانا عبدالحیٔ کی ''نزہتہ الخواطر'' میں ان کا تذکرہ موجود ہے۔

قیامِ پاکستان کے بعد ۱۹۴۹ء میں اپنے عزیز و اقارب کے ساتھ پاکستان آنے کے بعد خورشید رضوی صاحب کا داخلہ اسلامیہ ہائی سکول منٹگمری (ساہیوال) میں پانچویں جماعت میں کروایا گیا۔ بعد ازاں ساہیوال کے ہی ایک سرکاری سکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ سکول میں رانا مرتضیٰ صاحب ان کے اردو کے استاد تھے جنھوں نے رضوی صاحب کے ادبی ذوق کی تربیت میں ابتدائی کردار ادا کیا۔ ۱۹۵۵ء میں میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد خورشید رضوی گورنمنٹ کالج منٹگمری میں داخل ہوئے۔ انہیں ابتدا ہی سے عربی پڑھنے سے شغف تھا، نیز ان کی والدہ محترمہ کی بھی خواہش تھی کہ وہ عربی پڑھیں۔ لہٰذا انہوں نے کالج میں عربی کا مضمون اختیار کیا۔ کالج میں انہیں ڈاکٹر صوفی محمد ضیاء الحق جیسے قابل استاد میسر آ گئے۔ صوفی صاحب بہت بڑے عالم تھے۔ عربی، فارسی، اردو اور اسلامیات پر زبردست دسترس رکھتے تھے۔ عربی میں پی ایچ ڈی بھی تھے۔ نہایت فاضل استاد تھے۔ رضوی صاحب کو صوفی صاحب کی شاگردی اور صحبت حاصل ہوگئی تو انہوں نے رضوی صاحب سے کہا کہ تم میں عربی پڑھنے کی صلاحیت ہے جو کم طالب علموں میں ہوتی ہے۔ صوفی ضیاء الحق صاحب نے رضوی صاحب کو عربی دانی میں استعداد بڑھانے کی خصوصی تربیت دی جو زندگی بھر ان کے کام آئی۔ خورشید رضوی صاحب نے منٹگمری کالج سے بی اے کرنے کے بعد پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے عربی کیا۔ وہاں بھی صوفی ضیاء الحق صاحب اعزازی طور پر اورینٹل کالج میں عربی پڑھانے آیا کرتے تھے۔ ایم اے کے 20 سال بعد پی ایچ ڈی بھی پنجاب یونیورسٹی سے کی۔

ڈاکٹر خورشید رضوی سے میرے تعارف کا پہلا حوالہ ان کی شاعری تھی، اور وجہ تعارف ان کی وہ معروف غزل بنی جس کا شعر ہے:

وہ جو مجھ میں ایک اکائی تھی وہ نہ جُڑ سکی
یہی ریزہ ریزہ جو کام تھے، مجھے کھا گئے

اس تعارف کا دوسرا حوالہ ان کا گرانقدر کام ''عربی ادب قبل از اسلام'' ہے جو پہلے رسالہ ''سویرا'' میں قسط وار شائع ہوتا رہا اور بعد ازاں کتابی شکل میں منظرِ عام پر آیا۔ خورشید رضوی صاحب عربی زبان و ادب کے استاد ہیں اور جس طرح ادب کا دائرہ کسی ایک زبان یا تہذیب تک محدود نہیں ہوتا، اس میں بہت سی زبانوں اور تہذیبوں کے دھارے آ کر ملتے ہیں۔ اسی طرح میرے نزدیک ایک اچھے استاد کے براہِ راست طالب علموں کے علاوہ بے شمار بالواسطہ طالب علم بھی ہوتے ہیں جن تک اس کا فیض کسی نہ کسی وسیلے سے پہنچتا ہے۔ ڈاکٹر خورشید رضوی کا شمار بھی ایسے ہی اساتذہ میں ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنی عملی زندگی کا آغاز ۱۹ سال کی عمر میں گورنمنٹ کالج بہاولپور سے عربی کے لیکچرار کے طور پر کیا۔ کچھ عرصہ بعد وہ گورنمنٹ کالج سرگودھا چلے گئے اور ۱۹۸۴ء میں اس کالج کے پرنسپل بننے تک تدریسی فرائض سرانجام دیتے رہے۔ ۱۹۸۵ء میں وہ ڈیپوٹیشن پر اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد تشریف لے گئے اور وہاں چھ سال تک دارالترجمہ کے چیف بیورو آفیسر کے طور پر فرائض سرانجام دیتے رہے۔ ۱۹۹۱ء میں انہیں گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور میں صدر شعبۂ عربی مقرر کیا گیا جہاں سے انہوں نے چار سال بعد ۱۹۹۵ء میں اپنی علمی و تحقیقی سرگرمیوں پر توجہ مرکوز کرنے کے لیے قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے لی۔ تاہم انہوں نے وزیٹنگ استاد کے طور پر گورنمنٹ کالج لاہور میں تدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ ڈاکٹر خورشید رضوی پاکستان کی بہت سی جامعات جن میں پنجاب یونیورسٹی، لمز یونیورسٹی اور فاسٹ یونیورسٹی شامل ہیں سے بطور استاد منسلک رہے ہیں۔ بہت سے تعلیمی بورڈز اور ادبی مجالس کے رکن بھی رہ چکے ہیں۔ مصر کی ''مجمع اللغۃ العربیۃ بالقاہرہ'' (عربی لینگویج اتھارٹی قائرہ) کے رکن بھی رہ چکے ہیں۔ اس سے قبل پاکستان سے یہ اعزاز صرف مولانا عبدالعزیز میمن کو حاصل ہوا ہے۔ ڈاکٹر خورشید رضوی کو نہ صرف پاکستان بلکہ دنیا بھر میں قدیم عربی ادب اور مخطوطات کی تدوین پر اتھارٹی تصور کیا جاتا ہے۔ ان دنوں ڈاکٹر صاحب اپنی تصنیف ''عربی ادب قبل از اسلام'' کے دوسرے حصے کی ترتیب میں مصروف ہیں۔

بطور معلم تعلیمی نظام کی موجودہ صورتحال کے حوالے سے ڈاکٹر خورشید رضوی سمجھتے ہیں کہ سائنس کے طالب علموں کو کسی کلاسیکی زبان کی تھوڑی بہت تعلیم دینا ضروری ہے اس سے شخصیت میں توازن آتا ہے۔ صرف سائنس پڑھنے سے لوگ یک رُخے ہوتے جا رہے ہیں۔ اردو کے نفاذ کے ضمن میں کوئی حقیقی رکاوٹ موجود نہیں ہے۔ حکمران طبقہ اور اشرافیہ اپنے مستقبل کو اردو کے بجائے انگریزی سے وابستہ سمجھتے ہیں۔ نیز جو افراد اور ادارے اردو کے نفاذ کے ذمہ دار ہیں وہ خلوصِ دل سے اردو کے حق میں نہیں ہیں کیونکہ اصطلاحات اور سافٹ ویئر کے حوالے سے متعدد ادارے اتنا کام کر چکے ہیں کہ ایسا کوئی عذر اب قابلِ قبول نہیں رہا۔ علاوہ ازیں اردو کی قوتِ انجذاب اتنی زیادہ ہے کہ یہ بدیشی زبانوں کے الفاظ بخوبی اپنے اندر جذب کر لیتی ہے۔ ان کے خیال میں مسئلے کا تعلق حرکیات سے زیادہ عمومی نفسیات سے ہے کیونکہ لوگ نصف جملہ اردو اور نصف انگریزی میں بولنا باعثِ فخر سمجھتے ہیں جس کی وجہ سے تعلیمی نظام کے مختلف دھارے ہیں جن سے فارغ التحصیل ہونے والے طالب علم ہجوم تو کہلا سکتے ہیں قوم نہیں کیونکہ قوم ہونے کا مطلب مشترک امنگوں کا حامل ہونا ہے۔ خیالات اور رویے ایک دوسرے سے مختلف ہونے کے باعث متحارب گروہ پیدا ہو رہے ہیں اور عدم برداشت بڑھتی جا رہی ہے۔ قوم کو قوم بنانے کے لیے ضروری ہے کہ آپ پہلے طے کریں کہ آپ کی قومی ترجیحات کیا ہیں۔ جبکہ صورتحال یہ ہے کہ ہم نے خود کو اور اپنی آنے والی نسلوں کو اپنے کلاسیکی تہذیبی ورثے سے یکسر منقطع کر لیا ہے۔

ڈاکٹر خورشید رضوی کے خیال میں استاد کی عزت تو ہر زمانے میں ہوتی ہے لیکن چونکہ علم بطور سماجی قدر ہمارے معاشرے کا مزاج نہیں رہا۔ اس لیے یہاں استاد کو آئیڈیل بنانے کی کوشش کبھی نہیں کی گئی نہ ہی استاد کا مقام بلند کرنا ہماری تعلیمی منصوبہ بندی کا حصہ رہا ہے۔ اگر کوئی حکومت استاد کا مقام بلند کرنا چاہتی ہے تو اسے اس طرح کے مثبت اقدامات کرنے کی ضرورت ہے جو نتیجہ خیز ہوں کیونکہ معاشرے کی تربیت اور فضا بندی کے بغیر آپ انسان سازی نہیں کر سکتے۔ اور فضا بنانے کے لیے ضروری ہے کہ جو تعلیمی اداروں کا انتشار ہے اسے ختم کیا جائے۔ اداروں میں وسائل کم یا زیادہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لیکن کم از کم دونوں جگہ

نصاب تو ایک سا پڑھایا جائے جو ذہنوں اور دلوں کو جوڑ کر رکھے۔

ڈاکٹر خورشید رضوی اپنی شخصیت کی متفرق جہات میں سے شاعری کو فوقیت دیتے ہیں اور شاعری کے حوالے سے ان کا کہنا ہے کہ جان صرف اس تخلیقی تجربے میں ہوتی ہے جو انسان کے اندر سے پھوٹے۔ شاعری میں اصلاح کسی سے نہیں لی۔ پہلا شعر یہ تھا:

ہر شب کو فلک پر ہیں چمکتے ہوئے تارے
خورشید نکلتا ہے تو چھپ جاتے ہیں سارے

اپنی خوش طبعی کے باوجود ڈاکٹر خورشید رضوی مجلسی آدمی نہیں ہیں۔ تاہم کالج کی مجلسِ ادب میں شاعری سنایا کرتے تھے۔ بعد ازاں ساہیوال کی بزمِ فکر و ادب کے اجلاسوں میں شریک ہوتے رہے جن میں مجید امجد، منیر نیازی اور ظفر اقبال بھی شریک ہوا کرتے تھے۔ خورشید رضوی صاحب کے خیال میں شعری تجربہ یکبارگی ظہور پذیر نہیں ہوتا۔ کسی وقت اچانک کوئی گزشتہ واقعہ انسان کے اندر بول اٹھتا ہے تو شاعری تخلیق ہو جاتی ہے۔ انہوں نے سقوطِ ڈھاکہ کے تقریباً ڈیڑھ سال بعد جو اشعار کہے ان میں اس واقعے کا عکس موجود ہے۔

فضا میں آج بہت دیر یاد آتے رہے
مجھے بہارِ گزشتہ کے بال و پر اپنے
فغاں کہ دستِ عدو میں بنے ہوئے ہیں تیر
وہ اپنے ہاتھ سے بوئے ہوئے شجر اپنے

ڈاکٹر خورشید رضوی قدیم عربوں کی سخت کوشی، مہمان نوازی، عہد کی پاسداری، بہادری اور پرشکوہ شاعری سے متاثر ہیں اور اپنے تدریسی تجربے کی بنیاد پر سمجھتے ہیں کہ ایک اچھے طالب علم میں حصولِ علم کی سچی لگن، محنت اور جانفشانی، لاعلمی کا اعتراف کرنے کی ہمت، مسلسل سیکھتے رہنے کا جذبہ، اساتذہ کا احترام، خیالات کی پاکیزگی اور نظم و ضبط ہونا چاہیے۔ اسے علم کو حصولِ مفادات کا ذریعہ نہیں بنانا چاہیے اور طالب علمی کو ساری زندگی پر محیط سمجھنا چاہیے۔

تصانیف

۱۔ شاخِ تنہا — شاعری

۲۔ سرابوں کے صرف شاعری
۳۔ رایگاں شاعری
۴۔ امکان شاعری
۵۔ دیریاب شاعری
۶۔ نسبتیں شاعری
۷۔ یکجا کلیات
۸۔ تالیف مضامین
۹۔ اطراف مضامین
۱۰۔ عربی شاعری ایک تعارف
۱۱۔ تاریخ علوم میں تہذیبِ اسلامی کا مقام (عربی سے ترجمہ)
۱۲۔ قلائدالجمان
۱۳۔ حکم المحکمۃ الشریعۃ (انگریزی سے عربی ترجمہ)
۱۴۔ عربی ادب قبل از اسلام

اعزازات

ستارۂ امتیاز ۲۰۰۸ء
احمد ندیم قاسمی ایوارڈ ۲۰۰۵ء
احمد فراز ادبی ایوارڈ ۲۰۱۲ء
خالد احمد ایوارڈ ۲۰۱۳ء
یو بی ایل لٹریری ایکسیلنس ایوارڈ ۲۰۱۳ء
مجلس فروغِ اردو ادب دوحہ قطر ایوارڈ ۲۰۱۵ء

ڈاکٹر رحیم بخش شاہین

ڈاکٹر محمد وسیم انجم

ڈاکٹر رحیم بخش شاہین ۱۴ جولائی ۱۹۴۲ء کو جالندھر کے گاؤں کھڑلے کنگرے میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد تاج الدین اور والدہ سرداراں بی بی نے آپ کا نام رحیم بخش رکھا، بعد میں آپ نے اپنے نام کے ساتھ ''شاہین'' کا تخلص اختیار کر لیا۔ آپ کے دادا امیراں بخش اور دادی حفیظہ بی بی قیام پاکستان سے پہلے راولپنڈی آ گئے۔ دادا امیراں بخش ۵۰۲ ورکشاپ میں ملازم ہو گئے تو انہوں نے باقی خاندان کے لوگوں کو راولپنڈی آنے کا مشورہ دیا۔ اس طرح ان کا خاندان جالندھر سے راولپنڈی منتقل ہو گیا اور خاندان کے اکثر افراد راولپنڈی، فیصل آباد اور ساہیوال میں آباد ہو گئے۔ راولپنڈی کے مختلف علاقوں میں رہائش پذیر رہنے کے بعد کمیٹی چوک کے قریب عالم خان روڈ سے ملحقہ قدیمی محلّہ جس کا نام چھاچھی محلّہ ہے یہاں ایک مکان میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ اب یہاں ان کے صاحبزادگان رہائش پذیر ہیں۔

ڈاکٹر رحیم بخش شاہین جب راولپنڈی میں ہجرت کر کے آئے تو اس وقت ان کی عمر چار پانچ برس کے لگ بھگ تھی۔ ۱۹۴۷ء میں کمیٹی چوک کے قریب ایم بی پرائمری سکول تیلی محلّہ میں داخل کروایا گیا۔ اسی دوران پاکستان قائم ہو گیا۔ ۱۹۵۴ء میں پرائمری تعلیم اسی سکول سے مکمل کرنے کے بعد اسلامیہ ہائی سکول نمبر امری روڈ راولپنڈی جو اب ہائر سیکنڈری سکول ہے یہاں داخل کرا دیا گیا۔ آٹھویں جماعت ۱۹۵۷ء میں پاس کی۔ اس کے بعد میٹرک کا امتحان اسی سکول سے ۱۹۵۹ء میں سائنس کے مضامین کے ساتھ امتیازی نمبروں سے پاس کیا اور سکول میں تیسری پوزیشن حاصل کی۔ آپ چھٹی سے میٹرک تک اپنی جماعت کے مانیٹر رہے۔ میٹرک کے بعد

اسلامیہ سکول کے ہیڈ ماسٹر خواجہ عبیدالرحمٰن نے آپ کی قابلیت اور فرمانبرداری کے پیشِ نظر ''اَن ٹرینڈ ٹیچر'' رکھ لیا اور ساتھ ساتھ تعلیمی سلسلہ بھی جاری و ساری رہا۔ ۱۹۶۲ء میں فائنل فارسی کا امتحان پاس کیا اور بورڈ میں دوسری پوزیشن حاصل کی۔ اس کے بعد ۱۹۶۳ء میں ایف اے، ۱۹۶۴ء میں بی اے اور ۱۹۶۶ء میں ایم اے اُردو کے امتحانات پاس کر لیے۔ ان کے تعلیمی اسناد کی عکسی نقول ان کے شعری مجموعہ ''شہرِ جمال'' کے آخر میں شامل ہیں۔

تعلیم کے دوران سرکاری اداروں میں ایم ای ایس اور سی ایم اے میں ملازمت کرتے رہے۔ ۱۹۶۹ء میں عارضی بنیادوں پر لیکچرار ہو کر گورنمنٹ کالج پنڈی گھیب میں تعینات ہوئے۔ ۲۹ ستمبر ۱۹۷۰ء کو حشمت علی اسلامیہ سائنس کالج راولپنڈی میں لیکچرار کی حیثیت سے پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز کیا۔ ستمبر ۱۹۷۲ء میں کالج قومی تحویل میں لے لیا گیا جسے بعد میں حشمت علی آرٹس کالج میں مدغم کر کے گورنمنٹ حشمت علی کالج کا نام دے دیا گیا۔ اس طرح گورنمنٹ ملازمت کا آغاز ہوا۔

ڈاکٹر رحیم بخش شاہین کو دورانِ تعلیم ہی اسلامیہ سکول سے مطالعہ کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ یہاں ایک اُستاد ملک نذیر احمد جو لائبریری کے انچارج بھی تھے، ان کی رہنمائی میں لائبریری کی کتب سے استفادہ کرتے۔ اسی طرح مولانا محمد عالم سے قرآن مجید کی تعلیم حاصل کی اور لکھنے کا شوق بھی نویں جماعت سے پیدا ہوا۔ اکثر سکول میں تقریری مقابلوں میں حصہ لیتے اور شعر و سخن کا آغاز دسویں جماعت سے کیا تو شاہین تخلص رکھا جو علامہ اقبال سے والہانہ عقیدت کی علامت ہے۔ علامہ اقبال کی فکر و فن ڈاکٹر شاہین کی غزلوں اور نظموں میں نمایاں ہے۔ غزل اور نظم کی شاعری کے بارے میں ڈاکٹر شاہین کا کہنا ہے:

''شاعری میں میرا میلان زیادہ تر غزل کی طرف ہے۔ ضرورت ہو تو نظم بھی کہہ لیتا ہوں۔ چند آزاد نظمیں بھی کہی ہیں۔ کسی اعلیٰ و ارفع مقصد کے بغیر شاعری میرے نزدیک تصنیع اوقات ہے لیکن شاعری کے جمالیاتی پہلوؤں سے اغماض کی روش کو بھی پسند نہیں کرتا۔''

کالج میں تدریس کے دوران شاعری اور نثر میں پختگی آ گئی تھی جہاں ڈاکٹر اسلم قریشی ان کی حوصلہ افزائی کرتے۔ ۱۹۵۹ء سے ۱۹۷۲ تک آپ نے مختلف موضوعات پر مضامین تحریر کیے جو مختلف رسائل میں شائع ہونے لگے۔ اب ان کی شاعری میں جمالیاتی پہلو اور اعلیٰ و ارفع مقصد

نمایاں ہونے لگا۔ آپ ''بزم روح الادب'' راولپنڈی کے سیکرٹری رہے اور ہر مشاعرے کی جان سمجھے جاتے۔ مشاعروں کی رودادیں تحریر کرتے جو اخبارات کے ادبی صفحات کی زینت بنتی۔ ان رودادوں میں چند ایک ان کے شعری مجموعہ ''شہرِ جمال'' کے آخر میں شامل ہیں۔ یہ شعری مجموعہ ان کی رحلت کے بعد راقم نے مرتب کر دیا ہے۔

ایک عرصہ تک ''ہمدرد'' اور علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے ''اقبال لیکچرز'' کی نظامت بھی کرتے رہے۔ ان لیکچرز کی رودادیں راقم نے ایک کتاب ''اقبال کی یاد میں'' میں شامل کر دی ہیں۔

ڈاکٹر رحیم بخش شاہین شروع میں شاعری کی جانب مائل رہے لیکن بعد میں انہوں نے اپنے خیالات کے اظہار کے لیے نثر کو موثر ذریعہ بنا لیا اور یوں نظم و شعر گوئی سے باز رہنے لگے۔ ''شہرِ جمال'' میں ان کے بعض منظومات کلام کے آخر میں کہیں کہیں تاریخ (سرورن) بھی درج ہے جو ۱۹۶۹ء سے ۱۹۷۵ء تک کے عرصہ پر محیط ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کا تخلص ''شاہین'' اس بات کی علامت ہے کہ وہ علامہ اقبال کے شیدائی تھے۔ ڈاکٹر صاحب کے اشعار میں علامہ اقبال کے سبک و اسلوب کا رنگ انتہائی واضح اور بہت گہرا نظر آتا ہے۔ علامہ اقبال کے فکر و فن کا واضح تاثر ان کی نظموں میں بالخصوص اور غزلوں میں بالعموم ملتا ہے۔

ڈاکٹر رحیم بخش شاہین کے شعری مجموعہ ''شہرِ جمال'' کی اشاعت میرے لیے اعزاز ہے کہ ڈاکٹر شاہین کی ایک دیرینہ خواہش کی تکمیل ہوئی جس کا اظہار اُن کی ایک قلمی تحریر میں برملا ہے جو اس مجموعہ کے آخر میں شامل ہے۔ اس مجموعہ کی اشاعت کے لیے میں ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی صاحب کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں کہ انہوں نے ڈاکٹر شاہین سے عقیدت و محبت کے ساتھ میری صلاحیتوں کو نکھارنے اور اس ادبی کام میں مصروف رکھنے کے لیے ڈاکٹر رحیم بخش شاہین پر احباب سے مضامین لکھوانے اور ان مضامین کی جمع و تدوین کی طرف مجھے متوجہ کیا تو ڈاکٹر رحیم بخش شاہین کے فکر و فن پر مضامین کا مجموعہ ''یادِ رحیم بخش شاہین'' مرتب کر دیا۔ اس میں ڈاکٹر رحیم بخش شاہین کا مفصل سوانحی خاکہ ان کے تمام پہلوؤں کی نقاب کشائی کرتا ہے۔

گورنمنٹ انٹر کالج پنڈی گھیب میں اُردو لیکچرار ۳ مئی ۱۹۶۹ء تا ۱۲ جون ۱۹۷۰ء رہے۔

۲۹ ستمبر ۱۹۷۰ء تا ۲۷ اپریل ۱۹۸۱ء تک گورنمنٹ حشمت علی اسلامیہ کالج راولپنڈی میں رہے۔
۲۸ اپریل ۱۹۸۱ء تا ۳۰ اگست ۱۹۸۲ء گورنمنٹ گورڈن کالج راولپنڈی میں اپنے فرائض منصبی ادا کرتے رہے۔ یکم ستمبر ۱۹۸۲ء تا ۳۰ اپریل ۱۹۸۵ء علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد میں اقبالیات کے لیکچرار ڈیپوٹیشن پر تعینات رہے۔ ۵ مئی ۱۹۸۵ء تا ۱۲ ستمبر ۱۹۸۶ء لیکچرار اُردو گورنمنٹ ڈگری کالج کوہ مری رہنے کے بعد ۱۳ ستمبر ۱۹۸۶ء تا ۴ ستمبر ۱۹۸۸ء گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج اصغر مال راولپنڈی میں رہے۔ بالآخر ۵ ستمبر ۱۹۸۸ء کو ایسوسی ایٹ پروفیسر علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی میں دوبارہ آ گئے اور یہاں پروفیسر اور چیئرمین شعبہ اقبالیات، چیئرمین شعبہ اُردو اور چیئرمین شعبہ پاکستانی زبانیں بھی رہے۔ اوپن یونیورسٹی سے مستقلاً وابستہ ہوئے تو انہیں احساس ہوا کہ پی ایچ ڈی کرنا ضروری ہے۔ انہوں نے ڈاکٹریٹ کے مقالے کے لیے ''مکاتیب اقبال کا تنقیدی جائزہ'' پر ایک تحقیقی خاکہ بنا کر پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ اُردو میں جمع کرایا جہاں اُن دنوں ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار صدر شعبہ اُردو تھے۔ بعض وجوہ سے موضوع کی منظوری میں تاخیر ہوتی رہی تو ڈاکٹر رحیم بخش شاہین کچھ مایوس ہونے لگے۔ آخر کار دسمبر ۱۹۸۵ء میں اپنے نگران ڈاکٹر نجم الاسلام سے مشورے اور رہنمائی کے لیے حیدر آباد سندھ چلے گئے اور سندھ یونیورسٹی جامشورو میں پی ایچ ڈی کے لیے رجسٹریشن ہوئی۔

۱۹۸۴ء اور ۱۹۸۵ء کا زمانہ اوپن یونیورسٹی شعبہ اقبالیات میں دفتری اور منصبی مصروفیات کی وجہ سے مقالے کی تیاری کے لیے خاطر خواہ توجہ اور وقت نہیں دے سکے۔ اس دوران ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی اور ڈاکٹر نجم الاسلام سے مسلسل رابطے میں رہے اور ہمت نہ ہاری۔ بہرحال دفتری اور منصبی مصروفیات، نصابی مشقوں کی پڑتال اور تحقیقی مقالات کی نگرانی کے ساتھ ساتھ اپنا تحقیقی کام جاری رکھا اور ۱۹۸۸ء کے اوائل میں مقالہ مکمل کر کے اسی سال ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کر لی۔

ڈاکٹر محمد ریاض ۲۸ نومبر ۱۹۹۴ء کو رحلت فرما گئے تو ڈاکٹر شاہین شعبہ اقبالیات کے صدر نشین مقرر ہوئے اور ۱۹۹۶ء میں عارضی بنیادوں پر اور اگلے برس مستقل پروفیسر بن گئے اور تادم مرگ ۱۸ جولائی ۱۹۹۸ء اسی عہدے پر فائز رہے۔

ڈاکٹر رحیم بخش شاہین کی ہمہ جہت شخصیت اُستاد، شاعر، محقق، مترجم و مبصر نمایاں ہیں۔

ماہر تعلیم، لسانیات، اقبالیات ہونے کے باوجود آپ کی شہرت کا باعث اقبالیات کا شعبہ ہے جس میں آپ اپنی انتھک محنت اور لگن سے علامہ اقبال کے ایسے نادر و نایاب گوشوں کو منظر عام پر لائے جن کے حوالے کے بغیر بات نہیں بنتی۔ آپ کی شخصیت میں علامہ اقبال رچے بسے ہوئے تھے۔ اللہ رب العزت نے مجھے سعادت بخشی اور مجھ ناچیز پر اللہ سبحانہ کا احسان عظیم ہے کہ اس نے مجھے بڑی محبت کرنے والے شفیق اور بلند مرتبہ اساتذہ کرام سے علمی پیاس بجھانے کا شرف بخشا۔

ڈاکٹر رحیم بخش شاہین سے اس وقت شناسائی ہوئی جب بی اے میں ''اقبال کی اُردو نظم'' میں میرے استاد مقرر ہوئے پھر نہ صرف ایم فِل اقبالیات کے کورسز میں میرے اُستاد رہے بلکہ ایم فِل مقالہ ''مجلّہ نیرنگِ خیال میں اقبالیات: تحقیقی جائزہ'' کے نگران مقرر ہوئے۔ اُنہیں بحیثیت استاد نہایت شفیق پایا۔

ڈاکٹر رحیم بخش شاہین ایم فِل، پی ایچ ڈی کے بے شمار مقالوں کی نگرانی کرتے رہے۔ تعلیمی سرگرمیوں میں بہت سے درسی نصاب بھی تیار کیے۔ تعلیمی، علمی و ادبی سیمینار، ریڈیو، ٹیلی ویژن کے پروگراموں میں شرکت فرمائی اور بہت سی تدریسی ذمہ داریوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے۔ تعلیمی مجلّات کے مدیر اور بطور مصنف و مرتب بھی ان کی خدمات کی فہرست طویل ہے۔ ان کی کتب کی تفصیلات زمانی اعتبار سے اس طرح سے ہیں۔

۱۔ اوراق گم گشتہ۔ اسلامک پبلی کیشنز لمیٹڈ، لاہور۔ اشاعت اول۔ اپریل ۱۹۷۵ء
اشاعت دوم، مارچ ۱۹۷۹ء۔ اس کتاب کا ایک ایڈیشن بھارت سے بھی شائع ہو چکا ہے۔

۲۔ نقوش قائداعظم۔ مکتبہ شاہکار، لاہور۔ اپریل ۱۹۷۶ء
نقوش قائداعظم (نظر ثانی ایڈیشن)۔ شیخ اکیڈمی، لاہور۔ نومبر ۱۹۷۶ء

۳۔ اقبال کے معاشی نظریات۔ ال پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگریس، لاہور۔ ۱۹۷۱ء

۴۔ Mementes ال پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگریس، لاہور۔ ۱۹۷۶ء

۵۔ مولانا مودودی کے انٹرویو۔ اسلامک پبلی کیشنز، لاہور۔ جنوری ۱۹۷۶ء
(یہ کتاب اصل کی بجائے ابوطارق ایم اے۔ اپنے صاحبزادے محمد طارق شاہین کے نام سے شائع ہوئی ہے)۔

۶۔ مکاتیب اقبال کا تنقیدی جائزہ (غیر مطبوعہ)۔ پی ایچ ڈی مقالہ۔ شعبہ اردو۔ سندھ یونیورسٹی

جامشورو۔سندھ۔۱۹۸۸ء(نگران مقالہ ڈاکٹر نجم الاسلام)۔

۷۔ ارمغان اقبال۔اسلامک پبلی کیشنز لمیٹڈ،لاہور۔نومبر ۱۹۹۱ء۔

۸۔ تخلیقی ارتقاء (ہنری برگساں کی کتاب (Creative Evaluation) ۔مترجمین ڈاکٹر رحیم بخش شاہین/عبدالحمید اعظمی۔مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد۔۱۹۹۹۔
(ڈاکٹر صاحب اس کتاب کا ایک تہائی ترجمہ کر چکے تھے لیکن خرابی صحت اور پھر بوجہ وفات ترجمہ مکمل نہ ہو سکا تو مقتدرہ قومی زبان نے باقی ترجمہ عبدالحمید اعظمی سے کروایا)۔

۹۔ شہر جمال(شاعری):(مرتب ڈاکٹر محمد وسیم انجم)۔انجم پبلشرز۔کمال آباد۳،راولپنڈی۔ ستمبر ۲۰۰۱ء

۱۰۔ اقبال پر مضامین کا مجموعہ: غیر مطبوعہ

۱۱۔ Allama Muhammad Iqbal Life, Act and Thought

ڈاکٹر محمد رحیم بخش شاہین کا غیر مطبوعہ پی ایچ ڈی مقالہ اور کتب ان کے صاحبزادے محمد طارق شاہین کے پاس محفوظ ہیں۔ان کی خدمات کے اعتراف میں نذیرہ بیگم نے ''ڈاکٹر رحیم بخش شاہین بطور اقبال شناس'' کے موضوع پر علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے ایم فِل اقبالیات کا مقالہ تحریر کیا ہے جبکہ عادل عباس نقوی نے ایم فِل اُردو مقالہ ''ڈاکٹر رحیم بخش شاہین: شخصیت وفن'' ناردرن یونیورسٹی نوشہرہ سے مکمل کیا ہے۔ڈاکٹر رحیم بخش کی طویل تعلیمی، علمی وادبی خدمات کے پیش نظر ضرورت اس امر کی ہے کہ ان پر پی ایچ ڈی کا مقالہ ضبطِ تحریر میں لایا جائے۔

پروفیسر ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی

ڈاکٹر راشد حمید

پروفیسر ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی ۹ فروری ۱۹۴۰ء کو مصریال، ضلع چکوال میں پیدا ہوئے۔ سرکاری کاغذات میں تاریخ پیدائش یکم اپریل ۱۹۴۲ء درج ہے۔والدِ گرامی کا نام محمد محبوب شاہ ہاشمی ہے۔ڈاکٹر صاحب نے حفظِ قرآن کے بعد پرائمری تعلیم مصریال اور لڈے والا سے ۱۹۵۳ء میں مکمل کی۔انبالہ مسلم ہائی سکول سرگودھا سے ۱۹۵۷ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔اسی سال گورنمنٹ کالج سرگودھا میں داخلہ لیا اور ۱۹۶۰ء میں انٹرمیڈیٹ کا امتحان یہیں سے پاس کیا۔ شدید اور مسلسل علالت کے سبب کسی کالج میں داخل نہ ہوئے اور بی اے کا امتحان ایک پرائیویٹ امیدوار کی حیثیت سے ۱۹۶۳ء میں پاس کیا۔

ڈاکٹر صاحب نے ۱۹۶۴ء میں گورنمنٹ کالج سرگودھا میں ایم اے اردو میں داخلہ لیا مگر ۱۹۶۵ء میں اپنے شوق کے سبب اورینٹل کالج لاہور میں مائیگریشن کرالی۔۱۹۶۶ء میں ایم اے اوّل بہ درجہ اوّل پوزیشن میں پاس کر کے سب کو حیران کر دیا۔انہیں یونیورسٹی گولڈ میڈل اور تمغائے بابائے اردو بھی دیا گیا۔ڈاکٹر صاحب نے جن اساتذہ سے پڑھا ان میں ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، پروفیسر سید وقار عظیم، ڈاکٹر مناظر حسین زیدی، پروفیسر خواجہ محمد سعید، ڈاکٹر اقبال احمد خاں، ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی اور ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا شامل ہیں۔

پروفیسر ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی نے عملی زندگی کا آغاز صحافت سے کیا۔طالب علمی کے

زمانے میں تعلیمی اخراجات پورے کرنے کے لیے مختلف اخبارات و رسائل میں مضمون نگاری کرتے رہے۔ایم اے اُردو کے بعد پروفیسر وقار عظیم کے توسط سے روزنامہ مشرق لاہور سے بہ طور معاون مدیر وابستہ ہوئے۔ بہت جلد غزالی کالج جھنگ میں لیکچرار ہو گئے۔ ۱۹۶۷ء میں میونسپل ڈگری کالج چشتیاں اور بعد ازاں ایف سی کالج لاہور میں پڑھاتے رہے۔ ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کے سبب ملازمتوں پر عرصے تک پابندی رہی لہٰذا ڈاکٹر صاحب نے ماہنامہ سیارہ اور اُردو ڈائجسٹ میں ادارت کے شعبے سے وابستگی اختیار کر لی۔ ۱۹۶۹ء میں انبالہ مسلم کالج سرگودھا سے لیکچرار کی حیثیت سے منسلک ہو گئے۔ اسی سال کے دوران میں اکتوبر ۱۹۶۹ء میں ڈاکٹر صاحب رشتہ ازدواج سے منسلک ہو گئے۔ جون ۱۹۷۰ء میں پنجاب پبلک سروس کمیشن سے پنجاب کے کالجوں کے لیے لیکچرر منتخب ہوئے۔ پہلی تقرری گورنمنٹ کالج مری میں ہوئی۔ سوا سال بعد تبادلہ گورنمنٹ کالج سرگودھا میں ہو گیا، جہاں نو برس تدریس کے فرائض انجام دیے۔ اس تعیناتی کے دوران میں ڈاکٹر صاحب نے ڈاکٹر وحید قریشی کی نگرانی میں ''تصانیف اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ'' کے موضوع پر مقالہ لکھ کر ۱۹۸۲ء میں جامعہ پنجاب، اورینٹل کالج لاہور سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔

۹ ستمبر ۱۹۸۲ء کو ڈاکٹر صاحب کی تعیناتی لیکچرر کی حیثیت سے اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی لاہور میں گئی۔ اسی جامعہ میں اسسٹنٹ پروفیسر، ایسوسی ایٹ پروفیسر، پروفیسر اور صدر شعبہ کے عہدوں پر خدمات انجام دینے کے بعد ۳۱ مارچ ۲۰۰۲ء کو ساٹھ برس عمر پوری کر کے ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ دو برس تک اسی جامعہ میں مہمان پروفیسر کی حیثیت سے منسلک رہے۔ ۲۰۰۱ء میں پروفیسر صاحب کو ہائر ایجوکیشن کمیشن نے بہترین استاد کا اعزاز بھی دیا۔ ڈاکٹر صاحب کی زیرِ نگرانی سیکڑوں تحقیقی اور تنقیدی مقالات لکھ کر طلبا و طالبات نے ایم اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ خاکسار بھی جہاں برس ہا برس پروفیسر ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی مدظلہٗ سے اکتسابِ فیض کی سعادت حاصل رہی وہاں ایم فل اقبالیات کا مقالہ بھی انہیں کی نگرانی اور راہ نمائی میں مکمل کیا۔ ان کے فیضانِ نظر ہے کہ میں یہ مقالہ مکمل کر سکا اور بعد میں ''زندہ رُود کا تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ'' کے عنوان سے شایع ہوا۔

ڈاکٹر صاحب نے ملازمت سے سبکدوشی کے بعد بھی کام اسی رفتار سے جاری رکھا۔ دو برس سے زیادہ عرصہ ادارہ معارفِ اسلامی کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ بعد ازاں ۲۰۰۶ء میں ایچ ای سی نے دو برس کے لیے ایمی نینٹ پروفیسر کا درجہ دیا اور ڈاکٹر صاحب دو برس جامعہ پنجاب کے شعبہ اقبالیات میں تحقیقی کاموں میں مشغول رہے۔ ڈاکٹر صاحب اس قدر متحرک ہیں کہ ۲۰۰۲ء سے اب تک ان کی انیس (۱۹) سے زیادہ کتابیں چھپ چکی ہیں حالانکہ جامعہ پنجاب سے ان کی وابستگی اور اس سلسلے کی مصروفیات میں کسی طرح کمی نہیں آئی۔

پروفیسر ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی نے ملک میں اور ملک سے باہر درجنوں بین الاقوامی کانفرنسوں میں بڑی تعداد میں تحقیقی، تنقیدی اور فکری موضوعات پر گراں قدر مقالے پیش کیے۔ انھوں نے ملک سے باہر پاکستان کی نمائندگی کا ہمیشہ کما حقہٗ ادا کیا۔ درجنوں علمی اور ادبی اداروں سے مختلف حیثیتوں میں ڈاکٹر صاحب کی وابستگی کبھی بھی معمول کی کارروائی نہیں رہی بل کہ وہ ان اداروں کے لیے اعزاز کا سبب بن جاتے رہے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کو یوں تو بہت سے اعزاز ملتے رہے ہیں مگر حکومت کی جانب سے ۲۰۱۴ء میں صدارتی تمغۂ امتیاز، ۲۰۱۵ء میں قومی صدارتی اقبال ایوارڈ، ۲۰۰۱ء میں بیسٹ ٹیچر ایوارڈ، جب کہ ۱۹۹۷ء میں نقوش ایوارڈ اور ۱۹۸۲ء میں داؤد ادبی انعام برائے تحقیق و تنقید دیے گئے۔ ڈاکٹر صاحب کی درجنوں کتابیں زیورِ طباعت سے آراستہ ہو چکی ہیں۔ **فہرست ملاحظہ کیجیے:**

۱۔ چاند کا سلام: اسعد گیلانی کے منتخب مضامین (شریک مرتب)۔ ادارہ ادب اسلامی، سرگودھا، ۱۹۶۹ء

۲۔ اقبال کی طویل نظمیں: گلوب پبلشرز، لاہور، ۱۹۷۴ء
نظر ثانی اور اضافوں کے ساتھ: سنگِ میل، لاہور، ۱۹۸۱ء، ۱۹۸۵ء، ۱۹۹۳ء، ۱۹۹۸ء، ۲۰۰۴ء

۳۔ سرور اور فسانۂ عجائب: سنگِ میل، لاہور، ۱۹۷۵ء، ۱۹۷۹ء، ۱۹۸۳ء، ۱۹۹۱ء، ۲۰۰۸ء

۴۔ اصنافِ ادب: سنگِ میل، لاہور، ۱۹۷۲ء، ۱۹۷۹ء، ۱۹۸۳ء، ۱۹۹۱ء، ۱۹۹۸ء، ۲۰۰۳ء، ۲۰۰۸ء

۵۔ کتبِ اقبالیات: تاج بک ڈپو، لاہور، ۱۹۷۵ء

۶۔ خطوطِ اقبال (مرتبہ): مکتبہ خیابانِ ادب، لاہور، ۱۹۷۶ء۔ بیسویں صدی پبلی کیشنز، دہلی، ۱۹۷۷ء

۷۔ اقبال بہ حیثیت شاعر (مرتبہ): مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۷۷ء، ۲۰۰۷ء۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۸۲ء، ۱۹۹۶ء

۸۔ کتابیاتِ اقبال: اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۷۷ء

۹۔ تصانیفِ اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ: اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۸۲ء، ۲۰۰۱ء، ۲۰۱۱ء

۱۰۔ خطوطِ مودودی، جلد اوّل (شریک مرتب): البدر پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۳ء۔ منشورات، لاہور، ۲۰۱۱ء

۱۱۔ ۱۹۸۵ء کا اقبالیاتی ادب: اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۸۶ء

۱۲۔ ۱۹۸۶ء کا اقبالیاتی ادب: اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۸۸ء

۱۳۔ اقبال شناسی اور جرنل ریسرچ (مرتبہ): بزمِ اقبال، لاہور، ۱۹۸۹ء

۱۴۔ اقبال شناسی اور محور (مرتبہ): بزمِ اقبال، لاہور، ۱۹۸۹ء

۱۵۔ اقبالیاتی جائزے: گلوب پبلشرز، لاہور، ۱۹۹۰ء

۱۶۔ علامہ اقبال سوانح و منتخب کتابیات: مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۲ء

۱۷۔ اقبالیاتی ادب کے تین سال (۱۹۸۷ء تا ۱۹۸۹ء): الحمرا پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۲ء

۱۸۔ علامہ اقبال اور میر حجازؒ: بزمِ اقبال، لاہور، ۱۹۹۴ء، ۲۰۱۵ء، ۲۰۱۶ء

۱۹۔ خطوطِ مودودی، جلد دوم (شریک مرتب): منشورات، لاہور، ۱۹۹۵ء

۲۰۔ تحقیقِ اقبالیات کے مآخذ: اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۹۶ء

۲۱۔ اورینٹل کالج کے موجودہ اساتذہ، کوائف اور علمی خدمات: پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور، ۱۹۹۷ء

۲۲۔ ارمغانِ علمی .....بپاسِ خدماتِ علمی و ادبی ڈاکٹر وحید قریشی (شریک مرتب): القمر انٹر پرائزز، لاہور، ۱۹۹۸ء

۲۳۔ خطباتِ رسولؐ: منشورات، لاہور، ۱۹۹۹ء، ۲۰۰۳ء، ۲۰۱۴ء

۲۴۔ تصانیفِ مودودی (اشاعتی اور کتابیاتی مطالعہ): ادارہ معارف اسلامی، لاہور، ۱۹۹۹ء

۲۵۔ مضامینِ فرحت اللہ بیگ (انتخاب مع مقدمہ): القمر انٹر پرائزز، لاہور، ۱۹۹۹ء

۲۶۔ اقبال کا تصورِ جہاد: منشورات، لاہور، ۱۹۹۹ء

۲۷۔ تفہیم و تجزیہ: کلیہ علوم اسلامیہ و شرقیہ، جامعہ پنجاب، لاہور، ۱۹۹۹ء

۲۸۔ پوشیدہ تری خاک میں..... (سفرنامہ اُندلس): دارالتذکیر، لاہور، ۲۰۰۲ء

۲۹۔ ارمغانِ شیرانی (شریک مرتب): شعبہ اردو پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۲۰۰۲ء

۳۰۔ اقبالیات کے سو سال (شریک مرتب): اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۰۲ء

۳۱۔ اقبالیات: تفہیم و تجزیہ: اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۲۰۰۵ء، ۲۰۰۷ء، ۲۰۱۱ء

۳۲۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی، علمی و فکری مطالعہ (شریک مرتب): ادارہ معارفِ اسلامی، لاہور، ۲۰۰۶ء

۳۳۔ سورج کو ذرا دیکھ (سفرنامہ جاپان): (کتاب سرائے، لاہور، ۲۰۰۸ء

۳۴۔ یادنامہ سید اسعد گیلانی (مرتب): ادارہ معارفِ اسلامی، لاہور، ۲۰۰۸ء

۳۵۔ مکاتیبِ مشفق خواجہ: ادارہ مطبوعات سلیمانی، لاہور، ۲۰۰۸ء

۳۶۔ علامہ اقبال: شخصیت اور فن: اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۰۸ء
علامہ اقبال: شخصیت اور فکر و فن: (نظر ثانی اور اضافوں کے ساتھ) اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۲۰۱۰ء، ۲۰۱۶ء

۳۷۔ جامعات میں اردو تحقیق: ہائر ایجوکیشن کمیشن، اسلام آباد، ۲۰۰۸ء

۳۸۔ پاکستان میں اقبالیاتی ادب: اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۲۰۰۹ء

۳۹۔ صحتِ املا کے اصول: ادارہ مطبوعات سلیمانی، لاہور، ۲۰۰۹ء ادارہ یادگارِ غالب،

کراچی، ۲۰۱۶ء

۴۰۔ ارمغانِ افتخار احمد صدیقی: (شریک مرتب) شعبۂ اردو، پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور، ۲۰۰۹ء

۴۱۔ یادنامہ لالۂ صحرائی: کتاب سرائے، لاہور، ۲۰۱۱ء

۴۲۔ نثرِ اقبال کا تنوّع: شعبہ فلسفہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۲۰۱۲ء

۴۳۔ علامہ اقبال: مسائل و مباحث (ڈاکٹر سید عبداللہ کے مقالات): اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۲۰۱۲ء

۴۴۔ سیرتِ سرورِ عالمؐ: جلد سوم (سید ابوالاعلیٰ مودودی)، (شریک مرتب): ادارہ ترجمان القرآن، لاہور، ۲۰۱۲ء

۴۵۔ علامہ اقبال کا تصورِ ریاست (ڈاکٹر وحید قریشی کے مضامین): بزمِ اقبال، لاہور، ۲۰۱۴ء

۴۶۔ اقبالیاتی ادب، حالیہ پیش رفت: اقبال انسٹی ٹیوٹ، کشمیر یونیورسٹی، سری نگر، ۲۰۱۴ء

۴۷۔ علامہ اقبال، سوانح و افکار: یو ایم ٹی (یونیورسٹی آف مینجمنٹ اینڈ ٹیکنالوجی) پریس، لاہور، ۲۰۱۶ء

۴۸۔ تذکرہ لالۂ صحرائی: (شریک مرتب): بیکن بکس، لاہور، ۲۰۱۶ء

۴۹۔ علامہ محمد اقبال: ادارہ فروغِ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۱۷ء

نام وَر اُستاد، بے بدل اقبال شناس، ممتاز محقق اور تنقید نگار پروفیسر ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کے علمی کمالات وفتوحات کے بارے میں کیا لکھوں۔ اس کے لیے تو کئی جلدوں پر مشتمل کتاب کی ضرورت ہوگی۔ ان کا کوائف نامہ دیکھ کر ہی اندازہ ہوجاتا ہے کہ یہ بھاری پتھر اُٹھانے کے لیے بڑے دل گردے کی ضرورت ہے۔ میں اس وقت حضرت کا ذکر کر کے صرف سعادت منداور باتوفیق شاگرد اور مرید ہونے کا سامان کرنا چاہتا ہوں۔ اس خوش قسمتی اور حسنِ اتفاق کا ذکر کرتا چلوں کہ حضرت نے اپنی پہلی سرکاری تدریسی ملازمت کا آغاز گورنمنٹ کالج مری سے کیا اور مجھے بھی یہ اعزاز حاصل ہے کہ پہلی سرکاری ملازمت کا آغاز اسی تعلیمی ادارے سے کیا۔

پروفیسر ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی درجنوں افراد کے مرشد، ہزاروں کے اُستاد اور ہزاروں ہی

کے محسن ہیں۔ اسلامی روحانی تہذیب کے خمیر میں گندھے ہوئے ایسے باکمال عالم ہیں جن کی طبیعت کے حیرت انگیز عجز اور انکسار نے خاکساری کی تمام حدیں پار کر لی ہیں۔ ان کے بارے میں لکھنا اس لیے مشکل ہے کہ مبالغے کی صفت سے مبالغے کی حد تک استفادے کے باوجود ان کی ذات پوری طرح تو کیا منکشف ہوگی، ان کی زندگی کا کوئی ایک گوشہ بھی فہم وادراک کی گرفت میں نہیں آتا۔

بہت سے بزرگ اور احباب ایسے ہیں جن کے بارے میں بڑی سہولت کے ساتھ تھوڑا بہت، اچھا بُرا لکھتا رہا ہوں کیوں کہ کچھ حقائق اور کچھ مبالغہ ملا کر لکھنا قدرے آسان کام ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے بارے میں لکھنا اس لیے مشکل ہے کہ حقائق اس حد تک ناقابلِ یقین ہیں کہ مبالغہ لگنے لگتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے قرآن مجید حفظ کرنے کی سعادت اوائل عمری میں حاصل کر لی، مگر میرے ان سے نیاز مندانہ تعلقات کو بیس برس ہونے کو ہیں اور ابھی کچھ روز پہلے ہی یہ حقیقت مجھ پر منکشف ہوئی۔ بیان کرنا تو کجا کبھی گفتگو کے دوران میں ضمناً کبھی انھوں نے کوئی ایسی بات نہیں کہی جس سے اشارتاً پتا چل سکے کہ ڈاکٹر صاحب حافظِ قرآن ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کے ایک شاگرد نے ایک روز اپنے حالات سے تنگ آ کر کہا کہ ڈاکٹر صاحب آپ ہمیشہ دیانت داری کا درس دیتے رہے اور ہمیں دیانت داری کے بدلے کیا ملا؟ ڈاکٹر صاحب نے حسبِ عادت ہلکی سی خوش گوار مسکراہٹ کے ساتھ بات شروع کی اور لمبی تمہید کے بعد فرمایا: دیانت دارانہ طریقے سے زندگی گزارنے کی توفیق بجائے خود اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے، لہٰذا جو لوگ دیانت کے بدلے میں کسی دُنیاوی فائدے کی توقع رکھتے ہیں، وہ سوچنے کا انداز درست کریں۔

ڈاکٹر صاحب کا شاگرد ہونا میرا بہت بڑا اعزاز ہے جس کے لیے اللہ رب العزت کا بے پناہ شکر گزار ہوں۔ ڈاکٹر صاحب کا حق تو میں نے کیا ادا کرنا تھا مگر انھوں نے زندگی کے تمام خوش گوار اور تلخ لمحوں میں مجھے یہ احساس دلایا کہ وہ ایک مرشد کی طرح میرے پشت پناہ ہیں۔ دُکھ کے لمحوں میں ڈاکٹر صاحب کی موجودگی دُکھ کی شدت ایسے کم کرتی ہے جیسے پانی آگ ٹھنڈی کر دیتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب وقت کے فراخ دلانہ استعمال کے سخت خلاف ہیں مگر وہ ہر کڑے وقت

پر جس طرح دل جوئی کے لیے اہتمام کے ساتھ کھڑے ہوتے ہیں اور جس شفقت و محبت کا اظہار کرتے ہیں، ایسا لگتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے وافر وقت فراہم کر دیا ہے۔ وقت کے محتاط استعمال کا عالم یہ ہے کہ سفر کے دوران میں چھوٹا سا دستی تھیلا ان کے پاس ہوتا ہے۔ اگر خدانخواستہ گاڑی خراب اور جنگل کے بیچ میں سڑک پر کھڑی ہو جائے تو ڈاکٹر صاحب ایک طرف بیٹھ کر تھیلے سے کاغذ پتر نکال کر لکھنے کا کام شروع کر دیتے ہیں۔ اگر راستے میں مسافروں کے طعام کے لیے گاڑی قیام کرے تو ڈاکٹر صاحب احباب کے خطوط کے جواب لکھنا شروع کر دیتے ہیں یا پروف خوانی کے لیے کسی مضمون یا کتاب کا مسودہ نکال کر بیٹھ جاتے ہیں۔ میں بیس برس سے ڈاکٹر صاحب سے وابستہ ہوں، مگر جب بات کرنی ہو تو حجاب آڑے آتا رہتا ہے تا ایں کہ ڈاکٹر صاحب خود فون کر لیں اور گفتگو شروع ہو جائے۔ ڈاکٹر صاحب کی شخصیت اتنی شفاف ہے کہ مجھے کبھی کبھی ان پر قرونِ اولیٰ کے کسی خدا رسیدہ بزرگ کا گمان گزرنے لگتا ہے۔ دوسرا عجیب تجربہ یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے ساتھ گفتگو شروع ہو جائے تو پھر بات ختم کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ ڈاکٹر صاحب سے گفتگو ہوئی ہو اور محسوس نہ ہوا ہو کہ میں نے وہ کچھ حاصل کر لیا ہے جو میرے علم میں پہلے نہیں تھا۔

پروفیسر ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی صاحب کی علمی اور ادبی خدمات کا دائرہ درحقیقت اتنا وسیع ہے کہ اس ہمالیہ کو دیکھنے کے لیے دستار سر سے اُتار کر ہاتھوں میں سنبھالنی پڑتی ہے۔ اس حوالے سے نام ور محقق اور ادبیات کے عالم مشفق خواجہ مرحوم سے اپنی ایک ملاقات کی یاد تازہ ہو گئی۔ اردو کے عہد ساز شاعر اور بے بدل عالم محترم افتخار عارف صاحب نے اکادمی ادبیات پاکستان کے مہمان خانے میں مقیم مشفق خواجہ صاحب سے میرا تعارف کراتے ہوئے ارشاد کیا: یہ راشد حمید ہے، آج کل پی ایچ ڈی کر رہا ہے۔

مشفق خواجہ صاحب نے پوچھا: راشد حمید، آپ نے ایم فل کیا ہے یا براہِ راست پی ایچ ڈی کر رہے ہیں؟

میں نے عرض کیا: ایم فل کر چکا ہوں۔

خواجہ صاحب نے اگلا سوال کیا کہ کہاں سے؟

عرض کیا علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی سے۔

پھر پوچھا: کس شعبے سے؟

عرض کیا: شعبہ اقبالیات سے۔

پھر سوال کیا کہ نگران کون تھے اور مقالے کا موضوع کیا تھا؟

موضوع کے بعد بتایا کہ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی صاحب نگران تھے۔

مشفق خواجہ صاحب کی رگِ ظرافت پھڑکی اور فرمانے لگے.....آہا..... افتخار عارف صاحب کیا بتاؤں: بس اتنا کافی ہے کہ ہاشمی صاحب اقبالیات کے بارے میں اتنا جانتے ہیں جتنا کہ خود اقبال بھی نہیں جانتے تھے۔ محفل کشتِ زعفران ہو گئی اور خواجہ صاحب نے فرمایا: آپ تو مذاق سمجھ رہے ہوں گے مگر حقیقت یہ ہے کہ مجھے ایسا سوال یاد نہیں جو میں نے اقبالیات کی نسبت ہاشمی صاحب سے پوچھا ہو اور اس کا درست جواب نہ ملا ہو۔ انھوں نے مزید فرمایا کہ اقبالیات کے فکری حوالوں سے لے کر چھوٹی چھوٹی جزئیات تک کی نسبت سے جب بھی مجھے کوئی مشکل محسوس ہوئی، میرے ذہن میں ہمیشہ ہاشمی صاحب کا نام آتا رہا ہے۔ خواجہ صاحب نے اس کے علاوہ ہاشمی صاحب کے شخصی اوصاف اور اخلاص و مروّت کا جو نقشہ کھینچا یقیناً ڈاکٹر صاحب اس کا مصداق ہیں۔

پروفیسر ڈاکٹر سید سجاد باقر رضوی

پروفیسر امجد علی شاکر

سید سجاد باقر رضوی ۱۴ اکتوبر ۱۹۲۸ء کو ضلع اعظم گڑھ کے ایک گاؤں چمانواں میں پیدا ہوئے۔ یہ تاریخ ان کی میٹرک کی سند میں درج ہے اور یہ نام بھی میٹرک کرتے ہوئے اختیار کیا گیا۔ ایسا یوں ہوا کہ جن دنوں دسویں جماعت کے داخلے جا رہے تھے آپ فیس کی عدم دستیابی کے باعث سکول کی طرف سے داخلہ نہ بھجوا سکے۔ پرائیویٹ داخلہ بھیجتے ہوئے وہ اپنے پیدائشی نام اولاد باقر کی بجائے سجاد باقر ہو گئے۔ یہ نام باپ اور دادا کے نام کو ملا کر بنایا گیا۔ ان کے والد کا نام سید علی سجاد اور دادا کا نام سید محمد باقر تھا۔ رہی تاریخ پیدائش تو میٹرک کے لیے چودہ سال کی عمر ضروری تھی، چنانچہ اُنھوں نے یہ تاریخ فرض کر لی اور تمام عمر اسی تاریخ کو تسلیم کیا۔

باقر صاحب نے ابتدائی تعلیم الہ آباد میں اپنی خالہ کے گھر رہ کر حاصل کی۔ وہ پہلے ایک سال میونسپل سکول میں پڑھتے رہے پھر اے۔ وی۔ ایم (اینگلو ورنیکلر مڈل) سکول میں داخل ہوئے۔ یہ سکول بعد میں ہائی سکول ہو گیا۔ جہاں سے انھوں نے میٹرک تک تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۴۲ء میں یو۔ پی بورڈ سے میٹرک کا امتحان پرائیویٹ امیدوار کے طور پر پاس کیا۔ اس کے بعد ملازمت اختیار کر لی اور چار سال بعد ۱۹۴۶ء میں یو۔ پی بورڈ سے ہی پرائیویٹ طور پر انٹر کا امتحان پاس کیا۔ قیامِ پاکستان کے بعد ۱۳ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو وہ کراچی آ گئے اور اے۔ جی آفس میں ملازمت کر لی۔ ملازمت کے دوران میں ہی سندھ مسلم کالج میں ایل۔ ایل۔ بی میں داخلہ لے لیا۔ ان دنوں ایف۔ اے کے بعد ایل۔ ایل۔ بی میں داخلہ لینا ممکن تھا۔ ایل۔ ایل۔ بی کے

دوران میں ہی انھوں نے سی۔ ایس۔ پی کا امتحان دیا اور تحریری امتحان پاس بھی کر لیا۔ ایل۔ ایل۔ بی کے بعد انھوں نے اسلامیہ کالج میں بی۔ اے آنرز میں داخلہ لیا اور ۱۹۵۳ء میں یہ امتحان بھی پاس کر لیا۔ اس دوران میں انھوں نے پروفیسر کرّار حسین اور محمد حسن عسکری سے استفادہ کیا۔ ۱۹۵۶ء میں انھوں نے ایم۔ اے انگریزی کا امتحان پاس کیا اور لاہور آ کر اسلامیہ کالج میں استاد مقرر ہو گئے۔ ۱۹۶۳ء میں پروفیسر حمید احمد خاں کے ایما پر وہ پنجاب یونیورسٹی سے منسلک ہو گئے۔ اس دوران میں ہی انھوں نے ۱۹۶۶ء میں اردو میں ایم۔ اے کیا اور بہت بعد میں یعنی ۱۹۸۵ء میں کراچی یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کیا۔ باقر صاحب ۱۹۶۳ء سے ۱۹۸۸ء تک ۲۵ سال اورینٹل کالج میں پڑھاتے رہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد اورینٹل کالج میں ہی غیر ملکی طلبہ کو اردو پڑھانے کا سلسلہ جاری رکھا۔

باقر صاحب دمے (Asthma) کے پرانے مریض تھے۔ آخری عمر میں دمے اور دیگر امراض نے غلبہ پا لیا تو اورینٹل کالج میں تدریس کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ عمر بھر بیماری کے حملے ہوتے، علاج ہوتا اور آپ صحت مند ہو کر گھر آ جاتے۔ آخری بار ۱۲ اگست ۱۹۹۲ء کو بیماری کا شدید حملہ ہوا، انھیں ہسپتال میں داخل کرایا گیا، مگر آفتابِ عمر ڈھل رہا۔ آخر ۱۳ اگست کا سورج طلوع ہوا اور علم و ادب کا یہ آفتاب غروب ہو گیا۔ انھیں اُسی روز ماڈل ٹاؤن جی بلاک کے قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔ احباب اور شاگردوں کی ایک بڑی تعداد نے جنازے میں شرکت کی۔

تصانیف:

شاعری	(۱) تیشۂ لفظ	(۲) جوئے معانی
	(۳) کلیاتِ باقر	
تنقید:	(۱) تہذیب و تخلیق	(۲) مغرب کے تنقیدی اصول
	(۳) وضاحتیں	(۴) معروضات
	(۵) باتیں	(۶) علامہ اقبال اور عرضِ حال
تراجم:	(۱) داستانِ مغلیہ	(۲) جدید ناول نگار (امریکہ میں)
	(۳) افتادگانِ خاک	(۴) بلالؓ
	(۵) بدلتی دنیا کے تقاضے	(۶) جدید دنیا میں روایتی اسلام

ترتیب: (۱)غالب ذاتی تاثرات کے آئینے میں (۲)مرقع ادب

متفرق: قائداعظم محمد علی جناح، معمار پاکستان

غیر مطبوعہ (۱) کلاسیکی اردو شاعری میں طنز و مزاح (ڈاکٹریٹ کا مقالہ)

(۲)اسپائنوزا (ترجمہ))

(۳)حضرت ابراہیم اور ان کا عہد (ترجمہ)

غیر مرتبہ: متفرق مضامین، دیباچے اور تبصرے

تاثرات:

باقر صاحب اردو ادب کے عظیم اساتذہ میں شمار کیے جاتے ہیں۔ انھوں نے بہت سے لوگوں کو ذوقِ ادب سے آشنا بھی کیا اور انھیں تفہیم ادب اور تخلیقِ ادب کے اصول بھی سکھائے۔ وہ شاگردوں کے حلقے میں خوب کھلتے تھے اور علم و دانش کے نکات بیان کرتے تھے۔ وہ کلاس روم میں ہی نہیں اپنے کمرے میں بھی ترسیل علم کا کام جاری رکھتے تھے حتیٰ کہ اپنے گھر میں بھی علمی سرگرمیوں میں مصروف رہتے تھے۔ آپ کی شخصیت کو سمجھنے کے لیے ایک واقعہ بہت اہم ہے۔ ایک دفعہ پروفیسر قمر عباس نے آپ کے بوٹ دیکھ کر پوچھا کہ یہاں کہاں سے لیے ہیں۔ آپ نے بتایا کہ دراصل ان کے پاؤں بہت چھوٹے ہیں۔ ان کی اہلیہ بچوں کے جوتوں میں سے سب سے بڑے سائز کا جوتا خرید لاتی ہیں جو انھیں فٹ بیٹھتے ہیں۔ قمر عباس حیران ہوئے تو آپ نے کہا:

''دیکھو قمر عباس میرے اندر تین زمانے سانس لیتے ہیں۔ میں پاؤں سے بچہ ہوں، دل سے جوان اور سر سے بوڑھا ہوں۔''

باقر صاحب محبت اور محنت کے قائل تھے۔ محبت دوستوں کے لیے، عزیزوں کے لیے اور تلامذہ کے لیے، محنت علم کے لیے تخلیق کے لیے اور ادب کے لیے، وہ کہا کرتے تھے کہ:

''میں محبت اور محنت کے نقطے اوپر نیچے کرتا رہا ہوں۔''

وہ بتانے کہ ان کا مزاج رومانوی تھا۔ انھوں نے اسے کلاسیکی بنانے کے لیے بہت

محنت کی اور ریاضت کی۔ کلاسیکی مزاج تدریس اور تصنیف میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ آپ کی شخصیت میں کلاسیکیت کا رچاؤ تھا۔ یہی رویہ تہذیب کی تفہیم عطا کر سکتا ہے اور یہ رویہ کسی تہذیب میں ہی پیدا ہو سکتا ہے۔

باقر صاحب روایتی معاشرے کو عشق اور جہاد کا معاشرہ کہتے تھے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد یہ معاشرہ مقصدیت، افادیت اور اصلاح کا علم لے کر نکلا اور روایتی معاشرے کی شکست و ریخت ہونے لگی۔ روایتی معاشرہ اقدار پر قائم تھا اور جدید معاشرہ مقدار کو اہم سمجھتا ہے۔ باقر صاحب اقدار کے ساتھ کھڑے ہونے کو اہمیت دیتے تھے۔ یہی ان کا پیغام تھا۔ وہ کرار صاحب کا یہ جملہ دہرایا کرتے تھے:

''جب بھی لڑو Values (اقدار) کے لیے لڑو، (مفاد) Interest کے لیے مت لڑو۔''

یہی بات ان کے فکر و نظر کی بنیاد تھی۔

کتب پر تبصرہ:

شاعری

۱۔ تیشۂ لفظ، مارچ ۱۹۶۸ء، کتابیات لاہور، اشاعت ثانی، ۱۹۹۱ء، ملک لا چیمبرز راولپنڈی

یہ سجاد باقر رضوی کا پہلا شعری مجموعہ ہے۔ اس میں پہلی اشاعت کے وقت باسٹھ غزلیں شامل تھیں جبکہ دوسری اشاعت کے وقت ان کی تعداد تریسٹھ ہے۔ باقر صاحب رومانوی مزاج کے حامل تھے، مگر انھوں نے کلاسیکی انداز کو اپنانے کی سعی کی۔ وہ فن میں کلاسیکی شاعری اور شعرا کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ اس کتاب میں رومانی مزاج کی انانیت اور خودنگری بھی ہے اور کلاسیکی انداز کا ڈسپلن بھی۔ یہ دونوں رویے اِک مِک ہو کر ایک نیا ذائقہ اور انداز پیش کر رہے ہیں۔ فکری سطح پر اس کیفیت کو ناصر کاظمی نے یہ کہہ کر پیش کیا ہے:

''باقر صاحب معاشرے کے شاعر ہیں۔ اس لیے ان کا رویہ نہ تو محض داخلی ہے اور نہ محض خارجی ہے، بلکہ وہ اپنی صلاحیتوں کو ایک ایسے مرکز پر مجتمع کرنا چاہتے ہیں جہاں عقل اور جذبہ گلے ملتے نظر آئیں۔ جذبہ ان کے اشعار میں عقل کا بھیس بدل کر سامنے آتا ہے اور شاید اسی لیے وہ میر کی بجائے غالب کو اپنا رہبر مانتے ہیں۔''(۱)

باقر صاحب کا یہ مجموعہ کلام ایک نئے انداز، ذوق اور ذائقے کی خبر دیتا ہے۔ ناصر کاظمی نے انھیں شہری فرہاد کہا تھا۔ وہ محبت کے لیے دودھ کی نہر تو نکالتے ہیں، مگر شہر سے باہر نہیں جاتے۔ یہ بات انھیں کلاسیک سے منسلک رکھتی ہے۔ نمونہ کلام:

میرے مالک میں تکبر سے نہیں ہوں سر بلند
سر جھکا اتنا ہوئی نفرت اطاعت سے مجھے
ہر رنگ ہر آہنگ مرے سامنے عاجز
میں کوہِ معانی کی بلندی پر کھڑا ہوں

۲۔ جوئے معانی، ۱۹۹۱ء، مکتبۂ تمثیل لاہور

اس کتاب میں بھی باقر صاحب کی تریسٹھ غزلیں شامل ہیں۔ یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ باقر صاحب نے تریسٹھ سال عمر پائی۔ اس مجموعے میں ان کا کلاسیکی انداز مزید مستحکم ہو کر سامنے آیا۔ اس مجموعے میں وہ کہیں کہیں زبان کے شعر کہتے نظر آتے ہیں۔ ایک غزل کے چند اشعار دیکھیے:

تھی جو بہت وہ آنکھ مست
ہم بھی کھڑے تھے دل بدست
پر نہ اٹھی ادھر کبھی، وہ بھی تھی ہوشیار ایک
نجد کی راہ ہے الگ شہر کی راہ ہے الگ
جمِ غفیر شہر میں نجد میں ہے غبار ایک
بس یہی درد لیجیے اور سکون بانٹیے
شہر سے تابہ شہر جاں اپنا ہے کاروبار ایک
احمد و ارشد ایک جاں سمتِ مزاج ان کی دو
ایک ہے راز دانِ شہر، دل کا ہے اشتہار ایک

اس غزل میں زبان کا استعمال خالص کلاسیکی انداز اور مزاج کا ہے۔ جوئے معانی میں ان کی خود پسندی اور انانیت عجز آشنا ہو جاتے ہیں۔ اس میں تمثال کاری نمایاں ہے اور یہ انداز کلاسیکی ڈسپلن میں ڈھل کر ایک نئے انداز کی خبر دیتا ہے:

سرِ سطحِ ریگ لکھی ہوئی کوئی داستانِ جنوں ملی
سرِ لوحِ آب بنا ہوا کوئی نقشِ کارِ وفا ملا

۳۔ کلیات باقر، اکتوبر ۲۰۱۰ء، اظہار سنز لاہور

کلیات میں تیشۂ لفظ اور جوئے معانی کے علاوہ غیر مطبوعہ اور غیر مدون کلام شامل ہے۔ اس میں حمد (۲) نعت (۹) اور سلام (۸) کے علاوہ چونتیس نظمیں اور اڑسٹھ غزلیں اور کچھ رباعیات شامل ہیں۔ گویا یہ کلام بھی ایک مجموعے کے برابر ہے۔ ان غزلوں میں بھی وہی تیشۂ لفظ اور جوئے معانی کا مزاج اور انداز، وہی طویل بحریں، وہی کلاسیکی مزاج اور رویہ ہے۔ چند ایک شعر دیکھیے:

وہ دورِ حادثاتِ جہاں ہے کہ الاماں
اپنا تو بس خدا ہی نگہبان ہے ان دنوں
جب سے اس بزم کا دستور بنی مہربلبی
رسم ایہام و اشارات چلی جاتی ہے
سر کا سودا جان کی بازی اور عزت کا بھاؤ
دیکھو اس بازار کی رونق کیا ہے بیوپار

اس مجموعے میں شامل نظموں میں سے صبح، شام اور رات کے عنوان سے شامل نظمیں گہری معنویت کی حامل ہیں اور وہ ہماری سیاسی تاریخ کے ایک بڑے المیے کا ادبی اظہار ہیں۔ ایک نظم صبح کی چند سطریں دیکھیے:

آخر شب تھی
وہ صحنِ مسجد میں پڑا سو رہا تھا
میں نے اس کو جگایا
اُٹھ
یہ شہادت کا تکبیر کا وقت ہے
دعاؤں کی تسخیر کا وقت ہے
وہ اٹھا۔۔۔ میرا قاتل جسے میں نے خود ہی اٹھایا

اٹھا

اور محراب مسجد میں میرے لہو سے چراغاں ہوا

تنقید:

۱۔تہذیب وتخلیق، اپریل ۱۹۶۶ء مکتبۂ ادب جدید لاہور، اشاعت ثانی مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد ۱۹۸۷ء

سجاد باقر رضوی کے بیس تنقیدی مضامین کا یہ اولیں مجموعہ بہت اہم ہے۔ اس میں مصنف کا تنقیدی نقطۂ نظر پہلی بار پوری صراحت کے ساتھ سامنے آیا ہے۔ یہ مجموعۂ مضامین تخلیق اور اشاعت کے اعتبار سے اولیں مجموعہ بھی ہے اور اولیت بھی رکھتا ہے۔ اس میں مصنف کے اصولِ نقد بھی آ گئے ہیں اور اُن کے نقطۂ نظر کا ادب پر اطلاق بھی سامنے آتا ہے۔ وہ ژنگ اور ان کے شاگرد آئرخ نیومان سے استفادہ کرتے ہیں اور ادب کی تفہیم وتنقید کے لیے مادری اصول اور پدری اصول پیش کرتے ہیں۔ جن سے تجربہ اور روایت مفہوم پاتے ہیں۔ مادری اور پدری اصول میں ترتیب وتناسب اور اس بنا پر ان کی نظریہ سازی ان کے مضامین ''ادب اور زندگی کا رشتہ''، ''ادب میں شخصیت کا مسئلہ''، ''ہمارا عہد اور تنقید''، ''پاکستانی تہذیب کا مسئلہ، قومی طرزِ احساس اور علامتیں'' اور ''اکبر اور ہندی مسلمانوں کی تہذیب'' میں صراحت اور وضاحت کے ساتھ نظر آتی ہے۔

اس کتاب میں باقر صاحب نے علامت اور تہذیب پر بصیرت افروز باتیں کی ہیں۔ وہ ایک مضمون میں واضح کرتے ہیں:

> ''بنیادی لاشعوری سانچے خود کو شعور کے سامنے پیش کرتے ہیں تو کسی نہ کسی علامت کی شکل میں ہوتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان بنیادی لاشعوری سانچوں کا کوئی مفہوم اس وقت متعین ہوسکتا ہے جب وہ خود کو شعور کے سامنے علامت کی شکل میں پیش کریں۔۔۔ انسان کے لیے دنیا کا مفہوم ان علامتوں کے ذریعے ہی سے متعین ہو جو اس نے اپنی روح (Psyche) سے پیدا کیا۔''(۲)

اس کتاب میں اصغر گونڈوی، یگانہ، فانی، نظیر اکبر آبادی، محمد حسین آزاد، غالب اور میرا جی پر عملی تنقید کے حوالے سے بھی مضامین شامل ہیں جو خاصے اہم ہیں۔

۲۔وضاحتیں، ۱۹۸۸ء، اظہار سنز لاہور

سجاد باقر رضوی نے اس کتاب میں اسی فکر کو آگے بڑھایا ہے جو فکر تہذیب وتخلیق میں سامنے آئی تھی۔ اس کتاب میں ''ادب اور جمالیاتی اقدار''، ''ادب میں مقصدیت کی تحریک''، ''ادب اور تمدن''، ''اردو تنقید کی نئی سمتیں''، ''تعلیم اور اخلاقیات'' جیسے مضامین ان کی تنقیدی فکر کو مزید واضح کرتے ہیں۔ ایسے ہی انھوں نے غالب، اقبال، حسرت موہانی، انیس، ناصر کاظمی، منیر نیازی پر عملی تنقید کے عمدہ نمونے پیش کیے ہیں۔ ساتھ ہی حمید احمد خاں اور انتظار حسین پر دو خاکے اس کتاب میں شامل ہیں۔

باقر صاحب نے اس کتاب میں اپنی تنقیدی فکر اور تہذیبی زاویۂ نگاہ کو واضح لفظوں میں پیش کیا ہے اور ان کی معرفت ادب کی معنویت دریافت کی ہے۔ وہ ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

> ''کلاسیکی دور کی شناخت دو قدروں اور دو رویوں سے ہوتی ہے۔ جمالیاتی اور اخلاقیاتی قدریں اور عشق اور جہاد کے رویے، سرسید اور حالی کے دور میں آئے تو اس دور کی شناخت بھی دو قدروں اور رویوں سے ہوتی ہے۔ مقصدیت اور افادیت کی قدریں۔۔۔ یہ نئی اقدار اور نئے رویے مغرب سے آئے۔ مغرب کی مشینی ترقی اور تاجرانہ ذہن یہی کچھ پیدا کرسکتا ہے۔''(۳)

باقر صاحب نے کلاسیکی ادب اور سرسید دور کی تفہیم کتنے مختصر لفظوں میں اور کس قدر سہل انداز میں کروادی۔ اب ذرا پاکستانی عہد میں ادب کے بارے میں اُن کے چند جملے ملاحظہ ہوں:

> ''۱۹۶۰ء کی دہائی میں نعرے ادب میں لگتے تھے۔ ۱۹۷۰ء کی دہائی میں پورا معاشرہ نعرے بازی میں مصروف ہوگیا۔ نعرے زیادہ لگنے لگیں تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ غور وفکر کی صلاحیتیں ختم ہوگئی ہیں۔ آج بھی صورتِ حال یہی ہے۔ اب نعروں کے ساتھ فتوے بھی شامل ہوگئے ہیں۔''(۴)

ان سطور میں حد درجہ معقولیت موجود ہے۔ انھوں نے اپنے عہد کے ادب کی روح کو

دریافت کیا ہے۔ وہ روایت اور تجربے میں، پدری اصول اور مادری اصول میں تالیف کرتے ہیں۔ ان کا مزاج کلاسیکی ہے اور کلاسیکیت تالیف اور ترکیب طلب کرتی ہے۔ وہ تضادات کو جمع کر کے توازن پیدا کرتے ہیں۔ وہ بیک وقت اخلاقیات کے حامی بھی ہیں اور جمالیات کے حامی بھی۔ اسی لیے وہ ایسے نکتہ ہائے وحدت تلاش کر لیتے ہیں جہاں کئی متضاد رویے آپس میں ملتے نظر آتے ہیں۔ یہی ان کی تنقید کا کمال بھی ہے یہی ان کے نقطۂ نظر کا جواز بھی۔

۳۔ معروضات، ۱۹۸۸ء پولیمر پبلی کیشنز لاہور

اس کتاب کے چار حصے ہیں۔ پہلے حصے میں فن و ادب کے مسائل ہیں، دوسرے حصے میں غالب اور اقبال موضوع گفتگو ہیں، تیسرے میں تذکرہ نگار اور نقاد زیر بحث آئے ہیں، جبکہ چوتھے حصے میں سلیم احمد، ناصر کاظمی اور میراجی کی غزلیہ شاعری کے تجزیات پیش کیے گئے ہیں۔ ناصر کاظمی پر مضمون میں وہ میر اور ناصر دونوں پر بہت بصیرت افروز بحث و گفتگو کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''میر کی طبیعت کا سوز و گداز پھیلی ہوئی کائنات میں اپنی ذات کو سمیٹ لینے کا سلیقہ، احساس نامرادی کے ساتھ قناعت ایک خاص وضع زندگی، یہ سب انھیں ان کے عہد کے فلسفۂ زیست سے ملا تھا۔ اس کے برعکس ناصر کاظمی رومانی مزاج کے حامل تھے۔ ان کا احساسِ نامرادی طبیعت کا گداز آئیڈیل اور حقیقت کے تضاد سے پیدا ہوا تھا۔۔۔ اگر میر سے انھوں نے اسلوبِ حیات نہ پایا تو اسلوبِ فن ضرور حاصل کیا۔ میر کی عمر کی پختگی تو انھیں نہ مل سکی۔۔۔ مگر میر کے فن کی پختگی سے انھوں نے بہت کچھ سیکھا۔'' (۵)

اس کتاب میں بھی باقر صاحب نے اپنے اصولِ نقد اور تہذیبی نقطۂ نظر کو پیش کیا ہے اور شعر و ادب کے حوالے سے اپنی بصیرت میں اپنے قاری کو شامل کیا ہے۔

۴۔ باتیں، ۱۹۸۸ء منیب بک ڈپو لاہور

اس کتاب کا ایک اہم مضمون عسکری صاحب کی جھلکیاں ہے۔ یہ مختصر تو ہے مگر عسکری صاحب کے فکری نظام کو سمجھنے میں بہت مددگار ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''جو بات عسکری صاحب کو سب سے زیادہ مختص کرتی ہے وہ یہ ہے کہ ادب ان کا طرزِ حیات تھا۔ ایک عہد میں ادبی حوالہ ہی وہ حوالہ تھا جس سے وہ معاشرتی اور تہذیبی رویوں کی افہام و تفہیم کرتے تھے۔'' (۶)

کچھ ایسی ہی سادگی غلام عباس کے بارے میں ان کے تجزیاتی مضمون میں ملتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''اسی معروضیت اور سادگی کا نتیجہ ان کا وہ توازن ہے جو انھیں ایک بازی گر کی طرح رسی پر چلاتا ہے۔ ان کی تحریروں میں ایک پروقار سکون نظر آتا ہے۔ وہ جذباتی ہیجان سے گزرتے ہیں، نہ ناصح بنتے ہیں۔ فنی چابکدستی اور مہارت سے بعض نتائج نکالتے ہیں جو ان کی معروضیت کے باعث منطقی اور فطری معلوم ہوتے ہیں۔۔۔ غلام عباس کی سادہ اور پرسکون تحریر کی تہہ میں ایک گہری معنویت ہوتی ہے جو ان کے اسلوب کو توانا رکھتی ہے۔'' (۷)

باقر صاحب کی تنقید میں نکتہ رسی اور تہہ داری ہے جو ادبی اور فنی بصیرت عطا کرتی ہے۔ اس مجموعے م میں اکیس مضامین ہیں اور زیادہ تر مختصر ہیں۔ اس میں تین حصے ہیں۔ پہلے حصے میں باتیں کے عنوان سے ایسے مضامین ہیں جیسے عسکری صاحب جھلکیاں لکھا کرتے تھے۔ دوسرے حصے میں تبصرے اور دیباچے ہیں۔ تیسرے حصے میں تجزیے ہیں اور یہ نو مضامین ہیں۔

۵۔ علامہ اقبال اور عرض حال، ۱۹۹۴ء، اقبال اکادمی پاکستان لاہور

اس مجموعے میں درج ذیل آٹھ مضامین شامل ہیں:

۱۔ قومی طرز احساس اور علامتیں
۲۔ اکبر اقبال اور ہمارے تہذیبی تقاضے
۳۔ اقبال اور توحیدی فکر
۴۔ قوت اور تخلیق اقبال کے شعری نظام میں
۵۔ اقبال اور تعلیم

یہ پانچ مضامین علامہ کی مذکورہ بالا کتابوں میں پہلے سے موجود ہیں۔ اس مجموعے میں یہ تین مضامین نئے ہیں:

۱۔ علامہ اقبال اور عرضِ حال

۲۔ اقبال اور ملا

۳۔ Iqbal's fight Against staguation exploitation

باقر صاحب کے ان مضامین میں اُن کا وہی تہذیبی نقطۂ نظر موجود ہے جو دیگر مجموعوں میں دیکھا گیا ہے۔

۶۔ مغرب کے تنقیدی اصول، دسمبر ۱۹۶۶ء، کتابیات لاہور

اس کتاب کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے۔ یہ کتاب دو بار مقتدرہ قومی زبان کے زیر اہتمام شائع کی گئی۔ اس کا ایک ایڈیشن ہندوستان سے بھی شائع ہوا، جسے ۱۹۸۵ء میں نصرت پبلشرز نے شائع کیا۔

زیرِ نظر کتاب میں افلاطون سے ماقبل مغربی تنقید سے ایلیٹ تک بیس ابواب ہیں۔ یہ کتاب یونانی اور انگریزی تنقید کی تاریخ بھی ہے، تجزیہ بھی۔ یہ کتاب مغربی تنقید سے شناسائی پیدا کرتی ہے اور قارئین کے ادبی شعور کو وسعت دیتی ہے۔ یہی اس کتاب کا مقصد تھا اور یہی اس کا جواز بھی۔ باقر صاحب اورئینٹل کالج میں ایم۔اے کے طلبہ کو مغربی تنقید پڑھاتے تھے۔ یہ کتاب ایک لحاظ سے نصابی کتاب کا درجہ اختیار کر گئی تھی، مگر یہ کتاب نصابی درجے کی کتاب سے کہیں زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔

مرتبات:

۱۔ قائداعظم محمد علی جناح۔ معمارِ پاکستان، ۱۹۸۸ء، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور

یہ کتاب بانیِ پاکستان پر تحقیقی مواد پر مبنی ہے، مگر اس کا مقصد سوال اٹھانا نہیں، موجود بیانیے کی توضیح و تفصیل پیش کرنا ہے۔

۲۔ غالب ذاتی تاثرات کے آئینے میں، ۱۹۶۹ء، مجلس یادگار غالب پنجاب یونیورسٹی لاہور

غالب صدی کے سلسلے میں یہ کتاب شائع کی گئی۔ اس میں چوبیس مختلف شخصیات کے غالب کے حوالے سے ذاتی تاثرات جمع کیے گئے ہیں۔ ان میں علامہ اقبال، پروفیسر حمید احمد خاں، مولانا سعید احمد اکبر آبادی، علی عباس حسینی، اختر حسین رائے پوری اور ن۔م راشد شامل ہیں۔

۳۔ مرقع ادب، ۱۹۷۳ء، برائے ٹیکسٹ بک بورڈ لاہور، مکتبہ جدید لاہور

اس کتاب کی ترتیب و تدوین میں آپ کے ہمراہ پروفیسر حمید احمد خاں اور پروفیسر قیوم نظر شامل تھے۔ اس کا دیباچہ بہت اہم اور معلومات آفریں ہے۔

تراجم:

داستان مغلیہ، ۱۹۶۸ء، نگارشات لاہور

یہ کتاب نکولائی مانوچی کی کتاب کا ترجمہ ہے۔ ترجمہ شدہ کتاب ولیم ارون کے انگریزی ترجمے سے انتخاب پر مشتمل ہے، جو ۱۹۰۷ء میں حکومت ہند نے چار جلدوں میں شائع کی گئی۔

جدید ناول نگار (امریکا میں)، ۱۹۶۹ء شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور

یہ Jack Ludwing کی کتاب "Recent American Novelists" کا ترجمہ ہے۔ اس میں امریکا کے جدید ناولوں اور ناول نگاروں پر تبصرہ ہے۔

افتادگانِ خاک، مارچ ۱۹۶۹ء، نگارشات لاہور

یہ فرانز فینن (Frantz Fanon) کی کتاب "The Wretched of the Earth" کا ترجمہ ہے۔ محمد پرویز نے اسے پہلے ترجمے کی صورت میں اردو میں منتقل کیا تھا۔ سجاد باقر رضوی نے اس ترجمے کو سامنے رکھ کر اسے نئے سرے سے ترجمہ کیا۔ یہ کتاب بار بار شائع ہوئی ہے۔

بلالؓ، ۱۹۸۸ء، پیکیجز لاہور

یہ کتاب ایچ۔ اے۔ ایل گریک کی کتاب (Bilal) کا ترجمہ ہے۔ اس کتاب کو حضرت بلالؓ کی آپ بیتی کے انداز میں مرتب کیا گیا۔

بدلتی دنیا کے تقاضے، مارچ ۱۹۹۱ء، روہتاس بکس لاہور

یہ ارنسٹ، ایف، شوماخر کی کتاب "Small is Beautiful" کا ترجمہ ہے۔ اس کتاب کی دوسری اشاعت مکتبہ نگارشات لاہور کی جانب سے ۱۹۹۴ء میں ہوئی۔

جدید دنیا میں روایتی اسلام، ۱۹۹۶ء، ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور

یہ کتاب ڈاکٹر سید حسین نصر کی کتاب ''جدید دنیا میں روایتی اسلام'' "Traditional

"Islam in The modern World" کا ترجمہ ہے۔اس کا پیش لفظ ڈاکٹر رشید احمد جالندھری نے لکھا ہے۔

حواشی:

۱۔ ناظر کاظمی، شہری فرہاد، مشمولہ تیشۂ لفظ، صفحہ:۵

۲۔ سجاد باقر رضوی، قومی طرز احساس اور علامتیں، مشمولہ تہذیب وتخلیق، صفحہ:۹۷

۳۔ سجاد باقر رضوی، ادب اور جمالیاتی اقدار، مشمولہ وضاحتیں، صفحہ:۹

۴۔ ایضاً، صفحہ:۲

۵۔ سجاد باقر رضوی، ناصر کاظمی ایک جائزہ، معروضات، صفحہ:۱۶۳

۶۔ سجاد باقر رضوی، عسکری صاحب کی جھلکیاں، باتیں، صفحہ:۴۳

۷۔ سجاد باقر رضوی، غلام عباس، باتیں، صفحہ:۴۰

ڈاکٹر سہیل احمد خاں

ڈاکٹر عزیز ابن الحسن

ڈاکٹر سہیل احمد خاں اساتذہ کی اُس نسل کے آخری افراد میں سے تھے جنہیں دیکھ کر علم، ذہانت، دقیقہ رسی، جدید ادبی تنقیدی نظری مسائل کا استحضار ترسیلِ علم اور طلاقتِ اظہار کے جملہ ملکات مجسم نظر آتے تھے۔اس پر اُن کی شخصی وجاہت تمکنت اور رعب کا تڑکا جس میں مزید اضافہ اُن کے ہونٹوں میں دبے سگار یا پائپ سے ہو جاتا تھا۔ وہ ایک ایسے انسان تھے جو دیکھنے میں ہی ایک مکمل پروفیسر لگتے تھے۔ وہ اُردو کے اُن اساتذہ میں سے تھے جنہوں نے خود کو محض رسمی تدریس تک محدود نہیں رکھا تھا وہ جدید اور قدیم ادب کا بہترین ذوق رکھنے کے ساتھ ساتھ ادب کے تہذیبی ماخذات پر بھی نظر رکھتے تھے۔اُردو کے ساتھ ساتھ انگریزی اور دیگر زبانوں کے ادب اور جدید شعری مسائل پر بھی اُن کی نظر تھی۔ وہ جدید حسیت کے نقاد تھے، خوش ذوق سخن فہم تھے، غزل اور نظم میں انوکھی چھب کے شاعر تھے۔ وہ جدید ادب کے اُن لکھنے والوں میں سے تھے جن کا اپنے سینیرز میں بھی بڑا اعتبار تھا۔علاوہ ازیں مشرق ومغرب کی فلم اور موسیقی سے انکی رغبت میں محض دیکھنے سننے سے بہت آگے کی تھی۔

اُن کی پیدائش 18 جولائی 1947ء کو ہوشیار پور میں ہوئی اور 1969ء میں ایم اے کرنے کے فوراً بعد ہی وہ پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ اُردو سے وابستہ ہو گئے۔ 1979ء میں انہوں نے "اُردو داستان کا علامتی مطالعہ" کے موضوع پر مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی۔ انکا شمار ڈاکٹر عبادت بریلوی اور سجاد باقر رضوی کے ہونہار شاگردوں میں ہوتا تھا . محمد حسن عسکری سے خصوصی تعلق کی بنا

پر عسکری کے آخری زمانے کے مضامین "وقت کی راگنی" کے عنوان سے شائع کرنے کا شرف حاصل کیا . احمد مشتاق کے ساتھ ملکر ایک منفرد ادبی پرچہ نکالا جسکا عنوان "محراب" عسکری صاحب ہی کا تجویز کردہ تھا.

اورینٹل کالج سے ریٹارڈ ہونے کے بعد وہ جی سی یونیورسٹی لاہور کے شعبہ اُردو میں چلے گئے اور تادم مرگ وہاں ڈین کے طور پہ خدمات انجام دیں۔ آج سے ٹھیک 9 برس پہلے 13 مارچ 2009 میں انکا انتقال ہوا . یہ تھے اردو کے معروف نقاد شاعر اور خوش بیان استاد ڈاکٹر سہیل احمد خاں۔

ماتھے سے کچھ ہلکے مگر لمبے بال، مونچھیں گھنی، قامت دراز اور چال میں عجیب سا بانکپن رکھنے والے سہیل احمد خان بے تکلف احباب اور کلاس روم میں تو خوب بولتے چہکتے لیکن عموماً سنجیدہ رہتے . جلد بے تکلف نہ ہوتے تھے . طلباء سے بے تکلفی کے باوجود ہمیشہ ایک فاصلہ رکھ کر ملتے اور بات کرتے۔

میری اُن سے ابتدائی ملاقاتیں 1987 یا 88 میں حلقہ اربابِ ذوق لاہور کے اجلاس میں یا پاک ٹی ہاؤس میں اُن کی بیٹھک کے دوران شروع ہوئیں۔ جہاں اُس زمانے میں ہفتہ کی چند مخصوص شاموں کو وہ باقاعدگی سے آیا کرتے تھے۔ اُن کی عمومی نشست یا تو پاک ٹی ہاؤس کے صدر دروازے کے دائیں طرف رکھے صوفے اور کرسیوں پر بیٹھے احباب انجم رومانی جاوید شاہین، الطاف احمد قریشی سلیم شاہد اور اسلم ملک کے ساتھ ہوتی یا اُس معروف میز پر جو ٹی ہاؤس کے درمیان میں اُس وقت کے سینیر ادیبوں مظفر علی سید، انتظار حسین، زاہد ڈار، اکرام اللہ وغیرہ کا مستقل مسکن تھی۔ سہیل صاحب زیادہ تر انہی دو جگہوں پر بیٹھتے تھے۔ باتوں کے دوران اُن کا پائپ یا تو ہونٹوں میں دبا رہتا یا میز پر دھرا رہتا۔ چائے چلتی رہتی یہ لوگ ہلکی پھلکی ادبی گپ شپ میں مشغول رہتے اور ہم جیسے نو واردان اپنے ادب کے ان بڑوں کو کنکھیوں سے دیکھتے رہتے۔ شروع شروع میں مجھے اُن سے ملنے میں ایک جھجک سی رہی جس میں کچھ حصہ اُن کے شخصی رعب کا اور کچھ اُن کی جلد بے تکلف نہ ہونے کی عادت کا تھا۔ لیکن آہستہ آہستہ اُن سے ملاقاتوں کا سلسلہ چل نکلا۔ 1993ء میں جب میں ادارہ ثقافتِ اسلامیہ سے سول سیکریٹیٹ لاہور میں چلا گیا تو پنجاب یونیورسٹی اورنٹیل کالج کے زیادہ قریب ہو گیا۔ جب بھی موقع ملتا میں سیکریٹیٹ سے اٹھتا اورینٹل کالج چلا جاتا جو اُس وقت میرے دو ممدوحین تحسین فراقی اور سہیل احمد خان کا ٹھکانہ تھا۔

سہیل صاحب عموماً شعبہ اُردو کے بجائے ادارہ تالیف و ترجمہ کے آفس میں بیٹھے ملتے۔ دوسرے تیسرے روز اُن سے سے وہیں آدھ پون گھنٹے کی ملاقات ہو جاتی۔ اُس زمانے میں جناب محمد سلیم الرحمان بھی ہفتہ میں ایک آدھ دن پیر یا جمعرات کو سہیل صاحب کے پاس آیا کرتے تھے۔ سلیم الرحمٰن سے ملاقاتوں کا سلسلہ بھی وہیں سے شروع ہوا۔ سلیم صاحب کے ہاتھ میں عموماً کوئی نہ کوئی لفافہ ہوتا۔ آتیہی وہ لفافہ کھولتے اور کوئی نظم افسانہ یا کسی کا آیا ہوا تازہ خط نکال کر سہیل صاحب کو دیتے . اس دوران چائے بھی چلتی رہتی اور میں عموماً خاموشی سے اُن کی باتیں سنا کرتا۔

کچھ عرصے کے بعد سہیل صاحب جاپان چلے گئے تو اُن سے ملاقاتوں میں طویل وقفے آنے لگے۔ وہ جب بھی کچھ عرصہ کے لیے واپس آتے تو ادارہ تالیف و ترجمہ والے آفس میں ہی بیٹھتے۔ مجھے جیسے ہی پتہ چلتا میں اُن سے ملنے پہنچ جاتا وہ اپنے قیامِ جاپان کے تجربات بھی بتاتے ادبی صورتحال پہ تبصرے بھی کرتے۔ ایسی ہی ایک ملاقات میں انہوں نے یہ دلچسپ بات بتائی کہ جاپان جا کر انہیں یہاں اپنے یہاں کے بڑے ادیبوں کی وسعتِ ذوقی اور دلچسپیوں کی ہمہ جہتی کا صحیح اندازہ ہوا ہے۔ کہنے لگے کہ وہاں جن پروفیسروں اور مختلف شعبوں کے ماہرین سے میری ملاقاتیں ہوئیں اُن سے مجھے یہ احساس ہوا کہ وہاں کے پروفیسرز اور ماہرین اپنے اپنے شعبے میں تخصیص اور مہارت تو خوب رکھتے ہیں مگر اپنے مخصوص شعبۂ علم کے علاوہ انہیں باہر کی زندگی، تہذیب، ثقافت، مصوری و تعمیرات اور فنی اظہارات کے دیگر مظاہر و مسائل سے کچھ خاص سروکار نہیں ہوتا۔ سہیل صاحب نے بتایا کہ وہاں جا کر انہیں اپنے یہاں کے خاک بسر درویش صفت اہلِ علم و ادب کے ذوق کے تنوع کا اندازہ ہوا کہ ہمارے مظفر علی سید اور محمد حسن عسکری جیسے لوگوں کے اندر جو ہمہ جہتی ہے وہ کتنی اہم اور نایاب شے ہے۔

ایک ایسی ہی ملاقات کے دوران عسکری صاحب سے انکے خصوصی تعلق کے پیشِ نظر جب میں نے اُن سے یہ پوچھا کہ ایسا کیوں نہیں ہوتا کہ ہمارا کوئی ادیب وہاں سے اپنے کام کا آغاز کرے جہاں عسکری صاحب نے اُسے چھوڑا ہے تو انہوں نے کہا کہ یہ بہت بڑا المیہ ہے ہم لوگ زندگی بھر اُن معاملات و مسائل کو اپنے تجربات و مطالعے سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں ان کی فہم پیدا کرتے رہتے ہیں اور پھر جب اُن سے آگے کام کرنے کا وقت آتا ہے تو ہماری عمر اور صلاحیتیں جواب دے چکی ہوتی ہیں۔ سراج منیر البتہ ایک ایسے آدمی تھے کہ جن کے بارے میں ہماری یہ

توقع تھی کہ یہ اپنے کام کا آغاز وہاں سے کریں گے جہاں پر عسکری نے اسے چھوڑا تھا اور اسے پایہ تکمیل تک پہنچائیں گے مگر افسوس کہ سراج منیر کی زندگی نے وفا نہ کی اور وہ عین عالمِ جوانی میں ہی انتقال کر گئے۔

۱۹۸۷ء میں لاہور کی ادبی دنیا سے جب میرا پہلے پہل سابقہ پڑا اور میں جن حوالوں سے اس دنیا سے متعارف ہوا وہاں بالعموم سہیل صاحب کے بارے میں کوئی اچھی رائے نہیں پائی جاتی تھی۔ اس سے کچھ عرصہ قبل پاکستان ٹیلی وژن کے ایک پروگرام میں جس کے شرکائے گفتگو احمد ندیم قاسمی، ڈاکٹر سہیل احمد خاں اور سراج منیر تھے، میں جب میں نے انہیں پہلے پہل دیکھا اور سنا تھا، میرا تاثر اپنے طور پر بھی کوئی خاص اچھا نہیں تھا۔ چونکہ کسی بھی شے کے بارے میں میرا پہلا تاثر بالعموم اور لازماً درست نہیں ہوتا اس لیے میں اپنی پہلی رائے کو کبھی حتمی نہیں سمجھتا اور اسے جانچتا آنکتا رہتا ہوں، لہٰذا اس صورتحال کے باوجود سہیل صاحب کے بارے میں مجھے ہمیشہ ٹوہ رہی کیونکہ ان کی شخصیت میں کچھ نہ کچھ ایسا تھا ضرور جس کی وجہ سے انہیں بے توجہ نہیں گذارا جا سکتا تھا۔

پس میں نے پاک ٹی ہاؤس اور حلقہ اربابِ ذوق لاہور کی محفلوں میں انہیں قریب و دور سے دیکھنے اور ملتے جلتے رہنے کا کوئی موقع ضائع نہ ہونے دیا اور مجھ پر آہستہ آہستہ کھلا کہ ان کے بارے میں میرے بعض ابتدائی تاثرات، خواہ ان کی بنیاد دید ہو کہ شنیدہ، غلط ہیں اور میں غیر محسوس طور پر ذہناً ان کے قریب ہوتا چلا گیا۔ لیکن ٹھہریے یہ بات پوری درست نہیں ہے۔ یہ ذہن بھی بڑی عجیب شے ہے۔ اس کے بے شمار پہلو ہوتے ہیں۔ پوری طرح درست بات یہ ہے کہ میرے ذہن کے کچھ گوشے ان سے قرب محسوس کرنے لگے اور کچھ کے اندر کشمکش اور سوالات جنم لینے لگے۔ آہستہ آہستہ میں نے ان ''گوشہ ہائے کشمکش'' کی ایک پوٹلی باندھ کر الگ رکھ دی اور گوشہ ہائے طمانیت کو وا کر کے ان سے ملتا رہا۔

۸۹۔۱۹۸۸ء کی بات ہے ہم نے کچھ دوستوں کے ساتھ مل کر پروگرام بنایا کہ سہیل صاحب سے نئی نظم کے بارے میں کچھ باقاعدہ طریقے سے سیکھنا چاہیے۔ پاک ٹی ہاؤس کے سامنے طارق زیدی کے اوطاق میں یہ تدریس کی محفل ہوئی اور نصاب کے طور پر ن۔م۔ راشد کی نظم ''سباویران'' کا انتخاب ہوا جو سہیل صاحب ہی نے کیا تھا۔ ایک آدھ نشست ہی میں اس نظم،

بلکہ ن۔م۔ راشد کی شاعری، بالعموم پوری نئی شاعری اور بالخصوص نظم کی شاعری سے میرا توحش بڑی حد تک کم ہو گیا۔ انہوں نے یہ نظم ہی نہیں پڑھائی بلکہ ان حالات و مسائل کی گرہ کشائی بھی کر دی جنہوں نے نئے ادب کو جنم دیا تھا۔ نظم کی شاعری کے اسباق کا یہ سلسل شاید دو چار نشستوں سے آگے نہ بڑھ سکا تھا مگر اس دوران میرے لیے سہیل صاحب کی ادبی شخصیت کے بنیادی جوہر کی تعین کا مسئلہ حل ہو گیا۔

ہماری ادبی تنقید میں لسانیات کے Synchronic اور Diachronic مباحث اور ساختیات و پس ساختیات کا غلغلہ تو بہت بعد میں جا کر کہیں اس وقت مچا جب یہ تصورات داخلِ فیشن ہو گئے، محمد حسن عسکری کے دورِ آخر کے ادبی تصورات میں ان مسائل کا احساس ان اصطلاحات و عنوانات کے ذکر کے بغیر بھی آتا رہا ہے۔ انہوں نے ایک جگہ لکھا کہ ان کے نزدیک ادبی و فکری معاملات ماقبل اور مابعد کے اَدوار کی صورت میں نہیں بلکہ سب کچھ ''ہمہ وقت موجود'' کی صورت میں ہوتے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ خیالات جو فلسفیوں کے لیے ''یکے بعد دیگرے'' کی شکل میں ہوتے ہیں ان کے ادبی تجربات میں ''بیک وقت'' موجود رہتے ہیں۔ اس بات کا سہیل صاحب کے ادبی جوہر سے کیا تعلق ہے؟

اس امر میں زیادہ بحث و تمحیص کی گنجائش نہیں کہ سہیل صاحب کے ادبی رجحانات کی تعمیر عسکری کے ادبی تصوّرات کے زیرِ اثر ہوئی تھی۔ عسکری کی تنقیدی فعالیت کا ایک خاص پہلو اپنے زمانے کے جدید ترین تصوّرات، مباحث، مسائل اور میلانات سے بیچ منجدھار کے نبرد آزما رہنا تھا۔ ان کے اندر مختلف اور متضاد فکری لہروں کو آپس میں جوڑ کر دیکھنے اور حیرت انگیز نتائج اخذ کرنے کی جو صلاحیت تھی وہ ان کی اس مخصوص حسیت کی بنا پر تھی جو ایک طرف تو مجرّد فکری مسائل کو ادبی تجربے کی کٹھالی میں گھول دیتی تھی اور دوسری طرف گذشتہ و آئندہ کے مسائل و حوادث کو لمحہ موجود کے تصوّر سے غافل نہیں ہونے دیتی تھی۔ عسکری کی ادبی حسیت کے یہی دو پہلو ہیں جن کے حوالے سے سہیل صاحب کا ادبی جوہر تشکیل و تعیین کے مراحل سے گزرا ہے۔

میں یہ ہرگز نہیں کہہ رہا کہ عسکری کے ادبی طرزِ احساس کی یہ ہمہ گیری، پہنائی اور وسعت، اپنے ان تمام مضرات کے ساتھ، جسے عسکری کی تنقید کہیں، سہیل صاحب کو بھی حاصل تھی مگر میں یہ بات پوری ذمہ داری سے کہہ سکتا ہوں کہ ایک طرف تو مجرّد ادبی و فکری مسائل کو ادبی تجربے کے

اندر رہ کر دیکھنے، سمجھنے اس سے محفوظ ہونے اور ادبی اسلوب ہی میں اسے بیان کرنے اور دوسرے لمحہ موجود اور حاضرت وقت ادبی مسائل سے باخبر رہ کر ان سے جڑے رہنے اور ان کی تعبیر نو کرنے کے اعتبار سے سہیل صاحب ایک منفرد لکھنے والے تھے۔ اس پسِ منظر میں اب میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ سہیل احمد خان کی ادبی شخصیت کا منفرد ترین پہلو ایک تو ان کی ادبی حسیت ہے جس نے انہیں تازندگی ادب اور صرف ادب سے وابستہ رکھا اور دوسرے نئے ادبی طرزِ احساس اور شعور سے وابستگی جس نے انہیں ایک ''علم ناک نقاد'' بننے کی یبوست سے محفوظ رکھا۔ یہ دونوں خوبیاں اس اعتبار سے ایک ہی ہیں کہ ان کی مخصوص ادبی حسیت ان کے جوہر ذاتی کی متعین کردہ ہے جس کا عملی اظہار انہوں نے اپنے دور کے حاضر وقت ادبی مسائل سے وابستہ رہ کر کیا۔ ان کی یہی ادبی حسیت تھی جس کی بنا پر وہ ہمیشہ اپنے دور کے، لاہور سے لے کر کراچی تک، ہر قابل ذکر ادیب، نقاد اور شاعر کے جلو میں نظر آتے تھے جس کا آج جدید ادب میں کوئی مقام ہے۔

جب میں سہیل صاحب کے دور کے ادبی مسائل اور جدید ادبی حسیت کی بات کرتا ہوں تو یہ خطرہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ بعض حلقوں کی طرف سے مجھے فوراً اسلوبیات، لسانیات، ساختیات، پسِ ساختیات، مرگِ (منشائے) مصنّف، قاری اساسیت، متن کی لامحدودیت، تانیثیت، گلوبلائزیشن، مابعد استعماریت، مابعد جدیدیت اور سب سے بڑھ کر پیراڈائم شفٹ جیسی ''مصطلحاتی تنقید'' سے مجموعہ سہیل احمد خان کے خالی ہونے کا طعنہ سننا پڑے گا۔ ہاں واقعی! سہیل صاحب کے ہاں یہ ''پیراڈائم شفٹ'' کا سانحہ نہیں ہوا مگر سہیل صاحب کے ہاں جو کچھ ہوا وہ کیا ہے؟

اصل میں سہیل صاحب کا پیراڈائم نئے ادب، ترقی پسند ادب، جدیدیت اور لسانی تشکیلات کے دور کا تھا لیکن سچ پوچھیے تو اس دور کا بھی کہاں تھا۔ ان کی ساری تنقیدی سرگرمیوں کا نقطہ ماسکہ عالم گیریت، کثرتیت اور اس طرح کے دیگر ادب نما مسائل کے درمیان کسی نقطۂ وحدت کی تلاش تھا۔ اشیا تصوّرات کی ظاہری، ارضی سطح سے اوپر یا نیچے کچھ تلاش کرنے کی خواہش سے ان کو خاص سروکار تھا۔ ظاہری سطح سے اوپر اٹھنے یا نیچے اترنے کے لیے انہوں نے جس روزن کا انتخاب کیا وہ ان کی تمام ادبی سرگرمیوں کا مرکزی اصول ہے۔ اس کا نام علامتیت یا رمزیت Symbolism ہے۔

مرکزی اصول کی تلاش اور علامتیت! بات اگر صرف اسی حد تک ہو تو یہ سہیل صاحب کی نہ انفرادیت تھی نہ وجۂ شرف! ان کے اکثر معاصرین اس حوالے سے کچھ نہ کچھ کہہ لکھ رہے تھے۔ سہیل صاحب نے علامتی طرزِ اظہار کی تعبیر جس مرکزی اصول کے تحت متعین کرنے کی کوشش کی اس کی سب سے بڑی امتیازی خصوصیت اس کا ''غیر شخصی پن'' تھا۔ آج جبکہ ہر ایک کے پاس علامت کا ایک ذاتی و شخصی نظریہ موجود ہوتا ہے۔ سہیل صاحب کے تصوّرِ علامت کا امتیاز یہ ہے کہ ان کے ہاں علامت کا مفہوم انفرادی و شخصی نہیں، شعوری و لاشعوری بھی نہیں بلکہ ان معنی میں اجتماعی لاشعوری بھی نہیں کہ اجتماعی لاشعور کے قائلین عموماً جس اسطوریات پر اجتماعی لاشعور کی بنیاد رکھتے ہیں وہ ارضی و ثقافتی مظاہر سے ماخوذ سمجھا جاتا ہے۔ جبکہ سہیل احمد خان جس تصوّرِ علامت کے نمائندہ ہیں وہاں علامت عالمِ طبعی سے آگے مابعد الطبیعیاتی عوالم تک جاتی ہے۔

مارٹن لنگز نے اپنی کتاب Symbols and Archetypes میں قدیم حکمت و دانش کی روشنی میں علامتیت (Symbolism) اور اس کی تعبیر کے حوالے سے جو کچھ لکھا ہے اس کا لبِ لباب یہ ہے کہ روایتی دانش میں علامت خود کفیل متصوّر نہیں ہوتی تھی بلکہ خود سے ماورا کسی اور عالم کے اظہار کا وسیلہ تھی۔ وہ عالم جو اپنی اصل میں ناقابل اظہار ہے، اس کے متعلقات کو حیطہ اظہار میں لانے کے لیے کسی ایسے وسیلے کی ضرورت پڑتی ہے جو ادراک کے لیے قریب الفہم بھی ہو اور حواس کے لیے جمالیاتی معنویّت بھی رکھتا ہو۔ اس ناممکن الاظہار عالم کو ''عین'' (Archetypes) اور وسیلہ اظہار کے طور پر استعمال ہونے والے جمالیاتی پیکر کو ''علامت'' (Symbol) کہا جاتا ہے۔ یہ تو ہوا علامتیت کا قدیم روایتی نظریہ جسے دنیا کی ہر اس تہذیب میں سند قبولیت کا درجہ حاصل تھا جو عالمِ نفس و ناسوت سے اوپر کسی اور عالم کے اثبات پر اپنی بنا رکھتی ہے۔ ایسی تہذیب میں علامتیں شخصی و ذاتی نہیں ہوتیں بلکہ معروضی و آفاقی ہوتی ہیں۔ اور ان کی شناخت اور معنویّت پر بالعموم اتفاق ہوتا ہے اس لیے ان کے ابلاغ میں کوئی ابہام نہیں ہوتا۔

اس کے برعکس جدیدیت پسند علامت نگاری کا بھی ایک نظریہ ہے جسے غیر روایتی یعنی موجود مغربی تہذیب نے جنم دیا ہے۔ اس تہذیب اور اس میں پیدا ہونے والے ادب و فن میں علامتوں کا منبع عالمِ نفس سے باہر نہیں ہوتا بلکہ وہ فن کار کی ذاتی اُلجھنوں، نفسی و ذہنی اختلال اور

مریضانہ اعصاب زدگی سے پھوٹتی ہیں۔ان کا خالق انہیں انتہائی شخصی مفہوم میں استعمال کرتا ہے۔ وہ اگر کوئی اسطورہ (Myth) بھی تخلیق کرتا ہے تو اسے بھی کسی بڑے نظام علم اور عالم سے کاٹ کر ایک ''ذاتی'' کائنات کا بیان بنا دیتا ہے، لہٰذا ان کی تفہیم اور جمالیاتی معنویت کے حوالے سے طرح طرح کے سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ مجھے احساس ہے کہ میں علامت نگاری کے حوالے سے کچھ زائد از ضرورت سادہ بیانی کا مرتکب ہو رہا ہوں لیکن آسان اور قابل فہم لفظوں میں بات کچھ ایسی ہی ہے۔

سہیل احمد خان کے تمام تحریری سرمائے پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے ہاں یا تو واضح اور کھلے طور پر علامت کے عنوان کے تحت اشخاص و مسائل کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ ان اصلاحات ولفظیات کے ادبی معاملات کی تعبیر کی گئی ہے جو کسی نہ کسی صورت میں رمزی معنویّت کی حامل ہیں مثلاً ان کی کتابوں کے عنوان ہی دیکھیے 'علامتوں کے سرچشمے، اور 'داستانوں کی علامتی کائنات، تو بڑے واضح عنوانات ہیں۔ اور پھر 'طرزیں'، 'طرفیں'، 'تعبیریں' وغیرہ کے عنوانات ہیں جن کی رمزیت محتاجِ تشریح نہیں۔ انہوں نے اپنی تحریروں میں جو مطالعات کیے ہیں ان کا بڑا حصّہ علامت نگاری کی معنویّت، تعبیر اور تفہیم پر مشتمل ہے۔ مجموعہ سہیل احمد خان کی پہلی کتاب ہی میں ہمیں ان کا یہ جملہ نظر آتا ہے کہ ''پچھلے چند برسوں سے علامتوں کا مسئلہ میری ادبی اور تنقیدی کاوشوں کا مرکز بنا ہوا ہے۔'' وہ سوال کرتے ہیں کہ ''یہ علامتیں آتی کہاں سے ہیں۔'' اس سلسلے میں جدید ادیبوں اور دانش وروں کے ہاں جو گھڑے گھڑائے جواب ہوتے ہیں وہ ان کی رد و قدح کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ اصل میں علامتیں وجود کی جملہ سطحوں سے مربوط ہوتی ہیں کیونکہ ان کے ذریعے ہم وجود کی اعلیٰ سطحوں کا ادراک کر سکتے ہیں۔

علامت کا یہ تصوّر کسی ذاتی تصوّرِ علامت سے ماخوذ نہیں بلکہ روایتی دانش سے آیا ہے جہاں علامت صرف اپنے ''عین'' سے چھوٹی مگر ''ہم'' یعنی فنکار سے اس معنی میں بڑی ہوتی ہے، اس کا سرچشمہ اس کے ذاتی شعور، لاشعور بلکہ ارضی ثقافتی تصورِ اساطیر پر مبنی اجتماعی لاشعور تک میں نہیں ہوتا بلکہ اعلیٰ مراتب وجود میں ہوتا ہے۔ وہاں سے آغاز ہو کر یہ علامتیں وجود کے اسفل مراتب تک ایک ربط نہانی رکھتی ہیں۔

سہیل صاحب لکھتے ہیں: ''علامتوں کا یہ روایتی اور حقیقی تصوّر فی زمانہ بے حد نامقبول ہے۔ روایتی

علامتوں کے معانی گم ہو چکے ہیں اور ان کی بعض کٹی پھٹی شکلیں باقی رہ گئی ہیں۔''

انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ آج کے شعر و ادب میں علامتوں کو ادیب کی ''انفرادیت'' سے وابستہ کر دیا گیا ہے اور عموماً ایک ادیب کا تصوّر دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ سہیل صاحب کو اس بات پر فخر ہے کہ انہوں نے علامتوں کا کوئی ذاتی اور انفرادی نظریہ پیش نہیں کیا بلکہ روایتی دانش کی روشنی میں اس کی تشریح کی ہے۔ سہیل صاحب نے خواہ شاعری پر لکھا ہو یا افسانہ، ناول اور داستان یا فکشن کی کسی اور صنف پر، انہوں نے ایک مربوط، مکمل تہذیب اور کائنات کا تصور ضرور سامنے رکھا ہے۔ اس سلسلے میں ان کے صرف انتظار حسین کے مطالعات ہی گواہی کے لیے ہیں۔ ''طوفان، مچھلی اور کشتی'' کے زیرِ عنوان انہوں نے انتظار حسین کا جو تجزیہ کیا ہے وہ اُردو کی حد تک بے مثال ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انتظار حسین کی فنی و معنوی جہت کو اگر کسی نے پوری طرح کھولا ہے تو وہ عسکری کے دو شاگردوں نے۔ میری مراد ہے سہیل احمد خان اور سراج منیر ورنہ خود عسکری صاحب نے تو انتظار حسین کو کم و بیش اردو فکشن کے مرکز کے بجائے کنارے پر ہی رکھا تھا۔ اصل میں وہ عسکری کی اس جدیدیت کا زمانہ تھا جب وہ بھی جدید فنکاروں کی طرح علامت کو کسی بڑے پسِ منظر سے مربوط کر کے دیکھنے کے بجائے ایک شخصی پینترہ بازی ہی سمجھتے تھے۔ علامت اور اس سے متعلقہ مباحث کے بارے میں بعد میں انہوں نے جو نقطہ نظر اختیار کیا یہ اسی کا شاخسانہ تھا کہ عسکری یونگ کی نفسیاتی تعبیرات کے، خواہ وہ سمبل ازم کی تشریح ہی کے حوالے سے ہوں، سخت خلاف تھے۔

معروف نفسیات دان ڈاکٹر محمد اجمل جو عسکری کے گہرے دوست تھے، ہمیشہ فرائیڈ کے مقابلے میں یونگ کے زیادہ قائل رہے اور سہیل احمد خان جوان دونوں کے نیاز مند تھے، یونگ پر ایک عمدہ تعارفی کتاب لکھنے اور اسے فرائیڈ کے مقابلہ میں گہرا نفسیات دان سمجھنے کے باوجود علامت کے بارے میں اس کی تعبیرات کو، عسکری ہی کے تتبع میں، مابعد الطبیعیاتی مشمولات کو عالمِ ارضی و سفلی میں گھسیٹ لانے کا مرتکب قرار دیتے ہیں۔

مضمون کے شروع میں میں نے سہیل صاحب کو جدید حسیت اور نئے ادبی طرزِ احساس کا نقّاد کہا تھا۔ سوال یہ کہ علامتی طرزِ احساس کی اس تعبیر کے ساتھ، جو جدید نقّادوں کو شاید قبول نہ ہو، سہیل صاحب جدید ادب میں کہاں فٹ بیٹھتے ہیں؟ اس کے جواب میں مجھے پھر ایک طویل تمہید

باندھنی پڑے گی جس کا ارادہ فی الحال ترک کر کے میں صرف اتنا اشارہ کروں گا کہ سہیل صاحب اپنی دانش ورانہ معنویّت میں روایتی مگر اپنے حسی و ادبی طریقہ اظہار میں جدید نقّاد ہیں۔ اس لیے انہوں نے مطالعے کے لیے زیادہ تر معاصر شاعروں اور ادیبوں کو منتخب کیا ہے۔ مگر ان کی تعبیر جس نقطہ ؟ نظر سے کی ہے وہ رمزی اور علامتی ہے۔ احمد مشتاق کا یہ شعر شاید انہیں کے حسبِ حال ہے:

اگرچہ دل وہی رجعت پسند ہے اپنا
مگر زبان ترقی پسند رکھتے ہیں

ڈاکٹر سی اے قادر

قاضی جاوید

قیام پاکستان کے زمانے میں، یوں کہیے کہ ۱۹۷۰ء کی دہائی تک ہمارے ہاں فلسفے کا چرچا اُس سے کہیں زیادہ تھا جتنا کہ اب ہے۔ ۱۹۵۴ء میں پاکستان فلسفہ کانگریس وجود میں آئی تھی۔ یہ تیسری دنیا میں ارباب فلسفہ کی دوسری اور مسلم ملکوں کی پہلی تنظیم تھی۔ اس کے بنانے والوں میں پروفیسر ایم۔ ایم۔ شریف اور ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم پیش پیش تھے۔ یہ دونوں صاحبان آل انڈیا فلاسفیکل کانگریس سے وابستہ رہے تھے۔ شریف صاحب تو اُس کے صدر بھی رہ چکے تھے۔ اُن کے جونیئر ساتھیوں میں پروفیسر قاضی محمد اسلم اور پروفیسر سی۔ اے۔ قادر نمایاں تھے۔ دونوں کا تعلق گورنمنٹ کالج لاہور کے شعبہ فلسفہ سے تھا۔

پاکستان میں دراصل فلسفے کی اعلیٰ تعلیم کا یہی ایک مرکز تھا اور اس مرکز نے علامہ محمد اقبال جیسا نامور فلسفی پیدا کر کے اپنی معنویت اور وقار میں بے پناہ اضافہ کر لیا تھا۔

پاکستان فلسفۂ کانگریس قائم ہوئی تو اُس نے جلد ہی اپنے سالانہ اجلاس شروع کر دیے۔ ان میں مقامی فلسفیوں کے علاوہ بیرونی دنیا کے ممتاز صاحبان فلسفہ کو بھی مدعو کیا جاتا تھا۔ ۱۹۵۴ء میں منعقد ہونے والے پہلے اجلاس کے لیے برٹرینڈ رسل اور اے۔ جی ایر کو دعوت دی گئی۔ رسل نے جواب میں نیک خواہشات کا پیغام بھیجا اور معذرت کر لی۔ ایر صاحب اُس زمانے میں منطقی ایجابیت (Logical Positionism) کے حوالے سے عالمگیر شہرت رکھتے تھے۔ وہ انگلستان سے آنے پر آمادہ ہو گئے۔ اُن کی آمد کے پیش نظر کانگریس کے صدر پروفیسر ایم۔ ایم

شریف نے سی۔ اے قادر صاحب کو منطقی ایجابیت اور فلسفے کے دیگر مغربی مکاتب کے مطالعے کا مشورہ دیا۔ اس مطالعے کا نتیجہ یہ ہوا کہ بیسویں صدی سے دلی رغبت پیدا ہوگئی اور وہ زندگی بھر اُن میں خصوصی دلچسپی لیتے رہے۔

بعدازاں جب ۱۹۶۲ء میں پنجاب یونیورسٹی میں فلسفے کا شعبہ قائم ہوا تو قادر صاحب اُس کے پہلے پروفیسر اور صدر شعبہ مقرر ہوئے۔ اُس زمانے میں انہوں نے منطقی ایجابیت، لسانی و تحلیلی فلسفہ، وجودیت اور متعلقہ موضوعات پر انگریزی اور اردو زبانوں میں کتابیں اور مفصل مقالات لکھے۔ ان موضوعات پر یہ پاکستان میں لکھی جانے والی اولین تحریریں تھیں۔ انہوں نے نئے فلسفیانہ افکار کو یہاں متعارف کرایا۔ یوں وہ پورے ملک کے علمی، فکری اور ادبی حلقوں میں فلسفے کے ممتاز استاد اور سکالر کی حیثیت سے پہچانے جانے لگے۔

ستر کی دہائی کے اوائل میں مجھے ڈاکٹر قادر صاحب کو پہلی بار دیکھنے کا موقع ملا۔ اُن دنوں میں معاصر فلسفے کے موضوع پر اپنی پہلی کتاب لکھ رہا تھا اور میرے دن پنجاب پبلک لائبریری میں گزرا کرتے تھے۔ مجھے احساس تھا کہ اُن کی شخصیت اور طریقہ تدریس کے بارے میں چند باتیں اور ایک دو کہانیاں سن رکھی تھی۔ وہ میرے ہیرو تھے اور ان سے ملنے کی خواہش تھی۔

بہت سی خواہشیں اتفاقاً پوری ہو جاتی ہیں۔ ایک دوپہر کو چائے کے کپ کی تلاش میں پنجاب پبلک لائبریری سے نکل کر میں ٹولینٹن مارکیٹ سے ہوتا ہوا پنجاب یونیورسٹی اولڈ کیمپس میں داخل ہوا تو گیٹ کے نزدیک بہت سے طالب علم اور استاد نیو کیمپس جانے کے لیے بس کے انتظار میں کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک صاحب کی طرف اشارہ کر کے کسی دوست نے مجھے بتایا کہ ''وہ ہیں ڈاکٹر سی اے قادر۔''

میں نے اُن کی طرف دیکھا اور بس کے آنے تک اُن کو دیکھتا ہی رہا۔ ابھی میں نے عرض کیا ناں کہ وہ میرے ہیرو تھے اور میں زندگی بھر اُن کے نقشِ قدم پر چلنے پر آمادہ تھا۔ اب پہلی بار اُن کو اپنے سامنے دیکھ رہا تھا۔ وہ باوقار اور جاذبِ نظر تھے، بالکل ایک پروفیسر کی طرح۔ ایک سکالر کی مانند۔

خیر، چند ہی ہفتوں بعد مجھے ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کا شرف حاصل ہونے والا تھا۔ ''بیسویں صدی کا فلسفہ'' کے عنوان سے میری کتاب مکمل ہوگئی تھی اور میں اُن سے دیباچہ لکھوانے

کا خواہاں تھا اور صاحب دیباچوں کا رواج اُس زمانے میں کچھ زیادہ ہی تھا۔ ملاقات کا وقت لینے کے لیے میں نے فلسفہ کے شعبہ سے رابطہ کیا تو معلوم ہوا کہ یونیورسٹی سے ڈاکٹر صاحب کا تعلق (عارضی طور پر) ختم ہو چکا تھا۔ لہٰذا ملاقات اُن کی رہائش گاہ پر ہو سکتی تھی۔ میں نے اُن کی رہائش گاہ کا پتہ معلوم کیا۔ وہ ۵۔ وحدت روڈ پر رہتے تھے جو اُس زمانے میں ایک سنسان اور اداس سڑک تھی۔

بھادوں کے جان لیوا حبس کی ایک سہ پہر کو مسودہ بغل میں دبائے کوٹھی کے کھُلے بیرونی گیٹ سے گزر کر جب میں نے دروازہ کھٹکھٹایا تو پسینے سے شرابور تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے خود دروازہ کھولا۔ انہوں نے بنیان پہن رکھی تھی اور تہ بند باندھ رکھا تھا۔ (آخر وہ سیالکوٹ کے چودھری تھے) ایک اجنبی نوجوان کو روبرو پا کر متعجب ہوئے۔ مجھ کو اندر لے گئے، بٹھایا اور آنے کا سبب پوچھا۔ فلسفے کے بڑے پروفیسر کو یہ بتانے کے لیے مجھے موزوں الفاظ نہ مل رہے تھے کہ میں نے فلسفے پر ایک کتاب لکھی ہے اور دیباچہ لکھوانے کے لیے ان کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ خیر، جب بتایا تو خوش ہوئے۔ مسودے پر نگاہ ڈالی اور کہنے لگے کہ ''یہ مجھے دے جایئے۔ اگلے ہفتہ کو لے جایئے گا۔''

میں نے جھجکتے ہوئے پوچھا ''آج کے دن، یعنی بدھ کو آ جاؤں؟''

''مناسب ہے۔ آ جایئے''

''مجھے کس وقت آنا چاہیے؟''

''اسی وقت آ جایئے'' ڈاکٹر صاحب نے کہا ''میں سارا دن گھر میں ہوتا ہوں۔''

اگلے بدھ کو میں دوبارہ دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ ڈاکٹر صاحب تپاک سے ملے۔ جب اُن کے کمرے میں قدم رکھا تو لکھنے والی میز کے ایک کونے میں اپنے مسودہ پر نظر پڑی۔ انہوں نے مسودہ اٹھا کر مجھے دیا اور اس کے بارے میں چند تعریفی جملے کیے۔

ڈاکٹر صاحب نے دیباچہ لکھا ہوا تھا۔ کھلی لکیر وار کاغذ پر پینسل سے لکھے ہوئے پانچ صفحے۔ بعد میں جب کئی برسوں تک ان کے نزدیک رہنے کا موقع ملا تو میں نے دیکھا کہ ڈاکٹر صاحب عموماً پینسل سے لکھا کرتے تھے اور لکیروں والے کاغذ کا استعمال کرتے تھے۔

خوش بختی سے میں پہلی کتاب کی اشاعت کی مشکلات سے بچ گیا۔ لاہور میں ستر کی دہائی

میں مکتبہ میری لائبریری مقبول اشاعتی ادارہ تھا۔ میں اس کے مالک مرحوم بشیر احمد چوہدری سے ملا ۔ وہ مہربانی سے پیش آئے ۔ انہوں نے کتاب چھاپنے کی حامی بھری اور چند ہفتوں میں کتاب مارکیٹ میں آ گئی۔ کتاب ڈاکٹر صاحب کو پیش کرنے کے لیے گیا تو ان سے ملاقات فلسفہ کے شعبے میں ہوئی۔ ان کے کمرے میں پہلے ہی دس بارہ طالب علم بیٹھے تھے جن میں طالبات کی اکثریت تھی۔ معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب طالب علموں میں اور خاص طور پر طالبات میں بہت مقبول تھے۔ فلسفہ کے علاوہ یونیورسٹی کے دوسرے شعبوں سے بھی طالب علم اور استاد ان سے ملنے کے لیے آیا کرتے تھے۔ ایک ہجوم سا رہا کرتا تھا۔ بعض لوگوں کو یہ معاملہ ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ وہ اس کی عجیب وغریب تعبیریں کرتے تھے۔ لیکن ان کا بس نہ چلا۔ وہ ان محفل آرائیوں کو روک نہ سکے اور ڈاکٹر صاحب کی زندگی میں ان کے کمرے میں رونقیں قائم رہیں۔

میں نے کتاب پیش کی تو بہت خوش ہوئے۔ میں دیکھ سکتا تھا کہ خوشی دل سے پھوٹ رہی تھی۔ اس میں کوئی بناوٹ نہ تھی۔ کہنے لگے کہ اردو زبان میں اس موضوع پر کوئی کتاب نہ تھی۔ اب یہ کمی پوری ہوگئی ہے اور فلسفے میں دلچسپی رکھنے والے اس سے فائدہ اٹھائیں گے۔ لیکن اس کو پہلی کتاب سمجھیے گا۔ لکھنا جاری رکھیے گا۔

پہلی کتاب نے پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ فلسفہ تک پہنچنے کا میرے لئے راستہ بنا دیا۔ یہ کتاب شعبے کے چیئرمین پروفیسر خواجہ غلام صادق صاحب تک پہنچی۔ انہوں نے ریسرچ سکالر کے طور پر مجھے اپنے شعبے میں لے لیا۔ یہ تعلق دسمبر ۱۹۷۳ء میں بنا جب ڈاکٹر محمد اجمل وائس چانسلر تھے اور کسی نہ کسی طرح ۱۹۸۴ء میں خواجہ صاحب کی وفات تک جاری رہا۔ ڈاکٹر سی اے قادر دوبارہ شعبہ میں پڑھانا شروع کر چکے تھے۔ وہاں ابتداء میں مجھے وجودیت اور مارکزم پڑھانے کو کہا گیا۔ یہ وہ مضمون تھے جو پہلے داکٹر صاحب پڑھایا کرتے تھے۔ شعبے سے دس گیارہ برسوں کے تعلق کے دوران ڈاکٹر صاحب کو قریب سے دیکھنے، کم وبیش روزانہ ان سے باتیں کرنے اور ان سے سیکھنے کا موقع ملا۔ اس زمانے کا ایک اہم واقعہ یہ ہے کہ ۱۹۸۰ء کے عشرے کے آغاز میں، غالباً ۱۹۸۲ء میں، ڈاکٹر صاحب نے کینیڈا کی ایک امدادی انجمن کے تعاون سے کتابیں شائع کرنے کا ایک ادارہ بنایا جو مشعل کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس نے بہت سی اہم اور عمدہ کتابیں شائع کی ہیں۔ میں اس ادارے میں ڈاکٹر صاحب کے معاون کے طور پر تین سال کام کیا۔

اوپر میں نے ڈاکٹر صاحب کی یونیورسٹی میں مقبولیت کی طرف اشارہ کیا تھا۔ پہلے بھی مجھے احساس تھا اور اب بھی سمجھتا ہوں کہ ان کی مقبولیت کا راز شخصیت کی دلکشی اور اپنے مضمون یعنی فلسفہ پر ان کے عبور میں تھا۔ وہ تجریدی، پیچیدہ اور الجھے ہوئے خیالات کو عام فہم انداز میں بیان کرنے کی اچھی صلاحیت بھی رکھتے تھے۔ چنانچہ ان کی تحریریں اور ان سے بھی زیادہ لیکچرز اس انداز کی اچھی مثال ہوا کرتے تھے

پنجاب یونیورسٹی میں وہ طالب علموں کے مختلف گروہوں کے درمیان تصادم کی طرف لے جانے والے شدید اختلافات کے دن تھے۔ استاد بھی گروہ بندی کا شکار تھے۔ لیکن سیکولر اور لبرل خیالات کی طرف واضح جھکاؤ کے باوجود ڈاکٹر قادر اس حد تک جانے سے گریز کرتے تھے جہاں ان پر لیبل لگانا آسان ہو جائے۔ ان کا کہنا تھا کہ استاد کو اس راہ سے پرے رہنا چاہیے جو تنگ نظری اور تعصّبات کی طرف لے جاتی ہے۔ اس راہ پر قدم اٹھانے کا مطلب طالب علموں کی فکری وجذباتی نشو ونما کے امکانات کو محدود کرنا ہے۔ استاد کا کام ان امکانات کو کم کرنا نہیں بلکہ بڑھانا ہے تاکہ نوجوانوں کی شخصیت پوری طرح نکھر سکے اور وہ اعتماد کے ساتھ اپنی زندگی کے انتخاب خود کرنے کے قابل ہو جائیں۔

اس طرز فکر کے باوجود لاہور میں ایسے صاحبان موجود تھے جو ڈاکٹر صاحب کو کیمونسٹ قرار دیتے تھے۔ میرے خیال میں یہ محض ایک بہتان ہے۔ وہ کبھی پکی کے قسم کے کیمونسٹ نہ رہے تھے۔ مارکسی فلسفہ کی تمام مقبولیت کے دور میں بھی ڈاکٹر صاحب شیکسپیئر کے ایک جملے کے حوالے سے کہا کرتے تھے کہ دنیا میں اور زندگی میں بہت سی حقیقتیں ہیں جو مارکس کے آنکھوں سے اوجھل رہ گئی ہیں۔

خیر یہ قصہ طویل ہونے لگا ہے تو آیئے اس کو قادر صاحب کی زندگی کے ایک اہم واقعہ کے بیان پر ختم کرتے ہیں۔

مظفر قادر ڈاکٹر صاحب کے بڑے صاحب زادے تھے، وہ سی ایس پی افسر تھے اور کئی ضلعوں کے ڈپٹی کمشنر تھے۔ بھٹو صاحب نے اقتدار سنبھالنے کے بعد کئی اعلیٰ افسروں کو عہدوں سے برطرف کیا۔ مظفر قادر بھی ان کی زد میں آ گئے تھے۔ بعد میں انہوں نے حسین نقی صاحب کے ساتھ مل کر ''پنجاب پنچ'' کے نام سے ایک انگریزی اخبار جاری کیا تھا۔ وہ جواں سال تھے کہ ایک

روز لاہور کے باغ میں جوگنگ کرتے ہوئے حرکتِ قلب بند ہونے سے انتقال کر گئے ۔شعبہ فلسفہ سے متعلقہ ہم سب لوگوں نے ان کی آخری رسومات میں شریک ہوئے۔

بوڑھے باپ کے لیے یہ بہت صبر آزما صدمہ تھا۔اس سانحہ کے تیسرے یا چوتھے روز میں شعبہ فلسفہ میں اپنے کمرے میں بیٹھا تھا جو یونیورسٹی نیو کیمپس کے مین کوریڈور کی نکڑ پر واقع تھا۔ کھڑکی کے پردے کھلے تھے اور دور تک منظر دکھائی دے رہا تھا میں نے دیکھا کہ داکٹر صاحب اپنا بیگ اٹھائے آرہے ہیں۔کمرے سے نکل کر میں ان سے ملا وہ مغموم تھے۔

میں نے پوچھا اس سانحہ کے بعد زندگی کیسی محسوس ہوتی ہے۔

انہوں نے آہستہ سے جواب دیا ''ابسرڈ''

پروفیسر ڈاکٹر شریف المجاہد

ڈاکٹر طاہر مسعود

اگر کسی یونی ورسٹی کے استاد کی معلمانہ کارکردگی کو جانچنے کا معیار یہ مقرر کیا جائے کہ اسے نہ صرف خود فنافی العلم اور فنافی التحقیق ہونا چاہیے بلکہ اپنے شاگردوں میں بھی علم اور تحقیق کا ذوق وشوق پیدا کرنے کی سعی وجستجو کرنا چاہیے تو اس کڑے معیار پر استاد محترم پروفیسر شریف المجاہد پورے اترتے ہیں۔ بہ حیثیت استاد ان کے فیض یافتگان شاگردوں کا دائرہ بہت وسیع ہے،ان میں بیشتر کا تعلق ذرائع ابلاغ کے مختلف اداروں نیز جامعات میں تعلیم وتعلم کے پیشے سے ہے۔مجاہد صاحب نے جو کمالات تدریس وتحقیق کے میدان میں دکھائے ہیں وہ تو اپنی جگہ ساتھ ہی ان کی شخصیت ادارہ ساز کی بھی ہے،انہوں نے کراچی یونی ورسٹی میں شعبہ صحافت، ملائشیا کی اسلامی یونی ورسٹی اور اسلام آباد میں بھی اسلامیو نی ورسٹی میں شعبہ ہائے ابلاغ عامہ قائم کیے۔ان شعبوں میں انہوں نے نصاب سازی کے علاوہ لائق اساتذہ کے چناؤ اور تقرری میں بھی حصہ لیا۔اسی طرح ۱۹۷۶ء میں قائداعظم کی شخصیت اور خدمات کے حوالے سے قائداعظم اکادمی کے قیام کا فیصلہ حکومتی سطح پر کیا گیا تو اس کے بانی ڈائریکٹر شریف المجاہد صاحب بنائے گئے، جنہوں نے اکادمی کو اپنے پاؤں پر کھڑا کیا اور علمی اعتبار سے ایک نہایت پر مایہ لائبریری بھی بنائی۔انہوں نے امریکی جامعات میں بھی مہمان استاد کی حیثیت سے تدریسی خدمات انجام دی ہیں۔

شریف المجاہد صاحب نے یکم جولائی ۱۹۲۶ء کو مدراس کے ایک متوسط گھانے میں آنکھ کھولی۔انہوں نے نوعمری ہی میں قلم وقرطاس سے ناتا جوڑ لیا تھا۔سترہ برس کی عمر میں ان کا پہلا

مضمون انگریزی ہفت روزہ ''دکن ٹائمز'' میں شائع ہوا جو اپنے وقت کا نہایت موثر جریدہ تھا۔ جب وہ بیس سال کے ہوئے تو ان کے درجنوں مضامین ہندوستان کے اہم اخبارات ورسائل میں شائع ہو چکے تھے۔ ان میں ''اشا آف انڈیا'' ''مارننگ نیوز'' ''کلکتہ'' ''ایسٹرن ٹائمز'' لاہور، خیبر میل پشاور'' سندھ ٹائمز کراچی'' آسام بیلا لڈ'' ''شیلانگ ویکلی'' اور آبزرور الہ آباد'' قابل ذکر ہیں۔ وہ ۱۹۴۵ء سے قائداعظم کے بارے میں مسلسل لکھتے چلے آئے ہیں۔

تعلیمی کوائف کے مطابق مجاہد صاحب ۱۹۵۰ء میں مدراس یونی ورسٹی سے تاریخ میں ایم اے کیا۔ پھر اگلے برس ۱۹۵۱ء میں انہوں نے تاریخ ہی کے مضمون میں اسٹین فوڈ یونی ورسٹی سے ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ وہ پاکستان سے فل برائٹ اسکالے شپ پر امریکا جانے والے اولین دستے میں شام تھے۔ ۱۹۵۴ء میں انہوں نے میکگل یومی ورسٹی سے اسلامیات میں ایم اے کیا۔ ۱۹۶۷ء سے ۱۹۷۰ء تک انہوں نے سرا کیوز یونیورٹی میں ابلاغ عامہ کے ڈائریکٹویٹ کے پروگرام میں شرکت کی۔ وہاں سے کورس ورک مکمل کر کے فیلڈ ریسرچ کے لیے پاکستان آئے تا کہ اپنا مقالہ مکمل کر سکیں لیکن یہاں کی تدریسی اور علمی مصروفیتوں میں الجھ جانے کی وجہ سے یہ کام ادھورا ہی رہ گیا۔

صحافت اور ابلاغ عامہ کے استاد لے لیے پیشہ وارانہ تجربے کو عموماً ضروری تصور کیا جاتا ہے۔

مجاہد صاحب بھی صحافت کی تدریس کی طرف صحافت کے پیشے سے ایک عرصہ تک وابستہ رہنے کے بعد ہی آئے انہوں نے پچاس کی دہائی میں الستر تیڈ ویکلی آف پاکستان بطور اسسٹنٹ ایڈیٹر کا کیا۔ اسی زمانے میں وہ کراچی میں بمبئی کے ایک رسالے ''فورم'' کے نانہ نگار بھی رہے۔ ۱۹۵۵ء میں وہ مشرق وسطیٰ میں ''پاکستان اسٹینڈرڈ'' کے گشتی نامہ نگار رہے اور پھر کراچی پہنچ کر انہوں نے اسی اخبار میں اداریہ نویسی کا فریضہ بھی انکام دیا۔ ۱۹۶۰ء سے ۱۹۶۴ء تک وہ فارن نیوز سروس نیویارک کے اسٹاف کا ریسپانڈس بھی رہے۔ ۱۹۶۵ء سے ۱۹۶۷ء تک وہ جرل آف دی پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کے ایسوسی ایٹ ایڈیٹر بھی رہے۔

اگست ۱۹۵۵ء میں کراچی یونی ورسٹی میں شعبہ صحافت ایشیا فاؤنڈیشن کے تعاون سے کھولا گیا۔ ابتا میں صرف ڈپلومہ کی کلاس شروع ہوئیں۔ رئیس کلیئہ فنون ڈاکٹر محمود حسین عارضی طور پر

اس کے سربراہ مقرر ہوئے جب کہ شریف المجاہد صاحب اس نوزائیدہ شعبے میں لیکچرار تعینات کیے گئے۔ انہوں نے نہایت محت اور لگن سے اپنے شعبے کو منظّم کیا۔ ۱۹۶۱ء میں ایم اے کی کلاس شروع ہوئیں تو مجاہد صاحب شعبے کے چیئر مین بنا دیے گئے۔ بعد ازاں انعام الرحمٰن جو اسی شعبے سے ڈپلومہ کر چکے تھے، بطور استاد شعبے سے منسلک ہو گئے۔ یہ مجاہد صاحب کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ مسلم لیگ کے ترجمان اخبار ''منشور'' کے ای ڈیٹر مولانا حق ایض ''مارننگ نیوز'' سے وابستہ صحافی محسن علی اور نوائے وقت کے سابق صحافی ایشیا فاؤنڈیشن سے منسلک زکریا ساجد بھی جز وقتی استاد کے طور پر شعبے میں پڑھانے لگے۔ بعد میں مجاہد صاحب نے متین الرحمٰن مرتضیٰ اور محمد شمس الدین کو بطور استاد شعبے سے متعارف کروایا۔

مجاہد صاحب ۱۹۵۵ء سے ۱۹۶۲ء تک سینئر لیکچرار (اسسٹنٹ پروفیسر) ۱۹۶۲ء سے ۱۹۷۲ء تک ایڈر (ایسوسی ایٹ پروفیسر) اور پھر ۱۹۷۲ء میں پروفیسر بنا دئے گئے۔ جیسا کہ عرض کیا گیا مجاہد صاحب نے بیرون ملک بھی جامعات میں مہمان استاد کی حیثیت سے تدریسی خدمات انجام دی ہیں۔ ۱۹۶۴ء میں وہ مہمان ایشائی استاد کی حیثیت سے برلے یونی ورسٹی اور بفیو میں نیو یارک کی اسٹیٹ یونی ورسٹی میں رہے۔ بعد ازاں ۱۹۲۸ء اور ۱۹۶۹ء میں بھی انہوں نے مہمان استاد کے طور پر امریکی جامعات میں پاکستان سے متعلق مختلف موضوعات پر لیکچر دیے۔ ادرون ملک وہ جہ ایچ کیو، اسٹاف کالج کوئٹہ، نیشنل ڈیفینس کالج پی اے ایف اسٹاف کالج، پی این کا رساز سول سروس اکیڈمی، پاکستان ایڈمنسٹریٹو اسٹاف، انفارمیشن سروس اکیڈمی پینا اور میرن اکیڈمی جیسے موقر اداروں میں سال بہ سال لیکچر دیتے رہے ہیں۔ مجاہد صاحب کے تحقیقی مقالات دنیا کے ممتاز علمی جرائد نیز متعدد اسائیکلو پیڈیاؤں میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان کی علمی و تحقیقی کتب اور انتائی معیاری مقالات کے حوالے سے امریکا و یورپ کے علمی حلقوں میں انہیں نہایت قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ قائداعظم پر ان کی کتاب Quaid-e-Azam Studies in Interpertation پر حکومت نے انہیں قومی اعزاز سے بھی نوازا۔

مجاہد صاحب ایک استاد اور ایک اسکالر کے طور پر ہمیشہ دوسرے اساتذہ کے لیے مشعل راہ رہے ہیں۔ انہیں وقت کا صحیح اور تعمیری استعمال آتا ہے۔

انہوں نے ہمیشہ اپنے طالب علموں میں علم کا ذوق تحقیق کا شوق پیدا کرنے کی کوشش کی

جس طالب علم میں بھی انہیں زرا بھی ''اسپارک'' نظر آیا ہے، اس پہ خصوصی توجہ اور التفات کے زریعے روشنی کی اس دھیمی سی لو کو بھی شعلہ بنانے کی جستجو کی ہے۔ عربی محاورہ حصول علم میں جسم کی راحت نہیں کے مصادق مجاہد صاحب نے اپنے آپ کو تا عمر فنا فی العلم اور فنا فی التحقیق کیے رکھا۔ اپنے طلبہ کا بھی انہوں نے ہمیشہ یہ ہی نصیحت کی کہ وقتی شہرت اور جھوٹی ناموری کے پیچھے نہ بھاگو۔ علم کے لیے اپنے آپ کو وقف کردو۔ اپنی فکری توانائیوں کو لفظوں میں کتابوں میں محفوظ کردو۔ کوئی وجہ نہیں کہ زمانہ تمہیں یاد نہ رکھے۔

ان کے دوست اور رفیق شعبہ پروفیسر زکریا ساجد جنہیں امریکا اور فرانس کی جامعات میں وہاں کے پروفیسروں کے ساتھ کام کرنے کا تجربہ ہے، مجاہد صاحب کی بابت کیا کرتے ہیں ۔مغربی اساتذہ میں جیسی علمی لگن پائی جاتی ہے اور لکھنے پڑھنے کے کاموں میں وہ اپنے آپ کو جس طرح فنا کر دیتے ہیں، اس کی ہمارے ملک میں کوئی مثال نہیں، بلکہ مغربی اساتذہ سے بڑھ کر کوئی مثال ہے تو وہ شریف المجاہد صاحب کی ہے۔ اور یہ سچ یہ کہ مجاہد صاحب جب تک شعبے میں رہے، وہ شعبے میں سب سے پہلے آنے والے اور شعبے میں سب سے پہلے آخر میں جانے والے استاد تھے۔ اسی طرح جب وہ قائداعظم اکیڈمی کے ڈائریکٹر بنائے گئے تو انھوں نے اپنا بستر بھی اکیڈمی کر دفتر ہی میں ڈال لیا تھا۔ ان کی راتیں بھی یہیں بسر ہوتے تھیں۔ پیشِ نظر تھا کہ آنے جانے میں وقت کیوں ضائع ہو۔ اتنا وقت بھی کیوں نہ علمی کام میں صرف کیا جائے۔ وہ جو اکثر اداروں کے سربراہوں کے کمروں میں ملنے جلنے اور آج جانے والوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے۔ چائے کے ساتھ گپ شپ کا ماحول سا بنا رہتا ہے۔ مجاہد صاحب کا دفتر ان ''بدعتوں'' سے ہمیشہ محفوظ رہا۔ وہ طلبہ کو بھی یہ ہی تلقین کیا کرتے تھے کہ زندگی کو ایک اعلیٰ مقصد کے تابع کرو اور اپنا وقت اور اپنی ذہنی وجسمانی توانائی اسی مقصد کو پانے میں لگا دو۔

ہمارے ہاں بالعموم پروفیسروں کو'' غائب دماغ '' سمجھا جاتا ہے اور Absent Minded اور Professor ایک مذاقیہ فقرہ ہے جو ادنیٰ سی بھول چوک پر پروفیسر حضرات پر چسپاں کر دیا جاتا ہے۔ مجاہد صاحب اس کے بالکل برعکس واقع ہوئے ہیں۔ ان کا حافظہ حیران کر دینے والا ہے۔ جن طالب علموں کو ان کی صلاحیت کے سبب وہ اہمیت دیتے ہیں، ان کے سارے کوائف انہیں زبانی یاد رہتے ہیں بلکہ مدت بعد ملاقات ہونے پر وہ طالب علم کو یہ بتا کر ششدر کر

دیتے ہیں کہ آخری ملاقات کس تاریخ اور سال کو کس موقع پر ہوئی تھی۔ ان کا یہ بے مثال حافظہ ان کے علمی اور تحقیقی کاموں میں کتنی معاونت کرتا ہوگا اور مجاہد صاحب اس حافظے سے کتنا فائدہ اٹھائے ہوں گے اس کا تو صرف تصور ہی کیا جا سکتا ہے۔ مجاہد صاحب جب تک درس وتدریس کے پیشے سے وابستہ رہے، ان کی کوشش ہمیشہ یہ ہی رہی کہ طلبہ میں عادت مطالعہ پیدا کر دیں۔

اس کے لیے بسا اوقات سختی بھی کیا کرتے تھے کہ اپنے ساتھ متعلقہ موضوع کی کتابیں لے کر کلاس میں آتے اور طلبہ میں یہ کتابیں تقسیم کر دیتے کہ انہیں پڑھو۔ اسی طرح جس موضوع پہ انہیں تحقیق کرنا مقصود ہوتا اس میں طالب علموں سے بھی کام لیتے۔ طالب علم کو تحقیقی کام میں لگانے سے فائدہ طالب علم ہی کو زیادہ پہنچتا کہ اس کی تربیت ہو جاتی اسی علمی طریقہ تدریس کا نتیجہ ہے کہ شریف المجاہد صاحب کے زمانے کے طلبہ جنہوں نے اس نابغہ استاد کے آگے زانوئے تلمذ کیا، آگے چل کر انہوں نے خواہ ذرائع ابلاغ میں یا درس وتدریس کے پیشے میں بڑا نام پیدا کیا۔

آج مجاہد صاحب کی عمر ۹۲ سال ہونے کو آئی ہے اس پیرانہ سالی میں بھی ان کے لکھنے پڑھنے کے شوق میں کوئی کمی نہیں آئی ہے۔ پچھلے مہینوں واش روم میں گرنے کی وجہ سے ان کی ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ کسی ذریعہ سے مجھے اطلاع ملی تو عیادت کے لیے ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ شکوہ کیا کہ ''سر! آپ نے حادثے کی خبر تک نہ کی۔''

فرمایا: ''بھئی! جان بوجھ کر نہیں کی۔ معلوم ہونے پر عیادت کے لیے جو آئے گا، اس کا اور ساتھ ہی میرا وقت ضائع ہوگا۔'' اسی سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ایک عالم اور اسکالر کے لیے وقت کی کیا قدر و قیمت ہے اور اس کے نزدیک وقت کا استعمال کیا ہے؟ کس علم کے اسی ذوق وشوق سے عالم صحیح معنوں میں عالم بنتا اور کہلاتا ہے۔

پروفیسر شریف کنجاہی

ڈاکٹر محمد منیر احمد سلیچ

شریف کنجاہی ایک ہمہ جہت ادبی شخصیت تھے۔ وہ پنجابی اور اردو زبانوں کے نامور شاعر و ادیب، محقق، نقاد، مترجم، ماہر لسانیات، فارسی کے شاعر اور استاد تھے۔ ان کا اصل نام محمد شریف تھا، وہ ۱۳/ مئی ۱۹۱۴ء کو گجرات کے مردم خیز قصبے کنجاہ میں جناب غلام محی الدین (۱۸۸۵ء۔۱۹۵۹ء) کے گھر پیدا ہوئے (کاغذات میں اور عام طور پر بیان کردہ تاریخ پیدائش ۱۳/ اکتوبر ۱۹۱۵ء ہے جو درست نہیں)۔ کنجاہ گجرات شہر سے مغرب میں دس کلومیٹر کے فاصلے پر ایک مشہور قصبہ ہے، اسی قصبے نے فارسی کے نامور شاعر غنیمت کنجاہی کو جنم دیا جن کی شاعرانہ عظمت کو اہل فارس نے بھی تسلیم کیا ہے۔ کنجاہ اپنے دور کا کاروباری اور سیاسی مرکز تھا اور اپنے حسن اور کڑوے تمباکو کی وجہ سے بھی جانا جاتا تھا جس کا ذکر مولانا ظفر علی خاں نے اپنے شعروں میں بھی کیا ہے۔ اسی قصبے میں ڈپٹی نذیر احمد نے اپنی مدرسی کا ابتدائی زمانہ گزارا تھا۔ اس دور میں یہاں ہندوؤں کی اکثریت تھی جو ہر میدان میں مسلمانوں سے آگے تھے اور مسلمان ان کے ہر طرح کے استحصال کا شکار تھے۔

شریف کے بزرگ صدیوں سے دینی علوم سے بہرہ مند چلے آ رہے تھے اور آئمۂ مساجد اور خطباء کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے تھے۔ شریف نے اپنی ابتدائی تعلیم گھر میں اپنی والدہ محترمہ 'فضل نور' سے حاصل کی جو محلے کی بچیوں کو بھی پڑھاتی تھیں، والدِ محترم میاں غلام محی الدین منشی فاضل، کنجاہ کے ڈسٹرکٹ بورڈ مڈل سکول اور دیگر کچھ سکولوں میں استاد

کی حیثیت سے فرائض انجام دیتے رہے۔ یوں شریف کو پہلے دن سے ہی اپنے گھر میں علمی ماحول ملا۔ انھوں نے ساتویں تک ڈسٹرکٹ بورڈ سکول میں پڑھا، آٹھویں اور نویں جلال پور جٹاں کے اسلامیہ ہائی سکول سے پاس کیں جہاں انھیں ماسٹر طالع محمد سے ریاضی پڑھنے کا موقع ملا جو اپنے عہد کے ممتاز استاد اور علامہ اقبال کے مکتوب الیہ تھے۔ میٹرک کا امتحان انھوں نے ۱۹۳۰ء میں کنجاہ کے سناتن دھرم ہائی سکول سے پاس کیا۔

اس دور میں کنجاہ میں ہونے والے سیاسی جلسوں میں مولانا ظفر علی خاں، سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری تشریف لاتے تھے جبکہ مقامی سیاستدانوں میں مولوی عبداللہ اور چودھری بہاول بخش نمایاں تھے۔ انھی جلسوں نے اس دور کے نوجوانوں میں سیاسی شعور پیدا کیا اور شریف بھی ان جلسے جلوسوں میں شامل ہونے لگے۔ مسلمانوں کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں اور استحصال نے شریف کے ذہن کو بہت متاثر کیا اور یہیں سے ان کے اندر انقلابی اور ترقی پسندانہ سوچ نے جنم لیا جو آگے چل کر ان کے مخصوص نظریات اور ان کی خوبصورت شاعری کی بنیاد بنی۔ کنجاہ میں مسلمان بچوں کے لیے الگ سکول کے قیام کے لیے مولوی عبداللہ نے سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری کو کنجاہ آنے کی دعوت دی، انھوں نے اپنی تقریر کے اختتام پر سکول کے قیام کے لیے امداد کی اپیل کی تو عورتوں نے اپنے زیورات ان کے قدموں میں ڈھیر کر دیے۔ یہیں شریف کی شاہ صاحب سے پہلی ملاقات ہوئی۔ شریف نے انھیں اپنی نظم سنائی، شاہ صاحب اعلیٰ درجہ کا شعری ذوق رکھتے تھے، پوچھا اصلاح کس سے لیتے ہو، کہا کسی سے نہیں۔ انھوں نے فرمایا حفیظ جالندھری کو کلام دکھا لیا کرو۔ انھوں نے حفیظ کے نام خط لکھ دیا۔ شریف، شبیر شریف شہید کے والد کے ساتھ، جو شریف کے ہم نام اور قریبی دوست تھے، سائیکل چلاتے ہوئے لاہور پہنچے۔ حفیظ صاحب کو شاہ صاحب کا خط دیا اور یوں ان سے تلمذ کا رشتہ استوار ہوا۔ اسی سلسلے میں شاہ صاحب سے بھی خط و کتابت رہی جنھوں نے شریف کی طرف سے اردو، پنجابی اور فارسی کلام ملنے پر انھیں کسی ایک زبان میں اظہارِ خیال کا مشورہ دیا جبکہ حفیظ نے انھیں سادہ اور آسان زبان لکھنے کی تلقین کی۔

شریف صاحب کی سوچوں نے جو رُخ اختیار کیا اس میں کسی مذہبی جماعت سے وابستگی کی گنجائش نہیں تھی لیکن وہ شاہ صاحب کی شخصیت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے جس کے نتیجے میں سرکاری کاغذات میں ان کا رشتہ احرار سے جوڑ دیا گیا۔ احرار کے بعد جب پنجاب میں کانگریس

مشہور ہوئی تو انگریز دشمنی کی وجہ سے شریف کو کانگریس کا نمائندہ ظاہر کیا گیا۔

میٹرک کے بعد شریف نے انٹر کالج گجرات میں داخلہ لیا۔ اسی دور میں ان کی ملاقات علی عباس جلال پوری سے ہوئی جو جلد ہی گہری دوستی میں بدل گئی۔ جلال پوری کتب بینی کا شوق فراواں رکھتے تھے' شریف نے بھی یہ شوق اپنا لیا۔ اسی شوق کی بدولت بعد ازاں وہ نیاز فتح پوری' علامہ مشرقی اور برٹرنڈ رسل جیسے دانشوروں سے متعارف ہوئے اور ان کی سوچ کا دھارا بدلنے لگا' وہ انسانیت کے مذہب کی بات کرنے لگے اور محدود فکری راستوں سے انحراف کرتے ہوئے اشتراکی فلسفے کی شاہراہ پر چل نکلے۔

۱۹۳۳ء میں ایف اے کے بعد' انیس برس کی عمر میں اپنی ماں کی خواہش پر قربان ہونا پڑا جب شریف کو شادی کے بندھن میں باندھ دیا گیا۔ اخراجات بڑھے تو نوکری کی فکر ہوئی مگر خفیہ والوں کے ریکارڈ میں آپ احرار اور کانگریس سے وابستہ سمجھے جانے کی وجہ سے سرکاری نوکری نہ مل سکی۔ دوسری جنگِ عظیم میں فرسٹ انفنٹری بریگیڈ میں اپر ڈویژن کلرک بھرتی ہو کر ایبٹ آباد چلے گئے لیکن خفیہ والوں کی رپورٹ آنے پر نوکری سے فارغ کر دیے گئے۔ ایبٹ آباد سے ہی حفیظ جالندھری کو خط لکھا اور اپنے حالات سے آگاہ کیا وہ دہلی میں سانگ پبلسٹی آرگنائزر (جنگی ترانوں کے پرموٹر)

کے طور پر تعینات تھے' انھوں نے اپنے شعبے میں شریف کی جگہ بنائی مگر یہاں بھی خفیہ والوں کی نظر میں آنے کی وجہ سے نوکری جاتی رہی۔ پھر اسلامیہ ہائی سکول گجرات کی پرائمری برانچ میں ملازم ہو گئے۔ اگلے سال منشی فاضل اور ایک سال بعد (۱۹۴۱ء میں) بی اے کیا۔ بی ٹی کرنا چاہتے تھے لیکن داخلے کے لیے ان کا خاندان اخراجات برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ ان کی وفا شعار بیوی نے اپنے زیور بیچ کر انھیں سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور میں بی ٹی میں داخل کروا دیا۔ یہیں معروف پنجابی ادیب اور براڈ کاسٹر سجاد حیدر سے ان کی ملاقات ہوئی جنھوں نے شریف کو آل انڈیا ریڈیو لاہور میں چھوٹی موٹی پارٹ ٹائم ملازمت دلوا دی جس سے تعلیمی اخراجات پورے ہونے لگے۔ شریف کی پہلی نثری تحریر میاں محمد بخش اور ان کی سیف الملوک کے بارے میں تھی جو آل انڈیا ریڈیو لاہور سے پیش کی گئی اور اسے پسند کیا گیا۔ لاہور میں ہی ان کے تعلقات عبدالسلام خورشید' ساحر لدھیانوی' یوسف ظفر اور وحید قریشی سے تعلق استوار ہوئے۔ چودھری برکت علی انھیں اپنے

رسالے ادبِ لطیف کی ادارتی مجلس میں شامل کرنا چاہتے تھے لیکن شریف کنجاہ سے باہر اور اپنے خاندان سے دور نہیں رہنا چاہتے تھے۔

۱۹۴۳ء میں بی ٹی پاس کیا۔ ۱۹۴۴ء میں اسلامیہ ہائی سکول کنجاہ میں بطور سینئر انگلش ٹیچر اپنی ملازمت کا آغاز کیا۔ چار سال یہاں پڑھانے کے بعد ۱۹۵۱ء میں اسلامیہ ہائی سکول شادیوال اور ۱۹۵۲ء میں پبلک ہائی سکول کنجاہ میں تدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔ یہ سب پرائیویٹ سکول تھے جن کی نوکری سے شریف نے تنگ آ کر استعفیٰ دے دیا اور ۱۹۵۳ء میں گورنمنٹ ہائی سکول پھالیہ میں تعینات ہوئے جہاں ۱۹۵۷ء تک پڑھاتے رہے۔ اسی دوران انھوں نے اپنا تعلیمی معیار بلند کرنے کے خواب کو تعبیر کا روپ دینے کے لیے کوشش جاری رکھی اور ۱۹۵۴ء میں اردو میں اور ۱۹۵۶ء میں فارسی میں ایم اے کے امتحانات نجی حیثیت میں پاس کر لیے۔ اب وہ اپنے تعلیمی معیار کے اعتبار سے اس قابل تھے کہ کالج میں پڑھا سکیں چناں چہ ۱۹۵۷ء تا ۱۹۵۸ء گورنمنٹ کالج سیٹلائٹ ٹاؤن راولپنڈی میں عارضی طور پر لیکچرار اردو کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے۔ ۱۹۵۸ء میں گورنمنٹ ہائی سکول خوشاب میں پڑھایا اور ۱۹۵۹ء میں لیکچرار فارسی کے طور پر مستقل ملازمت اختیار کی' پہلی تعیناتی گورنمنٹ کالج اٹک میں ہوئی' ۱۹۶۲ء میں گورنمنٹ کالج گوجر خان آ گئے اور ۱۹۶۷ء میں گورنمنٹ کالج جہلم تبادلہ ہوا۔ اس دور کے قانون کے مطابق ریٹائرمنٹ کی عمر ۵۶ برس تھی چناں چہ انھیں ۱۹۷۱ء میں ریٹائر ہونا تھا لیکن ایک قدر دان کی مہربانی سے انھیں مدتِ ملازمت میں دو سال کی توسیع مل گئی اور وہ ۱۹۷۳ء تک گورنمنٹ کالج جہلم میں رہے۔ اس دوران ۱۹۷۱ء میں چند ماہ لالہ موسیٰ اور تلہ گنگ میں بھی تعینات رہے۔ ۱۹۷۳ء میں انھوں نے ڈاکٹر وحید قریشی کی تجویز پر اورینٹل کالج لاہور کے نئے قائم شدہ شعبہ پنجابی میں بطور اسسٹنٹ پروفیسر جانا قبول کیا۔ سرکاری طور پر ریٹائرمنٹ کی عمر اب ساٹھ برس ہو گئی تھی چناں چہ وہ ۱۹۷۵ء میں سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہو گئے مگر کوئی مناسب متبادل نہ ہونے کی وجہ سے ۱۹۸۰ء تک شعبہ پنجابی میں خدمات انجام دیتے رہے۔ یوں انھوں نے پندرہ برس مختلف سکولوں' چودہ برس مختلف کالجوں اور سات برس یونیورسٹی میں کم و بیش چھتیس برس تدریسی خدمات انجام دیں اور نسلِ نو کو تعلیم و تربیت فراہم کرنے اور انھیں شعور کی دولت عطا کرنے میں اپنا خون پسینہ ایک کیا۔ انھوں نے نہ صرف تعلیمی و تدریسی خدمات انجام دیں بلکہ علمی

و ادبی میدانوں میں روشنی کا منبع بنے رہے۔ وہ ایک استاد کی حیثیت سے ہی نہیں بلکہ ایک شاعر و ادیب اور سب سے بڑھ کر ایک انسان کے روپ میں نئی نسل کے لیے رول ماڈل کی حیثیت رکھتے تھے۔ وہ سزا اور جذباتیت پر یقین نہیں رکھتے تھے بلکہ پیار اور طالب علموں کے رویوں کو سمجھ کر انھیں مناسب راہنمائی فراہم کرتے تھے۔ وسیع مطالعے اور اپنی تاریخ و ثقافت سے گہری آشنائی نے انھیں ایک مثالی استاد بنا دیا تھا۔ وہ اپنی دھیمی طبیعت اور روادری کے لیے جانے جاتے تھے۔ وہ جہاں بھی تعینات رہے، اپنے شاگردوں اور رفقاءِ کار میں مقبول رہے اور اس شہر کی تعلیمی، ادبی اور سماجی زندگی میں انمٹ نقوش چھوڑے۔

۱۹۸۱ء میں جب ڈاکٹر وحید قریشی مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد کے صدر نشین بنے تو انھوں نے شریف صاحب کو ماہنامہ 'اخبارِ اردو' کی ذمہ داری سونپ دی جہاں وہ ۱۹۸۸ء تک خدمات انجام دیتے رہے۔ اسی دوران انھوں نے بابا فرید کے کلام اور ہیر وارث شاہ کو اردو میں ترجمہ کیا۔ شریف صاحب کے خطباتِ اقبال کے آسان اردو ترجمہ کو بھی بزم اقبال نے شایع کیا۔ اس کے بعد گجرات چلے گئے اور تا عمر تصنیف و تالیف میں مصروف رہے۔ ان کی علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں انھیں حکومتِ پاکستان نے تمغۂ امتیاز اور صدارتی تمغہ برائے حسنِ کارکردگی سے بھی نوازا۔ شریف النفس اور کریم الطبع محمد شریف نے ۲۰ رجنوری ۲۰۰۷ء کو داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور اپنے آبائی قصبے کنجاہ میں غنیمت کنجاہی کے مقبرے میں آسودۂ خاک ہوئے۔

سنٹرل ٹریننگ کالج میں شریف صاحب کے ایک استاد آر آر مکریا سائیکالوجی پڑھاتے تھے، انھوں نے شریف کی سائیکالوجی میں دلچسپی اور مطالعہ دیکھتے ہوئے انھیں سائیکالوجی سٹڈی سرکل کا سیکرٹری بنا دیا جس میں فرائڈ، مارکس اور ایڈلر وغیرہ کی کتب پڑھی جاتی تھیں، یوں ان کا تعارف ان شخصیات سے ہوا۔ وہ ایڈلر سے بہت متاثر ہوئے اور کالج کی لائبریری میں موجود ایڈلر کی تمام کتابیں پڑھ ڈالیں جن میں What Life Should mean to You اور Social Interest: A Change to Mankind انھیں خاص طور پر بہت پسند آئیں۔ انھیں کتابوں نے ان کی سوچ اور عمل کے دھارے کا رخ موڑ دیا۔ اسی دور میں ان کا تعارف ترقی پسند تحریک کا آغاز کرنے والے شعراء و ادباء سے ہوا تو وہ فکری طور پر اس کے ساتھ وابستہ ہو گئے، وہ جیلانی کامران، احمد ندیم قاسمی،

فیض احمد فیض اور دیگر ترقی پسندوں سے متعارف ہوئے۔ پھر وہ پریت لڑی کے لیے لکھنے لگے اور ان کی نظمیں گورمکھی میں چھپنے لگیں۔ وہ پنجابی اور اردو آزاد نظم کے بانیوں میں سے ہیں۔ انھی نظموں میں ان کی مشہور نظم ''سرینڈر'' تھی جسے اوپندر ناتھ اشک نے ''پسپائی'' کے نام سے شایع کیا اور جسے میرا جی نے ۱۹۴۱ء کی منتخب شاعری میں شامل کیا۔ اسی نظم کو فراق گورکھپوری نے ایک اور انتخاب میں شامل کرتے ہوئے شریف صاحب کے فکر و فن کو یوں خراج پیش کیا ہے؛

> ''شریف کنجاہی کی نظم سنئے عنوان ہے ''پسپائی''۔ آزاد نظم کی ایک مثال، مصرعے کہیں چھوٹے کہیں بڑے، ردیف قافیہ سے بھی یہ نظم آزاد ہے، تشبیہیں اور استعارے بھی صرف نئے نہیں ہیں بلکہ پرانے شاعروں کو تو جانے دیجئے، آج کے وہ شاعر بھی جن کی عمریں ادھیڑ ہو چلی ہیں، یہ انداز بیان سوچ ہی نہیں سکتے تھے۔ شعور اور تحت الشعور، خیالات کی پرچھائیاں ایک دوسرے کو کاٹتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ یہ نفسیاتی اور ڈرامائی خود گویائی یا مکالمے اردو شاعری میں نئی چیز ہیں۔ نئی اردو شاعری کی روپ ریکھا، اس کے خدوخال اور اس کی نوک پلک کی تیاری میں ایسی نظموں کا خاص حصہ ہے۔''

شریف کنجاہی نے ایک بھرپور زندگی گزاری مگر جنگِ عظیم دوم اور تقسیم ہند کے واقعات نے ان کے قلب و ذہن کو شدید متاثر کیا۔ ان کے بہت سے دوست بچھڑ کر بھارت چلے گئے اور آنے جانے والے مہاجرین سے ہونے والے سلوک نے بھی انھیں بے حد آزردہ کیا۔ ان کی شاعری کا معتد بہ حصہ اسی پس منظر میں لکھا گیا ہے۔

انھوں نے عمر بھر قلم سے رشتہ استوار رکھا، ان کی مصنفہ، مرتبہ اور مترجمہ کتب کی تفصیل نیچے درج کی جا رہی ہے جس سے ان کی ہمہ جہت ادبی صلاحیتوں کی عکاسی ہوتی ہے۔ شریف نے میٹرک کے بعد شعر لکھنا شروع کر دیا تھا لیکن ان کی اولین مطبوعہ کتاب برٹرینڈ رسل کی کتاب Road to Freedom کا اردو ترجمہ تھا جو ''آزادی کی راہیں'' کے نام سے نیا ادارہ، لاہور نے ۱۹۳۹ء میں شایع کیا۔ ان کی دوسری کتاب بھی ترجمہ تھی جو پرنس کروپاٹکن کی کتاب Conquest of Bread کے ہندی ترجمے کا اردو ترجمہ تھا۔ اسے ''آزاد سماج'' کے عنوان سے پریت نگر ضلع امرتسر کے سردار گوربخش سنگھ نے ماڈرن پبلشرز کی جانب سے مرکنٹائل پریس، لاہور سے چھپوا کر مئی ۱۹۴۱ء میں شایع کیا۔ ۱۹۵۳ء میں چھپنے والی ان کی تیسری کتاب بھی ایک انگریزی

کتاب کا اردو ترجمہ تھی جسے پنجاب بک ڈپو سرکلر روڈ لاہور نے ''ہمارا جسم'' کے نام سے طبع کیا تھا۔
یہ تینوں کتابیں 'قلم کی مزدوری' تھیں جو اس دور میں شریف کے حالات کا تقاضا تھا۔

''جھاتیاں'' شریف کنجاہی کی اولین تنقیدی کتاب تھی جو پندرہ پنجابی مضامین کا مجموعہ تھا اور جسے الجدید' انارکلی' لاہور نے ۱۹۶۰ء میں طباعت کا روپ دیا تھا۔ اس کتاب نے شریف کو پنجابی زبان کے اولین نقادوں میں شامل کر دیا تھا۔ شریف کنجاہی مرحوم کا پہلا اور بنیادی تعارف ایک شاعر کا تھا اور انھوں نے ہمیشہ اسی تعارف کو اپنا فخر جانا۔ ان کی پنجابی نظموں کا اولین اور رجحان ساز مجموعہ ساٹھ کی دہائی کے شروع میں ''جگراتے'' کے نام سے گورمکھی میں شایع ہوا۔ اردو رسم الخط میں اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۶۵ء میں گجرات سے انھوں نے خود چھپوایا تھا۔ اس کے بعد انھوں نے طویل عرصہ اپنی شاعری کی اشاعت کی طرف توجہ نہیں دی۔ ۱۹۹۲ء تا ۱۹۹۵ء ان کے درج ذیل مجموعے شایع ہوئے:

- ستارۂ سحری: لاہور' راوی پبلشرز: ۱۹۹۲ء: ۱۶۰ص (اردو نظمیں)
- سورج، سوچ اور سائے: لاہور' الحمد پبلی کیشنز: اگست ۱۹۹۴ء: ۱۵۹ص (اردو شعری مجموعہ)
- لمحوں کا صحرا: لاہور' الحمد پبلی کیشنز: نومبر ۱۹۹۵ء: ۱۵۲ص (اردو شعری مجموعہ)
- اوڑک ہوندی لو: لاہور' پولیمر پبلیکیشنز: ۱۹۹۵ء: ۱۶۴ص (پنجابی مجموعہ: ترتیب ڈاکٹر اسلم رانا)
- دودِل: گجرات' چناب اکیڈمی:: ۱۹۹۷ء: ۱۱۴ص (فارسی شعری مجموعہ)

اورینٹل کالج کے زمانے میں انھیں ڈاکٹر وحید قریشی نے دوبارہ ترجمے کی طرف راغب کیا اور یکے بعد دیگرے ان کے درج ذیل تراجم شایع ہوئے۔ ترجمے میں شریف صاحب کو کمال حاصل تھا' انھوں نے انگریزی سے اردو' فارسی سے اردو' پنجابی سے اردو اور عربی سے پنجابی تراجم کیے اور اپنی مہارت کا لوہا منوایا۔

- جاوید نامہ (منظوم پنجابی ترجمہ): لاہور' مجلس ترقی ادب' کلب روڈ: جنوری ۱۹۷۷ء: ۲۱۶ص
- خطبات اقبال (پنجابی روپ): لاہور' مجلس ترقی ادب: ۱۹۷۷ء: ۳۷۴ص
- علم الاقتصاد (پنجابی ترجمہ): لاہور' بزم اقبال: ۱۹۷۸ء: ۲۹۸ص

(علامہ اقبال کی کتاب ''علم الاقتصاد'' [مطبوعہ ۱۹۰۳ء] کا پنجابی ترجمہ)

- کہے فرید: اسلام آباد' لوک ورثے کا قومی ادارہ: ۱۹۷۸ء: ۱۸۰ص

(بابا فرید گنج شکر کے پنجابی اشلوکوں کا منظوم اردو ترجمہ' حالات زندگی اور کلام پر تبصرہ)

- پنجسورہ پنجابی: گجرات' زمیندار ایجوکیشنل ایسوسی ایشن: [نقوش پریس' لاہور] ۱۹۸۰ء: ۱۲۰ص

(سورہ علق' سورہ مدثر' سورہ مزمل' سورہ واقعہ اور سورہ یٰسین کا آزاد نظم میں پنجابی ترجمہ)

- پنجابی شاعری سے انتخاب: اسلام آباد' اکادمی ادبیات: ۱۹۸۳ء: ۴۱۶ص (مع منظوم اردو ترجمہ)
- نبی پاک دے خطبے: لاہور' اسلامک بک فاؤنڈیشن: ۱۹۸۷ء: ۲۱۲ص
- ہیر وارث شاہ: اسلام آباد' اکادمی ادبیاتِ پاکستان: ۱۹۹۲ء: دو جلدوں میں (نثری اردو ترجمہ)
- مذہبی افکار کی تعمیر نو: لاہور' بزم اقبال: ۱۹۹۲ء: ۲۲۴ص (اقبال کے انگریزی خطبات The Reconstruction of Religious Thoughts in Islam کا آسان اردو ترجمہ)
- گلشن راز: لاہور' اقبال اکادمی: ۱۹۹۶ء: ۱۶۷ص (محمود شبستری کی فارسی مثنوی کا منظوم اردو ترجمہ)
- گلشن راز جدید: لاہور' اقبال اکادمی: ۱۹۹۶ء: ۳۶ص (اقبال کی فارسی مثنوی کا منظوم اردو ترجمہ)
- ابیاتِ فرید (اردو ترجمہ): اسلام آباد' اکادمی ادبیاتِ پاکستان: ۲۰۰۶ء: ۱۴۵ص

پاکستان میں پنجابی سے پنجابی کی پہلی مکمل لغت مرتب کرنے کا اعزاز بھی شریف صاحب کے حصے میں آیا۔ ان کی یہ لغت ''مختصر پنجابی لغت'' کے عنوان سے شعبہ پنجابی' اورینٹل کالج' لاہور نے ۱۹۸۱ء میں شایع کی۔ تحقیق اگرچہ شریف صاحب کا اصل میدان نہیں تھا لیکن انھوں نے ''حضرت شاہ دولہ دریائی گجراتی: حیات و تعلیمات'' کے نام سے کتاب لکھ کر محققین میں بھی اپنا نام لکھوایا۔ یہ کتاب' مرکز معارفِ اولیاء، محکمہ اوقاف پنجاب نے جون ۱۹۸۵ء میں شایع کی تھی۔ اس کے پہلا حصہ مؤلف کی تحریروں پر مشتمل ہے جبکہ دوسرا حصہ شاہ دولہ کے بارے میں دیگر

حضرات کی تحریروں پر مبنی ہے۔اسی طرح انھوں نے لسانیات کے شعبے میں پنجابی اور سکینڈے نیوین ممالک کی زبانوں کے درمیان تعلق اور مشترک الفاظ کے موضوع پر ۱۹۹۱ء میں ایک کتاب شایع کی جس کا عنوان ہے؛

Panjab Scandinavian Language Contact

ترقی پسند ذہن رکھنے والے شریف صاحب آخری عمر میں مذہب کی طرف مائل ہو گئے تھے اور ان کا ایک اور یادگار کارنامہ قرآنِ حکیم کا آزاد پنجابی نظم میں ترجمہ ہے جسے پنجابی فاؤنڈیشن لاہور نے ۱۹۹۶ء میں دو جلدوں میں طبع کیا۔ان کی دیگر کتابوں میں درج ذیل شامل ہیں جن کے متنوع موضوعات ان کی وسعتِ مطالعہ اور عمیق نظری کا پتا دیتے ہیں؛

- تاریخ گجرات اور لفظوں کی عینک: گجرات' المیر ٹرسٹ لائبریری و مرکز تحقیق و تالیف: نومبر ۲۰۰۰ء: ۱۷۸ص (گجرات کے مختلف مقامات کے ناموں کا لسانی و تاریخی جائزہ)
- سوالات شاہ ملندہ: اسلام آباد' مقتدرہ قومی زبان: ۲۰۰۳ء: ۴۶۵ص (یونانی بادشاہ کی دانش)
- رگ وید: اک جھات: گجرات' المیر ٹرسٹ لائبریری و مرکز تحقیق و تالیف: ۲۰۰۴ء: ۲۲۴ص
- جپ جی (گورو گرنتھ صاحب) اک جھات: گجرات' المیر ٹرسٹ لائبریری و مرکز تحقیق و تالیف: ۲۰۰۵ء: ۱۴۸ص (اردو و پنجابی ترجمہ)
- ساہواں داویزا: گجرات' المیر ٹرسٹ لائبریری و مرکز تحقیق و تالیف: ۲۰۰ء: ۳۶۸ص (خودنوشت' یادداشتیں [پنجابی])
- کلامِ اقبال اور شریف کنجاہی: گجرات' المیر ٹرسٹ لائبریری و مرکزِ تحقیق و تالیف: ۲۹ر جنوری ۲۰۱۲ء: ۱۴۰ص (کلامِ اقبال پر شریف کنجاہی کے مضامین۔مرتبہ: صبح میر)
- مضامین شریف کنجاہی: گجرات' المیر ٹرسٹ لائبریری و مرکزِ تحقیق و تالیف: ۱۳ر اکتوبر ۲۰۱۳ء: ۱۶۰ص (شریف کنجاہی مرحوم کے متفرق مضامین۔مرتبہ: صبح میر)

شریف کنجاہی کے فکر و فن پر لکھی ہوئی کتابیں:

- ویرتوں کنجاہ دا ایں: لاہور' سنگت پبلشرز: مارچ ۱۹۹۹ء: ۱۴۱ص (طویل انٹرویو شریف کنجاہی از پروفیسر خالد ہمایوں)

- شریف کنجاہی کی پرورشِ لوح و قلم: گجرات' المیر ٹرسٹ لائبریری و مرکزِ تحقیق و تالیف: ۲۰۰۱ء: ۴۷۸ص (از پروفیسر حامد حسن سیّد)
- شریف کنجاہی: انکار سے اقرار تک: گجرات' المیر ٹرسٹ لائبریری و مرکز تحقیق و تالیف: ۲۰۰۵ء: ۲۰۸ص (طویل انٹرویو' منتخب کلام اور مختلف ادباء کی آراء۔از غفور اسلم)
- شریف کنجاہی: شخصیت اور فن: اسلام آباد' اکادمی ادبیاتِ پاکستان: ۲۰۰۶ء: زاہد حسن: ۱۶۴ صفحات
- اجالے اُن کی یادوں کے: گجرات' المیر ٹرسٹ لائبریری و مرکزِ تحقیق و تالیف: مئی ۲۰۰۷ء: ۲۲۸ص (احسان فیصل کنجاہی با شتراک رستم عباس میر و فصیح اللہ جرال۔شریف کنجاہی کی وفات پر لکھے گئے مضامین' اخباری تراشے اور ان کے حضور منظوم خراجِ عقیدت کی جمع آوری)
- پاسبانِ فکر: گجرات' مرتب خود: ستمبر ۲۰۰۷ء: ۲۰۰ص (شریف کنجاہی مرحوم کے بارے میں مختلف افراد کے ۲۴ مضامین اور ۲۴ منظوم خراجِ عقیدت کا مجموعہ۔مرتبہ سیّد غلام مجتبیٰ شاہ)
- شریف کنجاہی کے مضباچے: گجرات' المیر ٹرسٹ لائبریری و مرکزِ تحقیق و تالیف: ۲۰۰۸ء: ۲۹۰ص (اپنی اور دوسروں کی کتابوں کے دیباچے' تاثرات' مضامین۔مرتبہ احسان فیصل کنجاہی)
- شریف کنجاہی: کچھ یادیں کچھ باتیں: کنجاہ ضلع گجرات' کامرانیاں پبلی کیشنز: مارچ ۲۰۱۴ء: ۱۲۶+۳۴ [تصاویر] صفحات (مرتبہ احسان فیصل کنجاہی)
- شریف کنجاہی کے خطوط: مرتبہ احسان فیصل کنجاہی و فصیح اللہ جرال: گجرات: ۲۰۱۸ء:

پروفیسر شوکت سبزواری

ڈاکٹر رؤف پاریکھ

اردو میں یہ عجیب رواج ہے کہ جو شخص چند الفاظ کے استعمال یا تلفظ و مفہوم پر یا لغت پر چند مضامین لکھ لے وہ خود کو بالالتزام ''ماہرِ لسانیات'' لکھتا، لکھواتا اور کہلواتا ہے۔ یہ سب لسانیات کا حصہ ضرور ہیں لیکن چھوٹا سا۔ اصل لسانیات تو تشریحی لسانیات اور صوتیات ہے۔

ہمارے ہاں چند ہی لوگ تھے جو صحیح معنوں میں ''ماہر لسانیات'' تھے اور انھوں نے تاریخی وتشریحی لسانیات کا باقاعدہ مطالعہ کیا تھا یا تربیت لی تھی۔ ان میں سید محی الدین قادری زور، مسعود حسین خان، شوکت سبزواری اور گیان چند جین وغیرہ شامل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے پیش کیے ہوئے لسانیاتی نظریات کارآمد بھی ثابت ہوئے اور ان پر وقت کی دھول بھی نہیں پڑی ورنہ لسانیات کے نام پر لکھا گیا بہت سا رطب و یابس وقت کی آندھی اڑا لے گئی۔ انہی چند لوگوں کی وجہ سے برعظیم پاک و ہند کی تمام زبانوں میں لسانی و لسانیاتی تحقیق کے میدان میں اردو سب سے آگے تھی۔ افسوس کہ آزادی کے بعد ہمارے ہاں لسانیات کی تعلیم کا خاطر خواہ انتظام نہیں کیا گیا اور یونی ورسٹیوں میں شعبہ ہائے اردو ہی کو لسانیات کی تدریس کی ذمے داری دے دی گئی جن کی سربراہی کوئی ادبی شخصیت یا ادب کا عالم کر رہا ہوتا ہے جبکہ لسانیات ایک الگ علم ہے اور موجودہ دور میں اسے ''زبان کا سائنسی مطالعہ'' سمجھا جاتا ہے۔ ہندوستان میں آزادی کے فوراً بعد اس طرف توجہ دی گئی اور وہاں کئی ادارے خالصتاً لسانیات (جو کہ ایک سائنسی علم ہے) کی تعلیم کے قائم کیے گئے اور ہمارے ہاں ''پنجاب میں اردو'' اور ''دکن میں اردو'' جیسے غلط نظریات کو لسانیات کی معراج سمجھ لیا گیا۔ آج پاکستان کی صرف چند سرکاری یونی ورسٹیوں میں لسانیات کا باقاعدہ

شعبہ قائم ہے۔ باقی جامعات میں شعبۂ اردو یا شعبۂ انگریزی ''لسانیات'' کے ذمے دار ہیں۔ اردو والے لسانیات کو الفاظ کے درست استعمال تک یا ''اردو زبان کے آغاز کے نظریات'' تک محدود سمجھتے ہیں اور انگریزی والے ایم اے انگریزی اور ایم اے لسانیات کے نام پر تدریسِ انگریزی کے کورس پڑھا رہے ہیں جو کالجوں کے لیے انگریزی کے استاد پیدا کر سکتا ہے۔ وہاں اگر لسانیات پڑھائی بھی جاتی ہے تو انگریزی زبان کی حد تک، اردو کے مصوتوں (vowels) اور مصمتوں (consonants) تک سے انگریزی لسانیات کا طالب علم واقف نہیں ہوتا۔ ادھر ہندوستان میں خالص لسانیات اور ہندی لسانیات پر اتنا کام ہوا ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہم اردو والوں کو اس کی ہوا بھی نہیں لگی۔ لسانیات کا ذکر یوں نکل چلا ہے کہ شوکت سبزواری کا ذکر آ رہا ہے۔

پاکستان کے معدودے چند ماہرینِ لسانیات میں ڈاکٹر شوکت سبزواری بھی شامل تھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم اگرچہ مدرسے میں ہوئی تھی لیکن اسی نے ان میں زبانوں کے علم سے دل چسپی اور مہارت پیدا کر دی اور انھوں نے اردو زبان کی تاریخ سے متعلق بیش بہا تحقیقی کام کیا۔ لغت اور قواعد پر ان کی گہری نظر تھی۔ شوکت سبزواری ادبی تنقید کا بھی ایک اہم نام ہے۔

سید شوکت علی نام تھا لیکن شوکت سبزواری کے نام سے لکھا اور اسی نام سے معروف ہوئے۔ سبزواری کی وجہ تسمیہ یہ تھی کہ ان کے آباواجداد مغلیہ دور میں سبزوار (ایران) سے ہجرت کر کے برعظیم پاک و ہند آئے تھے اور بلند شہر کے قریب مرزا پور میں آباد ہوئے۔ بعد ازاں ان کے دادا سید نیاز علی مرزا پور سے میرٹھ منتقل ہو گئے۔ شوکت سبزواری کی تاریخِ پیدائش کے ضمن میں اختلاف ہے۔ مالک رام نے ''تذکرۂ معاصرین'' (جلد دوم) میں لکھا ہے کہ شوکت سبزواری کا سالِ پیدائش بالعموم ۱۹۰۸ء بتایا جاتا ہے لیکن ''قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ۱۹۰۶ء یا ۱۹۰۵ء میں میرٹھ میں پیدا ہوئے تھے'' (ص ۱۳۵)۔ البتہ مالک رام نے یہ نہیں بتایا کہ وہ ''قرائن'' کیا ہیں۔

شوکت سبزواری کے والد سید اسد علی نے اپنے بڑے بیٹے حشمت علی کو اسکول میں داخل کروایا لیکن وہ کئی سال تک میٹرک میں فیل ہونے کے بعد بیمار ہو کر انتقال کر گئے۔ اسد علی نے اسے بچے کو انگریزی پڑھوانے کا وبال سمجھا اور طے کیا کہ اب کسی بیٹے کو تعلیم نہیں دلوائیں گے۔ لہٰذا

شوکت سبزواری خاصے عرصے تک تعلیم سے دور رہے۔ بالآخر انھیں ایک استانی کے پاس قرآن شریف پڑھنے بٹھا دیا گیا۔ استانی صاحبہ نے انھیں اردو پڑھنا بھی سکھا دیا البتہ لکھنا نہیں سکھایا کیونکہ یہ ان کے مرحوم خاوند کی وصیت تھی۔ کم سن شوکت سبزواری نے خود ہی کسی طرح لکھنا شروع کیا اور چل نکلے۔ بقول مالک رام، بڑے بیٹے کو انگریزی پڑھوانے کے ''کفارے'' کے طور پر شوکت سبزواری کو والد نے میرٹھ کے مدرسہ بحرالعلوم میں داخل کرایا۔ اس مدرسے میں اس دور میں بعض معروف اور جید اساتذہ حدیث، فقہ، عربی، فارسی اور منطق پڑھاتے تھے۔ ان میں مولانا عبدالمومن دیوبندی بھی تھے جو شیخ الہند مولانا محمود الحسن کے سالے تھے اور حدیث اور فقہ میں ممتاز تھے۔ مولانا اختر شاہ عربی و فارسی ادب پڑھاتے تھے اور اردو، فارسی اور عربی میں شعر کہتے تھے۔ عربی فارسی کی مہارت، منطقی استدلال اور ادب کا صحیح ذوق شوکت سبزواری کو غالباً انہی اساتذہ کا عطیہ تھا۔ انھوں نے ۱۹۲۴ء میں مولوی فاضل اور ۱۹۲۷ء میں منشی فاضل کے امتحانات کامیاب کیے اور اپنے طور پر انگریزی بھی پڑھتے رہے۔ ۱۹۲۶ء میں دسویں بھی پاس کر لی تھی۔

شوکت سبزواری ۱۹۳۰ء میں مدرسۂ عالیہ، میرٹھ، میں فارسی اور اردو کے استاد مقرر ہو گئے۔ اسی دوران میں ایک آریہ سماجی ادارے کی طرف سے مدرسے میں کہلوایا گیا کہ ہم عیسائیوں اور مسلمانوں سے مناظرہ کرتے ہیں آپ لوگ بھی آیئے۔ لیکن مدرسے کے منتظمین مناظروں کو تضیعِ اوقات سمجھتے تھے اس لیے اس دعوت کو قبول نہیں کیا گیا۔ لیکن شوکت سبزواری نے اسے چیلنج سمجھ کر ذاتی طور پر قبول کر لیا۔ البتہ انھیں احساس ہوا کہ جب تک ہندی اور سنسکرت کا باقاعدہ مطالعہ نہ ہو آریہ سماجیوں سے مناظرہ کرنا مناسب نہیں۔ چنانچہ انھوں نے ایک پنڈت سے باقاعدہ سنسکرت کے سبق لیے اور ہنود کے مذہبی متون اِنھیں کی زبان میں مطالعہ کیے۔ اس طرح انھیں سنسکرت پر بھی اچھا خاصا عبور ہو گیا جو بعد میں لسانیاتی تحقیق اور بالخصوص اردو کے آغاز کے ضمن میں پراکرتوں کے کردار کے مطالعے میں ان کے بڑے کام آیا۔

اس مدرسے میں وہ ۱۹۴۱ء تک رہے اور اس عرصے میں پرائیویٹ طور پر انٹر، بی اے اور ایم اے (فارسی) کر لیا۔ ۱۹۳۷ء میں ایم اے فارسی کے بعد ۱۹۳۹ء میں ایم اے عربی کیا۔ مدرسے کی ملازمت جاری رکھتے ہوئے انھوں نے میرٹھ کالج سے ایل ایل بی میں اور اردو میں ایم اے بھی کر لیا۔ عربی، فارسی اور اردو میں ایم اے اور ایل ایل بی کے بعد شوکت سبزواری بریلی کے

اسلامیہ کالج میں ۱۹۴۳ء میں شعبۂ فارسی و اردو میں استاد مقرر ہوئے۔ قیامِ بریلی کے عرصے میں انھوں نے اپنی پہلی کتاب ''فلسفہ کلامِ غالب'' تحریر کی۔ یہ ۱۹۴۶ء میں پہلی بار بریلی ہی سے شائع ہوئی۔

مالک رام نے ''تذکرۂ معاصرین'' میں نجانے کیوں یہ لکھ دیا ہے کہ شوکت سبزواری کانگریس کے حامی اور ''قوم پرست'' (یعنی متحدہ ہندوستانی قومیت کے حامی) رہے۔ نیز یہ کہ وہ ہندوستان سے جانا نہیں چاہتے تھے لیکن ہندوستان میں اردو کے خلاف فضا دیکھ کر ان کو اندیشہ ہوا کہ میری نوکری جاتی رہے گی اور وہ ۱۹۵۰ء میں عندلیب شادانی کے بلانے پر ڈھاکا یونی ورسٹی چلے گئے (جلد دوم، ص ۱۴۰)۔ حالانکہ شوکت سبزواری ہمیشہ سے اسلامی ذہن کے حامل تھے اور پاکستان آنے کے بعد اسلامی ادب کی تحریک اور پاکستانی ادب کی تحریک کے بھی حامی رہے۔ ان کی کئی تحریروں سے ظاہر ہے کہ وہ اسلامی تعلیمات سے بہت متاثر تھے۔ مثلاً ان کی کتاب ''معیارِ ادب'' میں ان کا مضمون ''اسلامی ادب'' پڑھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ کانگریس کے حامی اور قیامِ پاکستان کے مخالف تھے۔ اس مضمون میں انھوں نے فراق گورکھ پوری کی اس تحریر پر شدید تنقید کی ہے جس میں فراق نے ہندوستان اور پاکستان کی مشترک تہذیب و تمدن اور اکھنڈ انسانیت کی بات کیتھی۔ ان کے کئی اور مضامین میں بھی یہ رنگ جھلکتا ہے۔ اسی کتاب میں شامل ان کے ایک مضمون کا عنوان ہے ''اقبال اور اسلام کے اولیں اصول''۔ مالک رام کی نظر سے یہ کتاب غالباً نہیں گزری تھی ورنہ وہ شوکت سبزواری کو کانگریس کا حامی کبھی نہ لکھتے۔

مالک رام نے اپنی مذکورہ بالا کتاب میں لکھا ہے کہ شوکت سبزواری ڈھاکا (مشرقی پاکستان) پہنچ کر وہاں یونی ورسٹی میں صدرِ شعبۂ اردو ہو گئے۔ یہ بھی درست نہیں ہے۔ شوکت سبزواری کے ایک شاگرد سید شکور عظیم نے ''نقوش'' (لاہور) کے شخصیات نمبر میں اپنے مضمون ''ڈاکٹر شوکت سبزواری'' میں لکھا ہے کہ شوکت صاحب وہاں شعبۂ اردو میں لیکچرر تھے (ص ۳۶۹)۔ خود شوکت سبزواری نے لکھا ہے کہ ان کے ڈھاکا یونی ورسٹی جانے سے پہلے بھی عندلیب شادانی وہاں ڈین فیکلٹی اوف آرٹس تھے اور ان کے جانے کے بعد بھی رہے (نقوش، شخصیات نمبر، ص ۳۶۳)۔ شادانی وہاں ڈین ہونے کے ساتھ ساتھ صدرِ شعبۂ اردو بھی تھے۔ نظیر صدیقی نے اپنی کتاب میں دو تین بار نشان دہی کی ہے کہ عندلیب شادانی ڈھاکا یونی ورسٹی میں صدرِ شعبۂ اردو

اور ڈین بھی تھے (ڈاکٹر عندلیب شادانی: ایک مطالعہ، ص ۱۲، ۴۶)۔ شوکت سبزواری کی کتاب ''اردو زبان کا ارتقا'' کے اندرونی سرورق پر ان کے نام کے ساتھ ''شعبۂ اردو و فارسی، ڈھاکا یونی ورسٹی'' لکھا ہے۔ گویا شوکت سبزواری ڈھاکا یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو و فارسی میں لیکچرر تھے اور مالک رام سے یہاں بھی تسامح ہوا ہے۔

شوکت سبزواری نے ڈھاکا یونی ورسٹی میں تدریس کے ساتھ پی ایچ ڈی کے مقالے پر کام شروع کیا جس کی تیاری وہ پہلے سے کر رہے تھے اور ۱۹۵۲ء میں انھیں ڈھاکا یونی ورسٹی کی جانب ان کے مقالے ''اردو زبان کا ارتقا'' پر یہ سند تفویض کی گئی۔ یہ مقالہ ڈھاکا سے ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا۔

جب ۱۹۵۸ء میں کراچی میں اردو لغت بورڈ قائم ہوا تو مدیر اعلیٰ بابائے اردو مولوی عبدالحق تھے۔ بعد میں ادارتی عملے میں جو لوگ بورڈ میں منتخب ہوئے ان میں شوکت سبزواری بھی تھے۔ چنانچہ وہ ڈھاکا یونی ورسٹی سے استعفا (درست املا استعفا ہی ہے، نہ کہ استعفیٰ) دے کر کراچی آ گئے اور بورڈ کے ادارتی عملے میں شامل ہو گئے۔ مالک رام سے یہاں پھر ایک غلطی ہوئی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ ۱۹۶۱ء میں مولوی عبدالحق کے انتقال کے بعد ''سارے کام کی ذمے داری شوکت صاحب کے کندھوں پر آ پڑی۔ وہ مدیر اعلیٰ بنا دیے گئے اور آخر تک اسی عہدے پر متمکن رہے''۔ حقیقت یہ ہے کہ شوکت سبزواری اردو لغت بورڈ (جس کا نام اس وقت ترقیٔ اردو بورڈ تھا) میں کبھی بھی مدیر اعلیٰ نہیں رہے۔ وہ ۱۹۶۴ء میں ''مدیر اول'' بنائے گئے۔ ثانیاً، کام کی ساری ذمے داری ان پر نہیں شان الحق حقی پر تھی جو بورڈ کے سیکرٹری تھے اور بابائے اردو کے بعد حقی صاحب استعفا دینے (۱۹۷۶ء) تک معتمد کی ذمے داریوں کے ساتھ عملاً بورڈ کے مدیر اعلیٰ کے فرائض بھی ادا کرتے رہے۔ ممتاز حسن صاحب بورڈ کے صدر تھے لیکن ظاہر ہے کہ ان کی سرکاری منصبی ذمے داریاں ان کے پابندی سے بورڈ کے دفتر آنے میں مانع تھیں۔ ممتاز حسن صاحب بورڈ کے دفتر آتے ضرور تھے لیکن بیشتر اختیارات اور اہم کارِ منصبی حقی صاحب کے ذمے تھے۔ حقی صاحب نے سترہ (۱۷) برس تک بلا معاوضہ بورڈ کی خدمت کی اور مجبوراً استعفا دیا۔ درحقیقت اگر بورڈ کو حقی صاحب جیسا دانش مند، ماہر زبان ولغت اور جان توڑ کر محنت کرنے والا نہ ملتا تو لغت کا یہ عظیم منصوبہ جلد ہی ٹھپ ہو جاتا۔

بے شک حقی صاحب کے ساتھ بڑی تعداد میں اہل علم اور اہل قلم نے بورڈ کے کاموں میں مدد کی اور شوکت سبزواری صاحب کے ذمے بنیادی طور پر لفظوں کا اشتقاق لکھنا تھا۔ سنسکرت اور پراکرت کے الفاظ اور ان کی تاریخ اور اشتقاق پر ان کی جیسی نظر تھی اس لحاظ سے یہ ان ہی کو سجتا تھا۔ بہرحال، شوکت سبزواری بورڈ میں مدیر اول تھے اور ۱۹۶۴ء سے اپنے انتقال (۱۹۷۳ء) تک مدیر اول کے منصب پر فائز رہے نہ کہ مدیر اعلیٰ کے عہدے پر۔ ان کے بعد ۱۹۷۵ء میں نسیم امروہوی اس عہدے پر فائز ہوئے۔ بورڈ کے نفس ناطقہ ''اردو نامہ'' کے شمارے اس کے گواہ ہیں اور بورڈ کی لغت کی جلدیں بھی۔ لغت کی ساتویں جلد سے ''مدیر اول، شوکت سبزواری (مرحوم)'' بورڈ کی لغت کی تمام جلدوں پر لکھا جا تا رہا ہے۔ اس کے بعد انھیں مدیر اعلیٰ لکھنے کا کیا جواز ہے؟ مالک رام نے یہ بھی لکھا ہے کہ ان کے انتقال تک لغت کی ایک بھی جلد منظرِ عام پر نہ آ سکی تھی لیکن ''آٹھ جلدیں مکمل ہو چکی تھیں''۔ یہ بات تو درست ہے کہ لغت کی پہلی جلد ۱۹۷۷ء میں یعنی شوکت سبزواری کے انتقال کے بعد ہی شائع ہوئی لیکن آٹھ جلدیں مکمل ہونے کی بات متنازع فیہ ہے اور اس بات کا کوئی حتمی ثبوت نہیں ہے کہ اس وقت تک کتنی جلدیں مکمل ہو چکی تھیں۔ نیز اشاعت کے وقت ''تیار'' جلدوں پر بھی تنقیح و تحقیق کے بعد خاصے اضافے اور ترامیم و تنسیخ ہوتی رہی لہٰذا ''مکمل'' کہنا بھی درست نہیں۔

شوکت سبزواری کی اصل شہرت ان کے لسانی کاموں کی بنا پر ہے۔ اس سلسلے میں ان کا پہلا کام ان کا پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے جو ''اردو زبان کا ارتقا'' کے عنوان سے ڈھاکا سے ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا۔ اس میں ان کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اردو مسلمانوں کی ساختہ نہ سہی پرداختہ ضرور ہے اور یہ سمجھنا درست نہیں کہ مسلمانوں کی ہندوستان آمد سے قبل اردو کا وجود ہی نہ تھا نیز یہ کہ یہ خیال بھی غلط ہے کہ اردو ہندوؤں اور مسلمانوں کے میل جول سے پیدا ہوئی۔ اردو اور برعظیم پاک و ہند کی کئی زبانوں کا تہذیبی اور ادبی سرمایہ مسلمانوں کا عطا کردہ ہے۔ ان کے اس مقالے سے بعض لوگوں کو مغالطہ ہوا کہ شوکت سبزواری اردو کی ابتدا پالی پراکرت سے جوڑ رہے ہیں اور پالی کو اردو کا منبع قرار دے رہے ہیں۔ لیکن یہ خیال درست نہیں تھا۔ تاریخی لسانیات کی بحثوں میں بالعموم سنسکرت کے بعد شورسینی پراکرت کا ذکر ہوتا تھا اور پھر بتایا جاتا تھا کہ یہ پراکرتیں ارتقا پا کر اپ بھرنش بن گئیں اور پھر ان سے مختلف زبانیں اور بولیاں مثلاً پنجابی، رجستھانی، برج بھاشا اور کھڑی

بولی وغیرہ بنیں۔ایک خیال یہ بھی تھا کہ اپ بھرنش کا ایک روپ مغربی ہندی تھی اور اس سے بولیاں نکلی تھیں مثلاً کھڑی بولی، ہریانی، قنوجی، بندیلی (بندیل کھنڈی) اور برج بھاشا وغیرہ اسی مغربی ہندی سے نکلی ہیں۔شوکت سبزواری نے اس مقالے میں ایک تو یہ خیال ظاہر کیا کہ مغربی ہندی کا کوئی وجود نہ تھا اور بقول ان کے ''یہ ایک طرح سے فرضی اور خیالی زبان ہے'' (ص ۸۲)۔ دوسرا یہ کہ انھوں نے لکھا کہ اردو کی صرفی اور نحوی خصوصیات سے اندازہ ہوتا ہے کہ ''اردو کا ماخذ شورسینی پراکرت یا اپ بھرنش نہیں'' (ص ۸۴)۔ان کا خیال تھا کہ اردو قدیم ویدک بولیوں میں سے ایک ہے۔ پالی بھی اسی کی ترقی یافتہ ادبی شکل ہے اور ''اردو اور پالی کا منبع ایک ہے'' (ص ۸۷)۔

اردو کی تاریخ پر اپنی دوسری کتاب ''داستان زبان اردو'' میں شوکت سبزواری صاحب نے اپنے ان لسانی نظریات کو واضح کیا جو اردو کی ابتدا سے متعلق تھے اور ان کی بنیاد تاریخی لسانیات کا گہرا مطالعہ اور سنسکرت سے واقفیت تھی۔اس میں انھوں نے نہ صرف بعض نظریات کو رد کیا جو اردو کے آغاز سے متعلق تھے بلکہ بڑی وضاحت سے اردو کا ماخذ بھی بتایا۔انھوں نے محمد حسین آزاد کے اس نظریے کو رد کر دیا کہ اردو برج بھاشا سے نکلی ہے، انھوں نے اس غلط خیال کو بھی مسترد کر دیا کہ اردو لشکری زبان ہے اور یہ مختلف زبانوں مثلاً پراکرت اور عربی فارسی وغیرہ کے ملنے سے بنی ہے۔ انھوں نے واضح کیا کہ دنیا کی کوئی زبان ایسی نہیں ہے جو دو یا زیادہ زبانوں سے مل کر بنی ہو کیونکہ کوئی زبان آس پاس کی بولیوں سے توانائی اور ذخیرۂ الفاظ تو لے سکتی ہے لیکن کسی اور زبان سے مل کر نئی زبان نہیں بن سکتی۔زبان کے بننے میں صدیاں لگتی ہیں اور کسی خاص بولی کے ارتقا کے بعد وہ زبان بنتی ہے گو اس کی اپنی صرفی اور نحوی خصوصیات بھی بڑی حد تک برقرار رہتی ہیں۔انھوں نے اس نظریے کی بھی دلائل کے ساتھ تردید کی کہ اردو پنجابی سے نکلی ہے (ملاحظہ ہو: داستان زبان اردو۔تیسرا اور چوتھا باب)۔

''داستان زبان اردو'' میں شوکت سبزواری لکھتے ہیں کہ اردو اس کھڑی بولی سے ارتقا پا کر بنی ہے جو گیارھویں اور بارھویں صدی عیسوی میں دہلی اور میرٹھ کے مضافات میں بولی جاتی تھی۔ ان کا خیال ہے کہ کھڑی بولی مسمانوں کی آمد سے قبل ہی بولی جاتی تھی البتہ مسلمانوں کی آمد کے بعد اس میں بڑی تبدیلیاں ہوئیں اور اس نے مختلف بولیوں اور زبانوں سے ذخیرۂ الفاظ لیا لیکن اس

کی بنیادی صرفی ونحوی خصوصیات وہی رہیں۔ان کا خیال ہے کہ اردو کے ارتقا میں سے مغربی ہندی کو نکال دینا چاہیے اور اردو اور پراکرت کی درمیانی کڑی اپ بھرنش ہے۔بعد میں گیان چند جین نے بھی شوکت سبزواری کے نظریے سے بڑی حد تک اتفاق کیا۔وہ بھی اردو کی ابتدا کھڑی بولی سے مانتے ہیں لیکن ان کا خیال ہے کہ کھڑی بولی کے آغاز کی منزل اور اس میں عربی فارسی الفاظ کے شمول کے مرحلے پر غور کرنا چاہیے۔اس ضمن میں مسعود حسین خان کا نظریہ کہ اردو دہلی اور اس کے مضافات کی بولیوں کی ترقی یافتہ شکل ہے بھی قابلِ غور ہے۔البتہ اس میں انھوں نے کچھ ترمیم بھی کی۔ پہلے مسعود صاحب کا خیال تھا دہلی کے نواح کی بولیوں بالخصوص ہریانی سے ارتقا پا کر اردو بنی ہے لیکن ۱۹۸۷ء کے بعد ان کا نظریہ تبدیل ہو گیا اور انھوں نے ہریانی کی بجائے کھڑی بولی کو ترجیح دے دی۔اس کی تفصیل مرزا خلیل بیگ نے اپنی کتاب اردو کی لسانی تشکیل میں دی ہے (ص ۴۵۔۴۴)۔گویا مسعود حسین خان جیسے ماہر لسانیات اور گیان چند جیسے عالم فاضل نے بھی اس امر کا اعتراف کیا کہ شوکت سبزواری کا نظریہ کہ اردو کھڑی بولی کی ترقی یافتہ شکل ہے، درست ہے۔مسعود صاحب جن کو اپنے مقالے میں (جس پر انھیں پی ایچ ڈی ملی تھی) کوئی چالیس برس کے بعد ترمیم کرنی پڑی۔اس نظریے کو سب سے پہلے شوکت سبزواری ہی نے پیش کیا تھا۔اس سے بڑا عملی خراجِ تحسین شوکت سبزواری کے لیے اور کیا ہوگا؟

شوکت سبزواری لسانیات پر ایک اور اہم کتاب ''اردو لسانیات'' ہے۔اس میں انھوں نے اردو کی اصل اور اس کی ابتدا اور اس کے ارتقا کے علاوہ اردو کی صرفی، نحوی اور صوتیاتی خصوصیات بھی تاریخی تناظر میں بیان کی ہیں۔اس میں انھوں اردو کی ہائیہ یعنی aspirated آوازوں پر بھی بحث کی ہے جو دو چشمی ھ سے لکھی جاتی ہیں۔انھوں نے بتایا ہے کہ یہ ہائیہ آوازیں اصل میں ایک صوتیہ یا ایک آواز ہیں اور ''گھر'' اور ''بھر'' جیسے الفاظ میں جو ہائیہ آوازیں ہیں ان کی بنا پر ان کا املا گ ھ ر اور ب ھ ر نہیں بلکہ گھ ر اور بھ ر ہے اور ان کو توڑ کر لکھتے وقت خیال کرنا چاہیے کہ یہ مخلوط صوتیے (phoneme) ہیں (ص ۵۷)۔لیکن افسوس کہ آج اس کتاب کی اشاعت کے پچاس سال بعد بھی ہمارے اسکولوں میں حروف توڑیئے'' اور ''حروف جوڑیئے'' پڑھاتے وقت ان ہائیہ آوازوں کا غلط املا بچوں کو پڑھایا جا رہا ہے حالانکہ اس طرح (یعنی گھ اور بھ کی بجائے گ ھ اور ب ھ) لکھنے سے ان الفاظ کا تلفظ گہرا اور بہر ہو جاتا ہے۔

''لسانی مسائل'' شوکت سبزواری کی وہ کتاب ہے جس میں لسانیات اور اردو زبان کی ساخت وخصوصیات پر اہم مضامین ملتے ہیں جن میں وہ دادِ تحقیق دیتے نظر آتے ہیں۔ مثلاً ایک مضمون میں لفظ ''باورچی'' کی اصل پر عالمانہ انداز میں روشنی ڈالتے ہیں۔

افسوس کہ اردو قواعد پر ان کی کتاب نامکمل رہ گئی اور اسی حالت میں چھپی۔ اگر یہ مکمل ہوتی تو شاید نئی اردو قواعد لکھے جانے کے لیے انقلابی محرک ثابت ہوتی کیونکہ اردو قواعد اب تبدیلیوں کی متقاضی ہے تاکہ فارسی اور عربی کی قواعد کے تتبع میں لکھی گئی روایتی اردو قواعد کو بہتر اور وقت سے ہم آہنگ بنایا جاسکے۔

شوکت سبزواری کی ادبی تنقید پر مبنی کتابوں میں سے ایک یعنی ''معیارِ ادب'' کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ ان کی دوسری کتاب ''نئی اور پرانی قدریں'' ہے۔ اس میں شامل بعض مضامین ادب کی ہیت اور موضوعات پر بھی ہیں اور ہمارے اکابر ادب پر بھی۔ ان میں سے اکبر، حالی اور اقبال پر لکھے گئے مضامین پڑھ کر شوکت سبزواری کے بارے میں مالک رام کی رائے کی مزید تردید ہوجاتی ہے۔

شوکت سبزواری کا کراچی میں ۱۹/مارچ ۱۹۷۳ء کو انتقال ہوا۔

حوالہ جات

اس مقالے کی تیاری میں ان کتب سے استفادہ کیا گیا:

سنجیدہ خاتون، بیسویں صدی (نصفِ اول) کے اردو مصنفین (دہلی: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ۲۰۰۸ء)۔

شکور عظیم، سید، ڈاکٹر شوکت سبزواری، مشمولہ نقوش (لاہور)، شخصیات نمبر۔

شوکت سبزواری، اردو زبان کا ارتقا (ڈھاکا: پاک کتاب گھر، ۱۹۵۶ء)۔

شوکت سبزواری، اردو لسانیات (کراچی: مکتبۂ تخلیق ادب، ۱۹۶۶ء)۔

شوکت سبزواری، داستان زبان اردو (کراچی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۸۷ء)، اشاعتِ ثانی۔

نظیر صدیقی، ڈاکٹر عندلیب شادانی: ایک مطالعہ (کراچی: مکتبۂ اسلوب، ۱۹۸۵ء)۔

مالک رام، تذکرۂ معاصرین، حصہ دوم (دہلی: مکتبۂ جامعہ، ۲۰۱۱ء)، اشاعتِ نو۔

پروفیسر ڈاکٹر محمد صدیق خاں شبلی

ڈاکٹر زینت افشاں

پروفیسر ڈاکٹر محمد صدیق خاں شبلی ۱۹۳۴ء میں مشرقی پنجاب کے شہر لدھیانہ میں پیدا ہوئے۔ والدِ گرامی کا نام غلام قادر، پیشہ تجارت اور پڑھے لکھے بالکل نہیں تھے۔ والدہ ماجدہ دینی تعلیمات سے شغف رکھتی تھیں۔ ڈاکٹر صاحب سے بڑے دو بھائی ہیں اور بہن نہیں ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے بقول ان کے خاندان میں تین چار پشتوں سے لڑکی پیدا نہیں ہوئی تاہم ان کی اپنی اولاد میں بیٹیاں بھی ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کی شادی ۴/اپریل ۱۹۶۴ء کو اپنے خاندان میں ہوئی۔ ۳۴ برس کی عمدہ رفاقت رہی اور ۱۹۹۸ء میں بیگم صاحبہ کا انتقال ہوا۔ اولاد میں چار بیٹیاں اور دو بیٹے شامل ہیں۔ والدہ کی خواہش کے مطابق ابتدائی تعلیم مدرسہ بوستان اسلام لدھیانہ میں حاصل کی۔ اسی مدرسے سے ۱۹۴۵ء میں پرائمری کا امتحان پاس کیا اور اسلامیہ سکول لدھیانہ میں داخل ہوگئے۔ چھٹی جماعت کے آغاز ہی میں پاکستان کے قیام کا اعلان ہوا تو آپ والدین کے ساتھ ہجرت کر کے پاکستان آگئے۔ اس وقت ڈاکٹر صاحب کی عمر ۱۳ برس تھی۔ لدھیانہ شہر چھوڑنے کا احوال ڈاکٹر صاحب نے یوں بیان کیا:

> ''میرے والد صاحب کو کہا گیا کہ آپ کو پاکستان جانا ہے تو میرے والد صاحب نے کہا کہ ہم لدھیانہ شہر کو کیسے چھوڑ سکتے ہیں۔ ہمارا سامان، آباؤ اجداد یہاں پر ہیں۔ لیکن مجبوراً ہمیں لدھیانہ شہر کو چھوڑنا پڑا۔ یہاں پر ہم لوگ کیمپ میں آگئے۔

کیمپ میں کچھ دن بیٹھے رہے۔کیمپ سے گاڑی میں سوار ہونا تھا۔اس وقت گاڑی میں سوار ہونا بڑا مشکل کام تھا۔کچھ دیر کے بعد ہم تین بھائی اور ماں باپ' کل پانچ افراد گاڑی میں کافی جدوجہد کے بعد سوار ہوگئے۔''

(محمد طارق؛ ڈاکٹر محمد صدیق خاں شبلی: احوال و آثار (مقالہ برائے ایم اے اردو)؛ شعبہ اردو، اسلامیہ یونی ورسٹی، بہاولپور، ۲۰۰۰ء؛ ص ۶۔۷)

ہجرت کے فوراً بعد ڈاکٹر صاحب کا خاندان پہلے گجرات اور اس کے فوراً بعد فیصل آباد منتقل ہوا۔ قیامِ پاکستان کے بعد اسلامیہ ہائی سکول لدھیانہ، پاکستان ماڈل سکول کے نام سے فیصل آباد شہر میں قائم ہوا۔ ڈاکٹر صاحب نے اس سکول میں داخلہ لے لیا اور ۱۹۵۲ء میں اچھے نمبروں کے ساتھ میٹرک پاس کر لیا۔ اتنے زیادہ بیمار ہوئے کہ ایک برس سے زیادہ عرصہ تعلیم کا سلسلہ معطل رہا۔ ۱۹۵۴ء میں انٹر پاس کرنے کے بعد پھر شدید علیل ہوگئے۔ ۱۹۵۷ء میں اسی کالج میں بی اے میں داخلہ لیا۔ عربی، سیاسیات اور انگریزی کے ساتھ بی اے کر لیا۔ بعد ازاں منشی فاضل اور اردو فاضل کے امتحانات اچھے نمبروں سے پاس کیے۔ عربی میں آنرز کی ڈگری بھی حاصل کی۔

ڈاکٹر صاحب نے ۱۹۵۷ء میں ایک اور ہجرت کرتے ہوئے کوئٹہ منتقل ہوئے اور ایک دوست کے پاس قیام کے دوران اپنا علاج کرایا۔ ساتھ ہی گورنمنٹ سکول کوئٹہ میں عارضی طور پر انگریزی کے استاد مقرر ہوئے۔ آپ نے درس و تدریس کے ساتھ ساتھ اپنی تعلیمی قابلیت پر بھی توجہ مرکوز رکھی اور ۱۹۵۹ء ہندو باغ کوئٹہ سے بی ایڈ کا امتحان پاس کیا۔ اب مزید تعلیم حاصل کرنے کے شوق کے ہاتھوں مجبور ہو کر پھر ہجرت کی اور اگلا پڑاؤ لاہور میں ڈالا۔ اورینٹل کالج لاہور میں باقاعدہ داخلہ لیا اور ۱۹۶۱ء میں اردو جب کہ ۱۹۶۲ء میں فارسی میں ایم اے کیا۔ ۱۹۶۳ء میں میونسپل کالج فیصل آباد میں لیکچرار اردو مقرر ہوئے۔

ڈاکٹر صاحب پی ایچ ڈی کرنے کے لیے پاکستان کی مختلف جامعات سے رجوع کرتے رہے مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ ۱۹۶۵ء میں آر سی ڈی سکالرشپ حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے اور اسی سال تہران یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی میں داخلہ لے لیا۔ انہوں نے ۱۹۶۷ء میں ''اردو کی تشکیل میں فارسی کا حصّہ'' کے موضوع پر فارسی زبان میں مقالہ لکھ کر پی ایچ کی ڈگری

حاصل کی۔ پی ایچ ڈی کی تکمیل کے فوراً بعد وطن واپس آ گئے۔ ۱۹۷۰ء میں ایک اور ہجرت کی اور اسلام آباد منتقل ہوئے۔ یہ ہجرت ان کی کم و بیش آخری ہجرت ہے کیوں وہ تا حال اسلام آباد ہی میں مقیم ہیں۔

۱۹۷۰ء میں فیڈرل کالج اسلام آباد میں لیکچرار اردو تعنیات ہوئے۔ ۱۹۷۳ء میں اسی کالج کے پرنسپل بنا دیے گئے۔ ۱۹۷۴ء میں وزارتِ تعلیم میں اسسٹنٹ ایجوکیشن ایڈوائزر کے عہدے پر فائز ہوئے اور صرف چند ماہ کام کرنے کے بعد ۱۹۷۴ء میں نئی نئی قائم ہونے والی پیپلز اوپن یونیورسٹی میں اردو کے استاد مقرر ہوگئے۔ ۱۹۸۶ء میں علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی (پیپلز اوپن یونیورسٹی) کے شعبہ اردو کے سربراہ مقرر ہوئے۔ ۱۹۹۰ء میں اسی جامعہ میں ڈین، کلیہ سماجی علوم مقرر ہوئے اور اسی عہدے سے ۱۹/اگست ۱۹۹۴ء کو ساٹھ سال عمر پوری ہونے پر سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔

۱۱/اگست ۱۹۹۴ء کو الخیر یونیورسٹی کے رجسٹرار کی حیثیت سے کام شروع کیا مگر چند ماہ بعد کنسلٹنٹ کی حیثیت سے علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے پھر منسلک ہوگئے۔ ۱۹۹۸ء میں اسی یونیورسٹی کے شعبہ اقبالیات کے سربراہ مقرر ہوگئے اور اسی حیثیت سے ۲۰۰۵ء میں سبکدوش ہوئے۔ آج کل جی ایٹ، اسلام آباد میں اپنے گھر میں مقیم ہیں لیکن جب کبھی ان سے ملاقات ہوتی ہے وہ یہ پوچھتے ہیں کہ آپ کون ہیں اور جواب سُن کر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے نیچے دیکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ ان کی یادداشت ختم ہو چکی ہے لہٰذا انہیں گھر سے نکلنے نہیں دیا جاتا۔

ڈاکٹر صاحب، اردو اور فارسی ادب کے نام ور سکالر کی حیثیت سے ملک میں اور بیرونِ ملک توانا شناخت رکھتے ہیں لہٰذا مختلف حیثیتوں میں متعدد ممالک کے دورے کیے۔ ۱۹۷۶ء میں ایران گئے اور چار ماہ تک تدریسی خدمات انجام دیں۔ ۱۹۷۸ء میں آسٹریلیا کا دورہ کیا اور وہاں فاصلاتی تعلیمی ورکشاپ اور سیمی نار میں شریک ہوئے۔ ۱۹۷۹ء میں کوالالمپور کا دورہ کیا اور وہاں فاصلاتی تعلیمی نشریات کے ریڈیو کورس میں حصّہ لیا۔ ۱۹۸۰ء میں ملائشیا اور سنگاپور میں فاصلاتی نظامِ تعلیم کے حوالے سے تربیتی پروگرام میں شرکت کی۔ ۱۹۸۱ء سے ۱۹۸۴ء تک ہائیڈل برگ یونیورسٹی جرمنی میں ریسرچ سکالر کی حیثیت سے کام کیا۔ اس دوران ڈاکٹر صاحب نے درجنوں ریسرچ لیکچرز دیے اور فکرِ اقبال کے حوالے سے خدمات انجام دیں۔ ڈاکٹر صاحب نے

۱۹۸۴ء میں لندن کا دورہ کیا اور بی بی سی کے شعبہ نشریاتی کورس میں حصہ لیا۔

۱۹۸۴ء سے ۱۹۸۶ء تک قائداعظم یونیورسٹی اسلام آباد کے ساتھ وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے وابستہ رہے۔ ۱۹۸۶ء میں دوبارہ برطانیہ گئے اور آکسفورڈ یونیورسٹی میں منعقدہ فاصلاتی تعلیمی کورس میں شرکت کی۔ ۱۹۸۷ء میں رجسٹرار کی حیثیت سے بھارت، جاپان، چین، عراق، شام اور سعودی عرب میں حج کا فریضہ بھی ادا کیا۔

۱۹۹۰ء میں ڈین کلیہ سماجی علوم کی حیثیت سے ڈاکٹر صاحب دوبارہ برطانیہ گئے اور جدید تحقیق کے حوالے سے پروگراموں میں شریک ہوئے۔ ۱۹۹۱ء میں سپین کا دورہ کیا اور کانفرنس میں مقالہ پڑھا۔ ۱۹۹۲ء میں تہران کا دورہ کیا اور یومِ اقبال کے حوالے سے مقالہ پڑھا۔ ۱۹۹۳ء میں برطانیہ کا دورہ کیا اور آکسفورڈ یونیورسٹی میں کامن ویلتھ وائس چانسلرز کانفرنس میں علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی نمائندگی کی۔ ۲۰۰۰ء میں برطانیہ میں اردو ٹرسٹ، لندن کے زیر اہتمام انٹرنیشنل اردو کانفرنس میں شرکت کی۔

ڈاکٹر محمد صدیق خاں شبلی ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر سینکڑوں پروگراموں میں شریک ہوئے۔ ان میں سے زیادہ تر پروگراموں کے موضوعات تعلیمی اور فکری تھے۔ انہوں نے پاکستان ٹیلی ویژن کے لیے ''برصغیر میں فارسی ادب'' کے عنوان سے بارہ پروگرام تیار کرائے جو بے حد مقبول ہوئے۔

ڈاکٹر محمد صدیق خاں شبلی نے کئی دہائیوں پر محیط اپنی مدرسانہ زندگی میں نہ صرف ہزاروں طلبہ و طالبات کو اردو اور فارسی زبان و ادب سے روشناس کرایا بلکہ باقاعدہ نظریہ سازی کرتے رہے۔ ان پر جماعت اسلامی کی حمایت کے الزامات لگتے رہے مگر انہوں نے اس سلسلے میں کبھی صفائی پیش نہیں کی۔ وہ اسلامی دین اور تہذیب سے قلبی وابستگی کا زندگی بھر کھلے عام مظاہرہ کرتے رہے۔ وہ پانچوں وقت نماز پابندی کے ساتھ ادا کرتے رہے بلکہ زیادہ نمازیں مسجد میں باجماعت ادا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب نے پی ایچ ڈی، ایم فل اور ایم اے کے سیکڑوں طلبہ و طالبات کی براہ راست نگرانی اور راہ نمائی کی۔ اس کے علاوہ دوسروں کی نگرانی میں کام کرنے والے سکالرز کی راہ نمائی جس کشادہ دلی سے کرتے رہے ہیں اس کی مثالیں نہیں ملتیں۔ ڈاکٹر صاحب کو اردو اور فارسی

زبان و ادب پر ایسی غیر معمولی دسترس حاصل ہے کہ اس حوالے سے کوئی دوسری مثال پیش کرنا مشکل ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی فارسی اور اردو زبان دانی اور ان زبانوں میں لسانی مہارت کا تو زمانہ معترف ہے مگر عربی اور انگریزی زبانوں سے ان کی شناسائی بھی قابلِ داد ہے۔ ان چاروں زبانوں کے حوالے سے کوئی علمی، لسانی یا تحقیقی مسئلہ درپیش ہو تو بغیر کوئی لغت یا حوالے کی کتاب دیکھے اسے حل کرنے کی جو غیر معمولی صلاحیت ڈاکٹر صاحب میں موجود ہے وہ یقیناً اس میں طاق ہیں۔ علاوہ ازیں پنجابی زبان تو گویا ان کی مادری زبان ہے لہٰذا اس پر کسی قسم کی گفتگو زائد ہوگی۔

ڈاکٹر محمد صدیق خاں شبلی نے دفتری اردو کے سلسلے میں مقتدرہ قومی زبان (اب ادارہ فروغ قومی زبان) کی درخواست پر متعدد کتابیں تصنیف کیں جن کا ذکر آگے کتابوں کی فہرست میں آئے گا۔ انہوں نے علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی کے کورسز کے سلسلے میں ان تھک کام کیا۔ اقبالیات، اردو، دفتری اردو، پاکستانی ادب اور تعلیمی حوالوں سے انٹرمیڈیٹ، بی اے، بی ایڈ، ایم اے اور ایم فل کے طلبہ و طالبات کے لیے پورے پورے کورسز تیار کر کے لکھے۔ اس کے علاوہ مختلف کورسز میں ڈاکٹر صاحب کے لکھے ہوئے یونٹس کی تعداد درجنوں میں گنی جاسکتی ہے۔ علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی کے سی ٹی، پی ٹی سی، میٹرک، انٹرمیڈیٹ، بی اے، بی ایڈ، بین الصوبائی افسران اور ایم فل کے طلبہ و طالبات کے لیے تدریسِ اردو، اردو زبان و ادب، دفتری اردو، فارسی اور اقبالیات کے موضوعات پر درجنوں یونٹ لکھے۔ بلامبالغہ ڈاکٹر صاحب کے لکھے ہوئے کورسز اور یونٹس سے لاکھوں طلبہ و طالبات نے استفادہ کیا اور لاکھوں آئندہ بھی ان سے فائدہ اٹھاتے رہیں گے۔

ڈاکٹر محمد صدیق خاں شبلی نے مختلف اوقات میں ملک کے اندر اور باہر درجنوں بین الاقوامی کانفرنسوں میں حصہ لیا اور تحقیقی مقالے پیش کیے۔ ڈاکٹر صاحب کے مطالعے کی وسعت اور مضامین کے تنوع کا اندازہ آپ ان چند موضوعات سے کر سکتے ہیں جن پر آپ نے تحقیقی مقالے مذکورہ بالا چند کانفرنسوں میں پیش کیے:

۱۔ مسلمان اور ڈراما
۲۔ غالب کی فارسیت
۳۔ الف لیلہ مستشرقین کی نظر میں

۴۔ شاہ عبدالقادر دہلوی کا ترجمہ قرآن
۵۔ اقبال کی نظم گوئی
۶۔ ایرانیوں کی اقبال دوستی
۷۔ اقبال اور تلقین یقین
۸۔ اقبال اور غزالیؒ
۹۔ اقبال اور گوئٹے
۱۰۔ سیرت النبیؐ
۱۱۔ برصغیر میں مسلم فکر بارہویں صدی میں
۱۲۔ اردو رموزِ اوقاف
۱۳۔ دفتری اصطلاحات کا ترجمہ
۱۴۔ اردو میں پیراگراف نویسی
۱۵۔ فردوسی
۱۶۔ اقبال پر فارسی شعرا کے اثرات
۱۷۔ اقبال یورپ میں
۱۸۔ مسئلہ قومیت اور اقبال
۱۹۔ مولوی عبدالحق کی قواعد نویسی
۲۰۔ بوطیقا
۲۱۔ شعوبیت اور امام ابوحنیفہؒ
۲۲۔ واہ رے شیخ نذیر
۲۳۔ علامہ حسین میر کاشمیری وغیرہ

مذکورہ بالا موضوعات سے یہ بتانا مقصود ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے مطالعے کی جہتیں بے حد وسیع اور متنوع ہیں۔ ان کے موضوعات کا دائرہ یہ بتاتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کا سلسلہ عظیم اسلامی علمی روایت کے ان بزرگوں سے ملتا ہے جنہوں نے علمی دنیا کو نہ صرف یہ کہ متاثر کیا بلکہ اس کی سمت نمائی بھی کی۔

پروفیسر ڈاکٹر محمد صدیق خاں شبلی گو تمام عمر درس و تدریس میں مصروف رہے اور ہزاروں طلبہ و طالبات کی علمی راہ نمائی کے ساتھ کردار سازی کے فرائض بھی انجام دیے لیکن اس بے پایاں مصروفیت کے ساتھ ساتھ انہوں نے تصنیف و تالیف کا کام بھی جاری رکھا۔ ڈاکٹر صاحب کی کتابوں کی سال وار فہرست یوں ہے:

۱۔ اشاریہ کلام اقبال، کتاب مرکز، فیصل آباد، ۱۹۷۷ء۔
۲۔ کشف الابیات اقبال (شریک مصنف)، مرکز تحقیقات فارسی، راول پنڈی، ۱۹۷۷ء۔
۳۔ دفتری مراسلت، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۷ء۔
۴۔ دفتری خط و کتابت۔ (۹ جلدیں: ترتیب و تدوین)، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۷ء۔
۵۔ سرکاری مراسلت۔، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۷ء۔
۶۔ داتا گنج بخشؒ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۷۳ء۔
۷۔ فارسی ادب کی مختصر ترین تاریخ (شریک مصنف) سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۷۳ء۔
۸۔ امیدی تہرانی (فارسی)، مقدمہ و ترتیب، تہران، ۱۹۶۷ء۔
۹۔ تاثیر فارسی بر زبان اردو۔ مرکز تحقیقات، اسلام آباد، ۱۹۸۰ء۔
۱۰۔ شعرائی بزرگ عرفانی پاکستان (فارسی)، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۱۹۹۵ء۔
۱۱۔ شیخ کمال خجندی (تاجکستان کے صوفی شاعر)، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۱۹۹۶ء۔
۱۲۔ خلاصہ روداد نویسی، ایس ٹی پرنٹرز، گوالمنڈی، راولپنڈی، ۱۹۹۲ء

پروفیسر ڈاکٹر محمد صدیق خاں شبلی نے بھرپور زندگی گزاری مگر آج کل یادداشت کھو جانے کے سبب خاموش رہتے ہیں۔ ان کی فقرہ بازی کے سبب محفل زعفران زار ہو جاتی تھی۔ جس محفل میں ڈاکٹر صاحب موجود ہوتے تھے وہاں ان کی حیثیت ہمیشہ مرکزی ہوتی تھی۔

ڈاکٹر صاحب کا قد درمیانہ، رنگت گندمی، آنکھیں گہری مگر چمک دار ہیں۔ چہرہ گول اور بھرا ہوا، پیشانی کشادہ، ناک ستواں اور مناسب اور ہونٹ باریک ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی آواز جاندار اور گرج دار ہے مگر لہجہ ملائم ہے۔ لباس ہمیشہ انگریزی ہی زیب تن کیا مگر گھر میں شلوار قمیص میں ملبوس رہتے ہیں مگر پاجامہ بھی زیب تن کرتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب طویل عرصہ بیماریوں کی زد میں رہے مگر طبیعت ہشاش بشاش رہی۔ آج کل بھی جب کہ یادداشت ختم ہوچکی ہے اور گھر میں مقید رکھے جاتے ہیں، تب بھی ایسے شانت اور پرسکون نظر آتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ ایک دو سوال کر کے خاموش ہو کر بیٹھ جاتے ہیں اور کسی قسم کی تلخی یا پریشانی کا اظہار نہیں کرتے۔ ڈاکٹر صاحب گفتگو اس قدر روانی سے نپے تلے لفظوں اور جملوں میں کرتے ہیں کہ بس سنا کرے کوئی۔ بے حد شگفتہ، رواں، فصیح اور نکھری ہوئی گفتگو، جیسی ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کا حصہ ہے، اس کی مثال کم کم ملتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے ایک طالب علم محمد طارق نے ان کے بارے میں لکھا ہے:

''اس وقت ڈاکٹر محمد صدیق خاں شبلی کا شمار ملک کے نامور محققین اور اہلِ قلم میں ہوتا ہے۔ آپ نے اپنی اعلیٰ علمی بصیرت کے پیشِ نظر اردو نقد و ادب میں وہ مقام حاصل کیا ہے جس کا کوئی عام شخص روادار نہیں ہوسکتا۔ اتنی عظمت اور شہرت پانے کے باوجود آپ کی طبیعت میں عاجزی و انکساری کا پہلو نمایاں نظر آتا ہے۔ دورانِ گفتگو جب راقم الحروف نے ڈاکٹر محمد صدیق خاں شبلی سے ان کی اعلیٰ علمی و ادبی خدمات کے مقام و مرتبے کے بارے میں سوال کیا تو انھوں نے بڑے عاجزانہ انداز میں صرف ایک ہی مصرع کہا جس سے آپ کی عظمت کا بھید کھل کر سامنے آ گیا:

''ہم کہاں کے دانا ہیں، کس ہنر میں یکتا ہیں''

کہا جاتا ہے کہ مشکیں کسنا آسان ہے اور فقرہ کسنا قدرے مشکل ہوتا ہے لیکن ڈاکٹر صاحب پر فقرہ کسنا ختم ہے۔ موقع کی مناسبت سے ایسا فقرہ تراشتے ہیں، جس کی کسک مدتوں اپنی موجودگی کا احساس دلاتی رہتی ہے۔ جب آپ سامعین کے ساتھ خوش مذاقی میں مصروف ہوتے ہیں، اس وقت آپ کے چہرے پر عجیب طرح کی تازگی اور بشاشت نمودار ہوتی ہے اور آنکھوں میں بلا کی چمک پیدا ہو جاتی ہے۔

آپ کے روبرو کسی کا چراغ نہیں جل سکتا بلکہ بڑے بڑے منہ زور چراغ آپ کے سامنے گُل ہو جاتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کا حافظہ صرف تیز ہی نہیں، ہمہ گیر بھی ہے۔ اگر کوئی کتاب ایک مرتبہ پڑھ لیں تو انھیں دوبارہ اس کی ورق گردانی کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ جتنا کچھ انھوں نے اپنے تعلیمی دور میں پڑھا وہ سب یاد ہے اس کے علاوہ ہجرت کے تمام واقعات جیسے جیسے پیش آئے۔ ویسے ہی پوری منظر کشی کے ساتھ انھیں یاد ہیں۔

ڈاکٹر محمد صدیق خاں شبلی کی شخصیت کا ایک نمایاں پہلو یہ ہے کہ وہ اختلاف برائے اختلاف کے قائل نہیں ہیں۔ آپ کا اختلاف ہمیشہ ٹھوس اور بدیہی دلائل پر مبنی ہوتا ہے۔ ان کی طبیعت میں خود پسندی اور تکبر نام کو نہیں ہے۔ کسی کو حقارت کی نظر سے نہیں دیکھتے اور تمام ملنے والوں سے برابری کی سطح پر ملتے ہیں۔ دوسروں کی رائے کو بڑی اہمیت دیتے ہیں اور کھلے دل سے دوسروں کی بات سنتے ہیں۔ دوسروں کی خوبیوں کے اعتراف میں بخل سے کام نہیں لیتے جہاں تک ممکن ہوسکے دوسروں کو فائدہ پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔''

(محمد طارق، مقالہ؛ ایم اے اردو؛ بعنوان: ڈاکٹر محمد صدیق خاں شبلی احوال و آثار، ص ۲۸۔۲۹)

صوفی غلام مصطفیٰ تبسّم

(پیدائش ۱۸۹۹ء امرتسر: وفات: ۷ فروری ۱۹۷۸ء لاہور)

زاہد حسن

ابتدائیہ: صوفی تبسم کا شمار ایسے شعرا میں ہوتا ہے۔ جن کی شخصیت اور فن میں کئی ایک خوبیاں اور خصوصیات یکجا ہوتی ہیں۔ وہ پنجابی، اردو اور فارسی زبانوں کو لکھ، پڑھ، بول اور ان کا ترجمہ کچھ اس عُمدگی اور خوش سلیقگی کے ساتھ کرتے کہ اصل زبان میں لکھنے والا تخلیق کار بہت پیچھے رہ جاتا اور چار سُو صوفی صاحب کے فن کی گونج سُنائی دیتی۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ ہمارے علمی و ادبی نابغہ میں شمار ہوتے ہیں۔ انھوں نے غالب کی ایک فارسی غزل کا منظوم پنجابی ترجمہ کچھ اس خوب صورتی کے ساتھ کیا کہ آج بھی اسے پڑھنے اور سننے والے عش عش کر اُٹھتے ہیں۔

میرے شوق دا نہیں اعتبار تینوں، آجا ویکھ میرا انتظار آجا
ایویں لڑن بہانے لبھنا ایں، کیہ توں سوچنا ایں ستم گار آجا
بھاویں ہجر تے بھاویں وصال ہووے، وکھو وکھ دوہاں دیاں لذّتاں نیں
میرے سوہنیا جا ہزار واری، آجا پیاریا تے لکھ وار آجا

اسی طرح ان کی ایک مشہور غزل ہے:

یہ کیا کہ اک جہاں کو کرو وقفِ اضطراب
یہ کیا کہ ایک دل کو شکیبا نہ کر سکو
ایسا نہ ہو یہ درد بنے دردِ لا دوا
ایسا نہ ہو کہ تم بھی مداوا نہ کر سکو

اس غزل کے کل چھ اشعار ہیں اور خوبی کی بات یہ ہے کہ ہر نئے شعر کا ہر مصرعہ ایک ہی لفظ سے شروع ہو رہا ہے۔ صوفی تبسم کی شاعری کی یہ وہ جادوگری ہے جس کی بے شمار مثالیں ہمیں ان کے یہاں مل جائیں گی۔ اصل میں صوفی صاحب بے شمار حیرتیں اور معجزے تخلیق کرنے والی ایسی شخصیات میں شمار ہوتے ہیں جنھیں قدرت نے بے بہا فنی صلاحیتوں سے نواز رکھا ہوتا ہے اور وہ جس موضوع پر بھی لکھنے بیٹھتے ہیں اسی موضوع کو زندہ و جاوید کر دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ صوفی تبسّم ایک طرف بچوں کے عام فہم اور آسان زبان میں گیت لکھنے والے شاعر کے طور پر مشہور ہیں تو دوسری طرف انھوں نے اپنی اردو غزلوں، پنجابی نظموں اور جنگی ترانوں کو ایسے جاوداں اور چمکتے لفظوں سے سنوارا اور شنگھارا ہے کہ آج بھی وہ اسی طرح تر و تازہ اور سرسبز و شاداب ہیں۔ مثال کے طور پر ستمبر کے دن جب بھی آتے ہیں کون ہے جس کی سماعتوں میں صوفی صاحب کے ان ترانوں کے لفظ نہ گونجتے ہوں:

- ایہہ پُتر ہٹاں تے نہیں وِکدے
- یا پھر، او ماہی چھیل چھبیلا ہائے نی جرنیل نی کرنیل نی

اور یا پھر یہ کہ:

- میریا ڈھول سپاہیا تینوں ربّ دیاں رکھاں

یہاں مجھے اُن کی غزل کے دو اور اشعار یاد آتے ہیں:

تو نے کچھ بھی نہ کہا ہو جیسے۔ میرے ہی دل کی صدا ہو جیسے
یوں تری یاد سے جی گھبرایا۔ تو مجھے بھول گیا ہو جیسے

تعارف: صوفی غلام مصطفیٰ تبسّم ایک استاد، شاعر، نقاد، مترجم اور شارح تھے۔ وہ پنجابی، اردو اور فارسی تینوں زبانوں پر بیک وقت ایک جیسی قدرت رکھتے تھے۔ وہ ۱۴۔ اگست ۱۸۹۹ء کو امرتسر میں پیدا ہوئے۔ وہ کا حقیقی نام غلام مصطفیٰ اور صوفی لقب جبکہ تبسّم تخلص تھا۔ خالصہ کالج، امرتسر سے ایف اے اور بی اے کرنے کے بعد لاہور ایف سی کالج سے فارسی آنرز کے ساتھ بی اے کیا۔ اسلامیہ کالج لاہور سے ایم اے فارسی کیا۔ ۱۹۲۶ء سے بطور ہائی سکول استاد کے کیریئر کا آغاز کیا۔ ۱۹۳۱ء میں گورنمنٹ کالج، لاہور میں فارسی کے لیکچرار کے طور پر پڑھانا شروع کیا۔ یہیں سے ریٹائر ہوئے۔ وہ خانہ فرہنگ ایران، ریڈیو پاکستان، لیل و نہار، پی، ٹی وی،

پاکستان آرٹ کونسل اور اقبال اکادمی سے بھی وابستہ رہے۔ آپ بچّوں کے شاعر کے طور پر بھی مشہور ہیں۔

ان کی اہم مطبوعہ کتب میں ''دوگونہ'' (امیر خسرو کی سوغزلوں کا اردو غزل میں ترجمہ (۱۹۷۵ء۔ ۲۰۰۵ء) شرح غزلیاتِ فارسی (۲۰۰۶ء) ''نقشِ اقبال (۱۹۷۷ء) ''یک ہزار و یک سُخن'' ''ساون رین دا سفنا'' ''نظراں کردیاں گلّاں'' (۱۹۸۸ء) ''جھولنے'' ''حکمتِ قرآن'' (ترجمہ) ''ٹوٹ بٹوٹ'' ''اب سب ہیں ٹوٹ بٹوٹ'' اور ''کلیاتِ صوفی تبسم'' شامل ہیں۔

آکسفرڈ یونیورسٹی پریس کے زیرِ اہتمام اردو ورثہ سیریز میں ان پر رؤف پاریکھ کے تعارف و ترتیب کے ساتھ انتخاب کلام بھی شائع ہو چکا ہے۔

صوفی صاحب کی طلسمی شخصیت: حقیقت یہ ہے کہ صوفی تبسّم ایک عظیم ادبی اور تخلیقی شخصیت ہونے کے ساتھ ساتھ ایک جادوگر، ایک طلسمی شخصیت بھی تھے۔

تخلیقی عمل: ان کا نام اور کام تینوں زبانوں (پنجابی، اردو، فارسی) میں نہایت معیار و اعتبار کا حامل ہے۔ ایک طرف انھوں نے فارسی شاعری سے تراجم کر کے اپنا نام اہم مترجمین میں شامل کیا تو دوسری طرف اردو اور پنجابی میں بھی ان کا شمار اساتذہ میں کیا جاتا ہے۔ اور پھر ایک اہم اور نمایاں، پہچان اُن کی بچّوں کے شاعر کے طور پر بھی ہے۔۔۔ اگر ہم پنجابی اور اردو شعر و ادب کا تاریخی تناظر میں جایزہ لیں تو یہ بات نمایاں طور پر سامنے آتی ہے کہ برصغیر پاک و ہند میں طویل عرصے تک فارسی زبان کے رائج ہونے کے سبب فارسی زبان و ادب کی بہت سی خوبیاں، بہت سے معاملات مقامی زبانوں میں بھی در آئے۔ یہاں تک کہ وہاں رائج معروف لوک داستانیں اور کردار مقامی قصّے کہانیوں میں بھی جیتے جاگتے، سانس لیتے محسوس ہوتے ہیں۔ ایسا بھی ہوا کہ مقامی زبانوں میں لکھی گئی منظوم اور منثور داستانوں کے عنوانات فارسی زبان میں دیے جاتے۔ پڑھے لکھے ہونے کا ایک مطلب یہ بھی لیا جاتا کہ وہ فارسی اور عربی زبانوں سے کما حقہ واقفیت اور آگہی رکھتا ہو۔ یہ بات طے شدہ ہے کہ صوفی غلام مصطفیٰ تبسّم، کا تعلّق اس آخری نسل سے تھا جو فارسی شعر و ادب سے نہ صرف گہرا درک رکھتی تھی بلکہ جنھوں نے ان زبانوں میں تخلیق کیے گئے علوم و فنون کو حرزِ جاں بنائے رکھا۔ اور مقدور بھر کوشش کی کہ اس امانت کو آنے والی نسلوں تک بھی

پہنچا دیا جائے۔ بلکہ اس کا اظہار اُن کی ایک پنجابی نظم میں کچھ اس انداز سے ہوتا ہے۔

''میں ایہہ وی جاناں صوفی
نواں سال، نویں کماں دی
نویں فرضاں دی
نویں بھاراں دی
لے آیا اک پنڈ۔''

(ترجمہ): میں یہ بھی جانتا ہوں صوفی، نیا سال، نئے کاموں کی، نئے فرائض کی۔ نئے بار کی، ایک نئی گٹھڑی لے آیا۔)

صوفی تبسّم کی طرف سے امیر خسرو کی سوغزلوں کے اردو تراجم میں سے کچھ اشعار کے تراجم دیکھیے؛ ایسے نہیں لگتا کہ صوفی صاحب نے ترجمہ محض ترجمہ سمجھ کر کیا ہے بلکہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ ترجمہ کو بھی تخلیقی عمل کا حصّہ سمجھتے ہوئے نباہ رہے ہیں:

ترجمہ: سبزہ وہی، دامنِ صحرا وہی
باغ کا مہکا ہوا سایہ وہی
سامنے نظروں کے بہت نازنین
دل میں مرے شاہدِ راعنا وہی
ہر طرف ہیں گل رخانِ دل نواز
اُس بتِ بے مہر کا شیوا وہی
کھو دیے ہیں جان و دل پھر بھی ابھی
شوق وہی، ذوقِ تمنّا وہی

ان کی ایک پنجابی نظم اور ایک پنجابی گیت کا ترجمہ دیکھیے؛ ان کی شاعری میں ہمیں خاص طرح کا کلاسیکی لحن ملتا ہے اور وہ جو روزِ ازل سے انسان کا جو مقسوم ہے جو اس کی تقدیر ہے۔ اس سب کا منفرد تخلیقی اظہار دنیا کے عظیم شعرا و ادبا نے اپنے اپنے طور پر ہے۔ صوفی تبسّم اس کو کچھ اس

انداز سے بیان کرتے ہیں:

(ترجمہ: ایک دنیا کہے یہ دیوانہ، ایک دنیا کہے پاگل
روگ لگانے والے لاکھوں
اور، میں روگی ایک اکیلا''

(ترجمہ: مدھم سا کوئی دیپ جلے دور کناروں پر
کشتی ہچکولے کھائے
نہیں بچنے کا کوئی راستہ
بھنور چاروں اور
تیز ہوا چلے، مدھم سا کوئی دیپ جلے
یونہی ڈھونڈ رہی ہیں
آنکھوں کو نہ راستہ ملے
پلٹ کر نہ آئیں کبھی
جا کر، جو پردیس بسے
مدھم سا اِک دیپ جلے۔'')

صوفی صاحب نے فارسی کے علاوہ قرآن کریم کی دو سورتوں ''الفاتحہ'' اور ''القارعہ'' سمیت انگریزی سے بھی بعض نظمیں اردو اور پنجابی میں ڈھالی ہیں۔ انھوں نے علامہ اقبال، شیلے اور ورڈزورتھ کے کلام کو پنجابی شعری روپ دیا ہے۔ جو ان کے مجموعہ کلام ''نظراں کردیاں گلاں'' میں شامل ہے۔ ''شیلے'' کی نظم ''محبت کا فلسفہ'' ورڈزورتھ کی نظم ''اس دنیا سے دُور'' اور ورڈزورتھ کی ہی ایک طویل نظم ''بچپن'' دس حصّوں میں شامل ہے۔ دیکھا جائے تو ایک طرح سے ان تراجم نے جدید پنجابی نظم میں نیا موضوع، نیا اسلوب اور نیا آہنگ متعارف کروایا۔ نظم کی کچھ سطریں اردو ترجمہ کی صورت میں دیکھتے ہیں۔ ''زندہ رہے یہ دل اپنا/ ہم اُسی کے سہارے جیتے ہیں/ اس کے دکھ سکھ، ہمارے دکھ سُکھ ہیں/ اسی سے سب اُمیدیں ہیں/ اس کی خوشیاں ہماری عیدیں ہیں/ کوئی چھوٹا سا اک پھول جب ہنستا ہے/ مجھے بتاتا ہے/ راہ ان عمیق خیالوں کی/ جو ہر دل میں

بس جاتے ہیں/ جو آنسوؤں کا پتہ بتاتے ہیں۔'')

صوفی صاحب کی ایک اور نظم دیکھتے ہیں جس کے فیض صاحب پر نمایاں اثرات محسوس کیے جاسکتے ہیں؛

''زندگی ہے تو کوئی بات نہیں ہے اے دوست
زندگی ہے تو بدل جائیں گے یہ لیل و نہار
یہ شب و روز، مہ و سال گزر جائیں گے
ہم سے بے مہر زمانے کی نظر کے اطوار
آج بگڑے ہیں تو اک روز سنور جائیں گے
فاصلوں، مرحلوں راہوں کی جدائی کیا ہے
دل ملے ہیں تو نگاہوں کی جدائی کیا ہے
(چند روز اور مری جان فقط چند ہی روز۔)

ان کے ایک پنجابی گیت کے یہ چند مصرعے بتاتے ہیں جو آگے چل کر ہم پڑھیں گے کہ انھوں نے پنجابی فوک ادب اور لوک شاعری کا بھی کافی مطالعہ کر رکھا تھا۔ اور ان کی نظر پنجابی شعر و ادب پر بہت گہری تھی۔ گیت کے مصرعے دیکھیے:

گھر گھر کے بدلیاں آئیاں۔ ساون نے جھڑیاں لائیاں
ہس ہس کے گاون سیّاں۔ پپلاں تے پینگھاں پئیاں
لگے آون جاون راہی۔ توں وی آجا، ڈھولن ماہی
تینوں سبھ اڈیکن پئیاں۔ پپلاں تے پینگھاں پئیاں

(ترجمہ): پھر سے بادل گھر گھر آئے ہیں۔ ساون کی برسات برس رہی ہے۔ میری سکھیاں سہیلیاں، ہنس ہنس گاتی ہیں۔ پیپل کے درختوں پر جھولے ڈال دیے گئے ہیں۔ مسافر آنے جانے لگے ہیں۔ اے میرے محبوب! تو بھی چلا آ۔ سبھی تیرا انتظار کرتے ہیں۔ پیپل کے درختوں پر جھولے ڈال دیے گئے ہیں۔)

دوہا، پنجابی کی ایک ایسی صنفِ سخن ہے۔ جس کا آغاز تو بہت پہلے لوک شاعری میں ہی ہو گیا، تاہم پنجابی کے پہلے صوفی شاعر بابا فرید الدین مسعود گنج بخش (۱۱۲۰ء۔۱۱۸۸ء) کے نام نے

اسے برکت عطا کی۔ انھوں نے اپنی لازوال شاعری اسی صنفِ سخن میں کی جسے بعض لکھنے والوں نے اشلوک اور دوہڑا کا نام بھی دیا۔ دوہا میں اور خاص طور پر بابا فریدؒ کے دوہوں میں زیادہ تر موضوعات تصّوف، سلوک ومعرفت اور اپنی اصل سے جدا ہونے، ہجر اور برہا کا بیان ملتا ہے۔ لہذا بعدازاں دوہے میں رچے گئے موضوعات کا تعلّق قریب قریب ایسا ہی دکھائی دیتا ہے۔۔۔ صوفی تبسّم کے یہاں بھی ہمیں یہ صنف ملتی ہے۔ انھوں نے بھی اس صنف میں زیادہ تر برہا اور جدائی کو بیان کیا ہے۔ اُن کا دوہا دیکھیے:

جدتوں یارنوں ودیا کیتا، مینوں کتے نہ ملدی ڈھوئی
لوکی باہر پردیسی ہوون، میں گھر پردیسن ہوئی

(ترجمہ: جب سے محبوب کو وداع کیا ہے مجھے ایک پل قرار نہیں پڑتا۔ لوگ تو باہر جا کر پردیسی کہلاتے ہیں۔ میں گھر میں رہتے ہوئے ہی پردیسی ہوں۔''

اسی مضمون کو تھوڑے سے فرق اور تبدیلی کے ساتھ انھوں نے اپنی ایک مشہور غزل میں کچھ ایسے باندھا ہے۔

سو بار چمن مہکا، سو بار بہار آئی
دنیا کی وہی رونق دل کی وہی تنہائی
دیکھے ہیں بہت ہم نے ہنگامے محبت کے
آغاز بھی رسوائی، انجام بھی رسوائی

اور آخر میں اس بے مثل شاعر کے کچھ مشہور شعر دیکھتے ہیں:

ہزار گردشِ شام و سحر سے گذرے ہیں
وہ قافلے جو تیری رہ گذر سے گذرے ہیں

وہ مجھ سے ہوئے ہم کلام اللہ اللہ
کہا میں کہاں یہ مقام اللہ اللہ

تجھ کو آتے ہی نہیں چھپنے کے انداز ابھی
مرے سینے میں لرزاں ہے تری آواز ابھی

بجھی بجھی سی ستاروں کی روشنی ہے ابھی

یہ رات کس کے اشاروں کو ڈھونڈتی ہے ابھی

پروفیسر ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری

ڈاکٹر سید عزیز الرحمٰن

ڈاکٹر صاحب کے کئی تعارف تھے۔ وہ مولانا ظفر احمد انصاری کے صاحب زادے تھے۔ ڈاکٹر صاحب محقق تھے، اور تحریک استشراق کے ماہر، بڑے اور عالمی سطح پر مانے ہوئے ایڈیٹر تھے، استاد تھے، اور بین الاقوامی جامعات میں تدریس وانتظام کا وسیع تجربہ رکھتے تھے، مگر یہ سب صفات تو کم وبیش اور دسیوں شخصیات میں بھی موجود ہوں گی مگر ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری محض محقق نہیں محقق گر تھے۔ وہ محض استاد نہیں، استاد گر تھے، اور یہ صفت ان کی تمام شخصی خوبیوں اور ذاتی اوصاف پر حاوی تھی اور شاید ان کے حق میں سب سے بڑا صدقہ جاریہ بھی۔

ڈاکٹر صاحب نے بھرپور زندگی گزاری، جس کا لمحہ لمحہ فعالیت، سرگرمیوں، منصوبوں، حوصلہ افزائی، رہ نمائی اور عقدہ کشائی سے عبارت ہے۔ آپ ۲۷ دسمبر ۱۹۳۲ء کو پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم کے بعد جامعہ کراچی سے اپنا تعلیمی سلسلہ آگے بڑھایا۔ ۱۹۶۶ء میں میکگل یونی ورسٹی مونٹریال، کنیڈا سے پی ایچ ڈی کیا، آپ کا موضوع تحقیق کوفے میں فقہ کے ارتقا کے حوالے سے تھا، جس میں خصوصیت سے امام ابو یوسف اللہ اور امام محمد بن حسن شیبانی کے حوالے سے بحث کی گئی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے ایک طویل عرصے تک مختلف بین الاقوامی جامعات میں تدریسی ذمے داریاں نبھائیں، جن میں کنگ عبدالعزیز یونیورسٹی، جدہ۔ دہران یونیورسٹی، یونیورسٹی آف میلبورن، آسٹریلیا شامل ہیں۔

۱۹۸۶ء میں آپ اسلام آباد پاکستان منتقل ہوگئے۔ ابتدا میں ۸۷ سے ۸۸ کے دوران کچھ وقت شریعہ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد کے ڈائریکٹر جنرل رہے۔ پھر ۸۸ء

میں ادارہ تحقیقات اسلامی کے ڈائریکٹر جنرل کے منصب پر فائز ہوئے۔ یہی منصب آپ کا بڑا تعارف رہا۔ یہیں اسی حیثیت میں آپ نے رجال کار کی تیاری کا فریضہ سرانجام دیا، یہاں تیار ہونے والے افراد میں سے وہ بھی جو ڈاکٹر صاحب سے رسمی سلسلۂ تلمذ نہیں رکھتے انہیں آج اپنا استاد تسلیم کرتے ہیں۔ اس دوران ڈاکٹر صاحب خاصا عرصہ بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی کے نائب صدر اور مختصر عرصے کے لیے صدر بھی رہے۔ اس طویل عرصے میں ایک اہم کارنامہ ادارہ تحقیقات اسلامی کے انگریزی مجلّے اسلامک اسٹڈیز کو جاری رکھنا اور اسے بین الاقوامی معیار اور اسلامی علمی روایت کے مطابق شائع کرنا تھا۔ یقیناً اس میں جہاں آپ کی محنت، ریاضت اور ادارتی صلاحیتوں کا دخل تھا، وہیں آپ کے بین الاقوامی تعلقات بھی اس کا بڑا سبب بنے۔ اور بلاشبہ یہ مجلّہ عالمی علمی دنیا میں پاکستان کا نمائندہ تعارف تھا۔ ادارہ تحقیقات اسلامی کا عربی مجلّہ الدراسات الاسلامیہ، جہاں عالم عرب میں پاکستان کی نمائندگی کرتا ہے، وہیں اسلامک اسٹڈیز انگریزی جاننے والے حلقے میں اہم ترین تعارف تھا، ویسے تو الدراسات اور اردو مجلّے فکر ونظر کا کریڈٹ بھی بہ طور ڈائریکٹر جنرل ڈاکٹر صاحب کا تھا، مگر اسلامک اسٹڈیز تو از اول تا آخر ان ہی کی نگرانی تیار ہوتا تھا۔

ڈاکٹر صاحب کا کام انگریزی میں ہے، اور اس میدان میں پاکستان میں شاید ہی ان کا کوئی ہم سر ہو، قرآن کریم کا انگریزی ترجمہ محض عربی اور انگریزی زبان کی مہارت نہیں، قرآنیات اور خصوصاً مضامینِ قرآن پر ان کی گرفت کا عکاس ہے، اور جدید انگریزی تراجم میں نمائندہ ترین ترجمہ قرآن بھی۔ چوں کہ ان کی خدمات کا دائرہ بڑی حد تک انگریزی زبان تک محدود رہا، اس لیے علمی سطح پر ان کی خدمات سے واقفیت پاکستان کے عمومی اور روایتی دینی حلقوں میں نہ ہوسکی۔

ڈاکٹر صاحب انگریزی کے علاوہ وہ عربی، فارسی، فرانسیسی اور جرمنی زبانوں سے واقف تھے، اور ایسے لوگ اب کہاں جو ان زبانوں سے بھی واقف ہوں، ان کے مزاجوں کا بھی علم رکھتے ہوں، اور علوم اسلامی پر ان کی دست رس بھی ماہرانہ ہو۔ پھر علم وعمل کی دنیا میں توازن بھی ایسا کہ حد درجے مثالی۔ یہ صفات اگر کسی میں موجود نہ ہوں یا ان میں توازن قائم نہ رہ سکے تو پھر اس کے افکار بھی غیر متوازن ہی رہتے ہیں، جن سے معاشرہ کبھی تعمیری اجزا کشید نہیں کرسکتا۔ ڈاکٹر صاحب اس عدم توازن سے کوسوں دور تھے۔

ڈاکٹر صاحب نہایت متحمل مزاج شخصیت کے حامل تھے۔ طویل طویل اور بعض اوقات لایعنی گفت گو کو بھی بڑے آرام سے پی جاتے، اور ذرا ردعمل نہ دیتے۔ اس کا زیادہ مظاہرہ میٹنگز اور مشاورتی نشستوں میں ہوتا۔ ڈاکٹر صاحب ایک کونے میں بیٹھے کسی کاغذ پر پنسل یا بال پوائنٹ سے بہ ظاہر بے مقصد بے مصرف نقش ونگار بناتے رہتے، حاضرین طلاقتِ لسانی کے کتنے ہی جوہر دکھاتے ڈاکٹر صاحب اف نہ کرتے، اجنبی شخص یہ سمجھتا کہ ڈاکٹر صاحب بڑی دل جمعی سے نوٹس لینے میں مصروف ہیں، مگر آپ کے قریب بیٹھے افراد آپ کے تیار کردہ نقوش دیکھ کر مسکرا دیتے۔ مگر جب گفت گو کو اپنے انجام تک پہنچانا مقصود ہوتا تو مائک اپنی جانب کرکے بات شروع کرتے اور اس وقت سننے والا شخص آپ کے حافظے پر اش اش کر اٹھتا کہ آپ زوائد کو حذف کرکے پوری نشست کا خلاصہ چند نکات میں سمیٹ لیتے۔ اس وقت یوں محسوس ہوتا کہ آپ نے پوری گفت گو باقاعدہ ضبط کی ہے۔

ڈاکٹر صاحب بہت نرم خو تھے، لگتا ہے کہ ان کا خمیر ہی پاس ولحاظ سے اٹھایا گیا تھا، مروت، وضع داری، عزت نفس کا خیال سب باتیں آپ کی گفت گو اور میل جول میں مجسم ہوکر سامنے آتی تھیں، اگر تنقید بھی کرنا ہوتی تو مدح کا ہی اسلوب اختیار کرتے، لیکن یہ آپ کا عام معمول تھا، اس سے ہٹ کر بھی کبھی کبھی اپنے انداز کی جھلک دکھا جاتے، ایک دوست راوی ہیں کہ ایک معروف بین الاقوامی اشاعتی ادارے نے قرآن کریم کے انگریزی ترجمے کا اہتمام کیا اور بڑے احترام سے وہ ترجمہ ڈاکٹر صاحب کو پیش کیا۔ آپ نے دیکھا اور رسان سے فرمایا: آپ کو ترجمے کے لیے کوئی انگریزی جاننے والا نہیں ملا تھا؟ اصل یہ ہے کہ آپ کا انداز نرم تھا، مگر معیار پر سمجھوتہ کرنے کے قائل نہ تھے۔

ایک بار کسی ایسی شخصیت کے یونیورسٹی میں تقرری کا معاملہ درپیش تھا، جو خود دوسری یونیورسٹی سے ریٹائرمنٹ کے بعد یہاں آنے میں دل چسپی رکھتے تھے، اور یونیورسٹی کے کئی ایک ذی قدر اساتذہ بھی چاہتے تھے کہ وہ یونیورسٹی کا حصہ بن جائیں۔ ڈاکٹر انوار حسن صدیقی صدر جامعہ تھے، انہیں بھی اس پر آمادہ کرلیا گیا، مگر ڈاکٹر صاحب ڈٹ گئے انہیں سنانے کے لیے انتہائی جید اور ممتاز شخصیات ان کے پاس پہنچیں اور بتایا کہ ڈاکٹر انوار صاحب بھی رضامند ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ آپ کی رضامندی حاصل کرلی جائے۔ ڈاکٹر صاحب نے صاف انکار کردیا، وہ پہلے

بھی انکار کر چکے تھے، اس پر جامعہ کی ایک اہم شخصیت نے، جو انصاری صاحب کے بے حد قریب تھے، نہایت بے تکلفی سے کہا کہ ڈاکٹر صاحب یونیورسٹی میں اتنے نکمے لوگ ہیں تو ایک اور سہی۔ انصاری صاحب پریشانی سے بولے کہ یہ نکمے میں نے رکھے ہیں یا میرے کہنے سے رکھے گئے ہیں؟ انوار صاحب سے کہیے کہ وہ رکھ لیں، میں کچھ نہیں کہوں گا، ہاں اگر وہ مجھ سے پوچھیں گے تو میرا جواب یہی ہوگا، انہیں رکھنا ہے تو مجھ سے مت پوچھیں۔ اور پھر ان کا تقرر نہ ہوسکا۔ دھیمے، نرم اور ملائم لہجے والے ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری کا ایک روپ یہ بھی تھا۔ جو اگرچہ کہ کم کم سامنے آتا تھا۔

ڈاکٹر صاحب نے خوب کام کیا، لیکن اس سے کہیں زیادہ لوگوں سے کام لیا، اور آج اس فن کی زیادہ کمی محسوس ہوتی ہے، لوگ آتے ہیں، اپنی صلاحیت اور توفیق الٰہی کے مطابق خدمات انجام دے کر رخصت ہو جاتے ہیں، مگر صلاحیتیں نہ تو منتقل ہو رہی ہیں نہ ان کا عکس کہیں پڑتا دکھائی دیتا ہے، یہی سبب ہے کہ رجال کار کی تیاری کا فریضہ انجام نہیں دیا جا رہا، ڈاکٹر صاحب اصل میں اسی میدان کے شاہ سوار تھے۔ آپ کی جانب سے کسی کی تعریف کا مفہوم یہ تھا کہ اب طے ہو گیا ہے کہ اس سے کام کرانا ہے۔

راقم نے ابتدائی سطور میں اپنے ایک خطبے کا ذکر کیا ہے، جو ادارہ تحقیقات اسلامی میں ڈاکٹر صاحب کے حکم پر مجھے دینے کا موقع ملا تھا۔ ''پاکستان میں اردو سیرت نگاری'' جب میری بات مکمل ہوگئی تو کسی موقع پر آہستگی سے فرمایا کہ اسے لکھ ڈالیے۔ میں کراچی آ گیا، بات آئی گئی ہوگئی، ایک روز فون آیا کہ وہ گفت گو قلم بند کر لیں، ہم اسے کتابچے کی صورت میں چھاپ دیں گے۔ میں نے حامی بھر لی، کہ میری بھی دل چسپی کی چیز تھی اور ڈاکٹر صاحب کے سامنے کسی بات پر نا کرنے کا ویسے ہی سوال نہیں تھا۔

کچھ عرصے کے بعد اسے میں نے اپنی دانست میں مرتب کر کے اور مضمون کی صورت دے کر مناسب اضافوں کے ساتھ بھیج دیا۔ پھر کسی وقت اسلام آباد جانا ہوا، ملاقات ہوئی تو کہنے لگے کہ یہ تو ایک مناسب حجم کی کتاب کا موضوع بن رہا ہے، اس میں مزید اضافے کیجیے، اسے کتابی شکل دیجیے، ہم اسے کتابی صورت میں چھاپ دیں گے۔ سچی بات یہ ہے کہ یہ بات ڈاکٹر صاحب پہلے مرحلے میں کہتے تو مجھے اسی، نوے فیصد یقین ہے کہ کام ہی نہ ہو پاتا، کیوں کہ ہماری

اوندھی سیدھی مصروفیات اس کا موقع ہی نہ دیتیں، اور پہلے ہی مرحلے میں اتنی محنت کا موقع ہی میسر نہ آتا۔ خیر مناسب تو نہیں البتہ چند چیزوں کا جیسے تیسے اضافہ کر کے اسے کتابی صورت میں تیار کر ہی رہا تھا کہ ڈاکٹر صاحب اپنی ذمے داریوں سے سبک دوش ہو گئے، اور وہ کام ادارہ تحقیقات اسلامی سے شائع نہ ہوسکا، میں نے پھر بھیجا ہی نہیں، اسے زوار اکیڈمی پبلی کیشنز سے شائع کر دیا۔ برادرم مولانا علی طارق راوی ہیں کہ انہیں خطبات بہاول پور کی تخریج کا کام دیا۔ جو لوگ اس فنِ شریف سے واقف ہیں، وہ جانتے ہیں کہ زبانی کہی جانے والی گفت گو میں در آنے والے حوالے بغیر کسی رہ نمائی کے تلاش کرنا کارِ دارد ہے، اور پھر گفت گو بھی ڈاکٹر حمید اللہ جیسی کثیر المطالعہ اور کثیر الجہات شخصیت کی ہو تو دقتوں میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ مگر ڈاکٹر صاحب کا طریق کار اس تجربے کار تیراک کے مشابہ تھا، جو نئے تیراکوں کو تربیت فراہم کرتا ہے، اور اس کا انداز یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کو تالاب میں چھلانگ لگانے کا کہہ کر خود کنارے سے منظر دیکھتا رہتا ہے، وہ صرف اس بات پر نظر رکھتا ہے کہ کوئی ڈوب نہ جائے۔ اور اگر کوئی نو آموز فطری جھجک کے تحت چھلانگ لگانے میں تامل کرتا ہے تو اسے اٹھا کر تالاب میں پھینک دینے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ اگر اسے بے ادبی کی بہ جائے محض تمثیل سمجھا جائے تو ڈاکٹر صاحب زندگی بھر یہی کرتے رہے۔

ڈاکٹر صاحب کا ایک بڑا وصف ان کی عاجزی تھی، ہم ایسے نو اموزوں سے بھی ایسے گفت گو فرماتے کہ ایک بار تو ہمیں شک سا ہو جاتا کہ شاید کسی اور سے مخاطب ہیں، دائیں بائیں دیکھنے پر جب کوئی نظر نہ آتا تب یقین ہوتا کہ ہم سے ہی مخاطب ہیں۔

ڈاکٹر صاحب ضعیف تھے، کہ عمر کا بھی تقاضا تھا، اور علیل تھے، اس قدر کہ دیگر عوارض کے علاوہ کئی برس پیشتر گردے فیل ہو چکے تھے، اور ڈائلیسز کے تکلیف دہ عمل سے ہفتے میں تین بار گزرنا پڑتا تھا، مگر آپ کے روایتی صبر نے اب اپنے اظہار کی نئی راہیں تلاش کر لی تھیں۔ درمیان میں کئی بار سخت علیل ہوئے، مگر پھر اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے۔ مگر اس بار وقت پورا ہو چکا تھا، بلاوا آ گیا تھا، سو ۲۴ اپریل ۲۰۱۶ء کو علم و تحقیق کا یہ سائبان ابدی نیند سو گیا اور گرم موسم میں تپش کچھ زیادہ ہی محسوس ہو رہی ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی ایسی شخصیت تھی کہ ان کی ہر یاد میں سبق پنہاں ہیں، اور ہر قصے سے ہمیں کچھ نہ کچھ حاصل ہوتا ہے۔ کراچی میں ایک صاحب تھے، ریٹائرڈ سرکاری افسر تھے، اچھے عہدے

سے ریٹائر ہوئے تھے، اگر انسان فطرتاً مذہب کی طرف مائل بھی ہو تو ریٹائرمنٹ کے بعد دین کے مطالعے کی طرف ضرور راغب ہوتا ہے، انہوں نے بھی فرصت کے ان لمحات میں قرآن کریم کا مطالعہ شروع کیا، آگے بڑھے تو انگریزی میں جو ترجمے بھی ان کے پیش نظر رہے، وہ انہیں مطمئن نہ کر سکے، ان حالات میں انہوں نے از خود ترجمے کا فیصلہ کیا اور درجنوں تبدیلیوں کے بعد ایک کاپی تیار کرنے میں کام یاب ہو گئے، اب ان کا مجھ سے اصرار ہوا کہ کسی صاحبِ علم اور صاحبِ ذوق شخصیت سے اس کی زبان و بیان پر رائے لی جائے، اپنی نظر میں پہلی شخصیت ڈاکٹر صاحب کی ہی آئی، ان ہی دنوں اتفاق سے امریکہ سے برادر مکرم ڈاکٹر حافظ حقانی میاں قادری بھی آئے ہوئے تھے، ان کا بھی اسلام آباد جانے کا ارادہ تھا، ہمارا پروگرام بن گیا، ڈاکٹر صاحب سے اجازت لی اور اسلام آباد کے لیے روانہ ہو گئے، عرصہ پہلے کی بات ہے، کوئی دس بارہ برس قبل کی، واپڈا ہاؤس میں قیام کا انتظام ہوا، وہاں سامان رکھا اور ٹیکسی لے کر ڈاکٹر صاحب کے ہاں پہنچ گئے۔ وہاں پہنچ کر ابتدائی گپ شپ کے بعد انہیں وہ ترجمہ دکھایا، ڈاکٹر صاحب نے چند جگہوں سے ملاحظہ کیا اور خاموش ہو گئے، انداز ہی سے بہت کچھ تو سمجھ میں آ گیا تھا، مگر میں چوں کہ اسی مقصد کے لیے گیا تھا، اس لیے واضح جواب چاہتا تھا، اب ڈاکٹر صاحب بڑی وضاحت سے اپنی بات کہہ سکتے تھے، جب کہ اصل مترجم سامنے نہ ہونے کی وجہ سے تکلف کا ماحول بھی نہیں تھا، مگر ان کے مزاج کی احتیاط دیکھیے کہ صرف اتنا کہا کہ میں نے خود ترجمہ کیا ہے، اس لیے کسی اور ترجمے پر رائے دینا مناسب نہیں سمجھتا، پھر میرے مزید اصرار پر کہنے لگے کہ ترجمہ تو اہل زبان کے محاورے اور ان کی ضرورت کے مطابق ہونا چاہیے۔ میں نے پھر اصرار کیا کہ اسے بہتر بنانے کے لیے کوئی تجاویز مناسب سمجھیں تو فرمادیں، کہنے لگے کہ تجاویز سے ترجمہ بہتر ہونے کا امکان نظر نہیں آتا۔ یہ بات تو ختم ہو گئی، چوں کہ ڈاکٹر حقانی امریکہ سے آئے تھے، اس لیے قدرتی طور پر گفت گو کا رخ امریکہ کے حالات اور وہاں مسلمانوں کی صورت حال کی جانب مڑ گیا، اور ڈاکٹر صاحب حقانی صاحب کی گفت گو پر مسلسل بامعنی اور مختصر تبصرے فرماتے رہے۔

ڈاکٹر عاصی کرنالی

ڈاکٹر لیاقت علی

یہ انھی دنوں کا قصہ ہے جب شہر اولیا نے ترقی اور تبدیلی کے عفریت کو ابھی اپنے قریب نہیں بھٹکنے دیا تھا اور نہ ہی توسیعِ شہر کے وہ منصوبے منظرِ عام پر آئے تھے کہ جنھوں نے اس شہر سے ہریالی اور درخت ہی نہیں؛ مروت اور تہذیب کی قربانی بھی لی۔ گول باغ اور اس کے مضافات کو صارفیت کے بے لگام ہاتھی نے ابھی نہیں روندا تھا سو آس پاس کتاب اور علم و آگہی سے وابستہ محفلیں بھی آباد تھیں۔ چائے خانوں سے باغ کے سرسبز میدانوں تک ہر طرف جہاں کہیں دو چار لوگوں کی نشست دکھائی پڑتی، سمجھا جا سکتا تھا کہ موضوعِ گفتگو کوئی نئی کتاب، فکر، تحریک یا فلسفہ ہی ہوگا۔ جمعہ کے جمعہ اردو اکادمی ملتان کے تنقیدی اجلاس اور اس کے بعد تا دیر گول باغ کے چائے خانوں میں بیٹھی نابغہ روزگار ہستیاں ہم ایسے نوجوانوں کے لیے کسی نعمت سے کم نہ تھیں۔ کہیں سے لطیف الزماں خاں اپنے روایتی پاجامے کُرتے میں ملبوس آتے دکھائی دیتے تو کہیں سر پر ہیٹ دھرے عرش صدیقی نظر آتے۔ کہیں ارشد ملتانی سرائیکی تہذیب کی ایک زندہ تمثیل بنے دکھائی دیتے تو کہیں اپنے نحیف ہاتھوں میں موٹی جلد کی نایاب کتب اٹھائے آہستہ آہستہ ڈگ بھرتے مرزا ابنِ حنیف نظر آ جاتے۔ چائے خانوں پر مبارک مجوکہ اپنی دل آویز گفتگو سے سامعین کو مبہوت کر لیتے تو کہیں اقبال ارشد اپنے قصوں کی چاشنی سمیت کلام سے سماں باندھ دیتے۔ اُدھر ڈاکٹر انوار احمد سماجی تناظر میں ادبیات کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالتے تو خالد سعید نفسیات کی پیچیدگیوں کو آسانیوں میں تبدیل کر دیتے۔ ایسے میں اپنے پرانے سکوٹر پر مشرقی وضع داری کا عملی نمونہ بنے آنکھوں پر نظر

کا چشمہ ٹکائے ، زبانِ اردو کے روشن ضمیر شاعر، استاد اور مفکر عاصی کرنالی بھی دکھائی دے جاتے ۔ وہ محفلوں میں آتے یا مشاعروں میں شریک ہوتے ، سامعین بے تابی سے اُن کے اشعار ہی نہیں، گفتگو کے بھی منتظر رہتے ۔ بولتے تو لگتا جیسے ناپ تول کر ایک ایک لفظ کو اپنے پورے تہذیبی ولسانی تناظر کے ساتھ برت رہے ہوں ۔فنِ شعر گوئی پر اُن کی گفتگو، شعر فہمی کو نا صرف آسان بنا دیتی بلکہ شعر گوئی کے امکانات کو بھی دو چند کر دیتی ۔ہم نے انہی محفلوں میں عاصی صاحب کی گفتگو سُن سُن کر اپنے تلفظ اور گفتار کی اصلاح کی ۔رموزِ شعر گوئی ہوں یا آدابِ گفتگو، عاصی صاحب نوجوانوں کے لیے چلتی پھرتی اکیڈمی کا درجہ رکھتے تھے ۔ ان کا شمار زبان وادب کے انھی چند معماروں میں ہوتا تھا جن کی آبیاری ہند مسلم تہذیب کے اشتراک سے ہوئی تھی ۔۲ر جنوری ۱۹۲۷ء کو کرنال (موجودہ بھارتی پنجاب) میں جنم لینے والے شریف احمد نے ایک وقت میں اپنے لیے عاصی تخلص تجویز کیا تو جنم بھومی کی نسبت سے یہ عاصی، عاصی کرنالی ہو گئے ۔انھوں نے جس گھرانے میں آنکھ کھولی؛ وہاں معاشی آسودگی تو میسر نہ تھی تاہم علم وادب سے ایک لگاؤ ضرور موجود تھا۔ قیامِ پاکستان کے بعد وہ ہجرت کر کے اپنے کنبے کے ساتھ ملتان آ گئے اور پھر بطور مدرس اپنی ملازمت کے ساتھ ساتھ تعلیم بھی جاری رکھی ۔۱۹۵۰ء میں پرائیویٹ امیدوار کے طور پر پنجاب یونی ورسٹی سے فاضل فارسی ،۱۹۵۴ء میں ایف ۔ اے، ۱۹۵۸ء میں بی ۔ اے، ۱۹۶۰ء میں ایم اے اردو ، اور ۱۹۶۱ء میں اول درجے میں ایم اے فارسی کے امتحانات پاس کیے ۔۱۹۴۸ء میں مسلم ہائی سکول ملتان سے اپنی تدریسی زندگی کا آغاز لینے والے عاصی صاحب اسلامیہ ہائی سکول عام خاص باغ ملتان، ملت ہائی سکول ملتان، اور پھر گورنمنٹ کالج ولایت حسین اور ملت کالج ممتاز آباد ملتان میں اردو کے پروفیسر کی حیثیت سے اپنے فرائض سرانجام دیتے رہے ۔ اِسی ادارے سے وہ پرنسپل کی حیثیت سے ۱۹۸۹ء میں ریٹائر ہوئے ۔ اُن کا شمار ادبیاتِ اردو کے جید اساتذہ میں ہوتا ہے ۔علم سے اُن کی وابستگی کا عالم یہ تھا کہ ۷۰ برس کی عمر میں زکریا یونی ورسٹی ملتان سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ۔ یقیناً اس ڈگری کا حصول کسی مالی منفعت کی خاطر نہیں کیا گیا تھا۔ ادبیات کے روایتی شعرا کے برعکس اُن کے ہاں محبوب کا تصور بھی کسی بازار یا کوٹھے کی بجائے گھر کی چار دیواری سے جُڑا تو ثمر بانو ہاشمی اُن کی اہلیہ ہی نہیں؛ محبوب بھی قرار پائیں ۔ایک ایسی شریکِ سفر کہ جنھیں عاصی صاحب نے اپنی کامیابیوں کا مرکز قرار دیا۔ محترمہ

ثمر بانو ہاشمی خود بھی اردو کی نام وَر شاعرہ اور افسانہ نگار کی حیثیت سے اپنی ایک شناخت رکھتی ہیں ۔سخن فہمی سے یہ تعلق عاصی صاحب کی اگلی نسل میں بھی منتقل ہوا اور اُن کے بیٹے شارق جاوید بھی اردو کے پروفیسر ہی نہیں؛ ایک قادر الکلام شاعر کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں ۔

عاصی صاحب کی ادبی زندگی کا آغاز قیامِ پاکستان سے قبل ہی ہو گیا تھا۔ وہ اپنے ایک استاد ذکی پانی پتی سے بے حد متاثر رہے ۔اگرچہ انھوں نے استاد مذکور سے شعری اصلاح نہیں لی مگر اُن کی شخصیت کے گہرے نقوش اُن میں منتقل ہوئے ۔ آٹھویں جماعت میں ہی تھے جب اُن کی نظمیں مقامی سطح پر شائع ہونے لگی تھیں ۔ وہ دسویں جماعت کے طالب علم تھے جب انھوں نے مسلم لیگ کے لیے ایک نظم کہی جو اُس عہد میں مولانا ظفر علی خان کے معروف اخبار 'زمیندار' کے سرِ ورق پر چھپی ۔ کرنال میں شعر گوئی کے آغاز کے باوجود بطور شاعر و ادیب ملتان ہی اُن کی شناخت کا بنیادی حوالہ بنا۔

اُن کی تخلیقی زندگی پر نگاہ دوڑائیں تو ہمیں کئی جہتوں سے واسطہ پڑتا ہے ۔ جہاں وہ ایک قادر الکلام استاد شاعر تھے وہیں بہت عمدہ نثر نگار بھی رہے ۔شاعری میں انھوں نے نظم وغزل کے مجموعوں (رگِ جاں، جشنِ خزاں، چمن، میں محبت ہوں، مرحلۂ شوق) کے علاوہ حمد ونعت وسلام ومنقبت ومرثیہ کے مجموعے (مدحت، نعتوں کے گلاب، جاوداں، حرفِ شیریں، خاصانِ خدا کربلا میں) اور شعری کلیات (تمام و ناتمام) یادگار چھوڑے ۔ علاوہ ازیں ایک افسانوی مجموعے 'چہرہ چہرہ ایک کہانی' اور تخلیقی نثر میں 'لبِ خنداں' (طنز و مزاح)، 'اپنی منزل کی طرف' (سفرنامہ) اور 'چراغِ نظر' (انشائیے، خاکے) بھی یادگار چھوڑے ۔

عاصی صاحب کو اپنی نعتوں کے مجموعے 'نعتوں کے گلاب' پر ۱۹۸۸ء میں قومی سیرت کانفرنس میں صدارتی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اِس کے علاوہ اپنی تخلیقی زندگی میں انھیں مختلف سرکاری ونیم سرکاری اداروں کی طرف سے تیس کے قریب ایوارڈز اور اعزازات سے نوازا گیا۔

بحیثیت شاعر وہ کلاسیکی مزاج کے حامل رہے اور کم وبیش ہر صنفِ سُخن میں طبع آزمائی کی ۔ مذہب اور بالخصوص اہلِ بیت سے محبت اُن کی شاعری کا کلیدی حوالہ قرار پائے ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے نعتوں اور سلام ومنقبت کے باقاعدہ مجموعے چھپ کر سامنے آئے ۔

۲۰ جنوری ۲۰۱۱ء کی شام ملتان کی ادبی، تہذیبی اور مدرسانہ تاریخ کا یہ معتبر حوالہ سفرِ

آخرت پر روانہ ہوا لیکن اپنے پیچھے یادوں کا اَن مٹ خزانہ چھوڑ گیا۔

سیّد عابد علی عابؔد

ڈاکٹر ارشد محمود ناشاؔد

سیّد عابد علی عابؔد کا شمار بیسویں صدی کی یگانۂ روزگار شخصیات میں ہوتا ہے۔ انھوں نے تعلیم و تدریس اور شعر و ادب کے شعبوں میں اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کی بدولت ایسے چراغ روشن کیے، جن کی ضیا پاشی سے ایک زمانہ مستنیر ہوا۔ وہ صحیح معنوں میں ہشت پہلو شخصیت تھے۔ انھوں نے شاعری، افسانہ نگاری، ڈراما نگاری، تنقید، تحقیق، تدریس، ترجمہ کاری اور ادبی صحافت کے میدانوں میں ایسے یادگار اور مثالی کارنامے انجام دیے، جو ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ ان کی زندگی کا ایک بڑا حصّہ علم و ادب کی آبیاری میں بسر ہوا۔ ان کی کوشش و کاوش سے تعلیمی اداروں کا ماحول علم و ادب کی خوش بو سے مہکنے لگا اور ان کے فیضِ تربیت نے ہزاروں طلبہ کی تراش خراش اور ان کی سیرت کی تعمیر و تشکیل میں مؤثر اور فعال کردار ادا کیا۔

سیّد عابد علی عابؔد کا تعلق سادات کے ایک علمی گھرانے سے تھا۔ آپ کے پردادا سید رجب علی ارسطو جاہ [م: ۱۸۶۹ء] اپنے عہد کے سربرآوردہ اشخاص میں شامل تھے۔ انگریز سرکار نے انھیں ''خان بہادر'' کا خطاب دیا۔ اپنے عہد کے اربابِ سیاست اور اہلِ علم کے ساتھ اُن کے گہرے دوستانہ مراسم تھے۔ مرزا اسد اللہ خان غالبؔ اور دوسرے نام ور اکابر کے ساتھ ان کا سلسلۂ مکاتبت ان کے ذوق و شوق اور اثر و رسوخ کا آئینہ دار ہے۔ عابؔد کے والد سید غلام عباس شاہ بھی شاعری کا عمدہ مذاق رکھتے تھے۔ ان کا تخلص صغیؔر تھا اور گاہے گاہے شعر بھی کہتے تھے مگر نمونۂ کلام محفوظ نہیں۔ عابؔد کی والدہ اقبال بیگم بھی ایک متمول اور تعلیم یافتہ خاندان سے تھیں۔ یوں علم

و ادب کا ذوق عابؔد کو ورثے میں ملا، جسے ذاتی استعداد اور کسب و ممارست سے انھوں نے بامِ کمال تک پہنچایا۔ عابد علی عابؔد کی تاریخِ پیدائش اور مقامِ ولادت میں محققین اور اہلِ قلم کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض تذکار میں ان کی تاریخ پیدائش ۲۰/اکتوبر ۱۹۰۶ء درج ہے اور ڈیرہ اسماعیل خان کو ان کا مولد قرار دیا گیا ہے مگر محققین کی اکثریت جن میں ڈاکٹر عبدالرؤف شیخ، محمد اسماعیل پانی پتی اور پروفیسر محمد اسلم کے نام بھی شامل ہیں، نے ان کی تاریخِ پیدائش ۱۷/ستمبر ۱۹۰۶ء پر اتفاق کیا ہے اور لاہور کو ان کا مولد قرار دیا ہے۔ عابؔد کے والد فوج میں ملازم تھے اور وہ ڈیرہ اسماعیل خان میں بھی بہ سلسلۂ ملازمت مقیم رہے۔ عابد علی عابؔد کی ابتدائی تعلیم بھی چوں کہ ڈیرہ اسماعیل خان میں ہوئی، اسی وجہ سے بعض محققین نے ڈیرہ اسماعیل خان کو ان کا مقامِ ولادت ٹھہرایا۔ سات سال کی عمر میں انھیں دادا کے پاس لاہور بھیج دیا گیا۔ یہاں انھیں مشن ہائی سکول، رنگ محل میں داخل کیا گیا۔ عابؔد نے ۱۹۲۱ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ میٹرک کے بعد والد نے انھیں واپس ڈیرہ اسماعیل خان بلوا لیا۔ عابؔد مزید تعلیم حاصل کرنا چاہتے تھے مگر والد کے اصرار پر انھیں سکول میں ملازمت کرنا پڑی۔ ملازمت کے ساتھ ساتھ عابؔد نے اپنی تعلیم بھی جاری رکھی اور ۱۹۲۲ء میں منشی فاضل اور ۱۹۲۳ء میں بی اے کے امتحانات بہ طور پرائیویٹ امیدوار پاس کیے۔ بعد ازاں وہ ملازمت چھوڑ کر لاہور آ گئے اور لا کالج، لاہور میں داخلہ لے لیا جہاں سے ۱۹۲۵ء میں درجۂ اوّل میں ایل ایل بی اور پھر ۱۹۳۰ء میں پنجاب یونی ورسٹی سے ایم اے فارسی کی ڈگریاں حاصل کیں۔

سید عابد علی عابؔد نے عملی زندگی کا آغاز گجرات میں وکالت سے کیا۔ یہ شعبہ ان کے مزاج سے پوری طرح ہم آہنگ نہ تھا، اس لیے بہت جلد وہ اسے ترک کر کے تدریس کے شعبے میں آ گئے۔ اوّل اوّل وہ مولانا تاجور نجیب آبادی کی وساطت سے دیال سنگھ کالج، لاہور میں فارسی کے جزوقتی استاد مقرر ہوئے۔ اس دوران میں وہ ایف سی کالج اور نیشنل سکھ کالج میں بھی تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے۔ یکم اکتوبر ۱۹۳۷ء میں دیال سنگھ کالج میں فارسی کے مستقل لیکچرر مقرر ہوئے۔ ۱۹۴۷ء میں وہ اسی کالج کے پرنسپل بنے مگر ٹرسٹ کے ممبران اور ٹیچنگ سٹاف کی ریشہ دوانیوں اور ملی بھگت سے ۲۵/نومبر ۱۹۵۴ء میں انھیں ملازمت سے برخاست کر دیا گیا۔ حالات سے مجبور ہو کر وہ اسی کالج میں سال بھر فارسی کے عاضی لیکچرار رہے۔ یہ وقت انھوں نے نہایت

کرب اور پریشاں حالی میں گزارا۔ بعدازاں وہ قلم کی مزدوری کرنے لگے، ریڈیو لاہور کے لیے انھوں نے کئی فیچر اور ڈرامے لکھے، کئی کتابوں کے اُردو میں تراجم کیے اور مختلف اخبارات ورسائل میں مضامین، افسانے اور تحریریں لکھ کر وہ گزر بسر کرتے رہے۔ ۱۹۵۶ء میں وہ مجلسِ ترقیِ ادب سے وابستہ ہوئے؛ جون ۱۹۵۷ء میں عابدؔ کی تحریک پر مجلس کے مجلّے ''صحیفہ'' کا اجرا ہوا۔ عابد علی عابدؔ اس کے پہلے مدیر مقرر ہوئے۔ عابدؔ نے اپنی غیر معمولی استعداد اور صلاحیت سے بہت جلد اس مجلّے کو صفِ اوّل کا تحقیقی اور علمی مجلّہ بنا دیا۔ ۱۰/ جولائی ۱۹۶۲ء میں وہ مجلس کے باقاعدہ ملازم ہوئے اور اپنی وفات تک وہ اس ادارے کے ساتھ وابستہ رہے۔ اس ملازمت کے دوران میں انھوں نے مجلس کی مطبوعات پر دیباچے، مقدمے اور تبصرے لکھے اور کئی کتب کے متون کی ترتیب وتہذیب میں حصّہ لیا۔ سید عابد علی عابد نے تین شادیاں کیں مگر صرف پہلی بیگم سے اولاد ہوئی۔ سیّد مینو چہر ان کے اکلوتے صاحب زادے ہیں، جنھوں نے اپنے والدِ گرامی کے غیر مطبوعہ اور غیر مدون کلامِ نظم ونثر کو جمع کر کے شائع کرنے کا اہتمام کیا۔ بیٹیوں میں شبنم شکیل نے اپنے باپ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے افسانہ نویسی اور شاعری میں نام پیدا کیا۔ سیّد عابد علی عابدؔ ۲۰/ جنوری ۱۹۷۱ء کو دل کا دورہ پڑنے کے باعث راہیِ ملکِ بقا ہوئے۔

سیّد عابد علی عابدؔ نے جو علمی وادبی سرمایہ یادگار چھوڑا وہ اپنے انفرادی رنگ وآہنگ کے باعث مثالی حیثیت کا حامل ہے۔ عابدؔ نے اگرچہ ادب کے مختلف شعبوں میں خدمات انجام دیں تاہم ان کا تنقیدی سرمایہ قدر وقیمت اور وقعت کے اعتبار سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ ان کی تنقید اگرچہ مشرقی رنگ کی ہے تاہم انھوں نے مغربی تنقید کے رنگ وروغن سے بھی استفادہ کیا ہے۔ اس استفادے کے باعث ان کی تنقید میں توازن، اعتدال، وسعت اور ہمہ رنگی کی صفات جلوہ گر ہوئی ہیں۔ وہ انگریزی کے ساتھ فارسی اور عربی کی تنقیدی روایتوں سے بھی خوشہ چینی کرتے ہیں مگر کہیں بھی مرعوبیت یا تقلیدِ محض کا شکار نہیں ہوتے۔ ان کا رچا ہوا ادبی مذاق حسن وقبح میں تمیز کرنے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ اسی ذوقِ سلیم نے ان کی تنقید کو تخلیق کی شان عطا کی ہے۔ تنقیدی شعبے میں عابدؔ کا سب سے وقیع کارنامہ ''اصولِ انتقادِ ادبیات'' ہے، جس میں پہلی بار اُردو ادب کی شعری اور نثری اصناف کی تنقید کے لیے اصول وقواعد وضع کیے گئے ہیں۔ اس سے قبل اگرچہ بعض اصناف کے حوالے سے مولانا الطاف حسین حالی اور دوسرے تنقید نگاروں نے ادبی تنقید کے اصول وضع

کرنے کی سعی کی مگر عابدؔ کا کام زیادہ جامعیت اور وسعت کا حامل ہے۔ انھوں نے ان اصولوں کی روشنی میں ادب کی منتخب تخلیقات کا جائزہ پیش کر کے اپنے نظری علم کو عملی صورت دینے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ نقدِ شعر کے اصول تو تذکروں سے لے کر جدید تنقید نگاروں تک کہیں کہیں اپنی جھلک دکھاتے ہیں مگر داستان، ناول، افسانہ، ڈراما جیسی نثری اصناف کے حوالے سے تنقیدی اصول ''اصولِ انتقادِ ادبیات'' ہی میں مرتب ہوئے ہیں۔ عابدؔ کی دیگر تنقیدی کتابوں میں ''البیان''، ''البدیع''، ''اسلوب''، ''شعرِ اقبال''، ''انتقاد''، ''تلمیحاتِ اقبال'' اور ''تنقیدی مضامین'' شامل ہیں۔ ''البیان''، ''البدیع'' اور ''اسلوب'' اپنے مزاج اور انداز کے باعث ایک طرز کی حامل ہیں۔ ان کتابوں میں عابد علی عابدؔ نے نہایت شرح وبسط کے ساتھ بیان، بدیع اور اسلوب کے عناصر اور اصطلاحات کا مفہوم، دائرۂ کار اور ان کے استعمال کے حسن وقبح کو واضح کیا ہے۔ انھوں نے ان علوم وفنون پر مشرق ومغرب کے نمائندہ لکھنے والوں سے کسبِ فیض بھی کیا ہے اور ان کے تسامحات کی گرفت بھی کی ہے۔ عابدؔ کی یہ کتابیں صحیح معنوں میں نظری اور عملی تنقید کا نمونہ ہیں۔ عابدؔ کے خیال کے مطابق نقاد کو ادبی اصطلاحات سے پوری طرح آگاہ ہونا چاہیے۔ اس واقفیت کے بغیر وہ کسی فن پارے کے حسن وقبح کے بارے میں درست فیصلہ نہیں کر سکے گا۔ اپنے ایک مضمون ''انتقاد کا منصب'' میں وہ اصطلاحات سے کماحقہٗ واقفیت کی ضرورت بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ''مُسلّم ہے کہ ہر علم کی ایک خاص زبان ہے جو اس کے مخصوص حقائق کی ترجمان ہے۔ کچھ رموز وعلامات ہیں، کچھ اشارات وکنایات ہیں، کچھ اصطلاحات ہیں، ان کے معنی متعین، دلالتیں روشن اور ان کے پہلو بیّن ہونے چاہئیں۔ یہ چیزیں تبادلۂ افکار کا زرِ رائج الوقت ہیں۔ اس زر کو کھرا ہونا چاہیے۔ اپنی رموز وعلامات سے کام لے کر ہر علم وفن کے ماہر دوسروں کی بات سمجھتے ہیں اور اپنا مطلب دوسروں کو سمجھاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر فن کے ماہر ایک ہی زبان بولتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس اعتبار سے موجودہ اُردو انتقاد پر ایک نظر ڈالیے تو آوے کا آوا بگڑا نظر آئے گا۔''

عابد علی عابدؔ کا دوسرا بڑا تنقیدی کارنامہ ''شعرِ اقبال'' کو قرار دیا جا سکتا ہے۔ علامہ اقبال

یگانۂ روزگار شاعر تھے۔ انھوں نے اپنی شاعری اور مکاتیب میں جا بہ جا اپنے شاعر ہونے کی نفی کی ہے تا کہ قاری ان کی شاعری کے حسن و جمال میں گم ہو کر ان کے پیغام سے غافل نہ ہو جائے۔ اقبال کی اس تاکید کے باعث ان کے شعری نظام اور ان کے فن کی طرف ناقدین کی توجہ عموماً کم کم رہی ہے۔ عابدؔ نے نہایت گہرائی اور گیرائی کے ساتھ اقبال کے شعورِ تخلیق کا جائزہ پیش کر کے ان کے شاعرانہ مقام و مرتبے کی تعیین کی ہے۔ یہ کتاب اقبالیاتی سرمائے میں اضافہ ہے اور اقبال کے فن کے اسرار و رموز کو سمجھنے اور اس کی شاعری سے پوری طرح حظ اندوز ہونے کے لیے اس کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ عابدؔ کے تنقیدی مضامین بھی ان کے رنگِ خاص کے آئینہ دار ہیں۔ ان مضامین میں انھوں نے لفظ و معنی کے رشتے، غنائیت اور نغمگیت کی کیفیتوں، آرائشی عناصر کے صناعانہ استعمال سمیت متعدد شعری جمالیات کے موضوعات پر قلم اٹھایا ہے اور صحیح بات تو یہ ہے کہ حق ادا کر دیا ہے۔ تنقید کے لیے عابدؔ نے جو زبان استعمال کی ہے وہ تخلیقیت کی چاشنی میں گندھی ہوئی ہے۔ ان کے اسلوبِ نگارش پر فارسی زبان کا فیضان پوری طرح سایہ فگن ہے۔ اس وصف کے باعث ان کی نثر میں وہ جادو بھر گیا ہے جو قاری کے سر چڑھ کر بولتا ہے۔ زبان کے اس خلاقانہ اور شاعرانہ رنگ رس نے تکنیکی اور فنی مباحث میں بھی افسانے اور داستان کی سی دل چسپی پیدا کر دی ہے۔

عابد علی عابدؔ کی دوسری نمایاں حیثیت ایک نغز گو شاعر کی ہے۔ انھوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز شعر گوئی سے کیا اور بہت جلد ان کے شمار اپنے عہد نے خوش نوا شاعروں میں ہونے لگا۔ ان کی زندگی میں ان کے دو شعری مجموعے اشاعت پذیر ہوئے۔ پہلا مجموعہ ''شب نگار بنداں'' کے نام سے ۱۹۵۵ء میں جب کہ دوسرا ''بریشمِ عود'' ۱۹۶۶ء میں مطلعِ ادب پر جلوہ گر ہوا۔ ان کی وفات کے بعد ان کے صاحب زادے سیّد مینو چہر نے ان دونوں مجموعوں کو ''میں کبھی غزل نہ کہتا'' کے عنوان سے یک جا کر دیا۔ عابدؔ کی شاعری تغزل کی سرشاری اور جذبے کی وارفتگی کی ترجمان ہے۔ فارسی شاعری کے بسیط مطالعے اور اُردو شاعری کی روایت کے صحیح عرفان کے باعث اُن کا رنگِ شعر نکھرا اور اپنی جمالیاتی قدروں کے باعث مثالی ٹھہرا۔ ان کی شاعری میں حسن و عشق کی دلآویز کیفیتیں، ہجر و وصل کے انوکھے مناظر اور انسانی زندگی کے اسرار و رموز کی حیرتیں زبان و بیان

کے معجزانہ رنگوں کا لباس پہنے دکھائی دیتی ہیں۔ لفظ و معنی کے کامل عرفان، آرائشی و زیبائشی عناصر سے گہری شناسائی، نغمہ و آہنگ اور دیگر فنی زاویوں سے پوری واقفیت نے ان کے رنگِ شعر کو عجب نوع کی دل پذیری اور رعنائی عطا کی ہے۔ ان کی غزلوں کے چند شعر دیکھیے:

اس کے باوصف کہ پابندِ سلاسل ہے نسیم
مہک اُٹھے جو گلستاں تو مزا آ جائے

☆

دیکھنا یہ غزل ہے عابدؔ کی
کہیں چھپتا بھی ہے مزاج کا رنگ

☆

تمھاری چشمِ سخن ساز کے اشاروں پر
غزل کے طاق میں جادو جگا دیے میں نے

☆

عرضِ ہنر ہے پردۂ اظہارِ آرزو
پوشیدہ ہیں کلام کی عریانیوں میں ہم

☆

دمِ رخصت وہ چُپ رہے عابدؔ
آنکھ میں پھیلتا گیا کاجل

تنقیدِ عابدؔ کی تاب ناکی نے اُن کی دیگر تخلیقی جہات کو ابھرنے اور روشناسِ خلق ہونے کا موقع نہ دیا۔ وہ نقاد اور شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ اعلیٰ درجے کے فکشن رائیٹر بھی تھے۔ ادبی زندگی کی ابتدا ہی میں وہ افسانہ کی زلفِ گرہ گیر میں اسیر ہوئے اور دسیوں عمدہ افسانے تخلیق کیے۔ ہزار داستان اور دوسرے ادبی رسالوں میں شاعری اور مضمون نویسی کے ساتھ ان کے افسانے بھی شائع ہوتے رہے۔ ۱۹۲۳ء میں ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''حجابِ زندگی اور دیگر

افسانے'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ دوسرا مجموعہ ''قسمت اور دوسرے افسانے'' ۱۹۳۲ء میں جب کہ تیسرا مجموعہ ''طلسمات'' کے نام سے ۱۹۳۶ء میں چھپا۔ ان مجموعوں میں شامل افسانوں کے علاوہ ڈاکٹر عبدالرؤف شیخ نے ان کے کئی غیر مدون افسانوں کا ذکر کیا ہے۔ اس قدر افسانے تخلیق کرنے کے باوجود افسانے کی تاریخ میں ان کا ذکر کم کم کیا گیا۔ اُردو کے مختصر افسانے کی تعمیر و تشکیل اور فروغ میں عابدؔ نے مؤثر اور فعال کردار ادا کیا۔ ان کا شمار بلاشبہ اُردو افسانے کے معماروں میں ہوتا ہے۔ عابدؔ کے افسانوں میں حقیقت اور رومان کا عمدہ امتزاج ملتا ہے۔ سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتح پوری اور دیگر رومانی افسانہ نویسوں کے برعکس ان کے افسانوں میں جذبات و احساسات کے بیان کا رنگ زیادہ حیرت آگیں ہے اور اس کا سبب اُن کا شاعرانہ اسلوبِ نگارش ہے جو مخیلہ کی اُڑان کو نت نئے زاویوں سے پیش کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ریڈیو سے وابستگی کے زمانے میں عابدؔ نے کئی ریڈیائی ناول بھی تحریر کیے جو بعد ازاں کتابی صورت میں اشاعت پذیر ہوئے۔ ان ریڈیائی ڈراموں میں شمع، دکھ سکھ، سہاگ اور چاندنی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان ناولوں میں سماجی زندگی کے مختلف مسائل کو نہایت ہنرمندی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ مختلف مناظر اور واقعات کی جزئیات ان کے گہرے مشاہدے کی غمازی کرتی ہیں اور قاری یا سامع کو اپنی طرف متوجہ رکھتی ہیں۔ انھوں نے ریڈیو ڈراما نگار کی حیثیت سے بھی شہرت پائی۔ ان کے کئی طبع زاد اور ترجمہ کردہ ڈرامے ریڈیو لاہور سے نشر ہوئے۔ عابدؔ کے ریڈیائی ڈراموں میں شہباز خان اور یدِ بیضا کتابی صورت میں بھی شائع ہوئے۔

سیّد عابد علی عابدؔ کے کمال کا ایک اور زاویہ ترجمہ کاری ہے۔ انھوں نے کئی علمی اور ادبی کتابوں، مضامین اور تحریروں کے تراجم کیے۔ تراجم کا یہ سلسلہ اگرچہ معاشی ضروریات کی تکمیل کے لیے تھا مگر ان کے ذوقِ ادبی نے ان میں بھی تخلیقی شان پیدا کر دی۔ ان کے معروف تراجم ''فلسفہ کی کہانی''، ''گل ہائے بہار''، ''داستان''، ''بشر ہے کیا کہیے''، ''ایرانِ قدیم''، ''میراثِ ایران'' اور ''تعلیم کا عمل'' شامل ہیں۔ مجلسِ ترقیِ ادب کی ملازمت کے زمانے میں انھوں نے کئی کتابوں کے مقدمات، دیباچے، حواشی اور تبصرے تحریر کیے جو ان کی علمی بصیرت اور ادبی شان کی گواہی دیتے ہیں۔ علم و ادب کے ساتھ عابدؔ کا تعلق زندگی بھر قائم رہا۔ انھوں نے اپنے زمانۂ تدریس میں اپنے شاگردوں میں علم و ادب کی جوت جگا کر انھیں میدانِ زندگی میں اُتار دیا۔ ان

کے شاگردوں نے علم و ادب کے شعبوں میں گراں قدر خدمات انجام دے کر اپنے استاد کی عظمت کو منوا لیا۔ ان کے نام ور اہلِ قلم تلامذہ میں شہرت بخاری، شیخ منظور الٰہی، قیوم نظر، ریاض احمد، میرزا محمد منور اور ڈاکٹر وحید قریشی کے نام شامل ہیں۔ ان کا رنگِ تدریس کیا تھا شیخ منظور الٰہی کی زبانی سُنیے:

> ''عابد صاحب میز سے ٹیک لگائے کھڑے ہیں۔ فصاحت و بلاغت کا دریا بہ رہا ہے۔ لیکچر کیا ہے، ایک نسیمِ جاں فزا کا جھونکا ہے۔ ایک جوئے رواں کی مانند اُردو، فارسی، انگریزی کے جملے ایک دوسرے میں مدغم ہو رہے ہیں۔ کلاسیکی فارسی کے تانے بانے سنگ تراشی، مصوری، ادب اور موسیقی سے یوں مل رہے ہیں کہ اجنبیت کا احساس تک نہیں ہوتا۔ اکثر اشعار کی تشریح اشعار ہی میں ہو رہی ہے اور اس انداز سے کہ اسرار و رموز خود بخود کھلتے جائیں۔''

مشرقی ادبیات کا یہ نام ور عالم اور مہا استاد اس قابل ہے کہ اسے یاد رکھا جائے اور علم و ادب کی ساتھ اُس کی سچی اور بے غرض محبت کو خراج پیش کیا جائے۔

کتنے روشن تھے گوشہ ہائے خیال
ہر طرف آفتاب تھا، کیا تھا

علامہ عبدالعزیز میمن

ڈاکٹر رؤف پاریکھ

عربی زبان کی اہمیت اور عظمت تو اسی بات سے ظاہر ہے کہ یہ نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان تھی، اسی میں قرآنِ عظیم نازل ہوا۔لیکن اس سے ہٹ کر دیکھا جائے تو بھی عربی دنیا کی بڑی زبانوں میں شامل ہے۔ یہ اس وقت ستائیس ملکوں کی قومی زبان ہے اور اسے تقریباً تیس کروڑ افراد بطور مادری زبان بولتے ہیں۔

عربی کی فصاحت و بلاغت ضرب المثل ہے۔عرب بجا طور پر اپنی زبان پر فخر کرتے ہیں۔شاید اسی نے عربوں سے یہ کہلوایا کہ غیر عرب ''عجم'' (یعنی گونگا) ہے۔ان کے خیال میں عربی کی فصاحت و بلاغت کے آگے دنیا کی ہر زبان گونگی ہے۔لیکن انہی عجمیوں میں سے عربی زبان کے ایسے ایسے ماہرین اٹھے کہ خود عرب بھی داد دینے پر مجبور ہوگئے اور ان کی عربی دانی کی مہارت کو انھوں نے تسلیم بھی کیا اور خراجِ عقیدت بھی پیش کیا۔ایران اور برعظیم پاک و ہند نے عربی کے ایسے ماہرین اور اساتذہ پیدا کیے جن کا لکھا ہوا یا کہا ہوا عربی زبان کے استعمال کی سند کے طور پر تسلیم کیا گیا۔ مثال کے طور پر عربی کی مستند لغت القاموس کے مولف مجدد الدین فیروز آبادی کا تعلق ایران سے تھا۔

عربی کے ایسے ہی غیر عرب ماہرین اور اساتذۂ کرام میں علامہ عبدالعزیز میمن بھی شامل تھے۔کسی غیر ملکی زبان کو کما حقہ سیکھ لینا عام بات ہے، یہ کام کئی لوگ کر لیتے ہیں لیکن ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے کہ کسی زبان کے اہل زبان اور جید عالم کسی غیر کی اس زبان پر دست رس اور عبور کو تسلیم کریں۔عربی زبان میں عبدالعزیز میمن کی مہارت اور عربی ادب پر دست رس کا اعتراف عرب

محققین و ماہرین نے بھی کیا۔مصر، شام اور سعودی عرب کے جید علما و اساتذہ نے علامہ میمنی کو شان دار الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ بلکہ عرب دنیا میں تو وہ ''استاذ المیمنی'' کے نام سے معروف تھے اور ہیں۔انھیں امام اللغہ یعنی لغت کا امام بھی کہا جاتا تھا۔انھیں بلا مبالغہ عربی کے ایک لاکھ کے قریب اشعار یاد تھے اور وہ کلاسیکی عربی شاعری کے اشعار بھی زبان و لغت اور عربی الفاظ و محاورات کے استعمال کی سند کے طور پر فی البدیہہ پیش کر دیتے تھے۔

ہندوستان کے صوبے گجرات میں ایک علاقہ کاٹھیاواڑ کے نام سے ہے۔اس کا شہر راج کوٹ علامہ عبدالعزیز میمن کا آبائی شہر ہے۔البتہ ان کی پیدائش کاٹھیاواڑ کے گونڈل نامی شہر میں ۲۳/اکتوبر ۱۸۸۸ء کو ہوئی جہاں ان کی ننھیال تھی۔گھر میں ابتدائی تعلیم کے بعد جونا گڑھ میں مدرسہ مہابت خان میں داخل ہوئے۔ان کے والد عبدالکریم دینی رجحان رکھتے تھے اور اپنے بیٹے کو عالمِ دین بنانا چاہتے تھے لہٰذا انھوں نے ۱۹۰۱ء میں جب علامہ صاحب کی عمر تیرہ سال تھی انھیں دہلی بھجوا دیا۔دہلی میں آپ نے فارسی اور عربی پڑھی اور بالخصوص عربی میں اس دور کے جید اساتذہ سے کسبِ فیض کیا جن میں دیگر اہل علم کے ساتھ اردو کے معروف ادیب مولوی نذیر احمد دہلوی بھی شامل تھے۔علامہ عبدالعزیز میمن نے ایک انٹرویو میں بتایا تھا کہ اس زمانے میں ہندوستان میں شاید ہی کسی کو عربی پر اتنی دست رس ہو جتنی نذیر احمد کو تھی جو عربی میں نہایت عمدہ شعر بھی کہتے تھے اور کبھی فی البدیہہ بھی نہایت عمدہ عربی شعر کہہ دیتے تھے۔

عبدالعزیز میمن کو علم کی طلب امروہہ اور رام پور لے گئی۔پنجاب یونی ورسٹی سے منشی فاضل اور مولوی فاضل کے امتحانات میں نمایاں کام یابی حاصل کی۔۱۹۱۹ء میں آپ پشاور کے ایڈورڈ کالج میں فارسی اور عربی کے لیکچرر مقرر ہوئے۔پشاور کے اسلامیہ کالج کے مضطوطات کی فہرات کی تصحیح و اضافے کا کام آپ نے اسی عرصے میں کیا اور عربی کے نصاب میں ضروری اصلاحات سے متعلق کچھ مضامین بھی لکھے جو لاہور سے نکلنے والے معروف جریدے ''مخزن'' میں شائع ہوئے۔اورینٹل کالج لاہور کے پرنسپل مولوی محمد شفیع مشرقی السنہ و ادبیات کے عالم، محقق اور استاد تھے۔عبدالعزیز میمن کو انھوں نے اورینٹل کالج میں ۱۹۲۱ء میں عربی کا استاد مقرر کیا۔بعد ازاں علامہ میمن صاحب کو اورینٹل کالج میں عربی اور فارسی کے شعبوں کا سربراہ بھی مقرر کیا گیا۔ برعظیم پاک و ہند میں ان کی عربی دانی اور تبحر علمی کی بازگشت سنائی دینے لگی تھی لہٰذا ۱۹۲۵ء میں ندوۃ العلما (لکھنو

ئ) نے انھیں مدعو کیا کہ وہ عربی زبان وادب پر خطبات دیں۔ ندوہ خود عربی اور دینی ومشرقی علوم کا بڑا مرکز تھا اور یہ دعوت بذاتِ خود اعترافِ فضیلت تھی۔ ۱۹۲۵ء میں میمن صاحب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں عربی کے استاد مقرر ہو گئے اور اپنی تحقیق اور علمیت کے سبب وہاں صدرِ شعبہ عربی کے عہدے پر بھی فائز ہوئے۔ وہ پہلے غیر یورپی اور غیر عرب تھے جنھیں علی گڑھ یونی ورسٹی میں اس شعبے کی صدارت دی گئی۔ اس سے قبل انگریز یا جرمن یا عرب اساتذہ صدور رہے تھے۔ اسی زمانے میں انھیں شام کے معروف علمی ادارے المجمع العلمی العربی (موجودہ نام مجمع اللغه العربیه) نے رکنیت دی جو بہت کم محققین اور عالموں کو دی جاتی تھی۔ عبدالعزیز میمن سے قبل برعظیم میں صرف حکیم اجمل خان کو یہ اعزاز حاصل تھا۔

آزادی کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں کی صورت حال کو مایوس کن دیکھ کر عبدالعزیز میمن ۱۹۵۴ء میں ہجرت کر کے پاکستان آ گئے اور انھیں کراچی میں نو قائم شدہ اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی صدارت کی پیش کش کی گئی جو انھوں نے قبول کر لی۔ جب ۱۹۵۶ء میں کراچی یونی ورسٹی میں شعبۂ عربی کا قیام عمل میں آیا تو اس وقت کے شیخ الجامعہ پروفیسر اے بی حلیم نے ان سے درخواست کی کہ وہ شعبۂ عربی کی صدارت کا منصب قبول فرمائیں۔ اس درخواست کو منظور کرتے ہوئے علامہ صاحب نے تقریباً ڈھائی برس تک شعبے کی صدارت کی۔ جب میمن صاحب ۱۹۶۴ء میں عربی کانفرنس میں شرکت کرنے لاہور گئے تو پنجاب یونی ورسٹی کے شیخ الجامعہ پروفیسر حمید احمد خان نے ان سے درخواست کی کہ وہ شعبۂ عربی کی صدارت سنبھالیں چنانچہ علامہ صاحب دو برس پنجاب یونی ورسٹی اورینٹل کالج میں صدرِ شعبہ عربی رہے۔ وہ عرب دنیا میں علمی اداروں اور یونیورسٹیوں میں لیکچر دینے جایا کرتے تھے اور پنجاب یونی ورسٹی کے بعد دنیا کی بعض بڑی جامعات نے انھیں اپنے ہاں مستقل تدریس کے لیے رضامند کرنا چاہا لیکن اس وقت تک ان کی خاصی عمر ہو چکی تھی اور انھوں نے مستقلاً کراچی میں قیام کا فیصلہ کر لیا تھا۔

علامہ عبدالعزیز میمن تدریس کے علاوہ عربی زبان وادب پر تحقیق کے لیے دنیا بھر میں شہرت رکھتے تھے۔ عربی کے بعض قدیم مخطوطات اور نایاب قلمی نسخوں پر ان کی تحقیق وتدوین نے ان کو عرب دنیا میں محترم اور مقبول بنا دیا تھا۔ کلاسیکی عربی زبان و ادب پر عربی میں تیس (۳۰) کتابیں تحریر فرمائیں اور ان کے بعض علمی کارناموں پر عرب عالم اور محقق بھی متحیر رہ

گئے۔ ان کی کتابیں جو لبنان، شام اور مصر سے شائع ہوئیں عرب دنیا کی کئی یونیورسٹیوں میں بطور نصابی کتب تجویز کی گئیں۔ عربی مخطوطات پر گہری نظر تھی اور کئی اہم عربی مخطوطات کی تدوین کی اور انھیں شائع کرایا۔ لغاتِ قرآن پر بھی عمیق نظر تھی اور اس ضمن میں بھی ان کا علم مستحضر تھا۔

تعجب خیز بات یہ ہے کہ علامہ صاحب کی مادری زبان میمنی تھی اور بقول خود ان کے انھوں نے اردو بھی صحیح معنوں میں دہلی جا کر سیکھی تھی لیکن جب عرب دنیا میں عربی کے کسی لفظ کے استعمال یا معنی وتلفظ پر کوئی اختلاف اٹھتا تو علامہ صاحب سے رجوع کیا جاتا تھا۔ جب عربی کی مستند اور جامع لغت ''لسان العرب'' کی تدوین وتالیفِ نو کا فیصلہ ہوا تو عربی زبان کے بڑے عالموں کے ساتھ علامہ صاحب کو بھی اس کی مجلس میں شامل کیا گیا۔

بعض چشم دید گواہوں کا بیان ہے کہ جب کسی سرکاری تقریب میں علامہ صاحب تشریف لاتے تو عرب ممالک کے سفیر کھڑے ہو کر ان کا استقبال کرتے۔ مصری سفیر عبدالوہاب عزام ان کے بڑے گرویدہ تھے اور ان کے پاکستان میں مستقل قیام کے پیچھے عزام ہی تھے جنھوں نے حکومت پاکستان کے اعلیٰ افسران اور وزرا کو قائل کیا کہ عربی کا یہ عالم ہندوستان کی بجائے پاکستان میں ہونا چاہیے۔ جمیل الدین عالی صاحب نے راقم کو بتایا کہ عالی صاحب جب پہلی بار عراق گئے اور ان سے پوچھا گیا کہ کہاں سے آئے ہیں تو یہ بتانے پر کہ پاکستان سے، کہا گیا کیا استاذ المیمنی کے ملک سے؟ گویا عبدالعزیز میمن بیرون ملک پاکستان کی پہچان تھے۔ ترقی اردو بورڈ، کراچی، (موجودہ نام اردو لغت بورڈ) میں شان الحق حقی اور ممتاز حسن نے علامہ صاحب کے خطبات کا اہتمام کیا اور انھوں نے کئی نشستوں میں عربی لغت نویسی پر لیکچر دیے جو بورڈ کے رسالے ''اردو نامہ'' میں شائع بھی ہوئے۔

علامہ عبدالعزیز میمن کی تصنیفات وتالیفات کی ایک طویل فہرست ہے اور ان میں سے چند کا ذکر کیا جاتا ہے:

۔ الزہر الجنی من ریاض المیمنی: یہ پنجاب یونی ورسٹی کے بی اے کے عربی کے نصاب کی شرح ہے اور ۱۹۲۴ء میں لاہور سے شائع ہوئی۔ یہ ان کی واحد اردو کتاب ہے۔

۔ ثلاث رسائل: اس میں عربی کے تین نادر مخطوطات پر دادِ تحقیق دی گئی ہے۔ یہ مصر سے ۱۹۲۵ء میں شائع ہوئی۔

۔ابوالعلا و ما الیہ: یہ وہ تحقیقی کتاب ہے جس نے عبدالعزیز میمن کو عرب دنیا میں عزت و شہرت عطا کی۔ یہ معروف عرب شاعر معری پر ہے اور اس میں طٰہٰ حسین اور معروف مستشرق ڈیوڈ سیموئیل مارگولاوتھ

(David Samuel Margoliouth) کی تحقیقی اغلاط کی نشان دہی کی گئی ہے۔ ۱۹۲۶ء میں قاہرہ سے شائع ہوئی۔

۔اقلید الخزانہ: یہ عبدالقادر بغدادی کی مشہور کتاب خزانۃ الادب کا اشاریہ ہے۔ ۱۹۲۷ء میں لاہور سے چھپی۔

۔تعلیقات علیٰ لسان العرب: عبدالعزیز میمن عربی کی معروف لغت لسان العرب کی تصحیح اور تدوین نو میں معروف عرب عالموں کے ساتھ شامل تھے۔ یہ کتاب ان کے تعلیقات اور تصحیحات پر مبنی ہے۔ ۱۹۳۱ء میں مصر سے چھپی۔

۔سمط اللآلی: علامہ میمنی کے تحقیقی شاہ کاروں میں سے ایک جس پر انھیں عرب دنیا سے بھی بھرپور داد ملی۔ یہ عرب ادیب لآلی کی کتاب (جس کا ذکر ابن خلدون نے کیا تھا) کے مخطوطے کی مدون و مرتب صورت ہے۔ مصر سے ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی۔

علامہ عبدالعزیز میمن نے ۲۳/اکتوبر ۱۹۷۸ء کو کراچی میں انتقال کیا۔ ان کے شاگردوں میں مختارالدین احمد آرزو، ڈاکٹر محمد یوسف، ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی، ڈاکٹر سید عبداللہ، ظہور احمد اظہر، نبی بخش بلوچ اور کئی دیگر قدآور اور نام ور لوگ شامل تھے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ

ڈاکٹر روبینہ شاہین

ڈاکٹر سید عبداللہ کے والد حکیم سیّد نور احمد شاہ موضع منگلور، تحصیل مانسہرہ، ضلع ہزارہ کے رہنے والے تھے۔ وہ عالم اور طبیب تھے۔ سیّد عبداللہ کی پیدائش اسی گاؤں میں ۱۵۔اپریل ۱۹۰۶ء کو ہوئی۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ قرآن مجید کے ساتھ اردو کی درسی کتابیں، حساب، خوش خطی، ابتدائی فارسی اور خطوط نویسی کی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ پھر مقامی سکول میں داخلہ لے کر پرائمری کا امتحان پاس کیا۔ مڈل کا امتحان مانسہرہ کے دسٹرکٹ بورڈ مڈل سکول سے پاس کیا۔ اس کے بعد گورنمنٹ ہائی سکول، ایبٹ آباد میں داخلہ لے لیا۔ نویں جماعت پاس کرنے کے بعد دسویں جماعت میں انجمن حمایت اسلام لاہور کے اسلامیہ ہائی سکول نمبر۲ (بھاٹی دروازہ) میں داخلہ لے لیا۔ ایک سال اس سکول میں پڑھتے رہے۔ جب داخلہ بھیجنے کا وقت آیا تو معلوم ہوا کہ ان کی عمر پندرہ سال سے دو تین ماہ کم ہے اس لیے امتحان کے لیے نام نہ جا سکا۔

سکول سے فارغ ہونے کے بعد ان کے چچا نے انہیں مدرسہ نعمانیہ (لاہور) میں داخل کروا دیا، اس کے ساتھ ساتھ صبح کے وقت مولانا احمد علی کے درس قرآن میں بھی شریک ہوتے رہے۔ بعد میں یونیورسٹی اورینٹل کالج میں منشی فاضل کی کلاس میں داخلہ لے لیا۔ کورس کی مشکلات کے باعث تین چار ماہ کے بعد اسی کالج کی مولوی عالم کلاس میں داخل ہو گئے۔ ابھی اس کی تکمیل نہ ہونے پائی تھی کہ اسی دوران لاہور میں جمعیت العلمائے ہند کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا۔ اس کی صدارت مولانا ابوالکلام آزاد نے کی۔ یہ زمانہ تحریک ترک موالات کا تھا۔ اس کانفرنس سے متاثر ہو کر جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڑھ کا رخ کیا۔ وہاں ان کے اساتذہ میں خواجہ عبدالحئی فاروقی، ڈاکٹر

ذاکر حسین، سید عابد حسین، ملک عبدالرؤف وغیرہ شامل تھے، ان ضمن میں وہ لکھتے ہیں:

''یہاں آنے کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ میں اس زمانے کی چند عظمتوں سے روشناس ہو گیا اور آنے والی زندگی میں یہ حضرات میرے لیے ایک روشن مثال کا کام دیتے رہے۔''

۱۹۲۲ء میں واپس وطن (منگلور) گئے۔ پھر لاہور گئے اور منشی فاضل کا پرائیویٹ امتحان دیا جس میں کامیابی حاصل کی۔ منشی فاضل میں کامیابی کے بعد ۱۹۲۳ء کے اپریل میں میٹرک کا امتحان پاس کیا (صرف انگریزی)۔ دسمبر کے مہینے میں انٹرمیڈیٹ (صرف انگریزی) کے امتحان میں کامیابی حاصل کی۔ ۱۹۲۴ء کے اپریل میں بی اے (صرف انگریزی) کا امتحان پاس کیا۔ اسی سال اکتوبر میں اسلامیہ کالج لاہور ایم اے فارسی میں داخل ہو گئے۔ ۱۹۲۵ء میں ایم اے فارسی کا امتحان پاس کر لیا۔ اس زمانے میں ان کے اساتذہ میں پروفیسر حافظ محمود شیرانی، قاضی فضل حق، پروفیسر ایم ایم مترا اور پروفیسر اسماعیل کے نام معروف ہیں۔ ۱۹۲۵ء میں ایم اے فارسی کا امتحان پاس کرنے کے بعد پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں مخطوطات کے فہرست ساز مقرر ہو گئے۔

۱۹۳۲ء میں ایم اے عربی کا امتحان امتیاز سے پاس کیا۔ اس دوران میں ان کے ممتاز استاد ڈاکٹر مولوی محمد شفیع تھے۔ ۱۹۳۲ء میں جرمن سرٹیفکیٹ اور ۱۹۳۴ء میں لائبریری سرٹیفکیٹ کے امتحان پاس کیے۔ دو سال بے کاری میں گزارے۔ ۱۹۳۴ء میں پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں عربی فارسی شعبے کے مہتمم (عربک اسسٹنٹ) مقرر ہو گئے۔ ۱۹۳۵ء میں ڈاکٹر آف لٹریچر (ڈی لٹ) کی ڈگری حاصل کی۔ تحقیق کا موضوع ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ تھا۔ یہ مقالہ انگریزی میں لکھا گیا کیونکہ اس وقت پاکستان وجود میں نہ آیا تھا اور پنجاب یونیورسٹی کا آکسفورڈ سے الحاق تھا۔ بعد میں اسے اردو کے قالب میں ڈھالا گیا۔

ملازمت:

سید عبداللہ پنجاب یونیورسٹی میں لائبریری میں عربک اسسٹنٹ کی حیثیت سے ۱۹۳۸ء تک کام کرتے رہے۔

۱۹۳۸ء میں ان کی تقرری اورینٹل کالج لاہور میں منشی فاضل کے استاد کی حیثیت سے ہوئی۔ ان سے پہلے یہ فرائض شاداں بلگرامی انجام دے رہے تھے۔ سید عبداللہ نے دو سال تک

اسی اسامی پر کام کیا۔ ۱۹۴۰ء کے ستمبر میں شعبہ اردو میں بحیثیت لیکچرار منتقل ہو گئے۔ اس کے بعد ان کے منصب میں ترقی ہوتی گئی۔ ۱۹۴۵ء میں ریڈر شعبہ اردو ہو گئے۔ قیام پاکستان کے بعد ۱۹۵۳ء میں اسی شعبے میں پروفیسر اور صدر شعبہ مقرر ہوئے۔ ۱۹۵۴ء میں یونیورسٹی اورینٹل کالج میں پرنسپل کی حیثیت سے ذمہ داریاں سنبھال لیں۔

۱۹۴۸ء میں یونیورسٹی میں ایم۔ اے اردو کی کلاسوں کا اجرا ہوا۔ اس وقت شعبے میں سیّد صاحب ہی ایک مستقل استاد تھے۔ باقی اساتذہ اعزازی تھے۔ اپنے زمانۂ تدریس میں سید عبداللہ نے اس شعبے کو ہر لحاظ سے وسعت دی۔ داخلہ لینے والوں کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ تحقیقی مقالات (Thesis) لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کی گئی۔ اس سے اورینٹل کالج کی تحقیقی روایت میں نہ صرف وسعت ہوئی بلکہ اس کو قائم رکھنے اور آگے بڑھانے میں بھی مدد ملی۔

۱۹۶۶ء میں پرنسپل کے عہدے سے مستعفی ہو گئے اور اسی سال یونیورسٹی کے شعبہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ کے صدر بنا دیے گئے۔ سید صاحب نے اپنی پوری توجہ اس کام کی رفتار کو تیز کرنے میں لگا دی۔ وہ اس منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں فخر محسوس کرتے تھے اور ان کی کوشش اور خواہش تھی کہ ان کی زندگی میں اس کی تمام جلدیں شائع ہو جائیں۔ مختصر اردو دائرہ معارف اسلامیہ کا منصوبہ بھی ان کی زندگی میں بن گیا تھا۔

سید عبداللہ ۱۹۶۳ء میں یونیورسٹی میں ادارہ تالیف و ترجمہ کے اعزازی ناظم مقرر ہوئے اور آخر تک (۱۹۸۶ء) اس منصب پر فائز رہے۔ ۱۹۵۶ء میں انہوں نے مغربی پاکستان اردو اکیڈمی کے معتمد عمومی کے فرائض بھی انجام دیے۔

جب وہ اورینٹل کالج کے بااختیار پرنسپل اور شعبہ عربی کی کرسیٔ صدارت پر بھی فائز تھے اس وقت شعبۂ عربی میں ایک تقرری کی گئی۔ انہیں اس تقرری پر اعتراض نہ تھا لیکن یہ تقرری ان کے علم میں لائے بغیر ہوئی تھی جس کا انہیں بے حد رنج تھا۔ ایسی صورت حال میں انہوں نے ایک خاموش مگر تکلیف دہ فیصلہ کرتے ہوئے اپنا استعفیٰ پیش کر دیا۔ یہ فیصلہ سب کے لیے حیران کن اور چونکا دینے والا تھا۔ ان پر یہ فیصلہ واپس لینے کے لیے دباؤ ڈالا گیا لیکن وہ اس پر آمادہ نہ ہوئے۔

بہر حال اس ناخوشگوار واقعے کی تلافی کے لیے انہیں شعبہ تاریخ ادبیات کی سرپرستی اور

دائرہ معارف اسلامیہ کی سربراہی کی پیشکش کی گئی۔انہیں ان فرائض کی ذمہ داری قبول کرنے میں تامل تھا۔ بالآخر وہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ کی سربراہی کے ساتھ شعبہ ترجمہ وتالیف اور شعبہ تاریخ ادبیات کے علمی کاموں میں دلچسپی پر رضامند ہوگئے اور اپنی بیماری تک اس کام میں مصروف ومشغول رہے۔

اردو سے محبت اور نفاذِ اردو کے لیے کوشش:

قومی زبان ''اردو'' کی ترویج اور فروغ کے بارے میں سید عبداللہ کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔۱۹۵۴ء میں یونیورسٹی اورینٹل کالج کے خلاف تحریک کا بڑی حوصلہ مندی اور جرأت کے ساتھ مقابلہ کیا۔۱۹۵۴ء میں کالج کے یوم تاسیس کا آغاز کیا۔اس تقریب کے موقع پر سید عبداللہ کا خطبہ السنۂ شرقیہ کے دفاع میں ان کے مؤقف کی بھرپور وضاحت کرتا تھا۔اس سلسلے میں شہر کے ادیب، عالم وکیل اور فنون مشرقی سے دلچسپی رکھنے والے لوگ کثیر تعداد میں شریک ہوئے تھے۔اس وجہ سے کالج کے بارے میں عام رائے بہتر ہونے لگی۔جس زمانے میں وہ پرنسپل تھے اس دور میں کئی کانفرنسیں بھی کروائیں۔اس طرح اردو اور علم شرقیہ کے حق میں ان اجتماعات کو اس طرح استعمال کیا گیا کہ ان کے خلاف اُٹھنے والی تحریکات خود بخود ختم ہونے لگیں۔

اس ادارے کا بنیادی مقصد سائنسی کتب کو اردو میں لکھوانا اور شائع کرنا تھا چنانچہ ان کی کوششوں سے اکیڈمی کی طرف سے ۶۴ کتابیں (بشمول چند پمفلٹ) شائع کی گئیں۔نفاذ اردو کے لیے اکیڈمی کے زیر اہتمام اور سید عبداللہ کی دیگر کاوشیں بھی قابل ذکر ہیں۔مثلاً ان میں اردو انجمنوں کی سالانہ مجلس مشاورت، اردو انجمنوں کی سالانہ کانفرنس، قومی زبان کانفرنس ۲۸۔مارچ ۱۹۷۵ء، مذاکرہ قائداعظم کانفرنس ۱۱۔دسمبر ۱۹۷۶ء، علامہ اقبال اردو کانفرنس ۲ تا ۹ نومبر ۱۹۷۷ء، قومی زبان کانفرنس ۴، ۱۵ اپریل ۱۹۷۷ء اور اردو کانفرنس جون ۱۹۷۹ء شامل ہیں۔انہوں نے عام روزمرہ زندگی میں اردو کے نفاذ کے لیے عملی کوششیں کیں مثلاً موٹر گاڑیوں کے نمبر، دکانوں کے سائن بورڈ، مکانوں کے نام، عید کارڈ، ملاقات نامے اور ہوٹلوں کا کاروبار وغیرہ اردو میں کرانے کے لیے اردو مندوبین کا جلوس ۱۹۶۵ء میں نکالا گیا۔اردو کے نفاذ کے سلسلے میں حکومتی اعلانات سے متعلق محضر نامے چھپوا کر حکومت کو یاددہانی کے طور پر ارسال کیے گئے۔وہ خود اس سلسلہ میں

لکھتے ہیں:

> ''اردو کے لیے دستخطی مہم، سائن بورڈ بدلوانے کی تحریک، ہوٹلوں کی زبان بدلوانے کی تحریک، دفتری زبان بدلوانے کی تحریک، خیر سگالی سفر کی تحریک اردو ذریعہ تعلیم کو رواج دینے کی مہم میں اب بھی منہمک ہوں۔''

سید عبداللہ کا زندگی بھر کا ایک بھرپور مشن نفاذ اردو بھی رہا ہے۔کوئی چیز انہیں اپنے موقف سے نہ ہٹا سکی، ایک قوم سخت نامساعد حالات میں پاکستان بنا کر تاریخ انسانی کا ایک عظیم کارنامہ سرانجام دیتی ہے اور اس کے حصول کے وقت اس کا ایک ہی نعرہ ہوتا ہے کہ اس ملک میں قومی زبان اردو ہوگی۔پھر اتنا عرصہ گزرنے کے بعد بھی اردو زبان کی قسمت نہیں سنور سکی۔ہم ان خوش قسمت قوموں میں سے ہیں کہ وطن بعد میں ملا اور زبان پہلے ملی۔اس کے لیے علمی وعملی کوششیں کیں اور ہر سطح پر نفاذِ اردو کے لیے دن رات کوشش کی۔اس طرح ان کا شمار اردو کے ان ادیبوں میں ہوتا ہے جنہوں نے اردو کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی۔

بیماری اور وفات

۹۔مارچ ۱۹۸۶ء کو شعبہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ میں اپنے دفتر میں اور اپنے ایک عزیز شاگرد اور قریبی دوست غلام حسین ذوالفقار کو خط لکھ رہے تھے کہ ان پر فالج کا حملہ ہوا۔انہیں میو ہسپتال لاہور میں داخل کرایا گیا۔کئی روز تک سخت نگہداشت میں رکھے گئے۔بعد میں اپنی رہائش گاہ المامن (اردو نگر، ملتان روڈ، لاہور) میں آ گئے۔کئی ماہ تک اس مرض میں مبتلا رہے۔آخر آزادی کے دن ۱۴۔اگست ۱۹۸۶ء کو یہ نامور استاد، ادیب، صحافی، عالم اور محسنِ اردو اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔۱۵۔اگست ۱۹۸۶ء کو ان کا جسدِ خاکی گلشنِ راوی لاہور کے قبرستان میں دفن کیا گیا۔(اناللہ وانا الیہ راجعون)

ڈاکٹر سید عبداللہ کا زیادہ تر وقت تصنیف وتالیف یا تعلیم وتدریس میں گزرتا تھا وہ خود کہا کرتے تھے کہ انہیں پندرہ سال کی عمر میں اقبال کا بیشتر کلام ازبر ہو گیا تھا اس زمانے میں انہیں قومی اور سیاسی شاعری سے گہری دلچسپی تھی۔

لکھنے کی ابتداء ۱۹۲۲ء کے قریب ہوئی۔تحریک خلافت میں تھوڑی مدت کے لیے اسیر ہو

گئے۔ رہائی کے بعد اپنے گاؤں ''منگلور'' میں دو تین ماہ قیام کیا۔ سہ روزہ اخبار ''جاٹ'' نکالا۔ جس میں وہ ''زبیر کہستانی'' کے نام سے لکھا کرتے تھے۔ اس میں ''زمیندار'' ''مدینہ'' اور ''نجات'' کی خبریں نقل کرتے اور ایک مضمون خود لکھتے۔ اس کو گاؤں کی مسجد میں رکھا جاتا۔ خواندہ لوگ فرصت کے وقت اسے پڑھ لیتے۔ گاہے گاہے اس کو خود بھی پڑھ کر سناتے۔ اخباری مضمون نگاری کا آغاز ۱۹۲۷ء میں ہوا۔ زمیندار میں ''داستان گو'' اور دوسرے قلمی ناموں سے لکھتے رہے۔ ''انقلاب'' میں بھی کئی مضامین لکھے۔ ''صحیفہ زندگی'' کے نام سے روزنامچہ لکھنا شروع کیا۔ جس کے کچھ اجزا بعد میں اختر شیرانی کے رسالہ ''خیالستان'' اور چراغ حسن حسرت کے رسالہ ''شیرازہ'' میں چھپتے رہے۔

انہیں کامیاب کانفرنسیں اور اجلاس کرانے میں ملکہ حاصل تھا چنانچہ مختلف طبقۂ خیال کے لوگوں کو ایک ہی جگہ جمع کر لیتے تھے۔ ترقی پسند ہوں یا رجعت پسند، دائیں بازو کے لوگ ہوں یا بائیں کے، اعتدال پسند ہوں یا انقلابی، جدید وضع اور فیشن کے دلدادہ یا پرانی وضع کے غرض سب کو جمع کرنا سید عبداللہ کے لیے آسان کام تھا۔ ایسے علمی میلوں میں رنگا رنگی تو ضرور نظر آتی مگر منظّم و مربوط انداز ہر جگہ موجود رہتا۔ مختلف افکار کے لوگ اکٹھے ہوتے اور سوچ و فکر کی نئی راہیں کشادہ ہو جاتی تھیں۔

ڈاکٹر سید عبداللہ کو علوم شرقیہ کے احیاء اور تحفظ کا بے حد خیال رہتا تھا۔ جب ۱۹۴۸ء میں قومی زبان کے سلسلے میں اردو کانفرنس منعقد ہوئی تو اس وقت قائداعظم ابھی زندہ تھے اور قوم ان کے فرمودات کا دل و جان سے احترام کرتی تھی۔ اور قومی جذبے میں بھی شدت تھی چنانچہ اس کانفرنس میں قومی زبان اردو کے سلسلہ میں مثبت پیش رفت بھی ہوئی۔ مگر اس کے بعد حالات سازگار نہ رہے۔ قائداعظم کی رحلت کے بعد کئی دیگر مسائل نے سر اٹھایا۔ انتشار اور اختلاف نے قومی یکجہتی کو نقصان پہنچانا شروع کر دیا۔ قومی زبان اردو کو بھی اختلافی مسئلہ بنا کر پیش کیا گیا۔ ہر فرد اپنے مسائل میں اتنا الجھ گیا کہ ذاتی مفاد کے سامنے ملکی مفاد ہیچ دکھائی دینے لگے۔ ان حالات میں ڈاکٹر سید عبداللہ نے مشرقی علوم کے تحفظ و بقا اور اردو کے فروغ کی تحریک کا آغاز کیا اور اس تحریک کو مہماتی جذبے کے ساتھ چلایا۔ دل سے نکلی ہوئی بات اثر ضرور رکھتی ہے لوگ ملتے گئے اور کارواں بنتا گیا۔ قومی رسائل و اخبارات کا تعاون بھی مل گیا۔

ڈاکٹر سید عبداللہ اس محاذ کے ساتھ ساتھ اپنے فرائض منصبی بھی احسن طریقے سے ادا کرتے رہے۔ جب وہ اورینٹل کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے تو علوم مشرقی کے تحفظ و احیاء کے کام کے ساتھ ساتھ تدریسی نظام الاوقات اور انتظامی امور کے لیے دن رات محنت کی۔ وہ معلّمی کو عبادت کا درجہ دیتے تھے اور جو وقت بچ جاتا اس میں اردو کے فروغ کی منصوبہ بندی، وسائل کی فراہمی جیسے امور کے لیے کوشاں ہو جاتے۔ ان کے سخت تدریسی شیڈول کو ان کے قریبی شاگرد دوست ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار ان الفاظ میں یاد کرتے ہیں:

> ''صبح جب وہ کالج آ جاتے تو ادارے کے تنظیمی امور و مسائل کو سرانجام دیتے۔ وقتاً فوقتاً پورے کالج کا چکر بھی لگاتے جس سے طلبہ و طالبات میں ایک نظم و ضبط کی صورت پیدا ہوئی۔ یونیورسٹی کی کوئی میٹنگ ہوتی تو اس میں شریک ہوتے اور پھر دوپہر کے بعد آخر میں درس دیتے۔ اس کا یہ فائدہ اٹھاتے کہ ایک گھنٹے کی بجائے اکثر اوقات ڈیڑھ اور دو گھنٹے تک ان کا لیکچر جاری رہتا۔ طلبہ کو اس کے مطابق اپنے کھانے پینے کا بندوبست کرنا پڑتا یا بھوکے رہ کر لطیفوں پر گزارا کرنا ہوتا۔'' (۸)
>
> ''وہ اپنے اور طلباء کے درمیان ایسے کسی بعد کو قائم نہیں ہونے دیتے جو شکوک و بدگمانی کی فضا پیدا کرے۔ طالب علموں سے آپ کا سلوک ہمیشہ شفیق باپ کی طرح رہا۔ طالب علم اپنی مشکلات آپ سے بیان کر کے اور آپ کی پدرانہ شفقت اور خلوص سے بھری مسکراہٹ کے ساتھ ہمدردی میں ڈوبی ہوئی آواز میں دو بول سنتے ہی اپنا سارا غم بھول جاتا تھا۔''

خواتین کا بے حد احترام کرتے تھے۔ ان کی بیٹی عطیہ سید نے بھی بتایا کہ وہ گھر میں اپنی اہلیہ سے شفقت، ہمدردی اور برابری کی سطح پر سلوک روا رکھتے۔ ان کے جو ساتھی سفر و حضر میں ان کے ساتھ رہتے تھے ان کے مطابق جب بیگم صاحبہ ان کے ساتھ ہوتیں تو پھر مختلف ریستورانوں میں کھانے کا بل کبھی خود نہ دیتے بلکہ یہ ذمہ داری بیگم صاحبہ کی ہوتی تھی اور ایسے مواقع اکثر آتے رہتے کیونکہ وہ سفر میں بیگم صاحبہ کو ساتھ ضرور لے جاتے۔ ایک اور واقعہ دلچسپی کا باعث ہو سکتا ہے ایک دفعہ اردو تدریس کانفرنس کے دوران لیڈی میکلیگن کالج کی ایک خاتون پروفیسر مس حمید خواجہ صاحب سے ملنے آئیں۔ انہوں نے چٹ اندر بھیجی جس پر ''حمید خواجہ'' لکھا ہوا تھا۔ چپراسی سے

کہا گیا کہ انہیں سٹاف روم میں بٹھائیں۔ اس خاتون نے اچھی خاصی دیر انتظار کرنے کے بعد دوبارہ چٹ بھیجی۔ اب انہیں بلایا گیا۔ انہیں دیکھ کر سید صاحب اچھے خاصے پریشان ہوئے کیونکہ اس خاتون کو مرد سمجھ کر انتظار کی زحمت دی گئی تھی۔ آئندہ جب کبھی حمید خواجہ آئیں تو اپنے نام کے ساتھ چٹ پر ''عورت'' لکھنا نہ بھولیں۔

تدریس کے بعد وہ شام تک اپنی تحریک کے کام میں جٹے رہتے تھرے۔ ان کے نحیف سے بدن کو جذبے کی شدت نے گرما رکھا تھا۔ لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ دفتری وانتظامی سطح پر انہیں اچھے رفقاء کی رفاقت بھی نصیب تھی جس کی وجہ سے وہ دن رات کی محنت سے ہرگز نہ گھبراتے تھے۔

ان کی ذاتی زندگی کے بارے میں زیادہ معلومات ان کی بیٹی عطیہ سید (جو خود بھی افسانہ نگار ہیں) سے ملیں۔ انہوں نے بتایا:

> ''ڈاکٹر سید عبداللہ کی والدہ ان کی بچپن میں ہی وفات پا گئیں تھیں۔ جب وہ صرف ۱۲ سال کے تھے۔ ان کے والد نے ان کی نسبت کم عمری ہی میں طے کر دی اور جب وہ صرف ۱۸ سال کے تھے تو ان کی پہلی شادی کر دی گئی۔ جیسا کہ اس زمانے کا دستور تھا کہ کم عمری میں شادیاں کر دی جاتی تھیں۔ ان کی پہلی بیوی ٹی بی کا شکار ہو گئیں جو اس وقت لاعلاج مرض تھا۔ اس مہلک مرض نے ان کی جان لے لی۔ ان کے بطن سے سید عبداللہ کا ایک بیٹا زبیر تھا جو وفات پا چکا ہے۔ سید عبداللہ کی دوسری شادی جناب عبداللہ شاہ کی دختر سے ہوئی۔''

عبداللہ شاہ اپنے زمانے کے انتہائی روشن خیال، پڑھے لکھے اور خوبصورت شخص سمجھے جاتے تھے۔ وہ علی گڑھ کے تعلیم یافتہ تھے۔ علی گڑھ ایک علمی ادارہ ہی نہیں ایک تربیت گاہ بھی تھی۔ چنانچہ علی گڑھ سے تعلیم پانے والے طلباء اپنے ساتھ وہاں کے خیالات نظریات اور فلسفۂ حیات کو ساتھ لاتے اور انہیں دوسری جگہوں پر پھیلانے کا باعث بنتے تھے۔ عبداللہ شاہ بھی ایسے ہی روشن خیال اور جدید سوچ کے حامل شخص تھے۔ ان کے گھر میں زمانے کے ادبی اور تہذیبی رسائل وجرائد کو معمول سمجھا جاتا تھا۔ تہذیب نسواں ''ساقی دہلی'' اور ''پھول'' وہ رسائل تھے جو بیگم عبداللہ کے مطالعے میں رہتے تھے۔ اس کے علاوہ انہوں نے باقاعدہ انگریزی تعلیم بھی پائی تھی جو اس زمانے

میں خواتین کے لیے غیر معمولی بات تھی۔

ڈاکٹر سید عبداللہ کا ظاہری حلیہ ان کی نفاست طبع کا حصہ معلوم ہوتا ہے۔ دبلا پتلا لانبا بدن، کھلتا ہوا گورا رنگ اور باوقار چال ان کی شخصیت کو جاذب نظر بناتی تھی۔ عطیہ سیّد ان کے بارے میں لکھتی ہیں۔

> ''انہیں اپنی والدہ کی نہ صرف دراز قامت، سفید رنگ، خوبصورت ہاتھ اور نفیس انگلیاں ہی جو سرجنوں اور مصوروں کا مقدر ہیں حاصل ہوئی۔ بلکہ ان کا شعری ذوق بھی (Genes) کے ساتھ یوں منتقل ہوا کہ زندگی اور ادب کی لطافتوں کا عشق آ جی (سید عبداللہ) کے رگ وپے میں مکمل طور پر رچ بس گیا۔''

شاعروں میں میرؔ ان کے موضوع خاص رہے ہیں۔ وہ کلاس میں میرؔ کے غم میں ڈوب جاتے ان کے پڑھانے کا انداز بھی غیر روایتی تھا۔ لطیفے سناتے، دلچسپ واقعات، نظیرؔ کے طربیہ چٹکلے شامل کر دیتے۔ جس نے ان کا ایک لیکچر بھی سنا وہ اس کو اپنے لیے اعزاز سمجھتا تھا۔ وہ ایک مرتب ومنظّم ذہن کے مالک تھے۔ جذب وشوق نے ان کی بات میں تاثیر پیدا کر دی تھی۔ خود کلامی ان کا محبوب مشغلہ تھی اگرچہ اس خود کلامی میں ان کا خطاب خود اپنے آپ سے ہوتا لیکن اس مشغلے نے ان کی بیانیہ صلاحیت کو مزید جلا بخشی۔ ان کی طبیعت کا خاص رجحان غم پسندی تھا۔ وہ خود اپنے بارے میں کہتے ہیں:

> ''میں غم پسند آدمی ہوں اس لیے غم کے مضامین بہت اچھے لگتے ہیں۔ مگر غم کے مضامین میں محبت کے عنوان موجود ہوں تو میرا دل کھل جاتا ہے۔ دور دور تک باغ پھیلے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔''

والدہ کی جلد وفات ایک ایسی محرومی تھی جس کا سامنا سید عبداللہ نے کمسنی میں کیا۔ اس محرومی نے ان کی شخصیت کے نہایت حساس اور مثبت پہلوؤں کو نکھارا۔ احساسِ محبت، دردمندی، احترامِ انسانیت اور عورتوں کا احترام ان کے دل میں گھر کر گیا۔ انہوں نے ابتدائی زندگی میں بڑے لوگوں کی سوانح عمریاں بڑے شوق سے پڑھیں جن کا گہرا اثر قبول کیا۔ میکالے کی تاریخ انگلستان، ایبٹ آباد کی کتابِ حیات، نپولین کے علاوہ رشلو، میزنی، بس مارک کی سوانح عمریاں پڑھیں۔ اور ٹالسٹائی کے ناول War and Peace نے تو انہیں صحیح معنوں میں دردمندی کے

مسلک سے آگاہ کرایا۔ ان کا مطالعہ بے حد وسیع تھا۔ سیاست ہندوستان، تاریخ ہندوستان، تاریخ اقوام اسلامی، دینی افکار، تہذیب اور اردو فارسی شعراء کا کلام ان کی دلچسپی کے میدان تھے۔ اردو میں میرؔ اور فارسی میں حافظؔ کے بے حد قائل تھے۔

اپنے بارے میں انہوں نے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا:

''میں ایک غم پسند آدمی ہوں اور اس کے زیر اثر میں نے اپنا ایک فلسفہ مرتب کیا تھا جسے کبھی کبھی میں میر تقی میر کے تتبع میں فلسفہ دردمندی کہہ لیا کرتا ہوں مگر میرا فلسفہ بار بار بکھرتا رہتا ہے..... میرا سب سے بڑا غمگسار شعر ہے۔ میرا گنگنانا ہر جاگتے لمحے تک پھیلا ہوا ہے۔''

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار ان کی شخصیت کے ظاہری پہلو کی طرف یوں توجہ دلاتے ہیں۔

''وہ بچے جنہوں نے بابائے قوم کا نام سنا تھا اپنی درسی کتابوں میں ان کے کارناموں کا ذکر پڑھا تھا۔ قائداعظم کی تصویریں جناح کیپ کے ساتھ دیکھی تھیں وہ جب سید صاحب کو دیکھتے تو انہیں ان کی شکل صورت میں جیتا جاگتا قائداعظم نظر آتا۔ پھر وہ ایک دوسرے کو متوجہ کر کے کہتے۔ وہ دیکھو! قائداعظم جا رہے ہیں۔''

جب الطاف حسین قریشی نے ان سے ایک انٹرویو میں زندگی کی بڑی آرزو کے بارے میں سوال کیا تو انہوں نے جواب میں ایسی بات کہی جو کسی بھی ادیب کی خواہش ہو سکتی ہے انہوں نے بتایا:

''آرزوئیں تو بہت ہیں مگر ایک ایسی آرزو ہے جو اکثر جان و دل میں بستی رہتی ہے اور وہ یہ کاش میں اپنی زندگی میں دس پندرہ سطریں ایسی لازوال لکھ جاؤں جو انسانی دکھ درد میں کسی مورنا تواں کے لیے سفینۂ برگ گل بن سکیں۔۔۔ سقراط دانش کی ایک چمک کے لیے پہاڑیوں کے گرد دیوانہ وار گھومتا تھا۔ میں سیاہی کے ایک قطرے کا آرزومند ہوں جو تحریر میں ڈھل کر مریم بن جائے۔''

تحقیق و تنقید ان کا خاص میدان عمل تھا اور انہوں نے اس میدان میں قلمی جوہر دکھائے۔ مطبوعہ کتب کے علاوہ اُن کے بے شمار مقالات مختلف رسائل و جرائد کی زینت بنتے رہے۔ ان مقالات کا موضوع پاکستانیات کلچر، اردو زبان، تہذیب، تعلیم و تربیت، قدیم شاعری و ادب ہے۔

تصانیف ڈاکٹر سید عبداللہ

1. The spirit and substance of Urdu Prose under the influence of Sir Sayyed Lahore, Sh. Muhammad Ashraf, 1940

۲۔ ''اردو ادب جنگ عظیم کے بعد'' لاہور، اردو اکیڈمی پنجاب طبع اول، ۱۹۴۱ء

۳۔ ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ۔ دہلی انجمن ترقی اردو (ہند) طبع اول، ۱۹۴۲ء

۴۔ شعرائے اردو کے تذکرے اور تذکرہ نگاری کا فن لاہور مکتبہ جدید، طبع اول لاہور مکتبہ خیابان طبع دوم، ۱۹۵۲ء، ۱۹۶۸ء

۵۔ نقد میرؔ۔ لاہور آئینہ ادب۔ طبع اول، لاہور اردو مرکز۔ طبع دوم، لاہور مکتبہ خیابان ادب، طبع سوم، ۱۹۵۸ء، ۱۹۶۴ء، ۱۹۶۸ء

۶۔ ولی سے اقبال تک۔ لاہور مکتبہ جدید، طبع اول، لاہور خیابان ادب، طبع دوم ایضا۔ طبع سوم، ۱۹۵۸ء، ۱۹۶۶ء، ۱۹۷۶ء

۷۔ سرسید احمد خان اور ان کے رفقاء کی نثر کا فکری اور فنی جائزہ، لاہور مکتبہ کارواں، طبع اوّل، لاہور، علمی کتب خانہ، طبع چہارم اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، طبع اول، ۱۹۶۰ء، ۱۹۸۱ء، ۱۹۸۶ء

۸۔ طیف غزل (ڈاکٹر سید عبداللہ کے کلاس لیکچرز کا مجموعہ) مرتبہ ممتاز منگلوری۔ لاہور نذر سنز طبع اول۔ ۱۹۶۳ء

۹۔ طیف نثر (ڈاکٹر سید عبداللہ کے کلاس لیکچرز کا مجموعہ) مرتبہ ممتاز منگلوری لاہور نذر سنز، طبع اول، لاہور اکیڈمی لاہور، طبع دوم، ۱۹۶۴ء، ۱۹۷۶ء

پروفیسر میر عبداللہ جان جمالدینی

(8 مئی 1922۔ 19 ستمبر 2016)

ڈاکٹر شاہ محمد مری

ایک سادہ معاشرہ وہ ہوتا ہے جس میں پیداواری رشتے بہت سادہ اور ابتدائی ہوں۔ بلوچستان کا نوشکی کا علاقہ ماقبل صنعتی سماج کا علاقہ تھا۔ جہاں ذرائع آمدن بہت سادہ اور فطرت کے قریب تھے۔ لہٰذا وہاں کے انسان اپنی فطرت میں نیک، خیر خواہ اور مددگار ہوتے تھے۔

یہ اچھا انسان (عبداللہ جان) تعلیم کی تلاش میں نوشکی، کوئٹہ، پشین اور پشاور تک کی مسافرتیں جھیلتا رہا۔ اس نے اسلامیہ کالج پشاور سے گریجوئیشن کرنے کے بعد 1950 کے اوائل میں نائب تحصیلداری کی افسری اختیار کی۔ لیکن اس نیک فطرت انسان کو عام انسانوں پر ظلم کرنے والی اس نوکری سے جلد ہی نفرت ہوگئی۔ تین چار دیگر ہم خیال نائب تحصیلداروں کے ساتھ باجماعت استعفیٰ دیا۔ اور لوگوں میں علم بانٹنے کتابوں کی ایک دکان کھولی۔ انہوں نے پمفلٹ لکھے، تعلیم بالغاں جیسے کام کیے اور انسانوں کی تنظیم کاری کی۔

مگر سرکاری پابندیوں سختیوں کے ہاتھوں دکان ختم ہوئی۔ بھوک نے کوئٹہ سے نکالا اور اُسے روزی رساں شہر کراچی جا پٹخا۔ وہاں کچھ عرصہ ریڑھی پر سبزیاں بیچیں۔ اور پھر روسی سفارت خانے کے رسالے میں کام مل گیا۔ اسی طرح اپنے بڑے بھائی کے ساتھ اپنا رسالہ چلایا۔ ٹریڈ یونین میں کام کیا۔ تراجم کیے، اور خود لکھا۔۔۔ یوں وہ ہرفن مولا بنا۔

اسی لیے تقریباً سو سال عمر پانے والے اِس پروفیسر عبداللہ جان جیسے نیک انسان کو ایک شعبے تک محدود کرنا ممکن نہیں۔ وہ سماجی اچھائیاں کرتا گیا۔ ایک اچھائی دوسری اچھائی کو جنم نہ بھی

دے تو اُسے تقویت ضرور دیتی ہے۔

یہاں تو معاملہ یہ تھا کہ ٹیچنگ اس کا محض روزی کمانے کا مقصد وسیلہ نہ تھا۔ یہ تو اُس کے ذائقے کی چیز بھی تھی، اور اُس کا عشق بھی تھا۔ میر عبداللہ جان اسلامیہ کالج کا پڑھا ہوا تھا۔ خود اُس کے پرائمری سے لے کر اسلامیہ کالج تک کے ٹیچر اس قدر انسان دوست اور خیر خواہ انسان تھے کہ اُن کے شاگردوں میں بہت کم لوگ عبداللہ جان کے علاوہ کچھ ثابت ہوئے۔ میر مٹھا خان مری، ہاشم خان غلزئی، اور صاحبزادہ ادریس جیسے اُس کے یہ سارے استاد چلتے پھرتے، مجسم استاد تھے۔ تعلیم سے محبت اور تعلیم کو عام کرنے کی ڈیوٹی عبداللہ جان کو انہی اساتذہ سے ملی تھی۔ وہ تو تدریس کا ہول ٹائمر تھا۔ 24 گھنٹے کا ٹیچر۔

یہ صحیح ہے کہ سماج نے اس کے لیے کنکریٹ کا ایک ہال مقرر کیا تھا جہاں وہ اتنے بجے سے لے کر اتنے بجے تک لیکچر دے گا۔ مگر خود اُس نے اِس محدود ہال کو اپنے لیے بہت کم پایا۔ وہ تو گلی کے آدمی، ریڑھی بان اور ناخواندہ کے لیے بھی استاد تھا۔ حتیٰ کہ وہ علماؤں کے لیے بھی ایک استاد تھا۔ کچھ نہ کچھ سکھا دیتا تھا۔

دلچسپ یہ ہے کہ عبداللہ جان طبقاتی استحصال کو بہت غلط سمجھتا تھا۔ مگر میں نے بہت سارے سرداروں، بیوروکریٹوں کو اُس کے آستانے میں حاضری بھرتے دیکھا۔ صرف اور صرف کچھ سیکھنے کو۔ اس لیے کہ عبداللہ جان نہ مخاطب کو جتاتا تھا نہ لوگوں کو بتاتا پھرتا تھا۔ اس سے سیکھنے میں آپ comfortable رہتے۔

1970 میں میر عبداللہ جان نے سوویت رسالہ ''طلوع'' کی جوائنٹ ایڈیٹری سے استعفیٰ دے دیا اور کوئٹہ چلا آیا۔ کچھ عرصہ بعد بلوچی اکیڈمی نے اُسے ریسرچ سکالر مقرر کیا۔ وہ ایک سال تک بلوچی اکیڈمی میں بطور ریسرچ سکالر کام کرتا رہا۔

بلوچستان میں نیپ دورِ حکومت میں بلوچستان یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا۔ گورنر بلوچستان میر غوث بخش بزنجو نے پروفیسر کرار حسین کو وائس چانسلر مقرر کیا۔ کرار صاحب اُس سے پہلے بھی بلوچستان میں بے مثال تعلیمی خدمات سرانجام دے چکا تھا۔ پروفیسر کرار حسین ادیب اور سکالر ہونے کے ساتھ ایک انسان دوست ماہرِ تعلیم بھی تھا اور وہ مادری زبانوں کی اہمیت کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔ لہٰذا اس نے جب یہاں ''مطالعہِ پاکستان'' کا شعبہ قائم کیا تو بلوچی، پشتو اور

براہوی زبانوں میں عالم اور فاضل کی کلاسوں کا اجراء کر دیا۔ بلوچی زبان کے لئے بھلا پروفیسر عبداللہ جان جمالدینی سے بہتر کون استاد اُسے مل سکتا تھا۔ تب منتخب حکومت میں یونیورسٹی آف بلوچستان نے اسے بلا لیا اور استاد کی حیثیت سے ملازمت دے دی۔

بلوچستان یونیورسٹی میں 1971ء میں استاد کی حیثیت سے اُس کا تقرر ہوا۔ عبداللہ جان نے جس شوق سے 1950 میں ''عوام دشمن'' نائب تحصیلداری والی اُس زمانے کی بہت بڑی نوکری سے استعفےٰ دیا تھا، اُسی شوق سے اُس نے 1971 میں اذہان کی تعمیر والی لیکچرار کی نوکری قبول کی۔

علمی فضا میں تو اُس نے نکھر جانا ہی تھا۔ یہاں بلوچستان یونیورسٹی میں اُس وقت پروفیسر کرار حسین، ڈاکٹر بندے حسن، ڈاکٹر محمد احسن فاروقی، ڈاکٹر جاوید اقبال، پروفیسر وارث اقبال، پروفیسر شکراللہ، پروفیسر بہادر خاں، پروفیسر تنویر جہاں تیموری، پروفیسر سحر انصاری، پروفیسر خلیل صدیقی، پروفیسر شمیم احمد، ڈاکٹر اقبال محسن جیسے جیّد لوگ پڑھاتے تھے۔ ایسی شاندار بنیادیں شاید ہی کسی اور یونیورسٹی کے نصیب میں آئی ہوں۔

یہ سارے لوگ یونیورسٹی کالونی میں رہتے تھے۔ شام کو یہ تین تین چار چار کی ٹولیوں میں کالونی کی وسیع اور خاموش سڑکوں پہ گفتگو کرتے ہوئے چہل قدمی کرتے۔ جب تھک جاتے تو پرسکون فٹ پاتھ پر بیٹھ جاتے۔ وہیں پہ محفل لگ جاتی۔ سٹڈی سرکل ٹائپ کی محفل۔ عمومی موضوعات بچوں کی تعلیمی استطاعت کو وسعت دینے اور تعلیم کو مقبول بنانے جیسے ہوتے تھے۔ وہیں نصاب کو سائنسی اور دلکش بنانے کی باتیں سوچی جاتیں اور یونیورسٹی کی لائبریری کو مزید بہتر بنانے کی تدابیر ڈھونڈی جاتیں۔ یہ بلوچستان کی خوش قسمتی تھی کہ اُس کی یونیورسٹی کے اولین اساتذہ وہ لوگ تھے جن کا نام ملکی اور بین الاقوامی سطح کا ہوتا تھا۔

ایک اور نعمت عبداللہ جان کے حصے میں یہ آئی کہ یہاں وہ نوجوانوں سے براہ راست رابطے میں آیا۔ اُس زمانے میں سارے طلبا سیاسی ہوا کرتے تھے۔ اور وہ سب کے سب سامراج دشمن سیاست کرتے تھے۔ ماما فوراً ہی آٹومیٹک طور پر اُن کا امام بنا۔ وہ ہر تنظیم کا محترم استاد اور گائیڈ بنا۔

اس وقت طلبہ کی یونین بھی قائم ہوئی اور اساتذہ کی انجمن کی داغ بیل بھی پڑی۔ اِن

دونوں تنظیموں کے اہلکاروں کی وہ راہنمائی کرتا تھا۔ وہ طالب علموں میں اپنے حقوق کا شعور پانے اور منظّم انداز میں جدوجہد کرنے پہ زور دیتا تھا۔ تدریس کے ساتھ ساتھ وہ طلبہ کی ذہنی تربیت کو بھی خاص اہمیت دیتا تھا۔

میر عبداللہ جان یونیورسٹی کی ترقی و توسیع کے کاموں میں ہمیشہ مستعد رہتا تھا۔ اس نے بلوچی، براہوی، پشتو اور فارسی کے شعبے قائم کرنے میں مدد ہی نہ کی بلکہ اِن شعبوں کے نصاب بنانے، طریقۂ امتحان وضع کرنے میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ چونکہ یہ شعبے پہلی بار یونیورسٹی میں پڑھائے جا رہے تھے اس لیے اُن کا رسم الخط، سٹینڈرڈائزیشن سارا کچھ نیا کام تھا۔ اور عبداللہ جان سرگرم ترین شخص تھا۔

یہاں بلوچی زبان پر کام کرنے والے محقق اور سکالر تحصیلِ علم کی خاطر جمالدینی صاحب سے استفادہ کرتے۔ میر عبداللہ جان بلوچی کے سارے لہجوں سے واقف تھا، وہ خود بلوچستان گھوم گھوم کر کلاسیکل اور فوک شاعری جمع کرتا رہا۔ فرسٹ ہینڈ انفارمیشن ہوتی تھی اُس کے پاس۔ تعاون بھی بہت کرتا تھا۔ اسی لیے بلوچ، غیر بلوچ حتی کہ غیر ملکی محقق و سکالر اُس سے رابطے میں رہتے۔ وہ بے شمار ریسرچرز کا میزبان رہا۔

وہ سارا وقت درس و تدریس اور علمی ادبی کاموں میں جتا رہتا۔ بہت محنت کی میر صاحب نے پڑھانے میں اور خوب خدمت کی بلوچی زبان و ادب کی۔ اس نے ہماری زبانوں میں بے شمار ٹیچر پیدا کیے۔ اس کے شاگرد اب بلوچستان کی ساری یونیورسٹیاں چلا رہے ہیں۔

پروفیسر جمالدینی ایک خالص ٹیچر تھا اندر باہر سے، طرز اطوار سے، اور نشست و برخواست سے۔ وہ نہ صرف اپنے مضمون کی تدریس میں ایک خاص اسلوب رکھتا تھا بلکہ طالب علموں سے نہایت شفقت سے پیش آتا تھا۔ جامعہ بلوچستان میں اس کا کمرہ طلبہ کے لیے ہر وقت کھلا رہتا تھا جہاں تعلیم و تدریس کے علاوہ، روشن فکر نظریات اور جمہوری اقدار کی پاس داری کے بارے میں معلومات افزا گفتگو جاری رہتی تھی۔ میر صاحب بین الاقوامی کلاسیک ادب سے بالخصوص دلچسپی رکھتا تھا۔ فرانسیسی، جرمن انگلش اور روسی ادب کا ہر وقت مطالعہ کرتا تھا فارسی ادب تو اس کا پسندیدہ شعبہ ہوا کرتا تھا۔ رے نے ساں کے سائنسی انکشافات اور روشن فکر ادب اُس کا خصوصی عنوان تھے۔ وہ مختلف قوموں کی مائتھالوجی کی کتب ڈھونڈ ڈھونڈ کے حاصل کرتا تھا۔ یہ سخی

استاد اِن سب باتوں میں اپنے طالب علموں کو حصہ دار بناتا جاتا۔ پڑوسی زبانوں کے بے شمار اشعار اُسے زبانی یاد تھے۔ اردو کے اساتذہ شاعروں سے لے کر ترقی پسند تحریک تک عبداللہ جان معلومات کا خزانہ تھا۔ اور علم کے اس خزانے پہ کوئی سانپ، کوئی پہریدار نہ تھا۔

اس کو بالخصوص بچیوں کی بے تعلیمی پہ بہت کوفت ہوتی تھی۔ میر صاحب ہمیشہ بچیوں کو تعلیم حاصل کرنے کی ترغیب دیتا تھا۔ وہ عورتوں کے لیے سکول و کالج قائم کرنے کی ہمہ وقت جدوجہد کرتا تھا۔ یونیورسٹی میں وہ جہاں فیمیل سٹوڈنٹس دیکھتا، ایک باپ کی سی شفقت بانٹتا۔ اُن کے مسائل پوچھتا، مطالعے کے بارے میں گائیڈ کرتا اور مستقبل کی راہیں سجھاتا۔ وہ اُن سے رسالوں اخباروں میں مضامین لکھواتا، سمیناروں میں مقالے پڑھواتا اور ملازمتوں کے حصول میں اُن کی مدد کرتا۔ اس باپ نما استاد نے سماج میں عورت کی حیثیت بلند کرنے میں اہم رول ادا کیا۔ طالبات کو ایم اے، ایم فل حتی کہ پی ایچ ڈی کرنے پر راغب کیا۔ وہ اپنے احباب کی بچیوں کا اچھا ''ناکو'' (انکل) تھا۔

پروفیسر جمالدینی کے تعلیمی مشن میں روشن خیالی اور خرد افروزی کا فروغ شامل تھا۔ اسی لیے وہ نوجوانوں پر خصوصی توجہ دیتا تھا۔ طلبہ سے اس کا سلوک مشفقانہ، ہمدردانہ اور دوستانہ ہوتا تھا۔ وہ بہت سے بزرگوں کی طرح پند و نصائح سے کام نہیں لیتا تھا بلکہ مسائل پر سائنٹفک انداز میں غور و خوض کرنے کا راستہ ہموار کرتا تھا۔ نئی نسل کے ذہن وہ اس طرح تیار کرتا تھا کہ رفتہ رفتہ نوجوانوں میں فلسفہ، تاریخ اور سائنسی معلومات کے مطالعے کا ذوق بڑھتا۔

اس کے لیے وہ خود کو سائنسی علوم سے ہر وقت اپ ٹو ڈیٹ رکھتا۔ انٹرنیٹ تو اس زمانے میں دستیاب نہ تھا۔ کتابوں، ریسرچ جرنلز اور دیگر ذرائع سے وہ سائنس کے مضامین میں اپنی علمی استعداد بڑھاتا رہتا۔ نیشنل جیوگرافی اور ڈسکوری چینل وہ بہت شوق سے دیکھتا تھا۔ بلاشبہ عبداللہ جان اس خطے میں سائنس کو مقبول بنانے والوں کا پیش امام تھا۔ ہم نے آرٹس کے اُس استاد سے جنیٹکس، خلا کے بلیک ہولز، اور ''مڈوالکینوز'' کے بارے میں باقاعدہ لیکچر سنے۔

بحیثیت استاد اُس کی شہرت ملک میں دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ اور جہاں بھی وفاقی تعلیمی، ادبی اور کلچرل اداروں کو بلوچستان سے متعلق کسی قسم کا کوئی کام پڑتا عبداللہ جان سے مشورہ کرتا۔ مجھے یاد ہے کہ اکیڈمی ادبیات، یا مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد کے بورڈز آف گورنرز کے

لیے جتنے لوگ بھی بلوچستان سے جاتے رہے اُن کا مشورہ عبداللہ جان جمالدینی دیتا رہا۔

ملک بھر کے اچھے اکیڈمیشنز اور سکالرز میر صاحب سے دوستانہ تعلق میں رہتے۔ میر عبداللہ جان علمی کانفرنسوں سمیناروں میں شرکت کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتا اور مقالہ پڑھتا۔

اپنی یونیورسٹی ملازمت کے دوران اس نے بلوچی زبان کے سکالروں کی ایک بہت بڑی کھیپ تیار کی جو آج بلوچی زبان و ادب کے کارواں کی صفِ اول میں بڑی مستعدی کے ساتھ خدمات سرانجام دے رہی ہے۔ جمالدینی ہی کی کوششوں سے بلوچستان یونیورسٹی میں 1985ء میں بلوچی ایم اے کی کلاسز شروع کرائی گئی تھیں۔ اس نے گھوم پھر کر طالب علم ڈھونڈے، انہیں داخلہ دلوایا اور بہت محنت و شفقت سے پڑھایا۔

اسی دوران عبداللہ جان جمالدینی نے بلوچستان یونیورسٹی سے اردو ادب میں ماسٹر کی ڈگری حاصل کی۔ پہلے وہ ''پاکستان سٹڈیز'' کے شعبے میں رہا۔ بعد میں جب یہ شعبہ 'مطالعہ پاکستان' سے ہٹ کر بلوچی براہوئی اور پشتو کے الگ اور مستقل شعبوں میں بٹ گیا تو ماما شعبہ بلوچی کا چیئرمین بن گیا اور تشنگانِ علم کی پیاس بجھاتا رہا۔ وہ ریٹائرمنٹ تک اور اُس کے بعد بھی ایک ہمہ وقت استاد رہا۔ لیکن کہاں ریٹائرمنٹ؟ تعلیم و تدریس کا سلسلہ تو اس نے اپنی ریٹائرمنٹ کے بعد موت تک جاری رکھا ہوا تھا۔ (وہ 1983 میں ریٹائر ہوگیا)۔

میر عبداللہ جان کا کمرہ ہر وقت علم کے خواہشمندوں سے بھرا رہتا۔ وہ کسی کے مضمون کی اصلاح کر رہا ہوتا۔ کسی کو لکھنے کے لیے موضوع دے رہا ہوتا۔ چونکہ وہ بہت سی زبانیں جانتا تھا۔ اس لیے ہر زبان کے سٹوڈنٹس راہنمائی کے لیے آتے۔

طالب علموں کے علاوہ اساتذہ بڑی تعداد میں اُس کے گرد جمگھٹا لگائے رکھتے۔ طالب علم ہوتے یا اساتذہ، عبداللہ جان میں ایک دلچسپ خاصیت تھی۔ وہ موضوع پہ تقریر نہیں کرتا تھا۔ یک طرفہ لیکچر بازی اسے پسند نہ تھی۔ وہ مخاطب کو بولنے دیتا، درمیان درمیان میں رہنما قسم کا کوئی لقمہ دے جاتا اور خود کو بالکل ناواقف قرار دے کر طالب علم میں فکر و تفکر کا پراسیس جاری کرواتا۔ ہاں۔ آخر میں جو نکتہ رہ جاتا وہ اُسے خود بیان کر جاتا۔۔۔ عبداللہ جان ایسی ذہن سازی کرتا کہ اُس سے پڑھا ہوا شخص سوچتا تھا، اور بولتا بھی تھا۔

عبداللہ جمالدینی اپنے طلبا کو اپنی اولاد قرار دیتا تھا۔ اور یہ محض ایک روایتی فقرہ نہیں ہے۔

وہ اُن کے خانگی خاندانی مسائل کے حل میں مدد کرتا، جہاں تک ہوتا ان کی فیس، کتابوں اور رہائش کے لیے کوئی انتظام کر دیتا تھا۔ اس وقت کئی طلبہ ملازم پیشہ بھی ہوتے تھے چناں چہ طالبات کی اکثریت صبح کی کلاسوں میں اور طلبہ کی اکثریت سہ پہر کی کلاسوں میں آتی تھی اور بلوچستان یونیورسٹی کے اساتذہ ایک دن میں دو مرتبہ وہی نصاب پڑھاتے تھے جس کا آغاز صبح ہوتا تھا۔

پروفیسر عبداللہ جان بعد از تعلیم اپنے طلبا کو روزگار کے حصول میں بھی کوشاں رہتا۔ اپنی سائیکل پہ شام کو وہ کئی بیوروکریٹ دوستوں کے گھروں کو دستک دیتا رہتا تھا تاکہ اس کے کسی فارغ التحصیل طالب علم کے لیے ملازمت کا بندوبست ہو سکے۔

اس کے فارغ التحصیل شاگرد ہمیشہ اُس سے رابطہ رکھتے۔ اس کے سابقہ شاگرد خواہ کوئٹہ میں ہوتے یا دور دراز ملازمتوں میں، وہ عبداللہ جان کے دفتر یا گھر ضرور حاضری دیتے۔ جب بلوچستان جمعہ پارٹی (بعد میں جس کا نام بلوچستان سنڈے پارٹی پڑا) کی محفلیں ہفتہ وار چھٹی کے دن لگنے لگیں تو پھر تو اُس کے شاگردوں کا اُس سے ملنا اور آسان ہو گیا۔ وہ اپنے ان شاگردوں سے ماضی کی باتیں کم، مگر حال اور مستقبل کے معاملات پہ ہی گفتگو کرتا۔ نئی کونسی کتابیں آئی ہیں، کون سی نئی سائنسی دریافتیں ہوئی ہیں۔ اور ادب کی دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ تاریخ، فلسفہ، ادب اور سیاست عبداللہ کے پسندیدہ موضوعات ہوتے تھے۔

میر عبداللہ جان جمالدینی کے طالب علم ایران افغانستان خلیجی ممالک اور یورپ میں کثیر تعداد میں موجود ہیں۔ اُن سب کی بلوچستان اور انسان دوستی کا اہم ترین سبب عبداللہ جان کی شاگردی ہے۔ ہمیں یاد ہے کہ براعظموں میں پھیلے اُس کے طالب علم کتنی چاہت سے اسے اپنے ملک بلانے کی دعوتیں دیتے رہتے تھے۔ مگر یہ سب سفر ایک شخص کیسے کر سکتا تھا۔ وہ بس ایک بار کافی ملکوں میں اپنے شاگردوں سے ملنے جا سکا تھا۔

میر عبداللہ جان کلاس میں سادگی کا نمونہ تھا۔ استری شدہ صاف ستھرے کپڑے، گرمیوں میں واسکٹ اور سردیوں میں کوٹ زیب تن کیے ٹھیک وقت پر کلاس روم میں داخل ہو جاتا۔ وہ لیکچر میں نسبتاً دھیمے انداز میں بات کرتا۔ ایک مہذب ترین انسان کے بطور طالب علم سے ہمیشہ ''واجہ، برات'' کہہ کر مخاطب ہوتا۔ بلوچی میں ''شما'' کا صیغہ ویسے ہی نہیں ہے اور استاد کی طرف سے شاگرد کے لیے اس کا استعمال حیران کن لگتا ہے۔ مگر عبداللہ جان نے اِسی ''شما'' کو اس قدر فروغ

دیا کہ یہی پھر علمی ادبی لہجہ بن کر رہ گیا۔

اُس کے پرائمری ٹیچر میر مٹھا خان مری کے اپنے طلبا کے بارے میں رویہ دیکھیے: ''۔۔ہم بچوں کو اتنی عزت دیتا تھا کہ ہم اُس کے سامنے خود کو وی آئی پی سمجھتے تھے''۔(1)

ایک وسیع المطالعہ شخص ہونے کی برکت سے میر عبداللہ جان کا لیکچر مقامی روایتوں، استعارات کا گلدستہ تو ہوتا ہی تھا مگر اس میں بین الاقوامی ادب و علم کی خوبصورت آمیزش بھی موجود ہوتی۔ کمال بات یہ تھی کہ وہ اپنے ساتھ رابطہ میں آئے ہر شخص کو اپنے سرہانے کے نیچے ایک کتاب رکھنے کی مستقل عادت ڈال دیتا۔

عبداللہ جان اپنے طالب علموں کو سادگی، بے تکبری اور سچائی خوب سکھاتا تھا۔ سادگی کا مطلب میلا کچیلا رہنا قطعاً نہیں ہوتا تھا، بے تکبری کمتری بالکل نہیں ہوتی تھی اور سچائی کا مطلب دوسروں کے امور میں مداخلت کرنا نہ ہوتا تھا۔

حوالہ جات:

1۔ مری، دین محمد۔ میر مٹھا خان مری۔ ماہنامہ بلوچی دنیا۔ ملتان۔ اپریل 1989

پروفیسر عرش صدیقی

رضی الدین رضی

عرش صدیقی کا اصل نام ارشاد الرحمٰن تھا۔ 21 جنوری 1927ء کو گورداسپور میں پیدا ہوئے۔ میٹرک تک گورنمنٹ ہائی سکول گڑگاؤں میں تعلیم حاصل کی۔ ایف اے کا امتحان 1947ء میں گورنمنٹ کالج لدھیانہ سے پاس کیا۔ قیام پاکستان کے وقت آپ کی عمر 20 برس تھی۔ عرش صاحب ہجرت کے بعد لاہور آباد ہوئے اور وہیں سے بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ آپ نے پاکستان ریلویز میں ٹکٹ چیکر کی حیثیت سے ملازمت کا آغاز کیا۔ بعدازاں 1955ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے انگریزی کی ڈگری حاصل کی اور محکمہ تعلیم سے منسلک ہوگئے۔ 1968ء سے 1975ء تک وہ گورنمنٹ ایمرسن کالج ملتان میں تعینات رہے۔ بہاء الدین زکریا یونیورسٹی میں تدریسی کام شروع ہوا تو 1975ء میں عرش صدیقی اس یونیورسٹی سے منسلک ہوگئے۔ زکریا یونیورسٹی میں انہوں نے صدر شعبہ انگریزی کی حیثیت سے 1978ء تک خدمات انجام دیں۔ 1978ء میں عرش صاحب کو زکریا یونیورسٹی کا رجسٹرار مقرر کر دیا گیا۔ 1990ء تک اس منصب پر فائز رہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد عرش صاحب نے ملتان پوسٹ گریجویٹ کالج کے پرنسپل کی حیثیت سے بھی کچھ عرصہ خدمات انجام دیں۔ یہ ایک نجی کالج تھا لیکن عرش صاحب کا اس کالج کے ساتھ تعلق زیادہ دیرجاری نہ رہ سکا۔ انگریزی ادب کے استاد کی حیثیت سے عرش صدیقی نے کئی نسلوں کی تربیت کی۔ ان کے شاگردوں میں ڈاکٹر انوار احمد، اصغر ندیم سید سمیت بہت سی نامور ہستیاں شامل ہیں جن میں کئی نامور ڈاکٹر بھی ہیں، وکلاء بھی، جج صاحبان بھی اور بیوروکریٹ بھی۔ عرش صاحب کا اپنے شاگردوں کے ساتھ

دوستانہ رویہ تھا۔ لیکن اس دوستانہ رویے میں وہ ایک فاصلہ ضرور برقرار رکھتے تھے کہ کہیں استاد کے ساتھ شاگرد کا احترام کا جو رشتہ ہے وہ مجروح نہ ہو جائے۔ لیکن وہ اپنے شاگردوں کی دیکھ بھال بھی کرتے تھے، ان کی ضروریات کا بھی خیال رکھتے تھے، ان پر کوئی مشکل وقت آن پڑتا تو اس میں بھی ان کا بھرپور ساتھ دیتے تھے۔ ضیاء دور میں جب ملک بھر کی طرح ملتان میں بھی شعروادب اور شعبہ تعلیم سے وابستہ افراد کی گرفتاریوں کا عمل جاری تھا تو اس زمانے میں ڈاکٹر انوار احمد عرش صدیقی کے گھر ایک حصے میں کرائے دار کی حیثیت سے مقیم تھے۔ عرش صاحب ان دنوں زکریا یونیورسٹی کے رجسٹرار کی حیثیت سے فرائض انجام دے رہے تھے۔ ڈاکٹر انوار احمد کے وارنٹ جاری ہوئے تو عرش صاحب کے لیے مشکل لمحہ آ گیا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کے گھر پولیس چھاپہ مارے۔ ملتان میں سلیم اختر کیانی مجسٹریٹ تھے جو عرش صاحب کے شاگردوں میں سے تھے۔ عرش صدیقی ڈاکٹر انوار احمد کو سلیم اختر کیانی کے پاس خود لے کر گئے۔ سلیم اختر کیانی نے ڈاکٹر انوار احمد کو مشورہ دیا کہ سردست وہ کہیں اور منتقل ہو جائیں کیونکہ حکومت کی جانب سے گرفتاریوں کے لیے بہت دباؤ ہے۔ جب حالات معمول پر آ جائیں تو پھر بے شک وہ دوبارہ عرش صاحب کے گھر منتقل ہو جائیں۔

ایک استاد کی حیثیت سے انہوں نے شعروادب کے میدان میں بہت سے لوگوں کی تربیت کی۔ ملتان میں رائٹرز گلڈ کے سیکرٹری کی حیثیت سے انہوں نے اس شہر میں تنقیدی محفلوں کو رائج کیا اور رائٹرز گلڈ کے ذریعے ملتان روایتی مشاعروں سے نکل کر ایک ایسے ماحول میں داخل ہوا جہاں تنقیدی اجلاسوں میں خالصتاً علمی بنیادوں پر شعروادب کی تفہیم کی جاتی تھی اور نئے لکھنے والوں کی تخلیقات کو پرکھنے کا عمل جاری تھا۔ رائٹرز گلڈ کے بعد ملتان میں اردو اکیڈمی کے قیام میں بھی عرش صدیقی صاحب کی کوششیں شامل حال تھیں۔ اردو اکیڈمی ایک ایسا ادارہ ہے جس نے ملتان میں بہت خوبصورت ادبی مجالس کا اہتمام کیا۔ ایک تسلسل کے ساتھ اردو اکیڈمی کے ہفتہ وار اجلاس سالہا سال تک جاری رہے اور ان اجلاسوں میں عرش صدیقی ایک شجر سایہ دار کی طرح موجود ہوتے تھے۔ 1960ء کے عشرے کے بعد ملتان میں جو بھی نئے لکھنے والے سامنے آئے ان

میں سے بیشتر کی تربیت اردو اکیڈمی کے اجلاسوں میں ہوئی۔

پروفیسر سید علی عباس جلالپوری

پروفیسر امجد علی شاکر

سید علی عباس جلال پوری ۱۹ اکتوبر ۱۹۱۴ء کو ڈنگہ ضلع گجرات میں پیدا ہوئے۔ وہ سیکنڈری تعلیم کے بعد لاہور آ گئے اور گورنمنٹ کالج میں داخل ہو گئے۔ انھیں دو مضامین سے خصوصی شغف تھا، فارسی اور فلسفہ۔ فارسی والد محترم نے پڑھائی تھی اور بہت شوق سے پڑھائی تھی؛ فلسفہ سے خود انھیں دلچسپی ہوئی اور تمام عمر قائم رہی۔ علم و ادب کے ساتھ ساتھ انھیں موسیقی سے بھی گہرا شغف تھا، مگر موسیقی کے شوق کو فلسفے کی دہلیز پر قربان کرنا پڑا اور تمام عمر اسی کے ساتھ گزار دی۔ انھوں نے گورنمنٹ کالج لاہور سے بی۔اے کا امتحان پاس کیا۔ اسی دوران میں انھیں والد محترم کی وفات کا صدمہ سہنا پڑا۔ بی۔اے کے بعد تحصیل علم کا سلسلہ باقاعدہ نہ رہا اور انھیں ترسیل عمل کو ذریعہ معاش بنانا پڑا۔ جلال پور شریف میں آریہ سماج کے سکول میں پڑھانا شروع کیا۔ وہ ۱۹۴۵ء میں سی۔ٹی کا امتحان پاس کر کے سرکاری سکول میں مدرس ہو گئے۔ ملازمت کے فرائض پنڈ دادن خاں، مکول، بوچھال کلاں اور پنڈی گھیپ کے سکولوں میں سرانجام دیے۔ اس دوران میں انھوں نے ایم اے فلسفہ، ایم۔اے فارسی اور ایم۔اے اردو کے امتحانات اعزاز کے ساتھ پاس کیے۔ ان مضامین میں ایم۔اے کرنے کی وجہ انھوں نے راقم سے یوں بیان کی:

> ''فلسفہ میرا مضمون تھا، فارسی والد مرحوم نے پڑھائی تھی اور وہ چاہتے تھے کہ میں فارسی میں ایم۔اے کروں۔ اردو میں ایم۔اے اس لیے کیا کہ اس مضمون میں ملازمت ملنے کا امکان تھا اور بس۔''

سید علی عباس جلال پوری نے ایمرسن کالج ملتان میں بطور لیکچرر اردو اپنی کالج سروس کا

آغاز کیا اور وہاں کی لائبریری سے استفادہ کرتے رہے۔ ۱۹۵۸ء میں گورنمنٹ کالج گوجرانوالہ آ گئے۔ مقصد یہ تھا کہ لاہور کے قریب پہنچ جائیں اور یہاں کی لائبریریوں سے فائدہ اٹھا سکیں۔ ۱۹۶۷ء میں ترقی پا کر سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور آ گئے اور شعبہ پنجابی کی بنیاد گزاروں میں شامل ہو گئے۔ ۱۹۷۹ء میں وہ جلال پور شریف لوٹ گئے جو ان کے بزرگوں کا مسکن رہا تھا۔ ان کے صاحبزادے پروفیسر حامد رضا نے جہلم میں مکان بنا لیا تو ان کے ہاں جہلم منتقل ہو گئے۔ وہ تمام عمر تدریس اور تصنیف سے وابستہ رہے اور علم و آگہی کے چراغ جلاتے رہے۔ ۱۹۸۴ء میں فالج کے مرض کے باعث دایاں ہاتھ متاثر ہوا اور وہ لکھنے کے قابل نہ رہا۔ انھوں نے بائیں ہاتھ سے لکھنے کی کوشش تو کی، مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ یوں ان کا قلم کاغذ پر علم کے گلزار سجانے سے محروم ہو گیا۔ آخر کو طویل علالت کے بعد ۶ دسمبر ۱۹۹۸ء کو جہلم میں اس جہان فانی سے عالم جاودانی کو روانہ ہو گئے۔

سید صاحب کی تصانیف کی فہرست یوں ہے:

(۱) روح عصر (۲) روایات فلسفہ (۳) اقبال کا علم الکلام
(۴) روایاتِ تمدن قدیم (۵) عام فکری مغالطے (۶) مقاماتِ وارث شاہ
(۷) وحدت الوجود تے پنجابی شاعری (۸) تاریخ کا نیا موڑ (۹) مقالات جلال پوری
(۱۰) جنسیاتی مطالعے (۱۱) کائنات اور انسان (۱۲) خرد نامۂ جلال پوری
(۱۳) رسومِ اقوام (۱۴) پریم کا پنچھی پنکھ پسارے (۱۵) مکاتیب

سید صاحب کی مندرجہ ذیل کتب منتظرِ اشاعت ہیں:

(۱) ساڈے وڈکیاں دی سوجھ (۲) سبد گلچیں (۳) میرا بچپن اور لڑکپن

نامکمل کتب:

(۱) سنگ ریزے (۲) یہ جہان رنگ و بو

سید صاحب کے بہت سے مقالات اور فنون میں ہونے والے مباحثے بھی اگر مرتب کر دیے جائیں تو اس فہرست میں یقیناً چار یا پانچ کتابوں کا اضافہ ہو سکتا ہے۔

ان کتب کے علاوہ ان کا اثاثہ وہ چالیس ڈائریاں ہیں جن میں دنیا بھر کی اہم کتابوں کے نوٹس ہیں۔ یہ ان کے طویل مطالعے کا حاصل ہیں۔

تاثرات:

سید علی عباس جلال پوری میرے دادا استاد تھے۔ میرے استاد پروفیسر ابوالاعجاز حفیظ صدیقی ان سے اردو پڑھتے رہے۔ استادِ محترم اُن کے علم اور جرأت اظہار کے بہت معترف تھے۔ پاکستانی معاشرے میں سوال اٹھانا اور نئی بات کرنا شجرِ ممنوعہ رہا ہے۔ سید صاحب تمام عمر سوال اٹھاتے رہے اور نئی بات کہتے رہے۔ وہ گھسی پٹی باتوں سے گریز کرتے رہے اور پرانی باتیں دہرانے سے اجتناب کرتے رہے۔ انھوں نے تمام عمر بڑی کتابوں کو پڑھا اور بڑے موضوعات پر لکھنے کی کوشش کی۔ وہ بڑی کتابوں کو پڑھ کر ان سے مرعوب نہیں ہوتے تھے، ان سے اختلاف بھی کرتے تھے اور ان پر سوال بھی اٹھاتے تھے۔ انھوں نے ول ڈیورانٹ کی کتاب Story of philosophy کو پڑھ کر اس سے اختلاف کیا اور مصنف کو خط لکھ کر انھیں اپنے نقطۂ نظر سے آگاہ کیا۔ ول ڈیورانٹ نے انھیں جواب میں خط لکھا اور بقول ڈاکٹر طارق جاوید:

''جوابی خط میں ول ڈیورانٹ نے وعدہ کیا کہ آئندہ ایڈیشن میں وہ ان اغلاط کی تصحیح کردے گا۔''(۱)

سید صاحب نے عمر کا آخر حصہ بیماریوں کے ساتھ رہ کر گزارا۔ میں نے ان سے احوال پوچھا تو کہنے لگے:

''میں نے بیماریوں سے سمجھوتا کر لیا ہے۔ میں نے اس کے حال پر چھوڑ دیا ہے۔''(۲)

سید صاحب جلالی طبیعت کے بزرگ تھے، اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے نقطہ نظر کے آدمی تھے۔ ان کا ادب کا معیار بہت بلند تھا، وہ بہت کم لکھنے والوں کو ادبی اہمیت دینے کو تیار ہوتے تھے۔ اس لیے بعض لوگ ان سے ناراض بھی ہو جاتے تھے۔ ویسے بھی ان کے مزاج میں جلال تھا۔ اس کی وجہ ان کا مشاہدہ تھا۔ انھوں نے بہت سی ریاکاریوں کو دیکھا تھا جنھیں وہ بے تکلف بیان کرتے تھے۔

سید صاحب تمام عمر پڑھتے رہے اور لکھتے رہے۔ ان کے لکھنے پڑھنے کا سلسلہ ہمہ عمر اور ہمہ وقت کا تھا۔ یہ تو عشق ہے جو پورا وجود مانگتا ہے۔ آپ نے اس عشق میں پورا وجود پیش کر دیا۔ یہاں تک کہ موسیقی سے اپنا عشق بھی اور شاعری بھی، سید صاحب نے شاعری بھی کی تھی۔

میرے سوال پر بتایا کہ ان کی تمام شاعری شریف کنجاہی کے حافظے میں محفوظ ہے۔ میں نے شریف کنجاہی سے پوچھا تو کہنے لگے؟ کچھ یاد ہے اور کچھ بھول گئی ہے۔

میں نے کہا: جو یاد ہے، اسے لکھ دیجیے؟(۳)

انھوں نے وعدہ تو کیا، مگر وہ خود بھی دنیا سے چل بسے۔ یوں اُن کے ساتھ ساتھ سید علی عباس جلال پوری کی شاعری بھی زمین میں دفن ہوگئی۔

تصانیف

۱۔ پیار کا پنچھی پنکھ پسارے، جنوری ۲۰۱۱ء، زرنگار بک فاؤنڈیشن فیصل آباد

یہ ۹۶ صفحات کا مختصر سا ناول سید علی عباس جلال پوری نے اس وقت لکھا جب وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھتے تھے۔ پھر وہ بشریات، عمرانیات، تنقید اور فلسفے کی طرف جا نکلے اور وہ ناول نگاری کے سلسلے کو آگے نہ بڑھا سکے۔ انھوں نے یہ ناول اپنی ادبی زندگی کی ابتدا میں قلمبند کیا۔ پھر نہ تو اسے شائع کیا، نہ ضائع کیا۔ مسودہ ان کے پاس محفوظ رہا جسے ان کی صاحبزادی پروفیسر لالہ رخ نے شائع کیا۔ یہ ناول رومانی کہانی پر مبنی ہے۔ اس ناول میں تقسیم سے پہلے کے مشترکہ ہندو مسلم سماج کے جوان لڑکے اور لڑکی کے عشق کا ایک قصہ ہے جو گہری معنویت نہ رکھتے ہوئے بعض حوالوں سے خاصا بامعنی ہے۔ ایک معنویت تو یہی ہے کہ اس میں سماج کے مختلف تضادات اور بوقلمونی سے آگاہی ہوتی ہے۔ دوسرے اس میں پوٹھوہار کی زبان کی لفظیات ملتی ہے۔ اس میں علاقے کی ریتیں رسمیں بھی ہیں، ہندو مذہب کے عقائد اور رسوم بھی ہیں۔ ان باتوں نے ناول کو اردو ادب کے قاری کے لیے خاصا بامعنی بنا دیا ہے۔

۲۔ روحِ عصر، ۱۹۶۹ء آئینہ ادب لاہور

یہ کتاب اس زمانے میں لکھی گئی جب سید علی عباس جلال پور گوجرانوالہ میں پڑھا رہے تھے۔ یہ کتاب اشاعت کے اعتبار سے آپ کی پہلی کتاب ہے۔ یہ کتاب انسانی تہذیب کی تاریخ ہے جسے مصنف نے انسانی زندگی کے عمومی رجحانات کو مدنظر رکھتے ہوئے مندرجہ ذیل ابواب میں تقسیم کیا ہے:

(۱) انتسابِ ارواح	(۲) زرخیزی کے مت	(۳) اصلاحِ مذاہبِ قدیم
(۴) آزادیِ فکر و نظر	(۵) عالمی شہریت کا تصور	(۶) عہدِ علمِ کلام

(۷) نشاۃ الثانیہ (۸) صنعتی انقلاب اور مغربی سامراج

(۹) صدیِ رواں اور زوالِ مغرب (۱۰) روحِ عصرِ حاضر

سید علی عباس جلالپوری نے ہر تاریخی عہد کو ایک خاص عنوان سے یاد کیا ہے۔ اس عنوان کو وہ روح عصر کہتے ہیں۔ روح عصر کا یہ تصور انھوں نے جرمنوں سے لیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''یونانی فلاسفہ کی طرح جرمن فلاسفہ نے بھی ہمیشہ کلیات کی روشنی میں جزئیات کا مطالعہ کیا ہے۔ ان کے فلسفہ تاریخ میں روح عصر (Zeit Geist) کا تصور اس اندازِ نظر کی ایک روشن مثال ہے..... راقم نے روح عصر کے تصور کی روشنی میں تاریخ عالم کے مختلف ادوار کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔'' (۴)

سید علی عباس جلالپوری کی روح عصر انسانی تاریخ اور تہذیب کی کہانی ہے اور منفرد انداز کی کہانی ہے۔

۳۔ اقبال کا علمِ کلام، جدید اشاعت ۲۰۱۳ء تخلیقات لاہور

اس کتاب کا پیش لفظ ۷ فروری ۱۹۷۱ء کو لاہور میں لکھا گیا۔ اُسی دور میں یہ کتاب لاہور سے شائع ہوئی۔

اقبال کا علم کلام میں مصنف نے اس نقطہ نظر کو پیش کیا ہے کہ اقبال فلسفی نہیں متکلم تھے۔ دلیل اس دعوے کی یہ ہے کہ اقبال عقیدہ پہلے رکھتے تھے اور دلائل بعد میں جمع کر رہے تھے۔ اقبال کو متکلم کہنے سے نہ اقبال کی عظمت کم ہوتی ہے، نہ مصنف کو اس بات پر گردن زدنی ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ بہت سے لوگوں نے سید علی عباس سے اختلاف کیا اور انھیں ایسا کرنے کا حق حاصل تھا۔ ان اختلاف کرنے والوں میں بی۔ اے ڈار کا نام نمایاں ہے۔ انھوں نے فنون کے صفحات پر سید علی عباس جلال پوری سے مباحثہ کیا۔ ظاہر ہے دونوں طرف سے دلائل دیئے گئے۔ دونوں نقطۂ نظر استدلال سے محروم نہیں تھے۔ سید علی عباس نے زیر نظر کتاب میں علم کلام کے آغاز و ارتقا اور مسلم دنیا پر علم کلام کے اثرات و نتائج پر بھی بحث کی ہے اور اقبال کے کلام اور ان کی نثری تحریروں سے ان کے افکار کو جمع اور مرتب کیا ہے۔ انھوں نے اقبال کی فکر کی تفہیم میں تجزیاتی انداز اختیار کیا ہے اور علم کلام کی تاریخ پیش کرتے ہوئے تبحر علمی کا ثبوت دیا ہے۔ انھوں نے آخر میں دنیائے اسلام میں خرد افروزی کی ضرورت کے عنوان کے تحت بعض اہم سوالات اٹھائے ہیں۔

کتاب کے آخر میں تصریحات کے عنوان کے تحت انیس فکری اور فلسفیانہ اصطلاحات کا تعارف پیش کیا گیا ہے جو اپنی جگہ بہت اہم ہے۔ آخر میں فلسفیانہ اصطلاحات کے اردو تراجم بھی دیئے ہیں۔ سید صاحب نے فلسفیانہ اصطلاحات کے اردو تراجم میں اپنی راہ خود نکالی ہے۔

۴۔ روایات تمدن قدیم، ۱۹۸۹ء خرد افروز لاہور

یہ کتاب علم بشریات پر بہت اہم کتاب ہے۔ اس میں انسانی معاشرے کے عہد قدیم کی اُن روایات کی کہانی ہے جو ہمارے آج میں بھی کسی نہ کسی صورت میں زندہ ہیں۔ سید علی عباس جلال پوری نے اس کتاب میں انسانی تہذیب کی ایسی جہتوں کو دریافت کیا ہے جو انسانی سرگذشت کے جاننے میں بہت اہم ہیں۔

۵۔ عام فکری مغالطے

سید علی عباس جلاس پوری نے یہ کتاب ۱۹۶۷ء کے بعد اپنے لاہور کے قیام کے دوران میں لکھی ہے۔ مقصد ان کا خرد افروزی تھا۔ دراصل ہمارے ہاں بہت سے مفروضے ہیں جو یقینیات کا درجہ اختیار کر گئے ہیں اور بہت سے مبالغے ہیں جو حقیقت سمجھے جاتے ہیں۔ اس کتاب میں ایسے ہی مفروضے، مغالطے اور مبالغے ہیں۔ ان کی فہرست یہ ہے:

۱۔ یہ کہ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔
۲۔ یہ کہ بے راہ روی کا نام آزادی ہے۔
۳۔ یہ کہ ماضی کتنا اچھا زمانہ تھا۔
۴۔ یہ کہ فلسفہ جاں بلب ہے۔
۵۔ یہ کہ انسانی فطرت ناقابلِ تغیر ہے۔
۶۔ یہ کہ وجدان کو عقل پر برتری حاصل ہے۔
۷۔ یہ کہ دولت مسرت کا باعث ہوتی ہے۔
۸۔ یہ کہ تصوف مذہب کا جز ہے۔
۹۔ یہ کہ عشق ایک مرض ہے۔
۱۰۔ یہ کہ اخلاقی قدریں ازلی ابدی ہیں۔
۱۱۔ یہ کہ عورت مرد سے کمتر ہے۔

۱۲۔ یہ کہ فن برائے فنکار ہے۔

۱۳۔ یہ کہ انسانی فطرت خودغرض ہے۔

۱۴۔ یہ کہ ریاست اور مذہب لازم وملزوم ہیں۔

سید علی عباس جلال پوری نے عقلی اور علمی حوالے سے ان موضوعات پر لکھا ہے۔ انھوں نے تاریخ کے دولابی Cyclic تصور کی نفی کی ہے اور Spiral تصور کی وکالت کی ہے۔ وہ خرد افروزی کے مکتب فکر سے تعلق رکھتے تھے اور اس میں کسی سمجھوتے کے قائل نہیں۔ وہ پہلے باب میں لکھتے ہیں:

''تاریخ نوع انسانی کی حرکت دولابی نہیں ہے یعنی تاریخ کا عمل ایک دائرے میں چکر نہیں لگا رہا، بلکہ خط مستقیم پر ارتقا پذیر ہے۔ انسان کا دورِ وحشت اس زمانے سے یقیناً بہتر تھا جب اس کے آباؤ اجداد درختوں پر بسرا کرتے تھے اور بربریت کا دور وحشت کے دور سے بہتر ثابت ہوا کہ اس میں آگ دریافت کر لی گئی تھی اور دھاتوں کا استعمال رواج پا گیا تھا۔''(۵)

۶۔ روایاتِ فلسفہ: الشال لاہور، جدید اشاعت ۲۰۱۳ء، تخلیقات لاہور

سید علی عباس جلال پوری نے پاکستان میں فلسفے کی تعلیم عام کرنے کی بہت کوشش کی۔ یہ کتاب اسی سلسلے کی ایک کوشش اور کاوش ہے۔ انھوں نے کوشش کی کہ فلسفے کو عام فہم پیرائے میں پیش کیا جائے۔ اس بات کا اظہار وہ اس کتاب کے دیباچے میں کرتے ہیں، مگر فلسفہ بہرحال فلسفہ ہے۔ یہ زیادہ سے زیادہ کس قدر عام فہم ہو سکے گا۔ بہرحال انھوں نے اسے عام فہم بنانے کی بہت کوشش کی ہے، مقصد ان کا وہی خرد افروزی ہے۔ وہ اس کتاب کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

''روایات فلسفہ اس توقع کے ساتھ پیش کی جا رہی ہے کہ چند ایک روزن اور دریچے کھل جائیں گے اور چند ایک تازہ ہوا کے جھونکے کوٹھڑیوں میں بار پا سکیں۔ نئے نئے خیالات آدمی کے دل و دماغ میں ہلچل پیدا کرتے ہیں۔ نئے نئے خیالات کا نفوذ شاید ذہنی کرب کا باعث بھی ہوتا ہے، لیکن دیانت اور جرأت سے کام لے کر ایسے نئے خیالات کو قبول کر لیا جائے جن کی صداقت آشکار ہو چکی ہے تو یہ کرب مسرت میں بدل جاتا ہے۔''(۶)

مصنف اپنے زیر نظر کتاب میں فلسفے کے آٹھ دبستان زیر بحث لائے ہیں اور ان کا جامع تعارف پیش کیا ہے۔ انھی آٹھ دبستانوں میں فلسفے کی پوری تاریخ سمٹ گئی ہے۔ یہ دبستاں درج ذیل ہیں:

(۱) مادیت پسندی (۲) عینیت پسندی (۳) نوفلاطونیت

(۴) تجربیت اور متعلقہ تحریکیں (۵) ارادیت (۶) ارتقائیت

(۷) حدلیاتی مادیت (۸) موجودیت پسندی

مصنف نے Existancialham کا ترجمہ وجودیت کرنے کی بجائے موجودیت پسندی کیا ہے۔ انھوں نے اس کتاب کے آخر میں فلسفے کی اصطلاحات کے اردو مترادفات بھی دیئے ہیں۔ اس سے اندازہ کیا جاتا ہے کہ وہ اردو میں اصطلاحات سازی پر گہری نظر رکھتے ہیں اور نئے مترادفات متعین کرنے پر قدرت بھی رکھتے ہیں۔

۷۔ مقامات وارث شاہ، طبع جدید ۲۰۱۳ء تخلیقات لاہور

اس کتاب کا پیش لفظ ۱۴ جنوری ۱۹۷۲ء کو لاہور میں لکھا گیا۔ گویا یہ کتاب ۱۹۷۱ء میں مکمل ہو چکی تھی۔

مقامات وارث شاہ پنجابی کے عظیم شاعر وارث شاہ اور ان کے لازوال تخلیقی کارنامے ''ہیر'' کے بارے میں لکھی گئی ہے۔ مصنف نے ہیر کا مستند نسخہ مدنظر رکھنے کے بجائے متداول نسخے ہی مدنظر رکھے ہیں۔ سید علی عباس جلال پوری نے ہیر وارث شاہ کو عالمی ادب کے تناظر میں پڑھنے کی کوشش کی ہے اور کامیاب کوشش کی ہے۔ وہ اپنے مطالعے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں:

''روسی ناول نگار، گوگل، ترگنیف، دوستوفسکی، ٹالسٹائی وغیرہ پر نقد لکھتے وقت کہا جاتا ہے کہ ان کے ناولوں میں روسی روح پوری طرح منکشف ہوئی ہے۔۔۔ اسی طرح کہا جاتا ہے کہ دانتے کے طربیہ خداوندی میں اطالوی روح اپنی تقدس آمیز جمالیت اور گوئٹے کی فاؤسٹ میں جرمن روح اپنی ہمہ گیر آفاقیت کے ساتھ منعکس ہوئی ہے۔ ہیر وارث شاہ میں پنجابیوں کی شہامت، وسعتِ تخیل، جوانمردی، زندہ دلی اور دردمندی کا امتزاج عاشقانہ وارفتگی اور رفعت پسندی کے ساتھ ایسے نادر پیرائے

میں ہوا ہے کہ دنیائے شعروشاعری کے چند گنے چنے شاہکار ہی ہیر کے مقابلے میں پیش کیے جاسکتے ہیں۔''(۷)

مقامات وارث شاہ میں مصنف نے تجزیے، تقابل اور عمرانی تنقید کے ایسے عمدہ نمونے پیش کیے ہیں کہ ان کی تنقید صحیح معنی میں فلسفۂ ادب کا فریضہ ادا کرتی نظر آرہی ہے اور یہی بلند نظری ان کی تنقید کا جواز اور امتیاز ہے۔

۸۔ وحدت الوجود تے پنجابی شاعری، ۱۹۷۷ء، پنجابی ادبی بورڈ لاہور

یہ واحد کتاب ہے جو علی عباس جلال پوری نے پنجابی میں لکھی۔ اس کتاب میں مصنف نے وحدت الوجود کے فلسفے کو عالمی تناظر میں پیش کیا ہے۔ ظاہر ہے مصنف فلسفے کے ڈسپلن کے آدمی تھے۔ انھوں نے وحدت الوجود کے فلسفہ کی توضیح اور تشریح کرتے ہوئے اسے برصغیر کے دائرے میں یا اسلامی روایت میں محدود نہیں رکھا، دوسرے اسے دوسرے فلسفیانہ نظریات کے پہلو بہ پہلو دکھایا اور بیان کیا ہے۔ سید علی عباس جلال پوری نے وحدت الوجود کے فلسفے کو پنجابی شاعری کے حوالے سے پیش کیا ہے اور دکھایا ہے کہ یہ وہ فلسفیانہ بنیاد ہے جو پنجابی تصوف اور پنجابی شاعری کے پس منظر میں ہمیشہ موجود رہی ہے۔ یہ کتاب اب تک پانچ بار شائع ہو چکی ہے۔

۹۔ تاریخ کا نیا موڑ، جدید اشاعت، ۲۰۱۳ء، تخلیقات لاہور

سید علی عباس جلال پوری نے اقبال کا علم کلام میں علامہ اقبال کو فلسفی کی بجائے متکلم ٹھہرایا تھا۔ اس کتاب میں انھوں نے فلسفی ہونے کے باوجود متکلم کا انداز اختیار کیا ہے۔ انھوں نے مارکسزم کو دلائل سے درست ثابت کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ اس کتاب میں تاریخی تناظر سے فکری تناظر کا باب زیادہ بھرپور ہے۔ مصنف نے مارکسزم کو سماجی سائنس سے زیادہ فلسفے کے طور پر پیش کیا ہے۔ مارکسزم پر لکھنے والے دوسرے مصنفین کے مقابلے میں علی عباس جلال پوری کا کام زیادہ سے زیادہ علمی academic اور فکری ہے۔ انھوں نے مارکسزم کے سیاسی اور سماجی نظام کے ساتھ ساتھ اسے طرزِ فکر کے طور پر بیان کیا ہے۔ وہ جدلیاتی مادیت کے نظریہ علم کے بارے میں لکھتے ہیں:

''جدلیاتی مادیت کی رو سے علم اس وقت صداقت بنتا ہے جب وہ حقائق سے مطابقت رکھتا ہو اور اس کی تصدیق عمل سے کی جاسکے، لہٰذا عمل ہی صداقت کا معیار

بھی ہے اور علم کا مصدر بھی۔''(۸)

مارکسزم پر لکھی گئی یہ کتاب پروپیگنڈا لٹریچر نہیں ہے، ایک علمی سرگرمی ہے، یہی اس کتاب کا امتیاز ہے۔ اس کتاب کے ابواب کی تفصیل یہ ہے:

(۱) تاریخی تناظر (۲) فکری تناظر (۳) کارل مارکس
(۴) جدلیاتی مادیت (۵) انحرافات

۱۰۔ مقالات جلال پوری ۱۹۷۹ء، آئینہ ادب لاہور

سید علی عباس جلال پوری نے متعدد مضامین لکھے تھے۔ ان مضامین کا ایک انتخاب مقالات جلالپوری کے نام سے شائع ہوا۔ بعد میں اس سلسلے کا کوئی دوسرا مجموعہ شائع نہیں ہوا، اگرچہ مصنف نے اپنے پیش لفظ میں اسے پہلا انتخاب قرار دیا ہے۔ ان مضامین کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ یہ مضامین اردو، فارسی، پنجابی، عالمی ادب، اصول نقد، اصول فن، فلسفہ، نفسیات اور فلسفۂ تاریخ پر لکھے گئے ہیں۔ انھوں نے اپنے مضامین کی تفہیم کے لیے پیش لفظ میں بہت گہری بات کہی ہے:

''مجھے ارسطو کے اسلوب بیان اور جرمن علما کے طرز تحقیق نے متاثر کیا ہے ارسطو مختصر اور سادہ الفاظ میں اظہار مطلب کا قائل تھا اور جرمن علما کا معروف شیوہ ہے کہ جب تک وہ کسی موضوع کے ہر پہلو پر اور ہر گوشے کا پوری طرح احاطہ نہیں کر لیتے وہ اس پر قلم نہیں اٹھاتے۔''(۹)

ان مضامین کا دائرہ فکر بہت وسیع ہے اور ہر گنجینہ معنی کا طلسم ہے۔ چند سطور دیکھیے:

''ابن عربی کے افکار میں فکری وحالی دونوں روایاتِ تصوف کا امتزاج ہوا۔ وہ صاحب حال صوفی بھی تھے اور صاحب قال مفکر بھی۔ فکری روایت کو ابن سینا کے ایرانی شارحین نے آگے بڑھایا۔۔۔ حالی روایت کو فارسی شاعروں نے تقویت دی اور وحدت وجود کی ہر کہیں اشاعت ہوئی۔ مرزا غالب وحدت وجود کی فکری روایت یا تصوف معقولی سے تعلق رکھتے ہیں۔''(۱۰)

علی عباس جلال پوری ادبی تنقید میں جس بلند سطح پر نظر آتے ہیں، بہت کم، نقاد ان تک پہنچ پائیں گے۔ وہ تاریخ، فلسفہ اور نفسیات کی توضیح اور تفہیم بھی کراتے ہیں اور یوں ان کے

مقالات ایک علمی تحریک کا نقطہ آغاز بنتے ہیں۔

۱۱۔ جنسیاتی مطالعے، ۱۹۹۳ء خرد افروز جہلم

جنس پر ہمارے ہاں عہد قدیم سے لکھا جا رہا ہے، مگر ان تحریروں میں جنس کا فکری تجزیہ بھی ملتا ہے، جنسی تلذذ بھی۔ سید علی عباس جلال پوری نے اسے علمی اور فکری سطح پر پیش کیا ہے۔ یہی اس کتاب کی انفرادیت ہے۔ مصنف نے اس علم کے پس منظر پر یوں روشنی ڈالی ہے:

> ایک مستقل شعبہ علم کی حیثیت سے جنسیات کی تدوین ۱۹ ویں صدی میں عمل میں آئی تھی، لیکن اس کے اصول و مبادی کا کھوج قدیم تمدنوں میں بھی ملتا ہے۔ فراعین مصر کے مقبروں کی کھدائی سے ایسی تحریریں دستیاب ہوئی ہیں جنھیں آج کی زبان میں فحش کا نام دیا جاتا ہے..... چینیوں، یونانیوں، رومیوں، ہندیوں اور عربوں نے جنسی موضوعات پر مستقل کتابیں تالیف کیں اور اس علم کے بارے میں ایسے ایسے انکشافات کیے کہ بعض پہلوؤں سے آج بھی ان پر چنداں اضافہ نہیں کیا جا سکتا۔'' (۱۱)

سید علی عباس جلاس پوری نے اس علم کو تاریخی تناظر میں بھی دیکھا ہے اور تہذیبوں کے تناظر میں بھی۔ ادب میں عشق کے موضوع پر سیر حاصل بحث کی ہے اور عشق کی مختلف تعبیریں اور مختلف سطحیں بیان کی ہیں۔ ایسے ہی وہ جنسی محرومی سے پھوٹتی جسمانی اور نفسیاتی بیماریوں کو زیر بحث لائے ہیں۔ اس کتاب میں وہ لفظوں کے اشتقاق یعنی Etymology سے بھی استفادہ کرتے نظر آتے ہیں۔

۱۲۔ کائنات اور انسان، ۱۹۸۹ء خرد افروز جہلم

اس کتاب کا موضوع تقابل مذاہب و ادیان ہے۔ یوں تو اردو میں تقابل مذاہب پر بہت سی کتب لکھی گئیں، مگر یہ ایک مذہب کی تائید اور دوسرے مذہب کی تردید میں لکھی گئیں۔ یہ کتاب سائنسی نقطہ نظر لکھی گئی ہے۔ انگریزی میں اس حوالے سے جیمز فریزر کی Goldenbough بہت معروف ہے۔ اس کی تلخیص کا اردو ترجمہ شاخ زریں کے نام سے کیا گیا۔ سید علی عباس جلال پوری نے اس کتاب میں انسانی تاریخ کو روحوں کا مت، جادو، دیومالا، فلسفہ وغیرہ کے مختلف ادوار میں تقسیم کرتے ہوئے تقابل مذاہب پر تجزیاتی انداز میں لکھا گیا ہے۔

مصنف نے تقابلی مذہب کے مباحث پر یوں روشنی ڈالی ہے:

> ''تقابلی مذہب کے مباحث کا مسلک ارواح، جادو، دیومالا اور علم الانسان کے ساتھ گہرا رشتہ ہے۔ اس لیے ان علوم کی تحقیقات میں تو ارد ہو جانا قدرتی امر ہے۔ اتنا ضرور ہے کہ تقابلی مذہب کا دائرہ تحقیق ان علوم سے کہیں زیادہ وسیع ہے کہ اس میں وحشی قبائل کے علاوہ متمدن اقوام کے رسوم و شعائر اور دستور اخلاق و عمل معرض بحث میں آ جاتے ہیں۔ یہاں اس بات کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کہ تقابلی مذہب ایک نہایت وسیع زرخیز اور سیر حاصل موضوع ہے۔'' (۱۲)

بلاشبہ یہ کتاب اسی وسعت اور زرخیزی کا ایک اچھا نمونہ ہے، اگرچہ بہت سے مقامات پر مصنف سے اختلاف کیا جا سکتا ہے اور ہر علمی کام میں اختلاف کیا جانا چاہیے۔

خرد نامۂ جلال پوری، ۱۹۹۳ء خرد افروز جہلم جدید اشاعت ۲۰۱۳ء تخلیقات لاہور۔

یہ کتاب ایک مفصل فرہنگ ہے۔ اس کتاب پر مقتدرہ قومی زبان کی اصطلاح کشاف کا انطباق درست ہوگا۔ مصنف نے ان اصطلاحات کی مدد سے جدید افکار اور قدیم تہذیبی روایات سے قاری کو متعارف کرایا ہے۔ یہ کتاب فرہنگ کے انداز میں مرتب کی گئی ہے اور فکر و فلسفہ کو عام فہم انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ سید علی عباس جلالپور علم الاشتقاق کے عالم بھی تھے، چنانچہ بہت سی اصطلاحات کی تفہیم میں وہ اس علم سے مستفید ہوئے ہیں اور اس علم کے حوالے سے قاری کے لیے اصطلاحات کو سہل بنایا ہے۔ مصنف خرد افروزی کو تحریک کی شکل دینا چاہتے تھے۔ یہ کتاب اسی تحریک کو آگے بڑھاتی اور خرد افروزی کو سہل اور عام بناتی ہے۔ یہ کتاب سید علی عباس جلالپوری کی جملہ کتب کا خلاصہ تو نہیں، مگر تمہید ضرور ہے۔ ان کی کتب کے سمجھنے کے لیے تمہیداً اس کتاب کا مطالعہ بہت مفید ہے۔

رسوم اقوام، ۱۹۹۳ء خرد افروز جہلم

سید علی عباس جلال پوری نے علم بشریات کے مطالعے کے دوران میں بہت سی رسوم کا مطالعہ کیا اور محسوس کیا کہ دنیا کی اقوام کی مختلف رسوم میں بعض جگہ مطابقت یا مماثلت نظر آتی ہے۔ اس کتاب میں انسانی تہذیب اور معاشرت کا سورج طلوع ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ آداب و رسوم کا آغاز بھی نظر آتا ہے، ارتقاء بھی، آداب و مراسم میں ترقی اور انحطاط کی کہانی بھی ہے اور بعض رسوم

کے تقدس کا حوالہ بھی۔اس کتاب میں بتیس موضوعات پر تفصیلی بحث ہے اور ضمیمے میں ۴۵ عنوانات کا مختصر تعارف پیش کیا گیا ہے۔

رسومِ اقوام میں مذہبی رسمیں بھی ہیں جیسے اجداد پرستی، لنگ پوجا، صائبیت، قربانی، معاشرتی مراسم بھی ہیں جیسے کھانا پینا، چائے کافی، پان، طب، حمام، تمباکو وغیرہ۔تہذیب کا سفر بھی ہے جیسے وضع قطع زیبائش، لباس، تفریحات، تہوار، جرم وسزا، طبقاتِ معاشرہ وغیرہ۔اس کتاب میں سادھو، سنت فقیر بھی نظر آتے ہیں اور آداب واطوار بھی دکھائی دیتے ہیں۔مختلف معاشروں کے Taboo بھی ہیں۔اس میں بیاہ، طلاق کے طریقے پیدا ہوتے اور ان میں تبدیلیاں ہوتی نظر آتی ہیں۔بہرحال یہ کتاب علم بشریات کے کئی پرت کھولتی ہے۔

مکاتیب سید علی عباس جلالپوری، ۲۰۱۳ء، تخلیقات لاہور

یہ کتاب ایک سو ایک خطوط کا مجموعہ ہے جو پروفیسر لالہ رخ بخاری نے مرتب کیا۔اس میں مصنف کی زندگی کے مختلف گوشے نمایاں ہوگئے ہیں۔مصنف نے کہیں تکلف نہیں برتا اور نہ کہیں اپنی ذات کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔مصنف نہ تو سات پردوں میں چھپتا ہے نہ اپنی ذات کا ڈھنڈورا پیٹتا ہے۔وہ فلسفیانہ بے نیازی اور انسان دوست رویے کا حامل ہے اور اپنے مخاطب سے بہت محبت سے مخاطب ہے۔

منتظر اشاعت کتابیں

۱۔ساڈے وڈکیاں دی سوجھ

یہ پنجابی لغات ہے، مگر اس میں زیادہ تر پوٹھوہار کے علاقے کے الفاظ، محاورات اور ضرب الامثال ہیں۔یہ کتاب مصنف کی اپنے علاقے اور اپنے لوگوں سے محبت کا بہترین اظہار ہے۔

۲۔سید گلچیں

یہ کتاب مختلف کتابوں سے لیے گئے اقتباسات کا مجموعہ ہے۔

۳۔میرا بچپن اور لڑکپن

یہ مصنف کی زندگی کی کہانی ہے اور زندگی کے ابتدائی حصے سے متعلق ہے۔اس میں مصنف نے اپنے لڑکپن سے جوانی میں قدم رکھنے کے زمانے کا ذکر کیا ہے۔یقیناً اس میں ایسے

مقامات آتے تھے کہ وہ اپنی زندگی میں اسے شائع کرنے میں متردّد رہے، مگر اب اس کتاب کی اشاعت میں کوئی امر مانع نہیں۔امید ہے پروفیسر حامد رضا یا پروفیسر لالہ رخ بخاری اس کی اشاعت کا بندوبست کریں گے۔

حواشی

۱۔ طارق جاوید، ڈاکٹر، مقدمہ، مکاتیب سید علی عباس جلالپوری، صفحہ:۷، ۸

۲۔ سید علی عباس جلالپور سے ملاقات اور گفتگو

۳۔ شریف کنجاہی سے راقم کی ملاقات۔

۴۔ علی عباس جلالپوری، روحِ عصر، صفحہ:۷، ۸

۵۔ علی عباس جلالپوری، سید، عام فکری مغالطے، صفحہ:۱۷

۶۔ ایضاً، روایات فلسفہ، صفحہ:۳

۷۔ سید علی عباس جلالپوری، مقامات وارث شاہ، صفحہ:۲۰۲

۸۔ ایضاً، تاریخ کا نیا موڑ، صفحہ:۸۰

۹۔ ایضاً، مقالات جلالپوری، صفحہ:

۱۰۔ ایضاً، صفحہ

۱۱۔ ایضاً، جنسیاتی مطالعے، صفحہ:۹

۱۲۔ کائنات اور انسان، صفحہ:۱۵۹

پروفیسر غلام جیلانی اصغر

ڈاکٹر عابد سیال

پروفیسر غلام جیلانی اصغر کا بچپن کا بیشتر زمانہ ننھیال میں گزرا۔ ان کے ننھیال کے اکثر لوگ حافظ قرآن تھے اور روایت یہ تھی کہ ایک بھائی کاروبار سے وابستہ ہو اور دوسرا حفظ کرے۔ اسی کی پیروی میں جیلانی صاحب کو حفظ کے لیے مدرسے میں بھیجا گیا لیکن یہ ان کے بس کا کام نہ تھا، البتہ سعدی کی ایک آدھ نظم اور ابتدائی قرآنی تعلیمات کا درس لیا۔ بعدازاں ان کی والدہ نے انھیں قصبے کے پرائمری سکول میں داخل کرا دیا۔ اسی دوران ان کے دادا انھیں اپنے ساتھ لے گئے اور تلہ گنگ شہر کے پرائمری سکول سے انھوں نے باقاعدہ تعلیم کا آغاز کیا۔ بعد میں گورنمنٹ ہائی سکول تلہ گنگ سے انھوں نے 1935ء میں میٹرک کیا۔

ابتدا میں انھوں نے گورڈن کالج راولپنڈی کی شہرت سن کر اس میں داخلہ لینے کا ارادہ کیا۔ داخلے کے انٹرویو کے دن شدید بارش تھی اور وہ لاری اڈے سے کالج پہنچنے تک بھیگ چکے تھے۔ کالج کے انگریز پرنسپل نے ان کے بھیگے ہوئے کپڑوں کے ساتھ اپنے کمرے میں داخلے پر نکتہ چینی کی تو جیلانی صاحب نے کہا کہ بارش ہو رہی تھی، میں خشک ہو کر دوبارہ آ جاؤں گا۔ لیکن وہ پھر کبھی اس کالج کی طرف نہ پلٹے۔ ان دنوں دوسرا نمایاں ادارہ کیمبل پور انٹر کالج تھا۔ جیلانی صاحب نے وہاں سالِ اوّل میں داخلہ لیا۔ ان دنوں سید ضمیر جعفری، شیر محمد شاد اور فتح محمد ملک ان کے ہم مکتب ساتھیوں میں شامل تھے۔ اس ادارے سے ایف اے کرنے کے بعد جیلانی صاحب کی اگلی منزل اسلامیہ کالج لاہور تھی۔ 1937ء میں انھوں نے یہاں داخلہ حاصل کیا۔ اس زمانے میں اس ادارے کے طالب علموں میں عبدالسلام خورشید، حمید نظامی، تابش صدیقی، سید ضمیر جعفری، حمید

نسیم، مختار صدیقی جیسے لوگ شامل تھے۔ ملک معراج خالد اور جیلانی صاحب کا ڈیسک ایک ہی تھا۔ بی اے کرنے کے بعد جیلانی صاحب کے دادا نے اپنی روایت کے مطابق انھیں کاروباری تربیت دینا چاہی اور انھیں روزنامچہ، کھاتہ، کیش بک وغیرہ لکھنا سکھانے کی کوشش کی۔ تاہم چند ہی روز میں ان کے والد کو یقین ہو گیا کہ وہ اس کام کے لیے نہیں بنے۔ ان کے والد کے ایک وکیل دوست انھیں اپنے ساتھ لے گئے اور مزید تعلیم کے لیے انھیں اسلامیہ کالج پشاور میں داخل کروا دیا گیا۔ کالج کے انگریز پرنسپل نے ان سے آرنلڈ کے مشہور مقولے 'ادب تنقیدِ حیات ہے' پر ان سے انگریزی میں مضمون لکھوایا۔ ان کی انگریزی مہارت سے متاثر ہو کر نہ صرف ان کو داخلہ ملا بلکہ فیس بھی معاف کر دی گئی۔ عبدالعلی خان اس زمانے میں جیلانی صاحب کے ہم مکتب تھے۔ جیلانی صاحب آل انڈیا انگلش اردو مباحثے میں کالج کی نمائندگی کرتے تھے۔ کالج میگزین ''خیبر'' میں ان کی نثری تخلیقات شائع ہوتی رہیں۔

23 مارچ 1940ء کو لاہور میں جس جلسے میں قراردادِ لاہور منظور ہوئی، اس میں شرکت کے لیے خاص طور پر جیلانی صاحب پشاور سے گئے تھے۔ انھوں نے قائداعظم اور دیگر قائدین کو بہت قریب سے دیکھا۔

1941ء میں انھوں نے ایم۔اے انگریزی کا امتحان اعزاز کے ساتھ پاس کیا اور اسلامیہ کالج، پشاور میں اپنے مضمون میں اوّل پوزیشن حاصل کی۔ اسی سال ان کی تعیناتی بطور لیکچرار زمیندارہ کالج گجرات میں ہوئی۔ یہ کالج ایک انجمن کے تحت کام کرتا تھا جس کے صدر نواب سر فضل علی تھے۔ جیلانی صاحب کی تعیناتی کے وقت ادارے کے سربراہ ڈاکٹر جہانگیر خان تھے۔ اس کالج میں تعیناتی کا دور جیلانی صاحب کی علمی و ادبی سرگرمیوں کی فعالیت اور نکھار کا زمانہ ہے۔ ان کی بنیادی دلچسپی نثر سے تھی تاہم شاعری کا شغل بھی جاری رہا۔ وہ کالج کی سپیکرز یونین کے صدر بھی رہے۔ جیلانی صاحب تقریباً سات برس اسی کالج سے منسلک رہے تاوقتیکہ 1947ء میں پاکستان معرضِ وجود میں آیا اور سرکاری ملازمین کے تبادلوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ 18 اگست 1947ء کو جیلانی صاحب کا تبادلہ گورنمنٹ کالج سرگودھا ہو گیا۔

گورنمنٹ کالج سرگودھا میں جیلانی صاحب نے اپنی ملازمت کا طویل ترین عرصہ گزارا۔ یہاں تبادلے کے بعد انھیں پروفیسر رازی، پروفیسر عبدالحی، پروفیسر چوہدری نذیر احمد، شیخ

نصیرالدین، پروفیسر کرامت حسین اور پروفیسر الطاف سید جیسے بےلوث اور مخلص رفقاء ملے جن کی صحبت کی تاثیر اور لطف ایسا تھا کہ جیلانی صاحب کے دل میں ہمیشہ کے لیے شہر سرگودھا اور گورنمنٹ کالج سرگودھا سے وابستگی اور انسیت پیدا ہوگئی۔ ان کی تحریک پر کالج میں یومِ اقبال کی تقریب منعقد کی گئی جو نہایت پُر وقار اور یادگار تھی۔ پروفیسر سید وقار عظیم، پروفیسر صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، ڈاکٹر عبادت بریلوی، پروفیسر وزیرالحسن عابدی جیسے معتبر اکابر اس تقریب میں شریک ہوئے۔ 1956ء میں منعقد ہونے والی یومِ اقبال ہی کے سلسلے کی ایک اور تقریب میں مولانا صلاح الدین احمد، ڈاکٹر عبداللہ چغتائی، ڈاکٹر نیاز احمد اور ڈاکٹر رفیق احمد نے شرکت کی۔ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی کی معاونت سے ایک نمائش کا بھی اہتمام ہوا جس میں اقبال کے حوالے سے مختلف کتابیں، تحریریں اور تصویریں رکھی گئی تھیں۔

1969ء کا ایک سال گوجر خان میں بطور استاد اور 1970ء کے کچھ ماہ بطور پرنسپل جیلانی صاحب نے تلہ گنگ میں گزارے۔ گورنمنٹ کالج میں ان کے اعزاز میں الوداعی تقریب منعقد ہوئی جس میں ان کے گہرے دوست ڈاکٹر خورشید رضوی نے، جو اردو غزل کا ایک معتبر نام ہیں، وداعی نظم پیش کی جس کا ایک ایک مصرع جیلانی صاحب کی شخصیت کے ظاہری و باطنی پہلوؤں کا عکاس ہے۔

لاکھ تُو رنگیں بنا لے پردۂ گفتار کو
جانے والے دل سمجھتا ہے ترے کردار کو
جلوتوں میں قہقہوں کے سلسلے چلتے ہوئے
خلوتوں میں اشکِ پنہاں کے دِیے جلتے ہوئے
عمر اپنی کاٹ دی تنہائیوں کی دھوپ میں
دوستوں کو چھاؤں بخشی محفلوں کے رُوپ میں

تلہ گنگ جیلانی صاحب کا آبائی شہر تھا لیکن اب ان کی مہربان ہستیاں وہاں موجود نہ تھیں، اس لیے اس شہر میں ان کا قیام زیادہ نہ رہا اور ان کا تبادلہ جوہر آباد (ضلع خوشاب) ہوگیا جہاں وہ 1972ء تک رہے۔ دسمبر 1972ء میں ان کا آخری تبادلہ واپس گورنمنٹ کالج سرگودھا میں ہوا۔ اس بار وہ پرنسپل کی حیثیت سے آئے تھے، اسی حیثیت میں قریب نصف صدی تک تدریسی خدمات

سرانجام دینے اور تقریباً پچاس ہزار سے زائد طالب علموں کو اپنے علم اور تجربے سے فیض یاب کرنے کے بعد 31 مئی 1978ء کو ملازمت سے سبکدوش ہوئے اور بعدازاں سرگودھا ہی میں سکونت پذیر رہے۔

بقول پرویز بزمی:

> ''ان کے پڑھانے کا انداز ایسا نرالا، دلنشین اور اچھوتا ہوتا تھا کہ ڈراموں کے کردار 'ایاگو'، 'ڈیزڈی مونا' وغیرہ بالکل متحرک اور زندہ صورت میں ہمارے سامنے آجاتے تھے اور ہم یوں محسوس کرتے تھے جیسے ہم خود اس ڈرامے کے کردار ہوں۔ نظموں میں جب شیلے یا کیٹس کی کوئی نظم پڑھاتے اور اس کی تشریح کرتے تھے تو ہم ان کے پڑھانے کے انداز کے سحر میں اس طرح کھو جاتے تھے کہ پیریڈ ختم ہونے کا پتا ہی نہیں چلتا تھا۔ ہمارا جی چاہتا تھا کہ یہ پیریڈ کبھی ختم نہ ہو۔ عجیب بات یہ ہے کہ اکثر بےفکرے لڑکے جو دیگر مضامین کے پیریڈوں میں عموماً حاضر نہیں ہوتے تھے، انگریزی کا پیریڈ کبھی نہیں چھوڑتے تھے۔''

انگریزی، اردو، پنجابی زبان اور ادبیات پر جیلانی صاحب کی دسترس گہری اور مطالعہ وسیع تھا۔

جیلانی صاحب کو گفتگو اور تقریر کا خاص ملکہ تھا۔ طویل عرصے کو محیط ان کے تدریسی تجربے نے ان کی زبان کی گرہ ایسی کھولی تھی کہ ان کی باتیں دل میں اترتی تھیں۔ وہ ہر موضوع پر ایک جیسی مہارت اور ایسی علمیت کے ساتھ گفتگو کرتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا ان کا اصل میدان یہی ہے۔ ان کی زندگی میں سرگودھا کی فضائیں ان کی شگفتہ گفتاری سے معمور و معطر تھیں۔ سرگودھا کی اکثر تقریبات میں، خواہ ان کی نوعیت علمی و ادبی ہو یا ثقافتی و صحافتی، جیلانی صاحب کی تقریر حاصلِ بزم ہوا کرتی تھی۔ گورنمنٹ کالج سرگودھا پورے ڈویژن کی مرکزی درس گاہ تھی، اس لیے ایک طرف گجرات سے بھکر تک اور دوسری طرف گوجرانوالہ سے چکوال تک کے درمیانی علاقے کے پڑھے لکھے لوگوں کی نصف سے زیادہ تعداد اسی درس گاہ کے فیض یافتگان کی تھی۔ طویل عرصہ اس ادارے کا سربراہ رہنے کے باعث جیلانی صاحب کے شاگردوں کی ایک وسیع تعداد شہر سرگودھا

میں اور مضافات کے شہروں اور قصبوں میں زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق تھی۔ اس لیے جیلانی صاحب جس محفل میں موجود ہوتے، ان کے کچھ نہ کچھ شاگرد وہاں موجود ہوتے۔ چنانچہ وہی بے تکلفی، بے ساختگی، بذلہ سنجی اور ایک طرح کی شفقت جوان کی کلاس روم کی گفتگو کا خاصہ تھا، کلاس روم کے باہر بھی اس کا فیضان جاری رہتا۔ پرویز بزمی نے اپنی کتاب ''خوش کلام- غلام جیلانی اصغر'' میں ان کی شگفتہ طبعی اور حاضر جوابی کے کئی واقعات قلم بند کیے ہیں جن میں سے ایک دو کا تذکرہ یہاں بے محل نہ ہوگا۔

ایک واقعہ ڈاکٹر خورشید رضوی کی زبانی درج ہے کہ رضوی صاحب بتاتے ہیں:

''میں وہ واقعہ کبھی نہیں بھول سکتا جب وہ (جیلانی صاحب) گورنمنٹ کالج سرگودھا میں پرنسپل تھے اور میں وہاں پڑھاتا تھا۔ ایک روز ان کے دفتر میں داخل ہوا تو وہ تنہا بیٹھے تھے اور خلافِ معمول سنجیدہ اور اداس نظر آتے تھے۔ میں نے کہا، جیلانی صاحب کیا بات ہے؟ ٹھنڈی آہ بھر کر بولے خورشید صاحب! کیا بتاؤں زندگی کس قدر تلخ ہوگئی ہے۔ میں ایک دم سنجیدہ ہوگیا۔ عرض کیا جیلانی صاحب، خیر تو ہے؟ کہنے لگے، یقین کیجیے زندگی کی سنگینی سے دل برداشتہ ہوکر کئی بار خودکشی کا خیال کر چکا ہوں لیکن حالات کی ستم ظریفی دیکھیے کہ جس روز خودکشی کا مصمم ارادہ کرتا ہوں، اس روز کوئی کام آپڑتا ہے۔ میں زور سے قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ مگر جیلانی صاحب قہقہے میں شریک نہ ہوئے بلکہ سنجیدگی کے ساتھ رک رک کر کہنے لگے۔ غالباً آپ میری بات کو مذاق سمجھ رہے ہیں۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ انسان دوستوں کو اپنا دکھ سنائے اور وہ اس پر ہنسیں۔ یقین کیجیے یہ میری زندگی کی ایک سنگین حقیقت ہے کہ میری خودکشی مسلسل ملتوی ہوتی چلی جارہی ہے اور مجھے اندیشہ ہے کہ میں کسی روز طبعی موت مرجاؤں گا۔''

گورنمنٹ کالج سرگودھا کے پرنسپل ہونے ہی کے زمانے میں ایک کانووکیشن میں صوبائی وزیرِتعلیم بطور مہمانِ خصوصی مدعو تھے۔ یہ وزیر جیلانی صاحب کے شاگرد رہ چکے تھے۔ اپنے خطبہ استقبالیہ میں جیلانی صاحب نے وزیر صاحب کے بارے میں جو ارشاد کیا وہ خاصے کی چیز ہے:

''عزت مآب وزیرِتعلیم حکومت پنجاب جو میرا شاگرد ہے اور کوئی ایسا ہونہار شاگرد

بھی نہیں تھا، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ خاصا سست روشاگرد تھا۔ لیکن بہرحال چونکہ میرا شاگرد تھا اس لیے وزیرِتعلیم کے عہدے پر جا پہنچا اور آج اس قابل ہوا ہے کہ اس کالج کے سٹیج پر بطور مہمانِ خصوصی رونق افروز ہو ورنہ اپنی طالب علمی کے دور میں تو شاید ہی اسے کبھی سٹیج پر آنے کا موقع نصیب ہوا ہو۔ بہرحال میں اسے اس کے اپنے کالج میں آج بطور چیف گیسٹ تشریف لانے پر خوش آمدید کہتا ہوں۔ ظاہر ہے میں وزیر صاحب کو سر کہہ کر خطاب نہیں کرسکتا، نہ ہی کوئی بہت زیادہ عزت واحترام کے القاب ان کی شان میں استعمال کرسکتا ہوں۔ اس میں سارا قصور وزیر موصوف کا ہی ہے کیونکہ وہ خود برضا ورغبت میرے شاگرد رہے ہیں اور میں بہرحال ان کے استادگرامی کے بلند مقام سے نیچے نہیں اتر سکتا۔ میں کالج کے موجودہ طلبہ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ وہ خوش قسمت ہیں کہ میرے شاگرد ہیں۔ اگر میرا ایک معمولی شاگرد وزیر کے عہدے تک جا سکتا ہے تو جو میرے لائق اور محنتی شاگرد ہیں، ان کے مستقبل کے روشن ہونے میں بھلا کیا شک ہوسکتا ہے۔''

جیلانی صاحب محض گفتار کے بادشاہ نہیں تھے بلکہ انھوں نے تحریر میں بھی قابل قدر سرمایہ چھوڑا ہے۔ ان کی تحریروں کا سب سے نمایاں حصہ تو انشائیوں پر مشتمل ہے جو ادب میں ان کی بنیادی وجہِ شہرت ہے۔ ان کے انشائیوں کا مجموعہ ''نرم دمِ گفتگو'' کے نام سے شائع ہوا ہے۔ ان کے دو شعری مجموعے ''میں اور میں'' اور ''اک ذرا شام سے پہلے'' کے عنوان سے چھپے۔ اس کے علاوہ مکتوب نگاری میں ان کا ایک خاص رنگ ہے جو علمیت اور مزاح وظرافت کے ایسے رنگوں میں ڈوبا ہوا ہے کہ مکاتیبِ غالب کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ ''اوراق''، ''تخلیق''، ''اردو پنچ'' اور دیگر رسائل میں ان کے متعدد مکاتیب شائع ہوئے جو شگفتہ نثر کی عمدہ مثالیں ہیں۔ اس کے علاوہ انگریزی میں ان کے مضامین کی تعداد قابلِ لحاظ ہے جن کے موضوعات تعلیم، سائنس، سماجیات، سیاست، ثقافت اور ادب تک پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ مضامین اپنے وقت کے مؤقر انگریزی روزناموں ''پاکستان ٹائمز'' اور ''دی نیشن'' میں شائع ہوتے رہے۔ ان مضامین میں انھوں نے وارث شاہ، غالب، اقبال، قیوم نظر، ن م راشد، میراجی، یوسف ظفر، فیض، مجید امجد، وزیر آغا، ضمیر جعفری، راجا مہدی علی خان اور دیگر مشاہیر کے فن وفکر کے جائزے پیش کیے ہیں۔ یہ مضامین نہ

صرف انگریزی پر ان کی دسترس بلکہ ادبی وسماجی فہم وبصیرت کے بھی غماز ہیں۔

بقول جمیل یوسف:

''جو شخص زندگی میں کبھی پروفیسر غلام جیلانی اصغر سے نہیں ملا، نہ کہیں ان کی تقریر سنی، نہ ان کی کوئی تحریر پڑھی، نہ ان کی محفل میں بیٹھنے کا اتفاق ہوا تو میرے خیال میں ایسا شخص ایک ایسی زندگی بخش مسرت سے محروم ہے جس کا اندازہ وہ کر ہی نہیں سکتا۔ جس شخص نے کبھی کسی سرسبز وشاداب ساحل پر کھڑے ہو کر دریا کی روانی کا لطف ہی نہ اٹھایا ہو، اسے آپ دریا کی روانی کے لطف سے کیسے آشنا کر سکتے ہیں۔ محض منظر کشی سے تو وہ کیفیت پیدا نہیں کی جا سکتی جو ایک زندہ اور متحرک منظر میں ہوتی ہے۔ پروفیسر غلام جیلانی اصغر کی شخصیت بھی کچھ اسی طرح کے طلسم سے عبارت ہے۔ ان کی تحریر وتقریر کے جادو سے وہی خوش قسمت واقف ہے جو میری طرح اس طلسم کا اسیر ہے۔''

جیلانی صاحب کو قدرت نے ایسا حلیہ اور جسامت بخشی تھی کہ پختہ عمری میں بھی نوجوان لگتے تھے۔ مشتاق احمد یوسفی نے ایک محفل میں انھیں ''نوجوان مزاح نگار'' کہا تو وہ بہت خوش ہوئے اور برجستہ جواب دیا کہ ''آپ واقعی صاحبِ نظر ہیں۔'' اسی طرح ن م راشد ایک مرتبہ سرگودھا آئے تو ان کے اعزاز میں ادبی نشست منعقد کی گئی۔ جیلانی صاحب شہر سے باہر گئے ہوئے تھے اور اسی وقت واپس پہنچے تھے۔ جیسے ہی راشد صاحب کی آمد کی خبر ملی تو سیدھے جلسہ گاہ میں آئے، جہاں انھیں دیکھتے ہی گفتگو کے لیے سٹیج پر بلا لیا گیا۔ انھوں نے بغیر تیاری کے نہایت فکر انگیز تقریر کی۔ ن م راشد نے اپنی گفتگو میں انھیں بے حد سراہا اور برسرِ محفل کہا کہ میں نے جدید اردو نظم پر اتنی پرمغز تقریر پہلے کبھی نہیں سنی اور میں اس نوجوان مقرر کے مطالعے سے متاثر بھی ہوا ہوں اور مرعوب بھی۔ اپنے عہد کے ایک بڑے شاعر سے ایسا خراجِ تحسین جیلانی صاحب کے لیے بڑا اعزاز تھا لیکن زیادہ لطف ''نوجوان مقرر'' کے الفاظ سے پیدا ہوا۔ جب راشد کو معلوم ہوا کہ جیلانی صاحب اس وقت پچپن برس کے ہیں تو وہ ایک بار پھر حیرت زدہ ہوئے۔

ڈاکٹر غلام جیلانی برق

ڈاکٹر عبدالعزیز ساحر

احوال: برِ صغیر پاک و ہند کے نامور ادیب، عالم اور دانشور غلام جیلانی برق، ۲۶۔اکتوبر ۱۹۰۱ء / ۱۳۔رجب ۱۳۱۹ھ کو ضلع کیمبلپور [حال: اٹک] کے ایک دور افتادہ گاؤں کنٹ میں متولد ہوئے (۱)۔ ان کے والدِ گرامی کا نام محمد قاسم شاہ (م ۱۷۔اگست ۱۹۳۶ء) تھا۔ ان کے دو بڑے بھائی مولوی نورالحق علوی (م ۱۹۵۱ء) اور پروفیسر غلام ربانی عزیز (م ۲۰۰۰ء) دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل تھے۔ اول الذکر اورینٹل کالج، لاہور میں عربی ادبیات کے استاد تھے۔ اسی زمانے میں انھوں نے بوعلی سینا کی کتاب اشارات کی تفہیم وتعبیر کے ضمن میں علامہ اقبال کی معاونت فرمائی (۲)۔ ثانی الذکر پنجاب کے مختلف دانشکدوں (مثلاً: زمیندار کالج گجرات، بوسن روڈ کالج ملتان وغیرہ) میں فارسی اور عربی ادبیات کے استاد رہے اور آخر آخر میں اسلامیہ کالج، قصور کے پرنسپل کی حیثیت سے سبکدوش ہوئے۔ برق صاحب کی تعلیم کا آغاز بھی دینی مدارس سے ہوا۔ ابتداً وہ کیمبلپور کے مختلف مدارس (مثلاً: اورنگ آباد، پنڈی سرہال اور غورغشتی) میں زیرِ تعلیم رہے۔ بعدازاں وہ بطور طالب علم دارالعلوم نعمانیہ اور دارالعلوم حمیدیہ لاہور سے بھی وابستہ رہے۔ ساتھ ہی ساتھ دنیوی تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ منشی فاضل، مولوی فاضل اور ادیب فاضل کے امتحانات اورینٹل کالج سے پاس کیے (۳)۔ ۱۹۲۸ء میں گریجویشن، ۱۹۳۱ء میں ایم اے عربی اور ۱۹۳۲ء میں ایم اے فارسی کے امتحانات میں کامیابی حاصل کی (۴)۔ حصولِ تعلیم کے ساتھ ساتھ وہ تدریسِ علم میں بھی مصروف رہے۔ اس دوران میں وہ نوشہرہ، جالندھر، گوجر خان، چکوال، لالہ موسیٰ، کیمبلپور، بھکر اور تلہ گنگ کے اسکولوں میں تدریسی خدمات انجام دیتے

رہے(۵)۔۱۹۳۳ء میں گورنمنٹ کالج، ہوشیار پور میں ان کا تقرر ہوا اور ۱۹۳۹ء تک اس کالج کے ساتھ وابستہ رہے(۶)۔۱۹۴۰ء میں امام ابنِ تیمیہ کے احوال و آثار پر مولوی محمد شفیع (م۱۴۔مارچ ۱۹۶۳ء) کی نگرانی میں پی ایچ۔ڈی کا مقالہ لکھا اور پنجاب یونیورسٹی، لاہور سے دورۂ دکتری کی سند تفویض ہوئی۔ہوشیار پور کالج سے وہ گورنمنٹ کالج کیمبلپور ٹرانسفر ہوئے اور پھر اپنی سبکدوشی (۱۹۵۷ء) تک وہ اسی کالج سے منسلک رہے۔ریٹائرمنٹ کے بعد وہ پبلک اسکول کیمبلپور میں پرنسپل کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے۔اس ادارے سے ان کی وابستگی ۱۹۶۳ء تک جاری رہی۔وہ جگت استاد تھے۔انھوں نے کئی نسلوں کی ذہنی اور فکری تربیت کی۔انھیں اپنی تدریسی زندگی میں ایسے شاگرد میسر آئے، جنھوں نے بعدازاں اپنے اپنے میدان میں بہت نام پایا۔ان کے شاگردوں میں: ڈاکٹر الف دنسیم، سید انوار الحق، کرنل محمد خان، جسٹس گل محمد، ڈاکٹر عبدالحمید عرفانی، دیوندر اسر، پروفیسر فتح محمد ملک، منو بھائی، شفقت تنویر مرزا، شورش ملک، خاور رضوی، عنایت الٰہی ملک اور عزیز ہمدانی کے نام نمایاں ہیں(۷)۔

ڈاکٹر غلام جیلانی برق ایک بھرپور زندگی گزار کر ۱۲۔مارچ ۱۹۸۵ء بروز منگل راہی ملکِ عدم ہوئے۔رہے نام اللہ کا

شخصیت: ڈاکٹر غلام جیلانی ایک زندہ دل اور شگفتہ مزاج انسان تھے۔وہ زندگی کے مثبت اور رجائی پہلوؤں کے مناد اور علمبردار تھے۔ان کے فلسفۂ زیست میں کہیں بھی قنوطیت کا گزر نہ تھا۔وہ مجلسی آدمی تھے۔خوش گفتاری ان کا شعار تھا۔وہ اول و آخر استاد تھے۔ان کا فیضِ تربیت کمرۂ جماعت تک محدود نہ تھا۔دانشکدے کے درو دیوار بھی ان کی خوش کلامی اور زندہ دلی کے امین تھے۔ان کے ایک شاگرد کا کہنا ہے: ''ڈاکٹر غلام جیلانی برق ہمارے عہد کی یگانہ روزگار شخصیات میں سے ایک تھے۔قدرت نے انھیں بے پناہ تخلیقی صلاحیتوں سے نواز رکھا تھا۔ان خداداد صلاحیتوں کو جس مسلسل اور انتھک محنت کے ساتھ انھوں نے چمکایا اور نکھارا تھا، وہ ان کے معاصرین میں کم کم نظر آتی ہیں۔اسلامیات، ادبیات اور تاریخ و تہذیب ان کے علمی اور تخلیقی تجسس کی جولاں گاہ تھے۔ڈاکٹر برق کی تخلیقی شخصیت یک رخی نہ تھی، پہلودار تھی۔ایک جگت استاد اور ایک نڈر، بے باک اور دراک ماہرِ اسلامیات کی حیثیت میں انھوں نے ہماری کئی نسلوں کی تربیت کی ہے۔خود مجھے اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے فخر محسوس ہو رہا ہے کہ میری ادبی تربیت

اور شخصی نشو و نما میں ڈاکٹر غلام جیلانی برق کا فیضان شامل ہے۔میری ذات میں ان کا یہ فیضان اس لمحے بھی زندہ اور سرگرمِ کار ہے''۔(۸) گویا وہ قطب مینار تھے، جو ہر ایک کے لیے سمت نمائی کا فریضہ انجام دیتا ہے۔وہ فیض رساں شخصیت تھے۔ان کے نزدیک عام اور خاص کی کوئی قید نہ تھی۔شہر کا ہر آدمی ان کی مجلسی سے کسبِ نور کرتا تھا۔خود انھوں نے زندگی میں بہت دکھ دیکھے، لیکن ان سے مردانہ وار ہم کلام رہے۔زندگی کے آخری کئی سال وہ مفلوج رہے، لیکن ان کی خوش مزاجی اور زندہ دلی میں کوئی فرق نہیں آیا۔انھیں زندگی کی مثبت قدروں پر یقین تھا۔وہ اطمینانِ قلب کی کسی ایسی منزل پر فائز تھے، جہاں زندگی کے تاریک رویے رنگ و نور میں ڈھل کر اُجالوں کی علامت بن جاتے ہیں۔ایسے نفسِ مطمئنہ کے لیے زندگی زندہ دلی سے عبارت ہوتی ہے، اس کی لغت میں مردہ دلی اور پژمردگی کا کہیں چلن نہیں ہوتا۔برق صاحب ایسے ہی تھے زندہ دل، سراپا زندگی، شگفتہ مزاج اور مجلس آرا۔بقولِ شاعر:

میں بعدِ مرگ دلِ دوستاں میں زندہ ہوں
تلاش کر مری محفل، مرا مزار نہ پوچھ

بحیثیت ادیب: جب غلام جیلانی برق بساطِ ادب پر جلوہ گر ہوئے تو علم و ادب کے اُفق پر کئی آفتاب اور مہتاب جلوہ کناں تھے۔علامہ اقبال اس قافلۂ شعر و سخن کے میرِ کارواں تھے۔اس عہدِ خوش توفیق میں کسی نووارد کا اپنی راہ بنانا اور شناخت قائم کرنا کچھ آسان نہیں تھا، لیکن برق صاحب نے اپنے لیے جس راستے کا انتخاب کیا، وہ شہرتِ دوام کے بازار کو نکلتا تھا۔وہ اس راہ پر ایسے گامزن ہوئے کہ بقائے جاوداں کے دربار میں جا نکلے۔ دو قرآن ان کی علمی اور فکری زندگی کا نقشِ اولین ہے۔اول اول یہ کتاب امرتسر کے رسالے البیان میں قسط وار اشاعت آشنا ہوئی اور بعدازاں کتابی صورت میں سامنے آئی۔اس کتاب کا چھپنا تھا کہ شہرت اور ناموری ان کے ہم رکاب ہوئی۔وہ بہت کم عرصے میں ہندوستان گیر شہرت کے حامل ہوئے۔ دو اسلام اور ایک اسلام کی اشاعت نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ناموری خانۂ برق کی کنیز تھی اور ہاتھ باندھے کھڑی تھی۔شہرت رقص کناں تھی اور برق صاحب اس بزم خوش طرب میں سرشار اور سرمست تھے۔ان کا پہلا قدم صراطِ مستقیم سے باہر پڑا تھا اور وہ اسی سرخوشی میں سرگرداں محوِ سفر تھے۔ان کا

سفر انحراف اور انکار سے شروع ہوا، لیکن خدائے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انھیں جادۂ مستقیم کی طرف مراجعت کی توفیق ارزانی فرمائی اور وہ نفی سے اثبات اور انکار سے اقرار کی طرف پلٹ آئے۔ ان کی چالیس کے قریب کتابیں اشاعت کی روشنی سے ہمکنار ہوئیں۔ ایک سے بڑھ کر ایک۔ مختلف اور متنوع موضوعات ان کی فکرِ رسا کا مقسوم ہوئے۔ دینی اور تہذیبی موضوعات کی رنگا رنگی کے باعث وہ مختلف علمی اور فکری حلقوں میں زیرِ بحث رہے۔ ان کی تردید میں بیسیوں کتابیں اور کتابچے بھی لکھے گئے اور روشناسِ خلق ہوئے۔ وہ خوش توفیق بھی تھے اور باحوصلہ بھی۔ جب جادۂ مستقیم پر مڑے تو خود اپنی تردید کی۔ توبہ نامہ چھاپا اور نہایت وقار اور ہمت سے اپنی غلطی ہائے مضامین کی نقاب کشائی کی۔ یہ سفر خداوندِ قدوس کے کرمِ خاص کے طفیل ممکن ہوا۔ فکری مراجعت کے بعد ان کے قلم سے: یورپ پر اسلام کے احسان، دانشِ رومی وسعدی، من کی دنیا، اللہ کی عادت، رمزِ ایمان، الحادِ مغرب اور ہم، ہماری عظیم تہذیب، دانشِ عرب و عجم، ہم اور ہمارے اسلاف، تاریخِ حدیث اور میری آخری کتاب جیسی کتابیں منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئیں۔ وہ صاحبِ طرز ادیب تھے۔ ان کی نثر لطافتِ احساس اور اس کی کومل اور سجل معنویت کے کئی رنگ رکھتی ہے۔ اثر آفرینی ان کی نثر کی وہ خوبی ہے جو انھیں ممتاز کرتی ہے اور منفرد بھی۔ وہ قاری کو مسحور کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ ان کی تحریریں فکر و فلسفے کے رموز اور علمیت کے عرفان کی گرہ کشا ہوں کہ نہ ہوں، لیکن ان کا اندازِ نگارش ان کی تحریروں کو ایسی رعنائی عطا کرتا ہے جو ندرتِ احساس کی آئینہ دار بھی ہے اور معنی آفرین بھی۔ اور یہ ایک ایسی خوبی ہے جو کسی بھی ادیب کو زندہ رکھنے کے لیے کافی بھی ہے اور شافی بھی۔ نظر شناس ان کے اسلوبِ بیان کے حوالے سے رقمطراز ہیں: ''برق صاحب کا اندازِ تحریر اس قدر خوبصورت ہے کہ پڑھنے والا محسوس کرتا ہے کہ اس کے سامنے لالہ زار کھلا ہے؛ جوئے نور بہہ رہی ہے؛ بادِ صبا کے جھونکے چل رہے ہیں اور شبنم کے قطرے گر گر کر دل میں گداز اور روح میں سوز و ساز پیدا کر رہے ہیں۔ وہ رومانیت جو مشرق کا طرۂ امتیاز ہے، انجانی فضاؤں میں کھو جانے اور مدہوش ہو جانے والی کیفیت کہ قاری پر سحر طاری ہو جائے اور ایسا نشہ چڑھ جائے کہ خمار ٹوٹنے نہ پائے۔ ان کیفیات کا حسین امتزاج ہمیں صرف

اور صرف برق صاحب کی تحریروں میں ملتا ہے۔ اردو زبان میں اسلام پر اس قدر خوبصورت، رواں دواں، ہلکا پھلکا اور مترنم طرزِ تحریر ہمیں ڈھونڈے سے نہ ملے گا۔ برق صاحب فلسفے کی گرہیں نہیں کھولتے؛ وہ تاریخ کی بھول بھلیوں میں گم نہیں ہوتے؛ علمیت کے سمندر میں غوطے نہیں لگاتے، اس لیے ان کی تحریریں ایک عام انسان کے دل و دماغ کو گدگداتی ہیں اور اس کے پتھر دل کو مسخر کر لیتی ہیں۔ ان کی نثر اس قدر لطیف، سبک، رواں اور جواں ہے، جس کی مثال ہمیں اردو میں شاذ و نادر ہی مل سکے گی۔'' (۹)

بحیثیت شاعر: ڈاکٹر غلام جیلانی شاعر بھی تھے۔ ان کا شعری کلیات برقِ بے تاب کے عنوان سے مرتب ہوا (۱۰)، لیکن ہنوز خاصا کلام غیر مدون صورت میں بھی موجود ہے (۱۱)۔ برق صاحب عربی، فارسی اور اردو میں شعر کہتے تھے۔ وہ سنجیدہ گو بھی اور مزاح نگار بھی۔ وہ برق تخلص کرتے تھے۔ البتہ مزاحیہ شاعری میں ان کا تخلص ڈھول دین تھا۔ انھوں نے ۱۹۴۰ء کے آس پاس اردو ماہیے لکھے۔ جب اس صنفِ اظہار کے اُفق پر صرف چراغ حسن حسرت اور اختر شیرانی کا طلوع ہوا تھا اور کوئی تیسرا اس میدان میں نبرد آزما نہیں تھا۔ انھوں نے نثری گیت بھی لکھے۔ ہمارے ہاں نثری نظم کا غلغلہ کہیں بعد میں بلند ہوا۔ وہ خود نثر نگاری میں گم رہے اور شاعری ان کی بیاضوں میں۔ اگر وہ شاعری کی طرف توجہ مبذول کرتے تو یقیناً اس میں بھی نام پاتے۔ پروفیسر فتح محمد ملک رقمطراز ہیں: ''شاعری ڈاکٹر غلام جیلانی برق کے علمی اور تخلیقی دھارے کی فقط ایک موجِ بیتاب ہے۔ خود وہ اپنی شاعری کو کوئی خاص اہمیت نہ دیتے تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ڈاکٹر غلام جیلانی برق اگر شاعری کی طرف توجہ دیتے تو آج ان کا شمار عصرِ رواں کے سربرآوردہ شعراء میں سرِ فہرست ہوتا، مگر اس کا کیا کیا جائے کہ خود انھیں شاعری کی بجائے اسلامیات، اقبالیات اور ان سب سے بڑھ کر اپنے شاگردوں کی تعلیم و تربیت میں انہماک زیادہ عزیز تھا۔'' (۱۲)

بحیثیت دانشور: ڈاکٹر غلام جیلانی برق معاشرتی اور سماجی زندگی میں مثبت اقدار کے داعی تھے۔ طلبہ کی ذہنی نشوونما اور فکری تربیت کے ساتھ ساتھ انھوں نے عام فرد کی تربیت کے سلسلے میں بھی بہت کام انجام کیا۔ وہ جنگ اور نوائے وقت میں کبھی کبھار تہذیبی، سماجی اور عصری مسائل پر

کالم نگاری بھی کرتے تھے۔ وہ اعلیٰ پائے کے خطیب بھی تھے۔ انھوں بلاشبہ سیکڑوں جلسوں سے خطاب کیا۔ وہ ریڈیو پاکستان راولپنڈی کے اکثر دینی اور ثقافتی پروگراموں میں بطور مقرر شریک ہوتے اور معاشرے کی رہبری اور رہنمائی فرماتے۔ انسانی زندگی میں خیر، محبت اور رواداری کی فراوانی ان کا مطمحِ نظر تھا اور وہ مختلف حوالوں سے اس کارِ خیر میں کوشاں رہے۔ بقولِ سرور بارہ بنکوی:

جن سے مل کر زندگی سے عشق ہو جائے وہ لوگ
آپ نے شاید نہ دیکھے ہوں مگر ایسے بھی ہیں

حوالے اور حواشی:

(۱) ڈاکٹر غلام جیلانی برق کے احوال وسوانح پر لکھے گئے مضامین اور مقالات میں بسال ضلع کیمبلپور کو ان کی جائے پیدائش لکھا گیا۔ بسال ان کا آبائی قصبہ ضرور ہے، لیکن ان کی جائے پیدائش کا شرف پنڈ بگھیب کے ایک گاؤں کنٹ کو حاصل ہے۔ راقم نے ڈاکٹر غلام جیلانی برق کے خطوط کی ترتیب و تدوین کے زمانے میں ان کے برادرِ بزرگ پروفیسر غلام زبانی عزیز سے ایک مکالمہ کیا تھا۔ ان کا فرمان تھا کہ برق صاحب بسال میں نہیں، بلکہ کنٹ میں پیدا ہوئے تھے، جہاں ان کے والد بسلسلۂ ملازمت مقیم تھے۔ (راقم سے مکالمہ: ۲۴۔ مارچ ۱۹۹۵ء)۔

(۲) اس کا تذکرہ علامہ اقبال کے کئی خطوط میں آیا ہے۔ رک: کلیاتِ مکاتیبِ اقبال۔

(۳) ۱۹۱۹ء میں منشی فاضل (انقلاب: ص۱۲)، ۱۹۲۱ء میں مولوی فاضل اور ۱۹۲۲ء میں ادیب فاضل کیا۔ (انقلاب: ص۱۳)۔

(۴) انقلاب: ص۱۵۔

(۵) نومبر ۱۹۲۰ء میں اسلامیہ ہائی اسکول نوشہرہ میں استاد مقرر ہوئے (انقلاب: ص۱۳)۔ اس کے بعد راہوں ضلع جالندھر میں چھے ماہ کے لیے عربی کے استاد رہے (میری داستانِ حیات: ص۴۷)۔ جالندھر کے بعد اسلامیہ ہائی اسکول گوجر خان میں تقرر ہوا (میری داستانِ حیات: ص۵۲)۔ ۱۹۲۲ء سے لے

کر ۱۹۲۶ء تک کا زمانہ ہائی اسکول چکوال میں گزرا (میری داستانِ حیات: ص۶۰)۔ ۱۹۲۶ء کے اواخر میں نارمل اسکول لالہ موسیٰ میں تبدیلی ہوئی (میری داستانِ حیات: ص۷۸)۔ ۱۹۲۸ء میں کیمبلپور آ گئے (میری داستانِ حیات: ص۷۹)۔ ۱۹۳۰ میں بھکر ٹرانسفر ہوئے (میری داستانِ حیات: ص۸۹)۔ ۱۹۳۲ء میں ایک سال تک ہائی اسکول تلہ گنگ سے وابستہ رہے (میری داستانِ حیات: ص۱۵۶)۔

(۶) امام ابنِ تیمیہ: ص۱۸۔

(۷) ڈاکٹر غلام جیلانی برق کے خطوط: ص۱۴ و ۱۵۔

(۸) دڈاکٹر غلام جیلانی برق از پروفیسر فتح محمد ملک مشمولہ در برقِ بے تاب: ص۱۶۔

(۹) مشعل، مجلّہ گورنمنٹ کالج، اٹک: ۱۹۸۸ء: ص۵۵۔

(۱۰) رک: برقِ بے تاب مرتبہ شاکر القادری۔

(۱۱) پندرہ روزہ ترقی اٹک کے شماروں میں شامل ان کا مزاحیہ کلام۔

(۱۲) برقِ بے تاب: ص۱۶۔

کتابیات:

امام ابنِ تیمیہ: ڈاکٹر غلام جیلانی برق: اسلامک پبلشنگ ہاؤس، لاہور: ۱۹۷۹ء۔

انقلاب: ڈاکٹر غلام جیلانی برق: دی اسٹوڈنٹس لٹریچر پبلشنگ سوسائٹی، فیروز پور: ۱۹۴۰ء۔

برقِ بے تاب: سید شاکر القادری (مرتب): ن والقلم ادارۂ مطبوعات، اٹک: بارِ اول اپریل ۲۰۰۴ء۔

ڈاکٹر غلام جیلانی برق کے خطوط: عبدالعزیز ساحر (مرتب): حسنین پبلی کیشنز، لاہور: ۱۹۹۹ء۔

میری داستانِ حیات: ڈاکٹر غلام جیلانی برق: شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور: بارِ دوم ۱۹۸۹ء۔

مشعل مجلّہ گورنمنٹ، اٹک: ۱۹۸۸ء۔

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار

ڈاکٹر پروین کلّو

یوں تو ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کے علمی و تحقیقی کاموں کی ایک طویل فہرست ہے جس کا یہ مضمون متحمل نہیں ہوسکتا۔ اس کام کے لیے تو پوری ایک کتاب کی ضرورت ہے۔ تاہم آپ کے اہم کاموں میں ایک کام اورینٹل کالج کی تاریخ لکھنا ہے۔

''تاریخ اورینٹل کالج'' کا پہلا ایڈیشن ۱۹۶۲ میں لاہور سے شائع ہوا۔ اس حوالے سے ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں ''اورینٹل کالج لاہور کو قائم ہوئے تقریباً ایک صدی کا زمانہ بیت گیا۔ اس ادارے نے تدریس و تحقیق اور تصنیف کی جو عظیم الشان روایت قائم کی اس کی اہمیت کا اعتراف بکھرا بکھرا سا تھا۔ اس صورت حال میں یہ خیال آیا کہ اورینٹل کالج کی ایک مبسوط تاریخ لکھی جائے' یہ کام میں نے اپنے عزیز ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کے سپرد کیا انہوں نے یہ روداد دو سے تین مہینوں میں ایک طویل مضمون کی صورت میں مرتب کر دی اس کتاب کی اہمیت اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ یہ تاریخ اورینٹل کالج پر پہلی مبسوط کتاب ہے۔''

اسی طرح آپ نے ''صد سالہ تاریخ جامعہ پنجاب'' لکھی۔

ڈاکٹر ذوالفقار علی ملک (پرووائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی) کہتے ہیں کہ جب پنجاب یونیورسٹی کی صد سالہ تقریبات کے سلسلے میں پنجاب یونیورسٹی کی تاریخ لکھنے کا پروگرام بنایا گیا تو سب نے اس کام سے پہلو تہی کی۔ اس وقت ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار آگے بڑھے اور یونیورسٹی کی تاریخ مرتب کر دی۔ تحقیق و تجسس کے ساتھ ان کے لگاؤ کا یہ سب سے بڑا ثبوت ہے۔

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار ایک ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔ وہ بہت محنتی اور شریف

النفس استاد تھے۔ ان کے آباؤ اجداد بٹالہ کے خوش حال زمیندار تھے۔ ان کے والد کا نام میاں محمد دین تھا۔ ''ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار ۱۵ اگست ۱۹۲۴ء کو بٹالہ ضلع گورداس پور مشرقی پنجاب (بھارت) میں پیدا ہوئے'' ان کا بچپن بٹالہ اور امرتسر کے شہروں میں گزرا۔ انہیں محلے کے بچوں کے ساتھ قرآن کریم پڑھنے کے لیے مسجد میں بھیجا گیا تو جابر مانیٹر (نگران سینئر طالب علم) کی چابک زنی برداشت نہ کر سکے۔ اور اس ماحول سے باغی ہو گئے اور گھر آ کر اعلان کر دیا کہ میں مسجد میں پڑھنے کے لیے نہیں جاؤں گا۔ چنانچہ انہیں مشن سکول میں داخل کروا دیا گیا اپنی والدہ سے چند پارے پڑھے۔

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کے والد انہیں گھر کے نامساعد مالی حالات کی وجہ سے دستکار بنانا چاہتے تھے۔ والدہ تعلیم کو فوقیت دیتی تھیں۔ والدہ کی وفات کے بعد ان کی دیکھ بھال ان کی بڑی بہن فاطمہ نے کی۔ ''میٹرک کا امتحان مسلم ہائی سکول بٹالہ سے ۱۹۴۱ء میں فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔''

اس دور کے اساتذہ نے ان کے دل میں شعر و ادب کا ذوق پیدا کیا۔ غالب' اکبر' اقبال' ابو الکلام آزاد' شبلی نعمانی' ظفر علی خان' اور چوہدری افضل حق کی کتابیں ذوق و شوق سے پڑھتے تھے۔ ایف اے میں ایم اے او کالج امرتسر میں داخل ہوئے۔ اس وقت اس کالج کے پرنسپل ڈاکٹر محمد دین (ایم ڈی) تاثیر تھے اور اساتذہ میں فیض احمد فیض کرامت حسین جعفری' عبدالبصیر پال' عظیم الدین احمد اور مہر ادریس تھے۔ بعد ازاں ان کا تعلیمی سلسلہ رک گیا کیونکہ بھارت میں فسادات شروع ہو گئے تھے اور ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو قیام پاکستان کا اعلان ہو گیا تھا چنانچہ مشرقی پنجاب سے ہجرت کر کے پاکستان آ گئے۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار اپنے خاندان کو بٹالہ سے نکال کر آگ اور خون کا دریا عبور کر کے ۲۷ اگست ۱۹۴۷ء کو لاہور آئے۔ یہاں آ کر ان کا تعلیمی سلسلہ منقطع رہا۔ لہٰذا ۱۹۵۱ء میں اورینٹل کالج لاہور سے ادیب فاضل اور اسی سال ایف اے کی انگریزی کا امتحان دیا پھر ۱۹۵۳ء میں عالم فاضل اور بی اے کی انگریزی کا امتحان پاس کر لیا۔ ۱۹۵۵ء میں ایم اے اردو اورینٹل کالج لاہور (پنجاب یونیورسٹی) سے پاس کیا۔ اسی یونیورسٹی سے ۱۹۶۰ء میں ''اردو شاعری کے سیاسی و سماجی پس منظر'' کے موضوع پر پی ایچ۔ڈی اردو کی ڈگری حاصل کی۔ ڈاکٹر صاحب کی شادی ۱۹۶۰ء میں ہوئی۔ ان کی سات بیٹیاں اور دو بیٹے ہیں۔

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کو زمانہ طالب علمی میں محکمہ ریلوے میں پارسل کلرک کی ملازمت اختیار کرنا پڑی۔ ۱۹۵۶ء میں ان کے استاد ڈاکٹر سید عبداللہ نے پنجاب یونیورسٹی میں اپنے ساتھ ریسرچ سکالر کی حیثیت سے رکھ لیا۔ ۱۹۵۹ء میں پنجاب یونیورسٹی میں ہی ان کی عارضی لیکچرر کی تقرری ہوگئی اس وقت شعبہ اردو میں ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر عبادت بریلوی، وحید قریشی اور سید وقار عظیم جیسے نامور محقق، ادیب اور ناقدین کام کر رہے تھے ان درخشاں ستاروں کے ساتھ کام کر کے ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کو اپنی خوابیدہ صلاحیتوں کو نکھارنے کا موقع ملا۔

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں ۱۹۷۰ء میں ریڈر اور ۱۹۸۲ء میں پروفیسر بن گئے دوبار صدر شعبہ اردو کا عہدہ سنبھالا، یاد رہے کہ جب لیکچرر تھے تب بھی صدر شعبہ اردو کے فرائض انجام دیئے۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کی زیادہ تر تدریسی خدمات پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں رہیں۔ ۱۹۸۴ء میں ۶۰ برس کی معینہ عمر پر پہنچنے کے بعد ملازمت سے سبکدوش ہو گئے یونیورسٹی ہذا نے ان کی علمی و ادبی اور تدریسی محبت دیکھتے ہوئے تین سال کے لیے دوبارہ ملازمت دے دی مگر ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار مقررہ مدت پوری کیے بغیر ہی برادر اسلامی ملک ترکی میں استنبول یونیورسٹی چلے گئے، جہاں انہوں نے عربی اور فارسی شعبوں کے ساتھ شعبہ ''اردو'' کی بنیاد رکھی اور لگن اور محنت سے نہ صرف تدریسی فرائض انجام دیئے بلکہ اپنی کئی کتابوں کا مواد بھی جمع کیا۔

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار نے دوران ملازمت ستر سے زائد ایم اے اردو کے تحقیقی مقالے کروائے اور پانچ سے زائد پی ایچ۔ڈی کے تحقیقی مقالات کی نگرانی کی۔ان کے پی ایچ ڈی اردو کے سکالرز میں ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، ڈاکٹر اورنگ زیب ستار، ڈاکٹر محمد یوسف بخاری، ڈاکٹر منظور اختر، تحسین فراقی اور ڈاکٹر شفیق احمد ہیں۔

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کو زمانہ طالب علمی سے ہی سیاست سے خاصا لگاؤ تھا۔ انہوں نے اورینٹل کالج میں یونین کی صدارت کا الیکشن لڑا اور کامیاب رہے تحریک پاکستان کے لیے بھی بڑی جدوجہد کی اور بہت زیادہ تکالیف کا سامنا کرنا پڑا۔

سیر و تفریح کے خاصے شوقین تھے گرمیوں کی چھٹیوں میں شمالی علاقہ جات کی طرف چلے جاتے پیدل چلنے میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے ان کا پسندیدہ مشغلہ ہائکنگ تھا۔

اردو ادب میں جب ہم اقبالؒ اور اکبر کا نام لیتے ہیں تو فوراً ایک نام اندھیرے میں روشن ستارے کی طرح چمکتا نظر آتا ہے اور وہ نام ہے ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، یوں تو اقبال اور اکبر کے حوالے سے بہت سی اہم شخصیات موجود ہیں جنہوں نے اقبال اور اکبر کے فکر و فن پر گراں قدر کام کیا ہے۔ مگر اقبال اور اکبر کی جن فنی و فکری جہتوں کو ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار نے دریافت کیا ہے وہ ان کا ہی اعزاز ہے۔ ان کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اقبال اور اکبر کی فکری جہتوں کو ایسے نزاکت سے سلجھایا ہے جیسے کوئی ریشم کو لگی گرہیں کھول دے۔ ریشم کو لگی گرہیں کھول دینے کی مثال میں نے اس لیے دی ہے کہ ہم نے اکثر دیکھا ہے کہ ریشم کو لگی گرہیں کھولنے کی بجائے اور زیادہ گرہیں ڈال دیتے ہیں۔ ہمارے اکثر ناقدین نے بھی اقبال اور اکبر کے ساتھ کچھ ایسا ہی کیا ہے۔ یعنی ان کے فن کی معنوی پرتیں کھولنے کی بجائے اس میں ابہام شامل کر دیا ہے۔ جبکہ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کا سارا علمی و تحقیقی کام اس عمل کے برعکس ہے۔ اس کے علاوہ آپ کی دیگر کتابیں بھی علمی و تحقیقی افادیت میں بلاشبہ بے مثال ہیں۔ آپ کی دیگر کتابوں میں شاہ حاتم حالات و کلام'' ''انتخاب کلام اکبر'' ''نذر رحمٰن'' ''اردو شاعری کا سیاسی و سماجی پس منظر'' ''ظفر علی خاں ادیب و شاعر'' ''مضامین سرسید'' ''خیالات آزاد'' محاسن خطوط غالب'' ''خیالستان'' ''نیرنگ خیال'' ''نقد اکبر'' کارروان شوق'' ''مطالعہ اکبر'' ''اکبر کا ذہنی ارتقا'' ''قومی زبان کے بارے میں اہم دستاویزات'' ''طبقات الشعراء ہند'' ان کے علاوہ حضرت علامہ محمد اقبالؒ کے حوالے سے آپ کی کتب نہایت اہمیت کی حامل ہیں۔ اقبال کے حوالے سے آپ کا کام آپ کو اپنے ہم عصر لکھنے والوں میں ممتاز مقام عطا کرتا ہے۔ اقبال پر لکھی ہوئی کتابیں ''اقبال کا اسلوب نگارش'' ''خطبات اقبال'' ''اکبر پیش رو اقبال'' ''بیاد اقبال'' ''اکبر اور اقبال'' ''اقبال کا ذہنی ارتقا'' اور ''اقبال ایک مطالعہ'' ''عاشقان اقبال کے لیے انمول سرمایہ ہیں۔

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار علم و ادب سے سچی محبت رکھنے والے ایک ذمہ دار استاد تھے۔ اور ان کے حوالے سے ان کے ہم عصر اساتذہ کرام نقاد اور محقق نہایت اچھی رائے رکھتے تھے۔

ڈاکٹر وحید قریشی کہتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب بہت محنتی استاد تھے ہر ریکارڈ کو سنبھال کر رکھتے تھے قلم جما کر خوشخطی سے تحریر کرتے تھے۔ وہ اپنا کام کسی کو نہ کہتے بلکہ خود کرتے۔ ڈاکٹر تحسین فراقی کے بقول:

''بحیثیت معلم تو میرا ان کا ساتھ تقریباً آٹھ دس ماہ رہا لیکن بحیثیت استاد وہ میرے پی ایچ ڈی کے نگران ہیں۔ ڈاکٹر صاحب گوشہ گیر اور خاموش طبع انسان ہیں۔ البتہ اپنے دوستوں کے حلقے میں انہیں خوب چہکتے دیکھا ہے حق بات ڈنکے کی چوٹ پر کہتے ہیں۔ مرغوب حسین طاہر کے نزدیک:

''ڈاکٹر صاحب کی شخصیت میں ایک عجیب بات نظر آتی ہے کہ وہ عام طور پر لوگوں سے خشک انسان کی طرح ملتے۔ طلباء سے ان کا رویہ مشفقانہ تھا دوستانہ نہیں لیکن وہ ذاتی طور پر اتنے خشک نہیں تھے جتنے نظر آتے تھے۔ وہ بہت خوش مزاج اور بزلہ سنج آدمی تھے۔ لیکن مخصوص دوستوں کے حلقے میں کُھلتے ہیں'' ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار دوستوں کے دوست اور آڑے وقت میں ان کے کام آنا اپنا فرض اولین سمجھتے تھے۔

ڈاکٹر یوسف بخاری کے بقول ''میں ۱۹۷۲ء سے ۱۹۸۵ء تک ڈاکٹر صاحب کے ساتھ رہا۔ وہ میرے پی ایچ ڈی کے استاد ہیں وہ ایک ہمہ گیر شخصیت کے مالک ہیں وہ دوستوں کے دوست اور دوستی کے قدردان اور اپنے دوستوں کے لیے چٹان کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا صاحب کہتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کا شمار ان چند لوگوں میں ہوتا ہے جو بہت ہی قابل اعتماد ہوتے ہیں ان سے کوئی نازک سے نازک مسئلہ ڈسکس کریں وہ لیک آؤٹ نہیں کریں گے ڈاکٹر صاحب میرے بہترین دوستوں میں سے ہیں ایسے دوست انسان کا بہترین سرمایہ ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب دیانت دار اور بہت محنتی ہیں۔ ۱۹۳۲ء میں جشن صد سالہ جامعہ پنجاب کے موقع پر انہیں تاریخ جامع پنجاب لکھنے کے لیے کہا تو وہ یونیورسٹی کا سارا ریکارڈ لے کر خانپور چلے گئے وہاں دن رات ایک کر کے کام کیا۔ میں جب خانپور گیا تو ڈاکٹر صاحب ریکارڈ میز پر رکھ کر فائلوں میں ایسے گم تھے کہ میرے آنے کا بھی ان کو احساس تک نہیں تھا ڈاکٹر صاحب بہت محنت کے عادی ہیں اپنا کام کسی کے سپرد نہیں کرتے۔''

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کو جن شخصیات سے لکھنے کی تحریک ملی ان میں مولوی محمد شفیع' ڈاکٹر سید عبداللہ اور مولانا صلاح لدین شامل ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی شعبہ اردو کی ملازمت کے دوران وہ کئی علمی و ادبی مجالس' کے رکن رہے اور علمی و ادبی کانفرنسز بھی کروائیں ان کی مختلف موضوعات پر تیس سے زائد تحقیقی و تنقیدی اور مدون کتب شائع ہو چکی ہیں اور دو سو سے زائد مضامین ملک کے

معروف رسائل و جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ یونیورسٹی ہذا سے ریٹائر ہونے کے بعد بھی وہ ادب کی دنیا سے کبھی غیر حاضر تصور نہیں کیے گئے۔ وہ بنیادی طور پر بندہ تحقیق تھے اور حقیقت کی جستجو میں ہمہ وقت قدیم کتابوں کی دنیا میں گم رہتے تھے کبھی غلط العام بات کی صداقت معلوم کر لیتے تو داخلی مسرت سے سرشار ہوتے اور اس کا ذکر اپنے کمرے میں داخل ہونے والے ہر شخص سے کرتے تھے مگر اپنے کسی کارنامے پر فخر کا اظہار نہ کرتے تھے بلکہ بڑی خاموشی سے اپنے تحقیقی کام میں لگے رہتے۔

ڈاکٹر صدیق جاوید کہتے ہیں ''میں نے ڈاکٹر صاحب کی تقریباً تمام کتابیں پڑھی ہیں ان کا پی ایچ۔ ڈی کا مقالہ اردو شاعری کا سیاسی و سماجی پس منظر'' مجھے بہت پسند ہے وجہ پسندیدگی یہ ہے کہ انہوں نے ایک بہت اچھا موضوع تلاش کیا۔ اور اس موضوع کے ساتھ پورا انصاف کیا۔ اردو شاعری کی تاریخ اس کے سیاسی و سماجی پس منظر کے بغیر نہیں سمجھی جا سکتی۔ میرے نزدیک ڈاکٹر صاحب کا محقق کی حیثیت سے بڑا مقام ہے''

پروفیسر صابر لودھی لکھتے ہیں'' ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کی ایک کتاب کا میں نے بغور مطالعہ کیا ہے (مضامین سرسید) دیباچے میں خاصی محنت کی ہے' خصوصاً سرسید کے رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' کے اقتباسات بڑے برجستہ ہیں۔ اچھے محقق اور اچھے نقاد ہیں' تنقید میں ان پر کسی خاص مکتبہ فکر کی چھاپ نہیں لگی' تحقیق میں وہ حافظ محمود شیرانی اور ڈاکٹر سید عبداللہ کے مقلد ہیں۔

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کہتے ہیں ''ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار نے اردو ادب کو بہت اچھی کتابیں عطا کی ہیں۔ کاش پنجاب یونیورسٹی میں ایسی محنت اور لگن سے کام کرنے والے اور لوگ بھی ہوتے جن کی کاوشوں سے ہم مستفید ہو سکتے۔

ڈاکٹر سید محمد اکرم شاہ کی رائے میں۔ ''ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار'' بہترین محقق اور معلم ہیں۔ تحقیقی اور تدریسی چیزیں اگر استاد میں ہوں تو طلباء کے لیے مفید ہیں۔ میں نے ان کی کتابوں کا مطالعہ کیا' انہوں نے ہر تحقیقی منصوبہ بروقت پورا کیا'' ان کا شمار بہترین محققین میں ہوتا ہے۔

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار نے عمر بھر کام' کام اور صرف کام کیا' اردو ادب کی تاریخ میں آپ کے کام کو ہمیشہ اچھے لفظوں میں یاد رکھا جائے گا۔ آپ ۱۳ جون ۲۰۰۷ء کو اس جہان فانی سے

رخصت ہوئے۔

پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں

ڈاکٹر مسرور احمد زئی

اک علم کہ جسے وقت کا رومی کہیے
ایک ناصح کہ جسے وقت کا سعدی کہیے

شخصیت کسے کہتے ہیں؟ یقیناً اُن اوصاف و کمالات کے مجموعی تاثر کو جن کے حوالے سے کسی فرد کو سماجی و معاشرتی زندگی میں پہچانا جاتا ہے، گویا شخص اگر کسی فرد کے تعارف کا نام ہے تو شخصیت اس کی مجموعی صفات کا حوالہ ہے، شاید یہی سبب ہے کہ کسی نام کو اعتبار کی منزل تک پہنچتے پہنچتے اپنے کام کی اور خدمات کے تعلق سے ایک طویل ریاضت سے گزرنا پڑتا ہے، لیکن یہاں ایک اور امر قابلِ توجہ سمجھا گیا ہے اور وہ یہ کہ بعض شخصیات کسی ایک کام، ایک شعبے اور ایک مشغلے یا ایک جہت کے حوالے سے دوسروں سے ممیّز و ممتاز ہونے کے باعث متعلقہ شعبے کی اہم شخصیت قرار پاتی ہیں، لیکن اس کے برعکس بعض شخصیات ایک سے زیادہ شعبہ ہائے زندگی پر یکساں طور پر وقیع و معتبر تسلیم کی جاتی ہیں، لہٰذا ایسی شخصیات کو ہمہ جہت، ہمہ صفات، ہمہ رنگ اور خیرِ کثیر شخصیت کہا جاتا ہے۔

سماجی و معاشرتی حوالوں سے متذکرہ اصول پر جب ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاںؒ کی شخصیت کو دیکھنے اور پرکھنے کا تحقیقی و تفصیلی تقاضا پورا کرنے کی سعی کی جائے تو مصنف و محقق کو معروضی اصولوں پر رہتے ہوئے بھی یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ وہ واقعتاً ہمہ جہت، ہمہ صفات، اور خیر کثیر کے اوصاف سے متصف شخصیت کے حامل تھے، جو بیک وقت مدرس، محقق، معلم، مفکر، مفسیر، مقرر، مدبر، مصنف، مؤلف، مبلغ، مترجم، ممتحن، منکسر المزاج، اور علمِ روحانیت کے علم بردار اور ہر صفت

میں مثالی، منفرد، ممتاز اور ممیّز تسلیم کیے گئے، دراصل اظہارِ علم و عمل، شخصیت ہی کا حصہ ہوتا ہے اس سے الگ ہو کر فن نمو پا ہی نہیں سکتا، کسی بھی فن کا اظہار اور علم کا بیان اس شخصیت کی تصویر ہی تو ہوتا ہے۔

یہ تمہید اس لیے بھی ضروری تھی کہ ہم ایک عظیم عہد ساز، علم پرور، ادب نواز، رجحان پرور اور کردار ساز استاذ الاساتذہ شخصیت سے ظہور پانے والے فن کا اجمالی جائزہ لینے کی کوشش کر رہے ہیں اس لیے مناسب سمجھا گیا کہ ہم ایک طاہرانہ نظر اس بات پر بھی ڈالیں کہ فن کی نمو کا سرچشمہ بننے کے بعد ہی ایک شخصیت کو خیرِ کثیر کی معراج حاصل ہوتی ہے۔

اس سے پہلے کہ ہم ڈاکٹر صاحب کے سوانحی نکات اور ان کے افکار و اذکار کا ذکر چھیڑیں مناسب ہے کہ پہلے ان کی مختصراً قلمی تصویر بھی دیکھ لیں، ڈاکٹر اسلم فرخی نے آپ کے خاکے میں لکھا ہے:

> ''لمبا قد لیکن بر بنائے انکسار خم، دہرا بدن کہ طالبِ علم و ریاضت میں خستگی سے محفوظ رہے، گول چہرہ، دائرۂ شریعت کی حدود کا ترجمان، آنکھوں میں شرم و حیا اور معرفت کی قندیلیں روشن۔ **سیماھم فی وجوھھم من اثر السجود**، رعونت کی سرکوبی کے لیے ترکی ٹوپی سے مزین سر پر خلق کے آثار، محاسن میں پاکیزگی کا حُسن، گندمی رنگ میں طمانیت کی جھلک معمولی سوتی شیروانی، علی گڑھ کاٹ کا پاجامہ، پاؤں میں سادہ سی گرگابی ••• یہ ہیں ڈاکٹر صاحب''۔

راقم نے جب دیکھا تب ترکی ٹوپی کی جگہ دوپلی ٹوپی نے لے لی تھی، لیکن باقی اوصاف میں کچھ اور ہی اضافہ ہو گیا تھا، انکساری، ملنساری، مہمان نوازی، ادب پروری، اعتدال، اعتماد، دھیمہ لہجہ، نرم مزاجی، سنجیدگی، بردباری کبھی تبسم میں تکلم اور کبھی تکلم میں تبسم حافظے میں کمال اور خوش خطی میں جمال، تہجد گزار اور دل گداز، اللہ نے ڈاکٹر صاحب کے وقت میں بڑی برکت عطا کی تھی، غالباً جو لوگ وقت کو فتح کر لیتے ہیں، وقت ان کے سامنے احتیاط سے گزرنا سیکھ لیتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے سامنے وقت ہاتھ باندھے کھڑا محسوس ہوتا تھا:

وقت حاضر ہے ہاتھ باندھے ہوئے
لمحے زنجیر عہدِ محکم ہیں!

راقم الحروف نے حضرت کے ساتھ بڑا وقت گزارا، انھیں ہمیشہ مشغولِ تلقین و ہدایت اور صلاح وفلاح کے کاموں میں مصروف پایا، پھر وظائف و لطائف، اوراد و اشغال کے بعد علمی و ادبی کاموں کا یہ وفور کہ دیکھنے والے کی عقل حیرت کی چوکھٹ پر سجدہ ریز ہو جائے۔ ایک مرتبہ کچھ لکھ رہے تھے، مجھ حقیر کو آواز دی اور فرمایا ''دوسری الماری کے تیسرے خانے میں ایک لال جلد میں فلاں کتاب ہے وہ لے آئیں''۔ میں کتاب صاف کر کے لے آیا، فرمایا ''اس کو کھولیں، اندرونی جلد پر ایک شعر لکھا ہوگا وہ پڑھ دیں''۔ میں نے پڑھا اور آپ نے اپنے مضمون میں وہ شعر لکھ لیا، میں نے عرض کی حضور! نامعلوم یہ کتاب کب سے الماری میں رکھی تھی، آپ کو کیسے یاد کہ اس مضمون کا ایک شعر اس کتاب کی جلد پر لکھا ہوا ہے؟ زندگی سے آراستہ مسکراہٹ کے ساتھ فرمایا ''بیٹا ساری زندگی لکھنے پڑھنے ہی میں تو گزاری ہے''۔

یہ تھے ڈاکٹر غلام مصطفٰے خاںؒ جنھوں نے ساری زندگی علم وادب اور عبادت و ریاضت میں صرف فرمائی، میں نے لوگوں کو سوال کرتے بھی دیکھا اور ڈاکٹر صاحب کے مختصر جواب میں مضطرب کے اضطراب کو اطمینان میں ڈھلتے بھی دیکھا، ورنہ لوگ تو دلیلوں اور مثالوں کے دفتر میں گردن کی رگیں تک پھلا بیٹھتے ہیں:

یاں لب پہ لاکھ سخن اضطراب میں
واں ایک خامشی تری سب کے جواب میں

ڈاکٹر صاحب کے اندازِ تربیت کی ایک جھلک انوار احمد زئی کی تحریر میں بھی دیکھ لیں:

''ڈاکٹر صاحب کی تربیت کا انداز اس قدر مؤثر اور گہرا ہوتا تھا کہ شعبہ اُردو میں غالب، میر اور مومن کو پڑھنے والا، آہستہ آہستہ اسماء الرجال، روایت و درایت کی اصطلاحات سے گزرتا ہوا دینی و روحانی سمندروں کی خواصی نہ بھی کر سکے تب بھی اس کے ساحل تک ضرور آ جاتا تھا••• یہاں تک کہ بعض غیر مسلم اُردو دوست شاعری اور تنقید کی گرہیں کھولنے شعبہ اُردو میں آئے اور ذہن و دل کی گرہوں کے ساتھ اُن کی روح کی ریشم ڈوریاں تک سلجھ گئیں اور وہ جب شعبۂ اُردو سے بامراد نکلے تو ان کے ایک ہاتھ میں ایم اے اُردو کی ڈگری تھی تو دوسرے ہاتھ میں صراطِ مستقیم کا عہد نامہ''۔

یہ ہے ڈاکٹر صاحب کی تربیت کی سچی تصویر، یہ ہیں وہ ڈاکٹر غلام مصطفٰے خاںؒ جو دوشنبہ، ۱۰ شوال المکرّم ۱۳۳۰ھ، مطابق ۲۳ ستمبر ۱۹۱۲ء کو پیر کی صبح فجر کے وقت جبل پور (سی پی) بھارت میں پیدا ہوئے۔ آپ کا تعلق یوسف زئی خانوادے سے تھا، والد کا نام گلاب خاں (م ۱۹۲۴ء) اور والدہ کا نام محفوظ النساء (م ۱۹۵۶ء) تھا جب آپ کی عمر تقریباً ۱۲ برس تھی تو والد کا وصال ہوگیا، اور آپ کی تعلیم و تربیت آپ کے بڑے بھائی نذیر احمد خاں (م ۱۹۵۷ء) نے مکمل کرائی، ان کی ابتدائی تعلیم جبل پور میں جب کہ ایم اے فارسی، ایل ایل بی اور قرآت و تجوید کی تعلیم مسلم علی گڑھ یونی ورسٹی سے حاصل کیں، ۱۹۳۷ء میں ڈاکٹر صاحب امراؤتی (برار) کے کالج میں لیکچرر منتخب ہوئے اور اسی دور سے آپ کی تحریر و تصنیف کا باقاعدہ آغاز ہوتا ہے۔ اور یہیں آپ نے اپنے استاد ضیاء الدین بدایونی کے مشورے سے فارسی کے قدیم شاعر حسن غزنوی (۵۵۶) پر پی ایچ ڈی کا مقالہ تیار کرنے کا منصوبہ بنایا، اور ۱۹۴۷ء میں ناگ پور یونی ورسٹی سے پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی۔ اسی یونی ورسٹی سے ۱۹۵۹ء میں ڈی لٹ کی ڈگری حاصل کی اس طرح ڈاکٹر صاحب پاکستان کی جامعات میں پہلے ڈی لٹ پروفیسر تھے، حسن غزنوی پر تحقیق کے دوران اس شاعر کے معاصر فارسی شعراء پر بھی تحقیق مکمل کی جو ''چند فارسی شعراء'' کے نام سے زیورِ طبع سے آراستہ ہوئی اس میں وہ ۱۴ مضامین بھی ہیں جو ''اسلامی انسائیکلوپیڈیا'' میں شامل ہیں، اس کے علاوہ مذکورہ شاعر کے عہد کے بادشاہ بہرام شاہ، کی تاریخ انگریزی میں لکھی اور انگریزی ہی میں ''برصغیر کے فارسی ادب کی تاریخ'' بھی تحریر فرمائی اس طرح ڈاکٹر غلام مصطفٰے خاںؒ کی ۹۷ تصانیف و تالیفات شائع ہوئی ہیں، جس میں فارسی پر اُردو کا اثر، حالی کا ذہنی ارتقاء، علمی نقوش، اقبال اور قرآن، مطالب القرآن، جامع القواعد، معارفِ اقبال، ہمہ قرآن در شانِ محمدؐ، ہمارا علم وادب، ثقافتی اُردو جیسی اہم تصانیف شامل ہیں جب کہ سلسلہ نقش بند کے بزرگوں کے مکتوبات اور ملفوظات کو مرتب و شائع کرنے کا سلسلہ بھی دراز ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو تاریخ گوئی میں بھی کمال حاصل تھا، تاریخی قطعات پر بھی دو مجموعے شائع ہوئے ہیں جب کہ ڈاکٹر این اے بلوچ کے ساتھ دو ضخیم و عظیم لغات، اُردو سندھی لغت اور سندھی اُردو لغت، بھی مرتب کی۔ ان کتب میں حضرت مجدد الف ثانیؒ کے غیر مطبوعہ رسائل کی اشاعت بھی قابلِ ذکر ہے۔ ان مطبوعہ کتب کے علاوہ ابھی ہزاروں تاریخی قطعات، سیکڑوں مطبوعہ مضامین، دیباچے، مکتوبات، طبی نسخے، وظائف،

بیاضیں، شاگردوں کے تحقیقی مقالات پر اصلاحات، نکات، ملفوظات وغیرہ یعنی بہت بڑا علمی و دینی خزانہ بکھرا ہوا ہے، جو کسی محقق کا منتظر ہے۔ اگرچہ آپ کی زندگی ہی میں راقم الحروف نے ''ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاںؒ، حالات علمی وادبی خدمات'' کے موضوع پر پی ایچ ڈی کا مقالہ تحریر کرنے کی سعادت حاصل کی ہے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کثیر التصانیف، کثیر الجہات، اور خیرِ کثیر شخصیت کے حامل ہیں اگر آپ کی قابلِ رشک اور قابلِ قدر زندگی کے اہم نکات ہی مرتب کرنے کا قصد کیا جائے تو ایک دفتر درکار ہوگا کیوں کہ یہاں تو علم کا ایک شہر آباد ہے، فکر کا ایک سورج تابندہ ہے، افکار کا ایک خزانہ، تہذیب کا ایک نمونہ، اور دینی خدمت کا ایک روشن تاب ستارہ دیکھا گیا ہے۔

اس طویل علمی وادبی، روحانی اور تہذیبی خدمات کے اعتراف میں ڈاکٹر صاحب کو بے شمار اعزازات سے نوازا گیا، جس میں صدارتی ایوارڈ، ستارۂ امتیاز، اور نقوش ایوارڈ بھی شامل ہیں، مگر دیکھا یہی گیا ہے کہ ہر اعزاز نے ڈاکٹر صاحب کو اور بھی تصویرِ تشکر اور نمونہ انکسار بنا دیا۔

آپ ایسے شخص کو کیا نام، کیا اعزاز اور کیا انعام دیں گے جس نے پاکستان میں تحقیق پر پہلا مضمون لکھا ہو، جس نے فنِ تحقیق کو نصاب میں شامل کیا ہو، جس نے فنِ تحقیق کے اصول مقرر کیے ہوں، جس نے کئی جامعات کا اردو نصاب مرتب کیا ہو، اردو ڈکشنری بورڈ اپنی ہر لغت کی اشاعت سے قبل لغت مستند ہونے کی جس سے سند لی جاتی ہو، جس نے ملک میں پہلا ڈی لٹ ہونے کا اعزاز حاصل کیا ہو، جس نے اقبالیات کو بطور مضمون متعارف کرایا ہو، جس نے پوری اردو دنیا میں سب سے زیادہ پی ایچ ڈی کے مقالات کی نگرانی کرنے کا اعزاز حاصل کیا ہو، جس نے پہلی مرتب نعت پر پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھوایا ہو، جس نے قرآن اور اردو ادب پر بہم تحقیقی کاموں کو فروغ دیا ہو، مثلاً اردو داستانوں پر قصص القرآن کے اثرات، یا اردو میں قرآن وحدیث کے محاورات، کوئی ہے ایسا جو! ہر دو موضوعات کا حق ادا کرنے کا علم رکھتا ہو! ہے کوئی ایسا شخص جس کے شاگردوں کی ایک کہکشاں سجی ہوئی ہو، جس میں ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر اسلم فرخی، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ڈاکٹر ابوالخیر کشفی، ڈاکٹر الیاس عشقی، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر رفیع الدین اشفاق، ڈاکٹر نجم الاسلام، ڈاکٹر رؤف پاریکھ، ڈاکٹر مسعود احمد، ابنِ انشاء، شاکر علی، حمایت علی شاعر، انوار احمد زئی، مختار کریمی اور مشفق خواجہ جیسے بے شمار ستارے اپنی ضوفشانی میں معروف ہوں، جن کے بارے میں ڈاکٹر سلیم اختر نے یہ لکھا ہو کہ:

''ڈاکٹر صاحب نے تعلیم وتعلم میں زندگی بسر کی اور تحقیقی وتنقیدی موضوعات پر خامہ فرسائی کی اور کیسے کیسے ذی علم ان کے تلامذہ میں شامل ہیں۔۔۔ نام روشن کرنے کو تو ایک ہی شاگرد کافی ہے، جیسے اپنے استادوں کے لیے علامہ اقبال، یہاں تو دنیائے نقد کے روشن اسماء کی کہکشاں ہے''۔

ڈاکٹر صاحب کا یہ مقام اور یہ منصب تھا لیکن انکسار کا یہ عالم کہ ایک مرتبہ چند مرید آپ سے ملنے گھر تشریف لائے، باہر کیچڑ تھی جس سے ان مہمانوں کے جوتے خراب تھے، جب یہ لوگ کمرے میں تھے تب ڈاکٹر صاحب نے باہر جا کر خاموشی سے مہمانوں کے جوتے دھو کر خشک ہونے کے لیے فرش پر دیوار کے سہارے سے رکھ دیے۔ یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے مریدوں کی تعداد تو بلاشبہ لاکھوں میں ہے۔ شاگردوں پر بھی مہربانی کی ایسی بارش بدستور جاری رہتی، ایک مرتبہ ایک شاگردہ کے پاس فیس جمع کرانے کے لیے پیسے نہیں تھے جب ڈاکٹر صاحب کو معلوم ہوا تو آپ نے کلاس سے سب بچیوں کی فیس اپنی تنخواہ سے جمع کرادی اور اس شاگردہ سے کہا اگر میں صرف آپ کی فیس دیتا تو مناسب نہیں تھا سب کو معلوم ہوتا کہ آپ کی مدد کی گئی ہے۔ پھر یہ بھی تو ہے کہ باقی بچیاں بھی تو میری بیٹیاں ہیں۔ ہوگی کسی میں ایسی شفقت اور ایسی محبت۔

ستمبر کا مہینا بھی ڈاکٹر صاحب کی زندگی میں کچھ کرشمہ ساز رہا ہے۔ ۲۳ ستمبر ۱۹۱۲ء کو آپ پیدا ہوئے، ستمبر ہی میں شاطبی شریف مکمل فرمائی، ۱۹ ستمبر ۱۹۳۷ء کو آپ نے اپنے کالج میں پہلا مباحثہ منعقد کرایا۔ ۲۵ ستمبر ۱۹۳۷ء کو آپ نے پہلا مشاعرہ منعقد کرایا، ۱۷ ستمبر ۱۹۴۰ء کو آپ نے پہلی مرتبہ کسی پروگرام کی صدارت کی، ۲۳ ستمبر ۱۹۵۶ء کو آپ کی والدہ کی وفات ہوئی، ۲۳ ستمبر ۱۹۷۶ء کو آپ کی ملازمت کا آخری دن تھا، ۷ ستمبر ۱۹۹۸ء کو آپ کی تاج پوشی ہوئی، ستمبر ۲۰۰۳ء کو آخری بار معتقدین کو بیعت کیا، ۲۳ ستمبر ۲۰۰۴ء کو آخری انٹرویو شائع ہوا، اور ۲۵ ستمبر ۲۰۰۵ء اتوار، مطابق ۲۰ شعبان المعظم ۱۴۲۶ھ کو یہ عظیم بابِ علم وادب، محترم مدرسہ شریعت وطریقت ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاںؒ کی آنکھوں کے ساتھ بند ہوگیا۔

الاقرباء نے اپنے اداریے میں یہ صحیح لکھا:

''ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاںؒ کا سانحہ ارتحال اردو زبان وادب میں ایک عہد کے اختتام کا

مظہر سہی لیکن ان کی ضیابار شخصیت اور خسروافروز ورثہ علمی کا فیضان ایسے ان گنت چراغ روشن کر گیا جن سے علم وادب کے آفاق منور ومستنیر ہو چکے ہیں''۔

آپ کے جنازے میں بلاشبہ لاکھوں افراد کا اجتماع تھا، حضرت کے پیر، حضرت زوّار حسین شاہ صاحب کے فرزند مولانا فضل الرحمٰن صاحب نے نمازِ جنازہ پڑھائی اور بعد از مغرب علم وعرفان کے آسمان کو ''المصطفٰے ٹرسٹ'' میں مسجدِ غفوریہ کے صحن میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔

علم و عرفان کی ضیاء تھے آپ
حق تو یہ ہے کہ حق نما تھے آپ
میرے مرشد جہاں کے مرشد
مظہرِ نورِ مصطفٰےؐ تھے آپ

☆☆☆

علامہ غلام مصطفٰے قاسمی

آغا نور محمد پٹھان

پیدائش: 24 جون 1924ء–وفات: 9 دسمبر 2003ء

علامہ غلام مصطفٰے قاسمی بیسویں صدی کے اعلیٰ مرتبت جید عالم دین، مفسر قرآن، مؤرخ، ادیب اور محقق تھے اور ہماری آئندہ نسلوں کے لیے مشعل راہ کے طور پہ یاد رکھے جائیں گے۔ انہوں نے تفسیر، حدیث، فقہ، ادب، معانی ومنطق، تواریخ ولغت کے میدان میں اپنے دوَر کے بڑے بڑے علماء اور دانشوروں میں بے مثل اور بے نظیر تھے۔ وہ بیک وقت عربی، فارسی، اردو، سندھی اور انگریزی زبانوں میں دسترس رکھتے تھے۔ انہوں نے ادیبوں، دانشوروں اور محققین کی کئی نسلیں تیار کیں۔ سماجی علوم میں سندھ کے 80 فیصد پی۔ایچ۔ڈی اسکالرس ان کے فیض یافتہ ہیں۔ دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہونے کے بعد انہوں نے سندھ میں 60 سال تک درس وتدریس کے سلسلے کو جاری رکھا اور "اطلبوا العلم من المهد الياللحد" کے فرمان رسولؐ کے مطابق ساری زندگی علم کے حصول اور تدریس وتحقیق میں گذاری۔ علامہ قاسمی صاحب نہایت ہی شگفتہ مزاج، شفیق، مرنجان مرنج، عابد، زاہد اور صاف گو شخصیت کے مالک تھے۔ علوم شریعت، طریقت، تفسیر، حدیث، تاریخ، لغت اور ادب کے متعلق کوئی بھی الجھا ہوا مسئلہ ہوتو آپ اس کے ہر موضوع پر بے تکلفانہ اور آسانی سے عالمانہ انداز میں گفتگو کرتے تھے جو طالب علموں کو آسانی سے سمجھ آجاتا تھا۔ علامہ کی ولادت بالائی سندھ کے ضلع لاڑکانہ کی تحصیل میرو خان کے گوٹھ "رئیس بھنبھو خان" میں 1335ھ/ 1916ء میں حافظ محمود خان چانڈیو کے گھر میں ہوئی۔ ان کے والد بزرگوار خود بھی بڑے جید عالم اور حافظ قرآن تھے اور قادری سلسلے میں اپنے استاد مولانا غلام صدیق شہداد کوٹی جو

اپنے زمانے کے ولی کامل اور صاحب حال وقال سے بیعت تھے، سندھ کے قدیم اور مشہور چانڈیو قبیلے سے ان کا تعلق۔ علامہ صاحب نے ابتدائی تعلیم اپنے آبائی گاؤں میں حاصل کی اور آخری مراحل میں برصغیر کے مشہور دارالعلوم دیوبند گئے جہاں 3 سال کے عرصے میں تمام دینی علوم میں فارغ التحصیل ہوئے۔ اس وقت دارالعلوم دیوبند سیاسی فکر اور تحریک آزادی کی جدوجہد میں ایک اہم مرکز تھا۔ اسی طرح علامہ موصوف فاضل دیوبند، مولوی فاضل اور فاضل طب وغیرہ کی بھی علمی لیاقتیں حاصل کیں۔ ان کے اساتذہ میں نامور علماء حضرت مولانا محمد ابراہیم بلاوی، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا اصغر حسین، مولانا اعجاز علی اور مولانا عبیداللہ سندھی کے اسماء گرامی شامل ہیں۔ انہوں نے دوران تعلیم دہلی کے مشہور اورینٹل کالج میں بھی داخلا لیا اور طب میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے دہلی میں مولانا حکیم جمیل الدین نگینوی کے مشہور طبی کالج میں داخلہ لیکر امتیازی حیثیت میں علم طب میں حکیم الحکماء کی سند حاصل کرنیکے بعد سندھ واپس آئے اور پیر جھنڈو میں مولانا عبیداللہ سندھی سے قرآن مجید اور شاہ ولی اللہ کے فلسفے کو پڑھا۔

علامہ صاحب نے اس کے بعد سندھ کے مشہور دینی مدارس میں درس وتدریس کا سلسلہ جاری رکھا اور سب سے پہلے لاڑکانہ میں بھٹو خاندان کی امداد سے چلنے والے مدارس مدرسہ دارالسعادت اور بیت الحکمت میں پڑھایا۔ اس کے بعد کراچی میں مدرسہ مظہرالعلوم کھڈہ (کھڈو) کراچی اور گھوٹکی میں مدرسہ قاسم العلوم میں بحیثیت شیخ الحدیث پڑھاتے رہے۔ وہ جہاں بھی رہے ہمیشہ طالب علموں کی ایک بہت بڑی جماعت ان کی شاگردی میں حاضر رہتی تھی اور وہ اپنے علمی فیض و برکت سے انہیں آخری حد تک کمال پر پہنچاتے تھے۔ سابق وائس چانسلر سندھ یونیورسٹی اور وفاقی وزیر تعلیم پروفیسر غلام مصطفیٰ شاہ جو خود ایک مردم شناس شخص تھے، وہ علامہ صاحب کی علمیت اور ذہانت سے متاثر ہوکر 1953ء میں انہیں سندھ مسلم کالج کراچی میں علوم اسلامیہ کا لیکچرار مقرر کیا اور بعد میں انہیں سندھ یونیورسٹی میں اعزازی پروفیسر کا منصب ادا کر کے مختلف شعبہ جات میں پی۔ ایچ۔ ڈی کا سپروائزر مقرر کیا۔ مولانا نے بعد میں شاہ ولی اللہ کے فلسفے اور تعلیمات کو عام کرنے کیلیے حیدرآباد میں شاہ ولی اللہ اکیڈمی قائم کی اور ان کے وہ بانی ڈائریکٹر بنے، جہاں انہوں نے 40 سال تک شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے فلسفے کو عام کرنے میں صرف کیے اور اس کی تعلیم کو

پاکستان میں عام کرنے کے لیے بڑی جدوجہد کی اور ان کی کئی کتابوں کے سندھی اور اردو تراجم کروا کے شائع کیے، اور دو ماہوار رسائل "الرحیم (سندھی)" اور "الولی (اردو)" میں شائع کرتے رہے۔ شروع کے زمانے میں ان کے سینکڑوں مضامین اس وقت کے مشہور ہفت روزہ اور روزناموں میں مضامین شائع ہوتے رہے جو ان کی تبحر علمی کی لازوال مثال ہے۔ جب ترکی کی خلافت کا خاتمہ ہوا تو سندھ کے سیاستدانوں اور علماء نے تحریک خلافت میں اپنی سرگرمیوں کا آغاز کیا۔ اس زمانے میں روزنامہ الوحید جو ترکی کے سلطان عبدالوحید کے نام پر جاری کی گئی تھی، اس میں علامہ صاحب مسلسل لکھتے رہے۔ سندھ کے صوفیاء کے سرتاج شاہ عبداللطیف بھٹائی کے کلام سے بھی ان کی بڑی رغبت اور عقیدت رہی۔ شاہ صاحب کی شاعری پر مختلف موضوعات کی صورت میں کئی قیمتی مقالات اور مضامین لکھے۔ شاہ جو رسالو کو مرتب کرنے اور مشکل الفاظ کی معنیٰ اور شرح لکھنے کا انہیں اعزاز بھی حاصل ہے۔ اسی طرح علامہ قاسمی صاحب کی شخصیت ہمہ گیر علمی حیثیت کا درجہ رکھتی ہے جو بیسویں صدی میں پروردگار کی طرف سے ایک تحفہ ہے۔ سندھ یونیورسٹی میں ان کے نام پر مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی چیئر بھی قائم کی گئی ہے جس کے سربراہ معروف ادیب، افسانہ نگار، ناول نویس اور اسکالر قاضی خادم مقرر ہیں۔ جس نے مولانا قاسمی کی علمی ادبی خدمات پر کئی کتاب شائع کروائے ہیں۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی کے حوالے سے ان کی بڑی خدمت ان کے رسالے کی نئی ترتیب اور شرح ہے جو سب سے پہلے 1951ء میں جھونا مارکیٹ کراچی سے شائع ہوا اور 2008ء میں مہران اکیڈمی شکارپور نے نئے سرے سے شائع کیا ہے۔ یہ رسالا ڈاکٹر گربخشانی کی ترتیب کے بعد اپنی نوعیت کا منفرد رسالا ہے جو لطیفیات کی تحقیق کے حوالے سے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ قاسمی صاحب سندھی ادبی بورڈ جو سندھ کا ایک قدیم ادبی ادارہ ہے، مخدوم طالب مولیٰ کے بعد اس کے 11 سال تک چیئرمین رہے اور اس ادرہ کو اپنی علمی خدمات سے منور کیا اور ان کا خاص کارنامہ فارسی زبان کا برصغیر میں اولین ترجمے کی ادارت اور اشاعت ہے جو شاہ ولی اللہ سے دوسؤ سال پہلے مخدوم نوح سرور ھالائی نے کیا تھا۔ علامہ صاحب نے اس ترجمے پر اپنا عالمانہ تحقیقی پیش لفظ لکھ کر شائع کروایا جو پاکستان کے لیے اور بالخصوص اہل سندھ کے

لیے انتہائی باعث افتخار ہے۔ انہوں نے سندھی زبان میں بھی بڑی سہل اور آسان سندھی میں مولانا محمد مدنی کا قرآن پاک کا سندھی محاوراتی ترجمہ شائع کروایا۔ قرآن پاک کی کئی صورتوں کی تفسیر الھام الرحمان فی تفسیر القرآن کی صورت میں لکھی جو تین جلدوں میں شائع ہوئی۔ سندھی زبان کی جامع لغت پر اپنا تحقیقی مقدمہ لکھا۔ "سماجی انصاف اور اجتماعیت شاہ ولی اللہ کی روشنی میں" کتاب لکھی، یہ ان کی غیر فانی خدمات ہیں۔ مولانا مرکزی رویت ہلال کمیٹی پاکستان کے چیئرمین بھی رہے، اس کے علاوہ مندرج ذیل اداروں میں بحیثیت چیئرمین اور میمبر خدمات اور ذمہ داریاں ادا کرتے رہے۔

1۔ چیئرمین سندھی ادبی بورڈ، جام شورو، 2۔ ڈائریکٹر شاہ ولی اللہ اکیڈمی، حیدرآباد، 3۔ سندھ میوزم، حیدرآباد، 4۔ انسٹی ٹیوٹ آف سندھالوجی، جام شورو، 5۔ ڈاکٹر داؤد پوتہ سندھ پروونشل لائبریری، حیدرآباد، 6۔ مہران آرٹس کاؤنسل، حیدرآباد، 7۔ میمبر مرکزی سیرت کمیٹی، اسلام آباد، 8۔ میمبر بورڈ آف گورننس اقبال اکیڈمی، لاہور، 9۔ اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد۔

قاسمی صاحب کی رہنمائی میں جن اسکالرز نے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی ان کے اسمائے گرامی مندرجہ ذیل ہیں:

1۔ ڈاکٹر میمن عبدالمجید سندھی، 2۔ ڈاکٹر سید محمود شاہ بخاری، 3۔ ڈاکٹر عبدالکریم سندیلو، 4۔ ڈاکٹر ایاز حسین قادری، 5۔ ڈاکٹر غلام علی الانا، 6۔ ڈاکٹر عبدالجبار جونیجو، 7۔ ڈاکٹر عبدالجبار مغل، 8۔ ڈاکٹر عبدالجبار عابد لغاری، 9۔ ڈاکٹر عبدالخالق ناز، 10۔ ڈاکٹر محمد جمن ٹالپر، 11۔ ڈاکٹر سید محمد صالح شاہ، 12۔ ڈاکٹر شمس الدین عرسانی، 13۔ ڈاکٹر عزیز اللہ میمن، 14۔ ڈاکٹر آپا شمس عباسی، 15۔ ڈاکٹر میمن عبدالغفور سندھی، 16۔ ڈاکٹر شاہنواز سوڈھڑ، 17۔ ڈاکٹر قاضی خادم، 18۔ ڈاکٹر مظہر الدین سومرو، 19۔ ڈاکٹر حافظ نظام الدین مھر، 20۔ ڈاکٹر خان محمد لاڑک، 21۔ ڈاکٹر محمد ادریس سومرو، 22۔ ڈاکٹر محمد ادریس آزاد شامل ہیں۔

علامہ قاسمی صاحب کی کچھ معروف تصانیف کے نام مندرجہ ذیل ہیں، اس کے علاوہ کئی مضامین اور

الرحیم اور الولی کے ادارتی صفحات کے موضوعات علیحدہ ہیں جس کو ابھی تک مرتب کرنے کی ضرورت ہے:

1۔ شاہ جو رسالو، ترتیب و تحقیق، 2۔ مقدمہ جامع سندھی لغات، 3۔ سیرت طیبہ پر سندھی زبان میں لکھی گئی کتاب مٹھو مرسل؟، 4۔ الھام الرحمان فی تفسیر القرآن، 5۔ مخدوم نوح کا ترجمہ قرآن پاک (فارسی) کی ترتیب و اشاعت، 6۔ سندھی تفسیر القرآن (3 جلدوں میں)، 7۔ مفید الطلبا فی شرح تعریف الاشیاء۔

مولانا کو صدر پاکستان کی طرف سے ستارہ امتیاز کا تمغہ عطا کیا گیا اور پاکستان کے یہ نابغہ روزگار علمی شخصیت استاد الاساتذہ اور حکیم الحکماء حیدرآباد شہر میں 9 دسمبر 2003ء کو وفات پا گئے اور حیدرآباد سندھ میں غلام النبی کلھوڑو کے مزار کے احاطے میں آسودہ خاک ہیں۔

پروفیسر فتح محمد ملک

ڈاکٹر سعدیہ طاہر

پروفیسر فتح محمد ملک تلہ گنگ کے ایک چھوٹے سے گاؤں ٹہی میں ۱۸ جون ۱۹۳۶ء میں پیدا ہوئے۔ دادا چند بیگھے خود کاشت اراضی کے مالک تھے۔ ان کے والد اپنے گاؤں کے مڈل سکول میں مدرس تھے اور ساتھ ہی ساتھ گاؤں کی جامع مسجد میں پابندی سے خطبہء جمعہ دیا کرتے تھے۔ پروفیسر صاحب نے گاؤں کے سکول کے بعد تلہ گنگ کے گورنمنٹ ہائی سکول سے میٹرک کیا۔ بعدازاں گورنمنٹ کالج کیمبل پور (حال اٹک) سے بی۔اے کیا۔ بی۔اے کے دوران ہی کالج کی بزم ادب میں پہلی تحریر بعنوان ''جینئس ساتھی'' پڑھی جو بعدازاں کالج میگزین ''مشعل'' میں شائع ہوئی۔ اسی زمانے میں یومِ اقبال کی تقریب میں ایک مضمون بعنوان ''غالب غزل سے قصیدے تک'' پڑھا جو مولانا صلاح الدین احمد نے ''ادبی دنیا'' میں شائع کیا۔ اسی دور میں ایک افسانہ ''بیوپاری'' لکھا جو میاں بشیر احمد اور ناصر کاظمی کی زیرادارت رسالہ ''ہمایوں'' میں شائع ہوا تھا۔

بی۔اے کے دوران ہی منٹو پر لکھا گیا مضمون ''گنجا فرشتہ'' ادبی جریدے ''افکار'' میں شائع ہوا تھا۔ کیمبل پور اُن دِنوں اپنے انداز کا ایک علمی، ادبی اور دینی مرکز تھا۔ کالج میں ڈاکٹر غلام جیلانی برق اور پروفیسر محمد عثمان کی سی شخصیات پڑھا رہی تھیں۔ ان اساتذہ کرام کی رہنمائی پروفیسر فتح محمد ملک کو حاصل رہی۔ خود پروفیسر صاحب کا کہنا ہے کہ ان اساتذہ کا ان کی علمی اور ادبی تربیت میں نمایاں کردار ہے۔

بی۔اے کرنے کے بعد گارڈن کالج راولپنڈی سے اردو زبان میں ایم۔اے کیا۔ یہاں

پروفیسر صفی احمد دانش اور مختار صدیقی جیسے اساتذہ سے اثر پذیر ہوئے۔ گورڈن کالج میں تعلیم کے دوران وہ روزنامہ ''تعمیر'' میں صحافیانہ خدمات انجام دیتے رہے۔ اُس زمانے میں پروفیسر صاحب کے کالج (کیمبل پور) کے زمانے کے دوست منو بھائی اور شفقت تنویر مرزا بھی ''تعمیر'' میں کام کر رہے تھے۔ ایم۔اے کے دوران ہی ادبی تحریروں کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ پروفیسر صاحب اپنے اُردو کے اساتذہ کے ساتھ ساتھ پروفیسر خواجہ مسعود سے بھی متاثر رہے۔ ایم۔اے میں کامیابی کے بعد وہ راولپنڈی کے پوسٹ گریجوایٹ کالج میں اُردو زبان وادب کے لیکچرر ہوگئے۔ چند برس بعد وہ یہاں سے قائداعظم یونیورسٹی، اسلام آباد کے شعبہ پاکستانیات میں خدمات انجام دیتے رہے۔ اسی دوران انہیں جرمنی کی ہائیڈل برگ اور برلن یونیورسٹیوں میں بطور اقبال پروفیسر کام کرنے کا موقع میسر ہوا۔ پیشتر ازیں اُنہیں نیویارک کی کولمبیا یونیورسٹی اور بعدازاں پینسل وینیا یونیورسٹی میں بھی ایک ایک سمسٹر پڑھانے کا موقع ملا۔

قائداعظم یونیورسٹی سے ریٹائرمنٹ کے بعد وہ متقدرہ قومی زبان کے چیئرمین مقرر کر دیئے گئے۔ چند برس بعد یہاں سے مستعفی ہوکر بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد میں ریکٹر تعینات کر دیئے گئے۔ اِن تمام درسی اور انتظامی مصروفیات کے دوران وہ ادبی تنقید کے میدان میں سرگرمِ عمل رہے۔ اب تک انہوں نے اقبالیات، لسانیات اور ادبیات کے مختلف موضوعات پر دو درجن کے قریب کتابیں تصنیف کی ہیں۔ اُن کے پہلے مجموعہ مقالات ''تعصّبات'' کا خیر مقدم کرتے ہوئے ڈاکٹر سید عبداللہ نے مجلّہ ''فنون'' میں لکھا تھا کہ:

''تعصّبات'' میں ہمیں ایک نیا ادبی مسلک صاف صاف ابھرا ہوا نظر آتا ہے جو ترقی پسندی کے ساتھ مسلمان ہونے یا کہلانے سے شرمندہ نہیں ہوتا اور اسلامی اقدار وتہذیب کے احترام کے ساتھ ساتھ ترقی کو زندگی کا پہلا عقیدہ قرار دیتا ہے۔ یہ اسی ادبی وتہذیبی روایت کی بازیافت کی کوشش ہے جس کے نقوش مٹائے جا رہے ہیں۔ یہ روایت کبھی تھی اور مشرق ومغرب دونوں اس کی ضیاؤں سے تابندہ تھے۔ دورِ حاضر میں اقبال اُس روایت کے آفتاب تاباں تھے اور اب بھی یہ فکر کسی روشن مستقبل کی ضمانت بن سکتی ہے۔ ''تعصّبات'' کا بڑا حصہ شعر اقبال کی توضیح اور فکر اقبال کی مدافعت کے لئے وقف ہے اور حق یہ ہے کہ تلہ گنگ کے اس ادب شناس سپاہی نے مسلمانانِ عالم کے ادبی مرشد نے اقبال کی روایت کے تحفظ کیلئے تیغ وسنان وشمشیر وخنجر کسی چیز سے دریغ

نہیں کیا اور اسے اگر کوئی ادبی جہاد یا ادب کی مقدس جنگ کہہ دے تو یہ مبالغہ نہ ہوگا'' (فنون، جون ۱۹۷۳)

پروفیسر فتح محمد ملک از اول تا ایں دم اسی نقطۂ نظر سے لکھتے چلے آرہے ہیں۔ اب تک ان کی متفرق مقالات پر مشتمل نصف درجن سے زیادہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ اقبالیات پر اُن کی کتابیں درج ذیل ہیں:

۱۔ اقبال فکر و عمل

۲۔ اقبال کا فکری نظام اور پاکستان کا تصور

۳۔ اقبال فراموشی

۴۔ اقبال، اسلام اور روحانی جمہوریت

۵۔ ThoughtPoliticalMuslim

۶۔ IdealPolitical&SocialIqbal

منتشر ادبی مقالات پر مشتمل کتابوں کے علاوہ عہدِ حاضر کے درج ذیل سرکردہ شاعروں اور ادیبوں پر اُن کی کتابیں یہ ہیں:

۱۔ ن۔م۔ راشد: سیاست اور شاعری

۲۔ فیض احمد فیض: شاعری اور سیاست

۳۔ احمد ندیم قاسمی: شاعر اور افسانہ نگار

۴۔ ندیم شناسی

۵۔ احمد فراز: نغمہ دلدار یا شعلہ بیدار

۶۔ سعادت حسن منٹو: ایک نئی تعبیر

۷۔ انتظار حسین کا خواب نامہ

۸۔ انجمن ترقی پسند مصنفین، پاکستان میں

متقدرہ قومی زبان سے وابستگی کے زمانے میں پروفیسر فتح محمد ملک نے اُردو زبان کے فروغ کے لئے بے پناہ مساعی انجام دی ہیں۔ اس زمانے میں انہوں نے وقتاً فوقتاً جو مضامین لکھے ان کا مجموعہ بعنوان ''اردو زبان ہماری پہچان'' آج کل زیرِ اشاعت ہے۔ اِن مضامین میں انہوں نے

پاکستان کے ہر خطے میں بولی جانے والی زبانوں سے اردو کے تخلیقی روابط کو بطورِ خاص پیشِ نظر رکھا ہے۔

جس زمانے میں فتح محمد ملک اُردو زبان و ادب کی تنقیدی دُنیا میں وارد ہوئے تھے ہمارے ہاں اُس زمانے کا ادب، ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کے دو دبستانوں سے منسلک تھا اور فرائڈ اور مارکس کے نظریات سے متاثر تھا۔ ایسے میں مسلمانوں کی ادبی روایت سے وابستگی کو پذیرائی حاصل نہ تھی۔

تحریکِ پاکستان کے دوران ہمارے ادیب دو گروہوں میں بٹ کر رہ گئے تھے۔ ڈاکٹر محمد دین تاثیر، فیض احمد فیض اور احمد ندیم قاسمی تحریک پاکستان کی حمایت میں ادبی، صحافتی اور سیاسی محاذوں پر سرگرم تھے تو سجاد ظہیر کی قیادت میں ادیبوں کی اکثریت اس تحریک کی مخالفت پر کمر بستہ تھی۔ قیام پاکستان کے بعد یہ نظریاتی مخالفت جاری رہی۔ علمی، ادبی اور تہذیبی سطح پر اس مخالفت کا مرکزی ہدف علامہ اقبال تھے اس صورتحال کا تجزیہ پروفیسر فتح محمد ملک کے مضمون ''اقبال کے خلاف ردِعمل کیوں'' میں کیا گیا ہے۔ اشتراکی اور سیکولر ادیب قیام پاکستان کو تقسیم اور بٹوارا کے سے اسمائے صفت میں یاد کرتے رہے۔ اُن کے نزدیک طلوع آزادی کی سب سے بڑی دین فسادات ہیں۔ چنانچہ قیام پاکستان کے ستر سال بعد بھی اُن کا محبوب موضوع فسادات کا ادب ہے۔ اس موضوع پر تخلیق کیا گیا ادب تحریک پاکستان کے محرکات و مقاصد کو نظر انداز کرتا دکھائی دیتا ہے۔

ترقی پسند نقادوں کے اس نظریے کی تردید کی بہترین مثال سعادت حسن منٹو ہیں۔ قیام پاکستان کے وقت سعادت حسن منٹو بمبئی کی فلمی دنیا میں خوشی اور خوشحالی کی زندگی بسر کر رہے تھے مگر اگست ۱۹۴۷ء کے بعد اُن کے ہندو دوستوں کے رویے میں خوفناک تبدیلیاں رونما ہونے لگیں۔ بمبئی شہر کی زندگی مسلمانوں پر تنگ ہونے لگی۔ نتیجہ یہ کہ وہ اپنے خاندان کے ہمراہ لاہور آ پہنچے جہاں اُن کی افسانہ نگاری نے تیزی کے ساتھ عروج کی منزلیں طے کیں۔ پروفیسر فتح محمد ملک نے سعادت حسن منٹو کے اس جذبے کو اپنی کتاب ''منٹو: ایک نئی تعبیر'' میں خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔

اشتراکی روس میں اقبال کی اہمیت تسلیم کئے جانے کے بعد برصغیر کے ترقی پسندوں کی آنکھیں کھلیں اور وہ بھی اقبال کی تحسین میں رطب اللسان ہو گئے۔ اس صورتحال کا تجزیہ فتح محمد ملک

کی کتاب ''اقبال کے خلاف ردِعمل کیوں'' کے پہلے باب میں پیش کیا گیا ہے۔ چند سال بعد اقبال کے خلاف ایک نیا ردِعمل سامنے آیا۔ صدر ضیا الحق کی اسلامائزیشن کے دور میں اسلام کے نام پر ملائیت کا تسلط قائم کر دیا گیا۔ اقبال نے اپنی شاعری اور نثری تحریروں میں ملائیت کو اسلام کی حقیقی روح کی بازیافت کے عمل میں سب سے بڑی رکاوٹ قرار دیا ہے۔ دین، ملا فی سبیل اللہ فساد، آج ملائیت کے ترجمانوں کو فکر اقبال سے خطرہ درپیش ہے۔ یہ موضوعات و مباحث پروفیسر فتح محمد ملک کی کتاب ''اقبال فراموشی'' اور ''اقبال، اسلام اور روحانی جمہوریت'' میں زیر بحث لائے گئے ہیں۔

انہوں نے اپنی انگریزی تصنیفات میں بھی اقبال کی تعلیمات سے اسلام کی حقیقی، انقلابی روشنی لی ہے۔ اپنی انگریزی تصنیفات میں بھی انہوں نے علامہ اقبال کے اجتہادی افکار کو موضوعِ بحث بنایا ہے۔ ان کا نقطہ نظر یہ ہے کہ اقبال نے اپنی انگریزی تصنیفات میں قدیم و جدید مفکروں کے افکار کی روشنی میں جو اصلاحی اور تجدیدی پروگرام پیش کیا ہے اس پر عمل پیرا ہونے سے ہی پاکستان اور مسلمان ملک زوال کی لپیٹ سے نکل کر ترقی اور تجدید کی راہوں پر گامزن ہو سکتے ہیں۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

خواجہ رضی حیدر

گزشتہ نصف صدی پر محیط عملی زندگی میں لاتعداد نام آور اہلِ علم سے نیاز و تعلق کا شرف حاصل ہوا لیکن ان میں سے چند ہی افراد ایسے ہیں جن کی یاد ہمہ وقت ذہن میں تازہ رہتی اور علمی طور پر کچھ کر گزرنے کی دعوت دیتی رہتی ہے۔ ان ہی افراد میں سے ایک فردِ فرید ڈاکٹر فرمان فتح پوری تھے۔ درس و تدریس اور علم و اَدب کی منفرد اور بے مثال شخصیت۔ بنیادی طور پر ڈاکٹر فرمان فتح پوری ایک استاد تھے، لیکن انہوں نے اپنی دیگر تخلیقی صفات کو اس انداز سے مرتب و مہمیز کیا تھا کہ وہ جب تک زندہ رہے اردو اَدب کے ایک رول ماڈل، یا لیونگ لیجنڈ کے طور پر پہچانے گئے۔ انہوں نے درس و تدریس کو اپنے روز و شب کا مقصد قرار دیا تھا لہٰذا چار نسلوں کی علمی و اَدبی تربیت کی۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اردو ادب کے حوالے سے تحقیق و تنقید میں اس تحقیق و تنقید میں اس سعی بلیغ کا مظاہرہ کیا کہ ان موضوعات پر نہ صرف ساٹھ سے زائد کتابیں تصنیف و مرتب کیں بلکہ قدما کے حوالے سے ایسے مخطوطات و ابیات کو عام کیا جن کی طرف اس سے قبل کسی نے توجہ نہیں دی تھی۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی ان علمی کاوشوں کے نتیجہ میں اردو ادب کے دامن میں موجود قدیم و جدید سرمائے کو جہاں بہتر تعارف میسر آیا وہاں ان تخلیقات کی تفہیم جدید کے دور کا بھی آغاز ہوا۔

یہی نہیں بلکہ انہوں نے درس و تدریس کے پیشے کو اس دور میں اپنی فضیلتِ علمی، سیر چشمی اور درویشی سے معزز کیا۔ ان کے شاگردوں کی تعداد کئی ہزار سے زائد تھی بلکہ یہ کہا جائے تو بے جا نہیں ہوگا کہ جس زمانے زمانے میں وہ جامعہ اردو سے وابستہ تھے تو اسی زمانے میں ان کے کئیشا گرد جامعہ کراچی کے شعبہ اردو سے وابستہ تھے تو اسہ زمانے میں ان کے کئی شا گرد جامعہ

کراچی سے بحیثیت استاد نہ صرف وابستہ ہو گئے تھے بلکہ وہ فرمان صاحب کی عزت وتوقیر میں کوئی کمی اٹھا نہیں رکھتے تھے۔ جامعہ کراچی پر ہی منحصر نہیں دیگر علمی شعبہ جات اور مختلف دفاتر میں ان کے شاگرد اپنی صلاحیتوں کا سکہ جمائے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی اپنے شاگردوں سے شفقت اور محبت مثالی تھی۔ وہ کلاس میں بھی اور کلاس سے باہر بھی ایک شگفتہ مزاج استاد کے طور پر ظاہر ہوتے تھے۔ طالب علم بھی ان سے محبت کیا کرتے تھے اور زمانہ طلاب علمی کے بعد بھی ان کی خدمت میں حاضر ہونا باعثِ سعادت تصور کرتے تھے۔ اپنی اسی خوبی کی بناء پر فرمان صاحب تمام عمر استاذ الاساتذہ کے منصب پر فائز رہے۔ انہوں نے متعدد طالب علموں کو ڈاکٹریٹ کروائی اور اردو لغت بورڈ کے مدیر اعلیٰ کی حیثیت میں اردو لغت سازی میں وہ کارنامہ انجام دیا کہ اردو کے ساتھ ان کا نام لازم ملزوم ہو گیا۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا اصل نام سید دلدار علی تھا اور ان کی پیدائش 26 جنوری 1926 کو فتح پور (ہسوہ) یوپی میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم اپنے آبائی شہر میں حاصل کی اور 1950 میں آگرہ یونیورسٹی سے بی اے کیا۔ بھارت سے پاکستان آنے کے بعد اسکول میں ملازمت اختیار کی اور اسی دوران ایل ایل بی، بی ٹی کی اسناد حاصل کیں۔ 1958 میں کراچی یونیورسٹی سے فرسٹ کلاس فرسٹ پوزیشن کے ساتھ اردو میں ایم اے کیا اور یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں لیکچرار مقرر ہوئے۔ 1964 میں اردو کی منظوم داستانوں پر تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ 1974 میں ''اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری'' نامی کتاب پر کراچی یونیورسٹی نے ان کو ''دی لٹ'' کی ڈگری تفویض کی۔ دریں اثنا ان کی خدمات اردو ڈکشنری بورڈ کے لیے حاصل کی گئیں اور انہوں نے تسرلیس کے ساتھ ہی ساتھ لغت سازی کی اہم خدمات انجام دیں۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے علمی وادبی مجلّہ ''نگار پاکستان'' کی تقریباً پچاس سال ادارت کے فرائض انجام دیے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی تحقیق وتنقید کے موضوعات بھی بہت اور وقیع ہیں۔ انہوں نے جہاں اردو کے قدیم تذکروں پر کام کیا وہاں شاعری کے حوالے سے قصائد مثنویوں کی بھی تشریح جدید کی۔ تحقیق وتدقیق کے بعد ان موضوعات کو نئی نسل کے لیے قابلِ فہم بنایا تاکہ علمی وتحقیقی روایت کا مستقبل میں بھی سلسلہ جاری رہے۔ تصانیف کے علاوہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے جہاں

بے شمار تخلیقی مقالات لکھے وہاں انہوں نے عام فہم انداز مین ادبی موضوعات کی تفہیم جدید پر بھی بھر پور توجہ دی۔ وہ عموماً فرمایا کرتے تھے کہ فارسی کا مذاق روز بروز معدوم ہوتا جا رہا ہے جب کہ اردو زبان، فارسی کی ''ماں جائی'' ہے ایسی صورت میں ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو کی ترویج وتفہیم کے لیے فارسی ماخذات کو ایسے طرز پر متعارف کرایا جائے کہ اردو دان طبقہ میں اس حد تک فارسی کا فہم پیدا ہو سکے کہ وہ با آسانی اردو میں جہاں فارسی تذکروں اور ابیات سے استفادہ کے سکے وہاں فارسی لفظیات وتراکیب سے اردو کے اظہاری دامن کو بھی کشادگی میسر آ سکے۔ شاید ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی انہی کاوشوں اور خوبیوں کے پیشِ نظر مشفق خواجہ نے ایک مضمون مین ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ''فرمان صاحب اپنے ادبی موضوعات اور رویوں کی بناء پر قدیم و جدید کا ایک ایسا امتزاج ہیں جس کی مثال دور ونزدیک کہیں نہیں ملتی'' ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے جہاں قدیم موضوعات وتخلیقات کی گرہ کھولی وہاں انہوں نے جدید ادب کو بھی بہت اہمیت دی۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں وہ میر تقی میر اور میر حسن کی مثنویوں سے کام تعلق رکھتے تھے وہاں وہ دور جدید کے ادیبوں اور شاعریں کی تخلیقات پر بھی بھر پور انداز سے اظہارِ خیال کیا کرتے تھے۔ اس ضمن میں ایک بات اور قابلِ توجہ ہے اور وہ یہ کہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے جہاں زبان وبیان کی تہذیب پ توجہ دی وہاں انہوں نے عالمی ادب سے اردو میں در آنے والے دجحانات اور رویوں کی بھی ایسے طور پر جانچ پڑتال کی کہ اردو داں طبقہ پر ان کی افادیت اور مضرات واضح ہوئے۔ مثال کے طور پر نثری نظم، ہائیکو اور بابعد جدیدیت جیسے موضوعات پر ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے مضامین تحقیق و تدقیق کی بہترین مثال ہیں۔

علامہ اقبال کی فکر وشاعری کے بارے میں بھی ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی تفہیم بڑی فکر انگیز اور نادر ہے۔ انہوں نے علامہ اقبال پر بہت کچھ لکھا ہے، کتابی صورت میں بھی اور مقالات کی صورت میں بھی۔ ان کی یہ تمام تحریریں جہاں علامہ اقبال سے ان کی گہری عقیدت کی ترجمان ہیں وہاں علامہ اقبال کے فکری پہلوؤں کی بھی موثر غماز ہیں۔ وہ علامہ اقبال کو پیغامبر عشق تصور کرتے تھے اور کہتے تھے کہ علامہ اقبال کا عشق الہامی اور نعمتِ ازلی ہے۔ عشق کی جیسی سرشاری اور بلندی علامہ اقبال کے یہاں ارزاں ہے، وہ اتنی بھر پور قوت کے ساتھ اردو کے شاعر کے ہاں موجود نہیں ہے۔ اسی لیے علامہ اقبال نے عقل ودل اور نگاہ مرشدِ اولین عشق کو قرار دیا ہے۔ وہ عشق کو مومن

سے اور مومن کو عشق سے مشروط تصور کرتے ہیں۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے ہاں عشق کی تفہیم دراصل ان کے تاریخی شعور سے وابستہ ہے۔ وہ عشق کے مختلف تقاضوں اور عوامل کو تاریخ کے آئینے میں دیکھ کر ان کی گہرائی اور گیرائی تک رسائی حاصل کرتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اقبالیات کے موضوع پر بہت کام ہوا ہے لیکن اس میں سے بیشتر کام تخلیقی یا بدیعی نہیں ہے بلکہ عموماً انہی خیالات و تجزیوں کو دہرا دیا گیا ہے جو پہلے اظہار پا چکے تھے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے علامہ اقبال پر جو کچھ لکھا ہے وہ انہی کے فکری اظہار سے مخصوص ہے اور علامہ اقبال کی تفہیم میں بے حد معاون ہے۔

علامہ اقبال سے ہٹ کر حضرت امیر خسرو، میر تقی میر، غالب، داغ، امیر مینائی، حسرت موہانی اور دیگر شعراء کے بارے میں بھی ڈاکٹر فرمان کے مقالات نئے تفہیمی زاویے لیے ہوئے ہیں، خصوصاً مرزا غالب کے حوالے سے انہوں نے جو تحقیقی کام کیا ہے وہ بھی بہت اہم ہے۔ ان کے مقالات ہوں یا کتب سب میں مرزا غالب کو ایک بئے تناظر میں دیکھا گیا ہے۔ خصوصاً ڈاکٹر صاحب کے مقالات پر مشتمل مجموعہ ''غالب شاعرِ امروز و فردا'' میں شامل موالات آج بھی غالب کے شعری اوع شخصی زاویوں پر سند کا درجہ رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ نعتِ رسولِ مقبول ﷺ کے حوالے سے بھی ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے جو تحقیقی کام کیا ہے وہ توصیفی ہونے کے باوجود اس قدر تخلیقی نوعیت کا ہے کہ اس کام کو نعت کے موضوع پر بنیادی کام قرار دیا جا سکتا ہے بلکہ نعت کے حوالے سے کسی تحقیقی کام میں اس سے صرفِ نظر ممکن نہیں ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری اپنے تخلیقی اظہار میں کسی گھر بند نہ تھے۔ ان کے تحقیقی اور تخلیقی کاموں کا حجم بہت وقیع و وسیع ہے۔ ان کے ہاں موضوعات کی فراوانی ضرور ہے لیکن اس فراوانی کے آئینے میں ان کا تحقیقی و تنقیدی وجود مسلسل جلوہ گر رہتا ہے۔ میں نے جب ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی تحریر کا مطالعہ کیا تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ وہ بنیادی طور پر ایک استاد تھے اور ان کو ہر لمحہ اپنی اس اساسی حیثیت کا احساس رہتا تھا اس لیے وہ اپنی تحریروں میں بھی بحیثیت ایک استاد تفہیمی ضرورت کو پیشِ نظر رکھتے تھے۔ چنانچہ ان کی تمام تحریریں مطالعاتی کشش کے ساتھ سرعتِ تفہیم کی بھی نمائندہ ہیں۔ انہوں نے ادق سے ادق موضوعات کو تفہیمی حوالے سے اس قدر سہل و آسام کر دیا ہے کہ این عام آدمی بھی ان تحریروں سے با آسانی استفادہ کر سکتا ہے۔ کسی لکھنے والے اور ایک ایسے لکھنے والے کی جس کی آئندہ نسلوں کی تعلیم و تربیت پر نگاہ ہو یہ ایک ایسی خوبی ہوتی ہے جو تادیر

اسے اندہ اور تازہ رکھتی ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری اپنے اظہار میں شش جہت تھے۔ یہ بات میں نے بلا سبب نہیں کہی۔ ان کے فکری فرمایہ پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اردو ادب کو ہر زاویے سے دیکھا اور ہر زاویے میں پوشیدہ نکات کا عام کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ مجھے تو ان کے علاوہ کوئی ایسا شخص دکھائی نہیں دیتا جس نے اس سنجیدگی سے اردو ادب کا جائزہ لیا ہو اور پھر اس پر بھرپور اظہارِ خیال بھی کیا ہو۔ ان کی گفتگو میں بھی علم تھا اور تحریر میں بھی۔ مجھے ڈاکٹر فرمان فتح پوری سے شرفِ تلمذ حاصل رہا اور اس حوالے سے میں تقریباً 47 سال تک ڈاکٹر صاحب کی شخصیت میں مضمر خوبیوں اور علمی رویوں کا دور و نزدیک سے مشاہدہ کیا ہے۔ اور میرے حافظے میں ان کے ساتھ گزارے ہوئے لمحات کی بپت سی یادیں محفوظ ہیں جو ایک عالم بے بدل اور محقق بے نظیر کی شخصیت کے پنہاں و پیدا گوشوں تک رسائی کے لیے بڑی قیمتی ہیں۔

میری یہ تمنا رہی کہ میں ڈاکٹر صاحب کی مذکورہ خوبیوں اور رویوں کا کسی تحریر میں احاطہ کروں لیکن آج جب میں ڈاکٹر صاحب پر اظہارِ خیال کی منزل میں آیا تو نا معلوم کیسے ان کی شخصی خوبیاں اور رویے میری نظر سے محجوب ہو گئے اور میں ان کی علمی حیثیت پر گفتگو کرنے لگا جس کا یقیناً میں خود کو اہل نہیں پاتا لیکن تحریر کے اختتام پر اچانک ٹی اس ایلیٹ کا ایک جملہ مجھے یاد آ گیا کہ ''کسی تخلیق کار کی تحریر ہی اس کی شخصیت ہوتی ہے۔'' اس جملہ نے میرے پورے وجود کو ایک گہرے اطمینان سے دوچار کر دیا اور میں نے سوچا کہ واقعی ڈاکٹر فرمان فتح پوری اپنی تحریر کا آئینہ تھے۔ اور ان کی تحریر ان کی شخصیت کا آئینہ تھی۔ ایک ایسی شخصیت جس کا خمیر تدریس و تعلم سے اٹھا تھا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اس شخصیت کے آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھیں اور سوچیں کہ ادبی اقدار کی اس زوال پذیری میں ہم ادب کو ایک سنجیدہ اور تعمیری تحریک کس طرح بنا سکتے ہیں۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نصف صدی سے زائد عرصہ تک تدریسی اور علمی خدمات انجام دے کر 3 اگست 2013 کو خالقِ حقیقی سے ملے۔

پروفیسر کرّار حسین

ڈاکٹر انوار احمد زئی

جس زمانے میں سقراط نے مکالماتی تدریس کا سلسلہ جاری کیا تھا اس وقت کسے خبر تھی کہ آئندہ صدیوں میں خطابت و تقریر ہی کے فن کو کسب کمال سمجھا جائے گا اور اسی اسلوب کے تحت تشنہ دہن جویانِ علم کو کن رس پینے اور علم کو سینوں میں اتارنے کا سلیقہ حاصل ہوگا۔ دراصل پروفیسر کرار حسین کو سقراط کے طریقِ تدریس کا جدید نمائندہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ پروفیسر کرار حسین نے بہت لکھا اور خوب لکھا مگر مختلف ادبی و تنقیدی محفلوں اور مجلسوں میں ان کے براہِ راست تکلم کے طفیل دانش و آگہی کے جو موتی بکھرے اس کے وہاں موجود ان گنت اور بے شمار انار کلیوں نے اپنے اپنے دامن بھر لیے۔ وہ چلتی پھری دانش گاہ اور شعور و ادراک کی موبائل جامعہ تھے!!

ان کی شخصیت ایک روایتی مضمون کے سانچے میں سما ہی نہیں سکتی، اس لیے کہ وہ خود ایسے روایت پسند تھے جس پر جدیدیت فدا ہو ہو جاتی تھی اور ایسے وضع دار تھے جن کی پوشش یعنی شیروانی اور پاجامے سے لے کر شرمیلی اور بامعنی مسکراہٹ تک قدامت پسندی کی دلیل تھی مگر اس شیشے میں جو جدیدیت کی لے تھی اور ترقی پسندی کی لے تھی وہ اس سراپے کو امتِ دل بنا ڈالتی تھی۔ ان کی وسعت نظری ان کے اندر کے بے کراں مطالعے کی نوید کے ساتھ ناقدانہ طرزِ حیات کے ذریعے حاصل ہونے والے بے محابا مشاہدے کی کشیدہ تصویر حسین بھی تھی۔ وہ ایک طرف تو اقبال کے چلتے پھرتے مردِ مومن تھے تو دوسری طرف غالب کے نقش و نگارِ طاق نسیاں کی جیتی جاگتی حکایت تھے۔ غالب نے کہا تھا:

کیا تنگ ہم ستم زدگاں کا جہاں ہے

جس میں کہ ایک بیضۂ مور آسماں ہے

کائنات کی اس تنگ دامنی پر فراز کا خیال بھی عجیب اور غالب کے فکر کے قریب ہے۔ اس نے کہا تھا کہ:

وحشت کا سبب روزنِ زنداں تو نہیں ہے
مہر و مہ و انجم کو بجھا کیوں نہیں دیتے

پروفیسر کرار حسین اس تنگ دامنی کے شاکی نہیں بلکہ شارح تھے۔ اس لیے جب انہوں نے غالب ''سب اچھا کہیں جسے'' تحریر کی جسے ادارۂ یادگارِ غالب نے شائع کیا تو اس میں موصوف نے غالب کی تہہ داری کو جس سادہ روی سے بے حجاب و بے پردہ کیا ہے وہ ان ہی کا کمال تھا۔ جسے پڑھ کر غالب پر کیے گئے بے حساب کاموں کا حساب لگانے کو جی چاہتا ہے یہاں وہ خلیفہ عبدالحکیم کے مکتبِ فکر سے وابستہ نظر آئے بھی جنہوں نے غالب کی مشکل گوئی کو بیدلیت قرار دے کر حکیم آغا خاں اور مولوی عبدالقادر رامپوری کے بہ خلاف غالب کے مشکل اشعار میں بھی ہمہ گیر انسان دوستی کے اعلیٰ احساسات کی طرف توجہ دلائی۔ انہوں نے بھی غالب کو خلیفہ عبدالحکیم کی طرح صاحبِ نظام فلسفی یا صوفیانہ شاعر کی بجائے ایک ایسا روشن ضمیر شاعر پایا جس نے نادانستہ طور پر کسی ایک مذہب کے فکری Frame Work میں نہ رہتے ہوئے حقیقتِ اولیٰ کی جانب جانے والے تمام راستوں سے خوشہ چینی کی اور اس طرح وہ ایک ایسے مکتب فکر کا بانی بن گیا جس کا ہر وہ شخص مقلد بن سکتا ہے جو ''ہر کس کہ شد صاحبِ نظر این بزرگاں خوش نہ کرد'' کی سنت پر عمل کر سکتا ہو۔

پروفیسر کرار حسین کی تصانیف کا سلسلہ طویل ہے اور جس طرح میں نے مندرجہ بالا سطور میں اشارہ کیا کہ ان کے خطبات کو بھی اس فہرست میں شمار کیا جائے تو بہت سے ایسے ملفوظات کا اشارہ ملے گا جو ابھی تک زیورِ طبع سے آراستہ کئے جانے سے قاصر رہے ہیں۔ وہ چونکہ نہ صرف نقاد تھے، شاعر تھے، استاد تھے، ماہر تعلیم تھے، ایک زمانے کے متحرک سیاسی کارکن تھے، مصلح تھے، مبلغ تھے بلکہ وہ عالمِ باعمل اور مسلم سکالر بھی تھے۔ ان کی کتابوں میں Study of Quran اور Quran & our lives جیسی تصانیف بھی موجود ہیں جو تفہیم قرآن اور تفہیم دین کے لیے ہر عہد کے خورشید کے روپ میں موجود رہ کر سامانِ نور و آگہی کر رہی ہیں۔ ان کی کتاب

''سوالات و خیالات'' فکری، سماجی، معاشی، معاشرتی، سیاسی اور عمرانی تہذیب کی آئینہ دار بھی ہے اور وسعتِ ذہنی کے حوالے سے طرح دار بھی۔ اس طرح ان کی تصنیف ''پاکستانی کلچر اور اس کے مسائل'' کوئی درسی کتاب نہیں بلکہ بجائے خود درس گاہ ہے جس میں دنیا کے نقشے پر ابھرنے والی اس نظریاتی مملکت کے کلچر اور تہذیب سے بحث کی گئی ہے۔ ساتھ ہی ان کے مسائل کی نشاندہی بھی کی گئی ہے اور ان کا حل بھی موجود ہے۔ علم انسان Anthropology میں جہاں تک Physical Anthropology کا تعلق ہے اس سے اس وقت بحث نہیں مگر اس حوالے سے Cultural Anthropology میں عہد بہ عہد، زماں بہ زماں اور مکاں بہ مکاں جو تحفظات اور اشکال موجود ہیں ان کی تشکیلِ جدید اور تعمیرِ نو کی بحث ان کی تصانیف کا خاصہ اور تخصیص ہے۔

غالب کے بعد اقبال، پروفیسر کرار حسین کا خاص موضوع رہا بلکہ ان کی تحریروں اور تقریروں سے تو اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اقبال کو غالب کی توسیعی صورت میں دیکھتے ہیں۔ غالب کی جدت پسندی نے اقبال کے بیان تحرک کا درجہ حاصل کیا تو وہ عملیت پسندی کے علمبردار بن گئے۔ اقبال کے فکری جہاں مین قدیم و جدید کے فکری خزائن سے جس طور استفادہ کیا گیا اور جستہ جستہ ان کی بازگزشت کا بھی احاطہ کیا گیا، وہی اقبال کا کمال ہے اور اس کمال کو جس جمال و جلال کے ساتھ پروفیسر کرار حسین نے اپنی تصنیف ''اقبال سوشلزم اور اسلام'' میں زیر بحث لا کر اقبال کی عظمت کی داد دی ہے۔ وہ بجائے خود مستفید سے بڑھ کر تخلیق کا درجہ حاصل کر گئی ہے۔ اس لیے پروفیسر کرار حسین کے مزاج سے ہم آہنگ اسی موضوع میں انہوں نے اقبال شناسی اور دریافت اقبال کا ہنر آزماتے آزماتے اور سوشلزم اور اسلام کے محرکات کو کھوجتے کھوجتے خود ایک طرزِ فکر کی دریافت کر ڈالی ہے اس لیے وہ گنگ و جمنی فکری نظام معیشت کے کولمبس نظر آتے ہیں۔

چونکہ وہ اردو انگریزی، فارسی، عربی، ہندی، فرانسیسی اور جرمن جیسی وقیع زبانوں کے شناور تھے اس لیے ان کی تحریر میں ان زبانوں کے خزینوں کا بھی پتہ چلتا ہے انہوں نے پروفیسر حسن عسکری کے ساتھ مل کر مولانا اشرف علی تھانوی کی کتاب کا انگریزی ترجمہ کیا اور اس کا نام رکھا Distribution of Wealth in Islam۔ اس طرح مولانا اشرف علی تھانوی کی ایک اور تصنیف کا انگریزی ہی ترجمہ کیا اور اس کا سرنامہ مقرر کیا Answer to Modernism۔ یہ دونوں تصنیفات انگریزی زبان میں اسلامی موضوعات کی تفہیم کے بے حد موثر اور قابل قدر منابع

ہیں۔

پروفیسر کرار حسین ایک متحرک شخصیت کے مالک تھے۔ ان کا کمال یہ تھا کہ وہ زمانے کو اپنے نظریات کے مطابق ڈھالنے اور زمانے کے جدید تقاضوں سے متصادم ہونے کی بجائے انہیں ہم آہنگ کرنے پر قدرت رکھتے تھے۔ وہ ۸۔ ستمبر ۱۹۱۱ء کو راجستھان کے شہر کوٹہ میں پیدا ہوئے اور ۷۔ نومبر ۱۹۹۹ء کو کراچی میں ۸۸ سال کی عمر میں انتقال کیا۔ انہوں نے آگرہ یونیورسٹی سے انگریزی اور اردو زبانوں میں ایم۔ اے کیا تاہم انہوں نے میرٹھ میں زیر تعلیم رہتے ہوئے اور آگرہ جانے سے قبل انٹر کرنے کے فوراً بعد عملی سیاست میں حصہ لینا شروع کر دیا اور علامہ مشرقی کی خاکسار تحریک سے وابستہ ہو گئے لیکن جلد سے انہیں احساس ہو گیا کہ یہ تحریک ہند کے نوجوانوں کی جدیدیت اور ان کی فکر کے مطابق نہیں اس لیے نظریاتی اختلاف کی بنیاد پر انہوں نے خاکسار تحریک اور علامہ مشرقی دونوں کو خیر باد کہہ دیا۔ اور اُڑہن نیشنل کانگریس سے وابستہ ہو گئے انہوں نے درس و تدریس کا سلسلہ ۱۹۳۳ء میں میرٹھ کالج سے شروع کیا جہاں ان کے شاگردوں میں ڈاکٹر جمیل جالبی، حسن عسکری، انتظار حسین اور سلیم احمد جیسے نام آتے ہیں۔ کمال یہ ہے کہ یہ چاروں حضرات نہ صرف منصۂ ادب کے چار ستون کہلائے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان چاروں میں سے ہر ایک کا شمار دبستان کے طور پر کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے نہ صرف ارسطو سے ایلیٹ تک جیسی معرکتہ الآرا تنقیدی اور تحقیقی کتاب تخلیق کی بلکہ کدم راؤ پدم راؤ اور تاریخ ادب اردو جیسی عہد ساز کتابوں کی تصنیف نے انہیں دنیائے ادب میں امر کر دیا۔ یہی صورت حال حسن عسکری کی ہے جن کو مغربی ادب کا حافظ اور مشرقی ادب کا ناسخ کہا جاتا ہے اور جن کے ساتھ مل کر پروفیسر کرار حسین نے مولانا اشرف علی تھانوی کی اہم کتابوں کا انگریزی زبان میں ترجمہ کر کے دونوں زبانوں کے ناقدوں کے ساتھ مذہبی اسکالروں کو بھی ششدر کر دیا۔ ان کے شاگرد انتظار حسین نے فکشن کی دنیا میں جو مقام حاصل کیا اسے صدیوں تک یاد رکھا جائے گا۔ یہی حال سلیم احمد کا تھا جنہوں نے شاعری، تنقید اور نثری میدانوں میں باوقار تخلیقات سے ادبِ اردو کو ثروت مند کیا۔ ایسے شاگردوں کے نابغۂ روزگار استاد سوائے پروفیسر کرار حسین کے کون ہو سکتا تھا جنہوں نے اپنے شاگردوں کے روح و جسم میں ذہانت، ذکاوت، صداقت، دیانت اور امانت کا انداز دلبرا منتقل کر دیا تھا۔

پروفیسر کرار حسین ۱۹۴۸ء میں نقل مکانی کر کے پاکستان چلے آئے جہاں وہ مختلف کالجوں میں تدریس کا فریضہ ادا کرتے رہے۔ شہر کراچی کے علاوہ اندرونِ صوبہ بھی ان کی تعیناتی رہی۔ میر پور خاص میں شاہ عبداللطیف گورنمنٹ ڈگری کالج کے پرنسپل رہے یہ وہی کالج تھا جس کی عمارت میں ابتدائی طور پر سندھ کا پہلا گورنمنٹ کیڈٹ کالج قائم ہوا تھا جس کے پرنسپل کرنل جے ایچ ایچ کومز تھے جن کا تذکرہ کرنل محمد خان نے اپنی کتاب بجنگ آمد میں نہایت دلپذیر انداز میں کیا ہے۔ اس طرح وہ اپنے علمی مرتبہ کے باعث ۱۹۷۶ء میں بلوچستان یونیورسٹی کے بانی وائس چانسلر مقرر ہوئے اور اس جامعہ کو ابتدا ہی سے ترقی پسند، جدت طراز اور روشن خیال ماحول عطا کرنے میں کامیاب رہے۔

پروفیسر کرار حسین کے بے شمار شاگردوں میں خلاقی کا جوہر عام رہا اس کا بنیادی سبب خود ان کی سحر انگیز شخصیت تھی مجھے ان سے نیازمندی کا شرف حاصل رہا ہے اور میں اس ضمن میں ان کی اولاد کے ساتھ ان کی وضع دار بیگم کا کردار نہیں بھول سکتا۔ ان کی صاحبزادی شائستہ باجی آج بھی دینی اور علمی شمع روشن کیے ہوئے ہیں جبکہ ان کے بڑے صاحبزادے جوہر حسین اپنے عہد کے نمایاں طالب علم رہنما اور اُس دور کے آمر کا مقابلہ کر کے کراچی بدر ہونے والوں میں شامل رہے۔ تاج حیدر بھی ان کے صاحبزادے ہیں جو بااصول سیاست داں کے حوالے سے جانے جاتے ہیں اور آج سینٹ آف پاکستان کے رکنِ رکین ہیں۔ صادقہ اور طاہرہ اپنے اپنے شعبوں میں کمال دکھا رہی ہیں جبکہ پروفیسر کرار حسین کی بیگم ان کے شاگردوں کے لیے ماں کا درجہ رکھتی تھیں وہ نہایت پابندی سے سہ پہر کے وقت ایک ہاتھ میں موگرے کی کلیوں سے بھری طشتری اور دوسرے ہاتھ میں کرار صاحب کے لیے تازہ پھلوں کے رس سے بھرا گلاس لے کر وہیں آ جاتی تھیں جہاں کے شوہر نامدار اپنے طلبہ کو ان کے سوالات کے جوابات لکھوا رہے ہوتے تھے۔ میں نے اس جوڑے کے ان لمحات میں دونوں کی مسکراہٹوں کے تبادلے میں جو حسن، ذوق، جوش اور شوق دیکھا وہ لفظ و تراکیب کے احاطے سے ماورا ہے۔

ان رقص کناں لوگوں کو اب کون بتائے
یہ رونے کی آواز ہے شہنائی نہیں ہے

ڈاکٹر کنیز فاطمہ یوسف

ڈاکٹر فہمیدہ تبسم

پاکستانی سماج کے مخصوص سانچے میں کسی خاتون کا اپنی خداداد صلاحیتوں کی بنیاد پر پورے اعتبار کے ساتھ ابھر کر سامنے آنا اور علمی و نظریاتی منظرنامے پر اپنے معتبر وجود کے ساتھ تادیر موجود رہنا یقیناً کار دشوار ہے لیکن ڈاکٹر کنیز فاطمہ یوسف نے ماحول کے سکوت اور جمود کو نئی آواز اور نئی اسمات سے آشنائی عطا کی اور آنے والے دور کی تعلیم یافتہ خواتین میں تحرک اور فعالیت کا جذبہ بیدار کرتے ہوئے یہ مشکل کام آسان کر دکھایا۔ ڈاکٹر کنیز فاطمہ یوسف ان باہمت خواتین میں شمار ہوتی ہیں جنہوں نے تنگ نظری اور تعصّبات کی اندھیر نگری میں علم و آگہی کی فصل کاشت کی۔ ڈاکٹر صاحبہ کی ہمہ صفت موصوف شخصیت کا سب سے اہم و صفتعلیم و تعلم ہے جس کے ذریعے انہوں نے ارتفاع ذات کی اہم منازل طے کیں۔

ڈاکٹر کنیز فاطمہ یوسف نے ۱۹۲۳ء کو لاہور میں صوفی محمد یوسف کے ہاں جنم لیا۔ لاہور ہی سے ابتدائی و ثانوی تعلیمی مراحل طے کرنے کے بعد ۱۹۴۵ء میں پنجاب یونیورسٹی سے بی اے آنرز (عربی) کی سند حاصل کی۔ ۱۹۴۷ء میں جامعہ پنجاب سے ایم اے جغرافیہ کے امتحان میں یونیورسٹی میں دوسری پوزیشن لے کر کامیاب ہوئیں۔ ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۳ء کے دورانیے میں آپ جغرافیہ کی لیکچرار کی حیثیت سے گورنمنٹ کالج برائے خواتین ملتان میں تعینات رہیں۔ ۱۹۵۳ء سے ۱۹۵۶ء تک آپ نے لاہور کالج برائے خواتین لاہور میں خدمات سرانجام دیں بعد میں آپ فل برائٹ سکالر کی حیثیت سے پی ایچ ڈی کے لیے کلارک یونیورسٹی وارسسٹر امریکہ تشریف لے گئیں جہاں سے ۱۹۵۹ء میں پی ایچ ڈی کی کامیاب تکمیل کے بعد وطن واپس لوٹیں۔ آپ کے مقالے کا عنوان تھا"

Economical and political relation of Pakistan,Iran and Afghanistan ''وطن واپسی پر آپ نے دوبارہ لاہور کالج برائے خواتین میں اپنے فرائض منصبی سنبھالے۔۱۹۶۱ء میں آپ کو پرنسپل گورنمنٹ کالج خواتین کوئٹہ مقرر کر دیا گیا جہاں معروف سیاسی راہنما حنیف رامے کی اہلیہ بھی تدریس پر مامور تھیں اس سیاسی و علمی خانوادے سے آپ کے تعلقات بہت خوشگوار رہے۔ڈاکٹر صاحبہ ۱۹۶۳ء تک کوئٹہ میں مقیم رہیں۔بعد ازاں آپ نے گورنمنٹ کالج برائے خواتین راولپنڈی میں بہ طور پرنسپل ۱۹۶۳ء تا ۱۹۷۰ء علم و آگہی کی شمعیں فروزاں کیں۔آپ مختصر عرصے کے لیے گورنمنٹ کالج برائے خواتین لائلپور (فیصل آباد) بھی تعینات رہیں۔جب کہ اسلام آباد یونیورسٹی کی وائس چانسلر شپ سنبھالنے سے پہلے آپ نے لاہور کالج برائے خواتین میں ۱۹۷۰ء تا ۱۹۷۲ء بحیثیت پرنسپل محکمہ تعلیم کالج ونگ پنجاب سے وابستگی کا آخری دور مکمل کیا۔

ستر کی دہائی کا پاکستان ذوالفقار علی بھٹو کی جدید فکر اور نظریات کا حامل پاکستان تھا جس میں جمہوری آزادیوں کی ایک نئی اور توانا لہر نے پورے پاکستانی معاشرے کی عمومی فضا کو تبدیل کر دیا۔رجعت پسندی مائل بہ شکست تھی اور روشن خیالی اور جدت فکر کو پذیرائی مل رہی تھی۔ بھٹو صاحب کی شخصیت کو سب سے زیادہ قبول پسے ہوئے طبقات کے علاوہ اس اعلیٰ تعلیم یافتہ کلاس میں بھی مل رہا تھا جو مغربی تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے شعور کی نئی منازل سے آشنا تھی اور معاشرتی و علمی انقلاب کا خواہاں تھی۔ڈاکٹر کنیز فاطمہ یوسف اسی طبقے کی نمائندہ و ترجمان تھیں۔ ڈاکٹر صاحبہ علمی حلقوں میں جانے پہچانے اور باوقار مقام کی حامل تھیں چناں چہ ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت جو خواتین کی زیادہ سے زیادہ نمائندگی چاہتی تھی نے آپ کو اسلام آباد یونیورسٹی (موجودہ قائداعظم یونیورسٹی) کا وائس چانسلر مقرر کیا یوں آپ پاکستان کی پہلی خاتون چانسلر ہونے کے اعزاز کی مستحق ٹھہریں۔ڈاکٹر کنیز فاطمہ یوسف ۱۹۷۲ء سے ۱۹۷۶ء تک اس منصب جلیلیہ پر فائز رہیں۔اس عہدے پر تعیناتی کے دوران آپ نے یونیورسٹی میں ایسے شعبے قائم کیے جن کے قیام کا مقصد طلبا کو نہ صرف معاشی چیلنجز کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار کرنا تھا بلکہ طلبا کی ایک ایسی کھیپ تیار کرنا بھی مقصود تھا جو ملکی جغرافیائی اور سیاسی حیثیت کے شعور کی حامل بھی ہو اس کے علاوہ ملک میں موجودہ معدنی ذخائر کی دریافت پر توجہ مبذول رکھ سکے۔ڈاکٹر کنیز فاطمہ یوسف کے دور میں

قائداعظم یونیورسٹی میں درج ذیل شعبے قائم ہوئے:

۱۔ شعبۂ بین الاقوامی تعلقات
۲۔ شعبۂ قدرتی علوم
۳۔ شعبۂ معاشرتی علوم
۴۔ شعبۂ مطالعہ پاکستان
۵۔ شعبۂ جغرافیائی طبیعیات

ڈاکٹر کنیز فاطمہ یوسف نے پاکستان کے جغرافیہ اور تاریخ کا گہرا شعور رکھنے والی خاتون کی حیثیت سے کئی سال تک نیشنل ڈیفنس کالج میں جغرافیہ پر لیکچر بھی دیے۔

ڈاکٹر صاحبہ وہ پہلی خاتون ہیں جنھوں نے ۱۹۷۳ء تا ۱۹۷۶ء ٹوکیو میں یو این کی رکن ایگزیکٹو کونسل کی حیثیت سے جمعیت اقوام کی نمائندگی کی۔۱۹۷۶ء تا ۱۹۷۸ء آپ نے وفاقی وزارت تعلیم میں بحیثیت سیکریٹری ایجوکیشن کونسل خدمات سرانجام دیں۔

۱۹۷۷ء میں پاکستان جمہوری ڈگر سے ہٹ گیا اور تیسرے اور سب سے طویل مارشل لاء کی لپیٹ میں آ گیا۔ذوالفقار علی بھٹو کے نظریے اور فکر سے رغبت رکھنے والے ہر فرد کے لیے مارشل لاء کی اس مخصوص فضا میں سانس لینا دشوار تھا۔ڈاکٹر کنیز فاطمہ یوسف جس سیاسی سوچ کی حامل تھیں اس میں جمہوریت کے علاوہ کسی دوسرے نظام کی تائید کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا چنانچہ ڈاکٹر صاحبہ نے ۱۹۷۹ء میں سرکاری ملازمت کو خیر باد کہہ دیا۔

اپنی ملازمت کے دورانیے میں ڈاکٹر کنیز فاطمہ یوسف متعدد اداروں کی رکن رہیں جو درج ذیل ہیں:۔

۱۔ رکن اکیڈمک کونسل پنجاب یونیورسٹی لاہور
۲۔ رکن کورس سٹڈی آف پنجاب یونیورسٹی شعبہ جغرافیہ
۳۔ رکن سینڈیکٹ اسلام آباد یونیورسٹی (قائداعظم یونیورسٹی)
۴۔ رکن سنڈیکٹ پنجاب یونیورسٹی
۵۔ رکن سلیکشن بورڈ پیپلز اوپن یونیورسٹی اسلام آباد (علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی)
۶۔ رکن سلیکشن بورڈ PIDE

۷۔ رکن ایگزیکٹو بورڈ PIDE

۸۔ رکن بورڈ آف گورنرز لاہور میوزیم

۹۔ رکن بورڈ آف گورنرز نیشنل کالج آف آرٹس لاہور

۱۰۔ رکن بورڈ آف انٹرمیڈیٹ اینڈ سیکنڈری ایجوکیشن سرگودھا

۱۱۔ رکن بورڈ آف گورنرز آف ایڈمنسٹریٹو سٹاف کالج، لاہور

۱۲۔ رکن اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان

۱۳۔ رکن فیڈریشن آف یونیورسٹی وومن

۱۴۔ رکن ایڈیٹوریل بورڈ آف کنٹمپریری افیئر فیڈرل منسٹری آف انفارمیشن

۱۵۔ رکن ایڈیٹوریل آف ایجوکیشن ریویو سنٹرل بیورو آف ایجوکیشن منسٹری آف ایجوکیشن، اسلام آباد

۱۶۔ رکن ایڈیٹوریل بورڈ آف میگزین ''سکروٹنی'' آف پاکستان سٹڈیز قائداعظم یونیورسٹی، اسلام آباد

۱۷۔ رکن ایگزیکٹو کونسل آف دی یو۔این یونیورسٹی ٹوکیو، جاپان

مذکورہ بالا اعزازات کے علاوہ ڈاکٹر کنیز فاطمہ یوسف فیڈریشن آف یونیورسٹی وومن کی دو مرتبہ صدر بھی منتخب ہوئیں، اسی طرح آپ ایجوکشن کلب کی بھی دو مرتبہ صدر منتخب ہوئیں۔ پنجاب پروفیسرز ایسوسی ایشن کی صدر ہونے کا اعزاز بھی آپ نے حاصل کیا۔ آپ نے امریکہ اور کینیڈا کے دورے بھی کیے اور وہاں کی علمی مجالس سے خطاب کیا، آپ نے متعدد بین الاقوامی کانفرنسوں میں پاکستان کی نمائندگی کی۔ ان میں ریاض (سعودی عرب) میں منعقدہ مسلم خواتین کانفرنس اور سینٹو وائس چانسلرز کانفرنس نہایت اہم ہیں۔ پاکستان میں منعقدہ کئی کانفرنسوں اور سیمناروں میں بھی آپ نے نہایت فعال شرکت فرمائی۔ آپ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے کئی پروگراموں میں بھی شریک ہوئیں۔ آپ نے تعلیم، سیاست، جغرافیہ، اقبال اور سماجی ثقافتی موضوعات پر بے شمار مقالات تحریر کیے۔ آپ ایک کتاب ''Towards a tri polar world'' کی مصنفہ بھی ہیں۔ ڈاکٹر کنیز فاطمہ یوسف بے نظیر بھٹو کے جمہوری دور میں منظر عام پر رہیں آپ نیشنل انسٹیٹیوٹ آف ہسٹاریکل اینڈ ریسرچ میں کنسلٹنٹ کے طور بھی تعینات رہیں اس دوران آپ نے ایک

خاص منصوبے ''Comprehensive History Of Pakistan'' پر کام کیا۔

ڈاکٹر کنیز فاطمہ یوسف نے ایک ماہر تعلیم کی حیثیت سے معاشرے کی کردار سازی اور فکری تشکیل نو میں اپنا بھرپور کردار ادا کیا اور طویل عرصہ علمی اور نظریاتی افق پر چھائی رہیں۔ گو آج ڈاکٹر کنیز فاطمہ یوسف صاحب فراش ہیں اور عملی زندگی سے لاتعلق ہیں لیکن جب تک تعلیم و تعلم کی روایت زندہ ہے ڈاکٹر کنیز فاطمہ یوسف کا نام بھی زندہ و پائندہ رہے گا اور ان کے نظریات نئی نسل کے لیے مشعل راہ رہیں گے۔

پروفیسر لطیف الزماں خاں

شاکر حسین شاکرؔ

یہ بات کوئی پندرہ برس پرانی ہے کہ مجھے اہلیہ نے کہا کہ ہمارے چھوٹے بیٹے کی اُردو کی لکھائی بہت بری ہے۔ اُس کے لیے کسی اچھے اُستاد کا انتظام کریں یا اُسے کسی خطاطی کی اکیڈمی میں بھجوائیں تا کہ اُردو کے ساتھ ساتھ اُس کی انگریزی کی لکھائی بھی خوشخط ہو سکے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مَیں ہر ہفتے پروفیسر لطیف الزماں خاں صاحب کے پاس دوپہر کا کھانا کھایا کرتا تھا۔ تو مَیں نے اپنے اس مسئلے کا تذکرہ اُن سے کیا تو کہنے لگے آپ اپنے بیٹے کو کل سے میرے پاس لے کر آئیں۔ مَیں نے پروفیسر لطیف الزماں خاں صاحب سے گزارش کی کہ آپ تو انگریزی کے اُستاد ہیں اور میرے بیٹے کی انگریزی اور اُردو کی لکھائی بہت بُری ہے۔ اگر اُس کی انگریزی کمزور ہوتی تو مَیں آپ کے پاس بھجواتا مَیں نے اُس کی لکھائی کو بہتر کرانا ہے۔ یہ سنتے ہی اُنہوں نے کتابوں کے ہجوم میں سے تین چار کاپیوں کو نکالا اور میرے سامنے رکھ کے بولے انہیں کھول کر دیکھو، مَیں نے جب وہ کاپیاں کھول کر دیکھیں تو معلوم ہوا کہ اس میں انگریزی اور اُردو لکھائی کی مشقیں نظر آ رہی تھیں اور وہ خوبصورت لکھائی پروفیسر لطیف الزماں خاں کی تھی۔ کہنے لگے اگرچہ مَیں انگریزی ادب کا اُستاد ہوں لیکن میری محبت اُردو کے ساتھ بہت زیادہ ہے یہی وجہ ہے کہ مَیں آج بھی کسی کو خط لکھتے ہوئے زیڈ کی نِب کا استعمال کرتا ہوں۔ جب مَیں نے پروفیسر لطیف الزماں خاں کی اُن کاپیوں کو دیکھ کر فیصلہ کیا میرا چھوٹا بیٹا اپنی لکھائی کی بہتری کے لیے خانصاحب کی شاگردی اختیار کرے گا۔ کتنی عجیب بات تھی پروفیسر لطیف الزماں خاں نے لاکھوں طالب علموں کو انگریزی ادب پڑھایا اور مَیں اپنے بیٹے کو اُن کے پاس انگریزی ادب کی بجائے لکھائی کی بہتری

کے لیے بھیج رہا تھا۔ کیسے کیسے اساتذہ ہمارے ہاں سے اُٹھ گئے جن کے بارے میں کوئی یہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ وہ اپنے مضمون کے علاوہ خوشخطی پر بھی کمال رکھتے تھے۔ ہمیں پروفیسر لطیف الزماں خاں اس لیے بھی یاد رہتے ہیں کہ جب بھی مَیں غالب کا کوئی شعر یا غزل پڑھتا ہوں تو ذہن کے ہر گوشے میں اُنہی کی وہ لائبریری چمک اُٹھتی ہے جہاں پر انہوں نے غالب کے عشق میں ہزاروں کتابیں جمع کر رکھی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب بھی دسمبر کا آغاز ہوتا ہے تو مجھے 26 دسمبر 2013ء کی وہ سرد صبح بھی یاد آتی ہے جس میں معروف ادیب، خاکہ نگار، نقاد، شاعر اور ماہر غالبیات ورشید احمد صدیقی پروفیسر لطیف الزماں خان معمول کے مطابق اٹھتے ہیں اپنے کمرہ کا ٹی وی ریموٹ کنٹرول سے آن کرتے ہیں ان کی نظریں کسی بریکنگ نیوز پر ٹھہر جاتی ہیں اور پھر ۔۔۔۔۔ کچھ دیر بعد ان کا پوتا حسب معمول ان کے کمرہ میں آتا ہے دادا، دادا کی آواز دیتا ہے لیکن پوتے کو دیکھ کر دادا اپنے بازو اس کی جانب نہیں بڑھاتے۔ معصوم پوتا دادا کے قریب ہو کر پھر آواز دیتا ہے ''دادا۔ دادا''۔ اور پھر کوئی جواب نہ پا کر واپس اپنے والد کے کمرے میں چلا جاتا ہے اور اپنے پاپا کو جا کر کہتا ہے کہ دادا اس کی بات کا جواب نہیں دے رہے ہیں۔ یہ سن لطیف الزماں خان کا بیٹا ڈاکٹر انیس الزماں بھاگ کر اپنے بابا کے کمرہ میں جاتا ہے۔ ٹی وی چل رہا تھا یقیناً اس وقت بھی ضرور کوئی نہ کوئی بریکنگ نیوز چل رہی ہوگی۔ لیکن 28 دسمبر 2013ء کی صبح ملتان کینٹ کے ایک گھر میں ایسی بریکنگ نیوز بنی جس کو سن کر اہل ادب سکتے میں آ گئے کہ لطیف الزماں خان خود کہا کرتے تھے ہماری والدہ مرحومہ خود کہا کرتی تھیں کہ جتنا عرصہ میں جیوں گی اتنا عرصہ میرا لَلّا جیئے گا۔ لیکن خان صاحب اپنی والدہ کی عمر سے پانچ سال پہلے ہی رخصت ہو گئے اور یوں خان صاحب پیشین گوئی کے منتظر نہیں رہے۔ 87 سال کے ہونے کے باوجود ان کی یادداشت کا یہ عالم تھا کہ بچپن کی باتیں یاد تھیں۔ ہم نے ان کی زندگی کے بے شمار واقعات بار بار ان سے سنے۔ غالب اور رشید احمد صدیقی کے عاشق تھے۔ میں نے کبھی انہیں اچھے لباس میں نہیں دیکھا البتہ کتابوں کے انتخاب اور پھر اس کو جس انداز سے محفوظ کرتے وہ اپنی مثال آپ تھا۔ خان صاحب جس دن کتاب خریدتے اسی دن اپنا نام، تاریخ اور شہر کا نام لکھتے۔ کتاب پڑھتے ہوئے سیاہ پین سے زِیر، زَبر، پیش لگانے کے ساتھ گرائمر کی غلطیاں بھی لگاتے جاتے۔ پروف کرنے کا ہنر ملتان میں صرف ان کو آتا تھا۔ میں نے ان کی جتنی کتابیں شائع کیں ہر کتاب کی اشاعت پر پل صراط سے

گزرا۔ کبھی سرورق کی کلر سکیم پر ان کا غصہ دیکھا تو کبھی بک بائنڈر کے گناہ دھوتے رہے۔ اگر ان کی کسی کتاب پر پرنٹنگ پریس والے نے سیاہی تیز چلا دی تو پھر خان صاحب کا تیز غصہ بھی مجھے سہنا پڑا۔ پندرہ سال کے اس تعلق میں کئی مرتبہ انہوں نے مجھے کہا میں آپ کی دکان پر نہیں آؤں گا ۔ میں ہنس کر ان کی یہ بات سنتا اور پھر دو تین دن بعد انہیں فون کرتا کہ خان صاحب غالب پر ایک نئی کتاب آئی ہے تو میرے فون کے کچھ دیر بعد خان صاحب کتاب نگر پر ہوتے ۔ کتاب لیتے، چائے پیتے اور گھر چلے جاتے۔ خان صاحب کی ایک خوبی حق گوئی تھی اور حق کا پیمانہ ان کا اپنا طے کردہ تھا۔ اگر ان کو کوئی شخص برا لگتا تو پھر مشکل سے اسے معاف کرتے ایسے لوگوں کی مثال ان کی زندگی میں سینکڑوں کی تعداد میں تھی جبکہ جن سے وہ محبت کرتے تو پھر وہ اس محبت کو بھی مشکل بنا دیتے۔ کیونکہ خان صاحب سے دوستی اور محبت کے راستے کانٹوں سے گزر کر آتے تھے۔ ان کے خطوط اور انشائے لطیف کی پانچوں جلدوں پر بے شمار احباب نے ناگواری کا اظہار کیا لیکن انہوں نے اپنے لکھے ہوئے کسی بھی لفظ کو واپس نہ لیا۔

لطیف الزماں خان نے زندگی اپنی شرائط پر گزاری ۔ کتابوں سے عشق کیا ۔ روزگار انگریزی ادب سے کمایا لیکن عشق اردو سے کیا۔ ایمرسن کالج میں پڑھاتے رہے لیکن ایمرسن کالج کے بہت سے کولیگ سے برملا اختلاف کیا۔ اپنی کتابوں سے عشق جنون کی طرح کرتے تھے۔ کسی زمانے میں انہوں نے واجدہ تبسم کی تمام کتب شعبہ اردو بہاالدین زکریا یونیورسٹی کو عطیہ کیں تو کسی نے انہیں بتایا کہ وہاں سے کتابوں کا سیٹ غائب ہو گیا ہے۔ یہ سنتے ہی آؤ دیکھا نہ تاؤ وائس چانسلر کو ایک خط لکھا اور کتابوں کی برآمدگی کے لئے مجھے تفتیشی افسر مقرر کیا ۔ میں نے اس خط کا تذکرہ ڈاکٹر انوار احمد سے کیا تو وہ کہنے لگے خان صاحب کو کون سمجھائے ان کی عطیہ کی ہوئی تمام کتب موجود ہیں۔ چند کتابیں طلباء و طالبات نے ایشو کروائی ہوئی ہیں۔ میں نے جا کر خان صاحب کو کتب کی بازیابی کا بتایا تو بچوں کی طرح خوش ہوئے۔

زندگی کے آخری چند سال نہوں نے ڈاکٹر صلاح الدین حیدر، ڈاکٹر عامر سہیل اور ڈاکٹر ابرار عبدالسلام کے ساتھ گزارے۔ حالی روڈ گلگشت کالونی میں غالب نما کے نام سے گھر تھا انہوں نے اپنی جیب سے خریدی گئی ہزاروں کتابوں سے سجایا۔ حقیقی معنوں میں وہ اس مثال پر پورا اترتے تھے کہ کتابیں ان کا اوڑھنا بچھونا تھیں ۔ گھر کے ہر کمرے میں کتابیں ہی کتابیں نظر آتی

تھیں۔ ہر کتاب کو خود کاغذ کا کور چڑھاتے اس کے پشتے پر کتاب اور مصنف کا نام لکھتے۔ مطالعہ کے بعد جس جگہ وہ کتاب رکھتے اس جگہ کو بھی یاد رکھتے ۔ گھر میں ان کی لائبریری کے لئے کوئی خاص کمرہ مختص نہ تھا بلکہ انہوں نے پورے گھر کو لائبریری کا درجہ دے رکھا تھا۔ اگر کسی پر شک گزرتا کہ وہ کتابیں چوری کرتا ہے تو خان صاحب اس کا داخلہ اپنے گھر میں بند کر دیتے۔ اس اصول کے تحت انہوں نے بہت سے لوگوں کو اپنے گھر آنے سے منع کر رکھا تھا۔ ہم جب بھی خان صاحب کے ساتھ کھانا کھاتے تو زبردستی ان کی پلیٹ میں چکن کی بوٹیاں ڈال دیتے۔ اس پر ہمیشہ ایک ہی بات کہتے آپ لوگوں نے مجھے کیا مسلمان سمجھا ہوا ہے جو میری پلیٹ بوٹیوں سے بھر دیتے ہیں؟۔ سالن کے گھی کو وہ روغن کہتے ۔ اسے بھی ناپسند کرتے ۔ کھانا ختم کرتے ہی ہمیں حکم دیتے سامنے سے ہاتھ دھولو یہ روغن والے ہاتھ تم کتابوں کو لگاؤ گے یوں میری کتابیں خراب ہو جاتی ہیں۔ ہاتھ دھوتے ہی وہ ہمیں تولیے کہ جگہ بتاتے کہ ہاتھ صاف کر لو۔ ان کے اس ہدایت نامے کی ایک ہی وجہ ہوتی تھی کہ کتابیں خراب نہ ہوں۔ انہوں نے اپنی کتابیں تین حصوں میں عطیہ کیں۔ پہلا حصہ انہوں نے ہمدرد یونیورسٹی کراچی دوسرا حصہ گوشۂ رشید احمد صدیقی کے نام بہاالدین زکریا یونیورسٹی کے شعبہ اردو اور تیسرا حصہ بھی شعبہ اردو بہاالدین زکریا یونیورسٹی کو دیا۔ تیسرے حصے میں اتنی نایاب کتب تھیں کہ جو بھی کتاب دوست وہ ذخیرہ دیکھ لیتا اس کے منہ میں پانی آ جاتا۔ اگر میں بھی ان سے کوئی کتاب مانگتا تو جلد واپسی کی شرط پر دیتے۔ خان صاحب کا مذہب کے معاملے میں واضح نظریہ تھا۔ اس بارے میں اکثر کہا کرتے نیاز فتح پوری کی تحریریں پڑھ کر تمام مذہبی جالے دور ہوئے ۔ میں نے مذہب کو عقل کی بنیاد پر سمجھا ہے جبکہ مجنوں صاحب کی تحریریں پڑھ کر میں نے سنجیدہ ادب کا مطالعہ کرنا سیکھا ۔ خان صاحب جب بھی فرقہ واریت کی خبریں پڑھتے بے حد رنجیدہ ہو جاتے اور بے ساختہ کہہ دیتے۔

''میں خدا سے نہیں ڈرتا کہ وہ غفور الرحیم ہے معاف کر دیتا ہے۔ مسلمانوں سے ڈرتا ہوں کہ وہ کبھی معاف نہیں کرتے''۔

ساری زندگی ان کی خدا سے ایسی دوستی رہی جس کو ہم نے جنگ کہہ سکتے ہیں نہ دوستی۔ اس کے بارے میں وہ جوان بیٹے کی موت کا ذکر کرتے کہ جب وہ بیمار ہوا تو میں نے خدا سے بہت التجائیں کیں لیکن خدا نے ہماری ایک نہ سنی تو ہم بھی خدا سے روٹھ گئے ۔ زندگی کے آخری برسوں

میں انہوں نے مرثیے کہنے شروع کر دیئے۔ مرثیے کے اصل محرک علامہ طالب جوہری ٹھہرے۔ انہوں نے وہ مرثیے علامہ عقیل الغروی کو بھی سنائے۔ میرے بے حد اصرار پر وہ اس بات پر تیار ہو گئے تھے کہ اسے کتابی شکل میں شائع کرائیں گے لیکن زندگی نے انہیں مہلت نہ دی۔

غالب اور رشید احمد صدیقی سے عشق کرتے تھے۔ اس عشق نے انہیں پوری دنیا میں اَمر کر دیا۔ دنیا میں کہیں بھی دیوان غالب یا اس کی شرح شائع ہوتی، ان کی خواہش ہوتی کہ وہ سب سے پہلے ان کے پاس پہنچے۔ غالب کے متعلق ہمیشہ یہ کہتے غالب کو نہ پڑھا ہوتا تو انسانیت کے معنی و مفہوم سے ناواقف تھا۔ رشید صاحب کی تحریروں کو نہ پڑھتا تو علی گڑھ کی اہمیت سے ناآشنا رہتا۔ کتابیں ہمیشہ خرید کر پڑھتے اور کسی کو ان کی لائبریری سے کوئی ضرورت ہوتی تو وہ بڑی مشکل سے کتاب دینے پر راضی ہوتے۔ البتہ طلباء و طالبات کے لئے یہ شرط ہوتی کہ ان کے ہاں بیٹھ کر کتابوں سے استفادہ کیا جائے۔ اگر کبھی وہ کسی کو کتاب پڑھنے کے لئے دے دیتے تو واپسی کا تقاضا بھی ضرور کرتے۔

ملتان کے ہر دوسرے ادیب و شاعر کے ساتھ ان کا اختلاف رہا لیکن جب ان کو معلوم ہوتا کہ فلاں ادیب یا شاعر انتقال کر گیا ہے تو خان صاحب سب سے پہلے ان کے گھر پہنچ جاتے جس کی زندہ مثال عرش صدیقی اور عاصی کرنالی کے جنازے تھے۔ عاصی کرنالی کے جنازے میں شریک ہونے کے لئے سب سے پہلے مرکزی عیدگاہ پہنچ چکے تھے۔ وہاں موجود ہر ادیب و شاعر سے تعزیت کر رہے تھے۔

گزشتہ کئی برسوں سے انہیں چلنے پھرنے میں دقت ہوتی تھی لیکن اس کے باوجود وہ صبح سویرے اپنے بیٹے ڈاکٹر انیس کے گھر سے روانہ ہوتے دوپہر کا کھانا گلگشت والے گھر میں کھاتے۔ ان کے تمام حب داروں کو معلوم تھا کہ خاں صاحب دو بجے دوپہر تک ''غالب نما'' میں ہوتے ہیں اس لئے ملنے والوں کی آمد و رفت جاری رہتی۔ وہ اس گھر میں تنہا مسافر کی طرح رہے نہ کوئی روگ پالا۔ سوائے کتابوں سے عشق کے اور اس کی خاطر کسی سے جوگ نہیں لیا۔ بظاہر خوش لیکن ان کا باطن دکھی رہا۔ پوری زندگی کڑی دھوپ میں گزاری لیکن جس عشق کا آغاز انہوں نے غالب سے کیا آخر تک اسی عشق میں غرق رہے۔ انہوں نے لاکھوں خرچ کئے صرف غالب کی محبت میں۔ نجانے ان کو کیسے کیسے دکھ تھے جو کلام غالب کو پڑھ کر سکھ میں بدل لیتے تھے۔ وہ غالب

کی محبت میں قریہ قریہ کوچہ کوچہ پھرتے رہے۔ اس کا ذکر اپنی تحریروں میں کیا کرتے۔ انشائے لطیف کے نام سے ان کے خطوط کے پانچ مجموعے شائع ہوئے تو وہ خط پڑھ کر ہر دوسرا شخص ان سے ناراض ہوا۔ ڈاکٹر عارف ثاقب کی دل سے قدر کرتے ان کی شادی نہ کرنے کا قصہ بھی سب کو سناتے۔ گفتگو میں تلخی نمایاں ہوتی لیکن شائستگی کا دامن بھی کبھی نہ چھوڑتے برہم ہونے کو آتے تو ایک دم ہی غصہ کر لیتے۔ تند مزاجی اور بدگمانی کو اپنے سامنے رکھتے جب جی چاہتا ان کو اپنے اوپر اوڑھ لیتے ورنہ دوستوں میں گھل مل کر رہتے۔

خان صاحب رحیم یار خان سے یکم ستمبر 1963ء کو ملتان پہنچے اور 26 دسمبر 2013ء کو انتقال کیا۔ میری ان سے ملاقاتوں کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ اگر سب نشستوں کا احوال لکھوں تو بہت سے دوست ناراض ہو جائیں گے۔ دسمبر کے اوائل میں مَیں نے انہیں سجاد جہانیہ کا ایک پیغام دیا کہ وہ اپنے اخبار کے لئے انٹرویو کرنا چاہتے ہیں تو انہوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ بھئی میری شخصیت کیا میری ادبی حیثیت کیا؟ انہیں تمام عمر جھوٹ سے نفرت رہی۔ بڑے سے بڑے شخص یا ہجوم کے سامنے حق بات کہنے سے کبھی نہیں جھجکے۔ خواہ اس کے لئے انہیں بڑی سے بڑی قربانی ہی کیوں نہ دینی پڑے۔ ان کی ایک ایک سانس میں کئی پرت موجود تھے۔ کبھی اپنے ہاتھوں سے وہ کسی کو زندگی کی نوید دیتے تو کبھی وہ خود موت کی وادی کو ہاتھ لگا کر واپس زندگی کی جانب لوٹ آتے۔ کبھی وہ اپنے بیٹے کے غم میں مرتے تو کبھی اپنی اہلیہ کے انتقال پر رنجیدہ دکھائی دیئے۔ آخری بار وہ اپنی بہو یعنی ڈاکٹر انیس کی جواں سال اہلیہ کی وفات پر دکھی نظر آئے۔ ان کا یہ معمول تھا کہ گلگشت والے گھر سے جب کینٹ والے گھر جاتے تو ڈاکٹر انیس کے تینوں بچوں کے لئے ان کی پسند کی چیزوں کے پیکٹ بناتے اور جا کر جب ان کو دیتے تو گھر میں ''دادا پہلے مجھے، پہلے مجھے'' کا شور بلند ہو جاتا۔

نومبر 2013ء میں انہوں نے اچانک فیصلہ کیا کہ وہ اپنی پوری لائبریری شعبہ اردو بہاالدین زکریا یونیورسٹی کو عطیہ کریں گے۔ ڈاکٹر روبینہ ترین، ڈاکٹر انوار احمد، ڈاکٹر قاضی عابد اور وائس چانسلر ڈاکٹر خواجہ علقمہ اور دیگر ان کے ہاں گئے تو کہنے لگے کہ ہم نے جب کہہ دیا تھا یہ تمام کتابیں آپ کی ہیں تو وائس چانسلر کو کیوں ساتھ لائے ہیں۔ ان کی کتابوں کی فہرست تیار ہونے لگی تو مجھے فون آیا کہ شاکر میری لائبریری کو آخری بار میرے گھر میں دیکھ لو پھر یہ کتابیں یونیورسٹی چلی

جائیں گی۔ میں نے کہا خان صاحب کیا کتابوں کے بغیر جی لیں گے؟ اس پر وہ خاموش ہو گئے۔
میں نے خان صاحب کا گھر جب کتابوں کے بغیر دیکھا تو مجھے یوں لگا جیسے شاید ان کو علم ہو چکا تھا
کہ وہ زیادہ عرصہ نہیں جئیں گے۔ پھر اگلی مرتبہ میں نے دیکھا ان کے صحن میں جو پودے رکھے
ہوئے تھے انہوں نے وہ بھی کسی کو دے دیئے۔ ان پودوں کو وہ روزانہ پانی دیتے۔ پالتو بلی بھی
کہیں دکھائی نہ دی۔ گھر غالب کی کتب سے خالی ہو گیا تو انہوں نے بھی سوچا کہ اب جینے کا لطف
کہاں؟ 26 دسمبر 2013ء کی صبح وہ معمول کے مطابق اٹھے دل میں درد اتنی شدت سے اٹھا کہ وہ
بقول غالب یہ بھی نہ کہہ سکے۔

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے؟
آخر اس درد کی دوا کیا ہے؟

گھر میں ڈاکٹر بیٹا موجود تھا لیکن وہ درد کی دوا لئے بغیر چلے گئے۔ اتنے انا پرست تھے کہ وہ
آخری عمر میں بھی کسی کے محتاج نہ ہوئے اور خاموشی سے دنیا سے چل دیئے۔ ان کے جانے سے
ملتان ایک بہت بڑے عالم سے محروم ہوا۔ بقول غالب؛

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

پروفیسر محمد حسن عسکری

ڈاکٹر عزیز ابن الحسن

اُردو دنیا میں افسانہ نگار، نقاد، تہذیبی و ادبی مسائل کے پارکھ، مشرقی و مغربی تہذیب کی
روح کے تجزیہ کار اور اُردو میں روایت کے تصورات کو ایک نیا رخ دینے والے صاحب دانش
استاد محمد حسن عسکری اپنے انداز کے واحد آدمی تھے۔ انہوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز ایک افسانہ
نگار کے طور پر کیا مگر ابتدائی پانچ سات برسوں کے دوران ہی انہوں نے افسانہ نگاری ترک کر
دی۔ ان کے افسانے اپنے زبان، لفظیات، اسلوب اور تکنیک کے اعتبار سے آج بھی اُردو کی
افسانوی دنیا میں اپنی مثال آپ ہیں۔ جس وقت وہ افسانے لکھ رہے تھے تب بھی مغربی و مشرقی
ادب کے فرق کا ایک منفرد اور گہرا تنقیدی شعور ان کے تخلیقی جوہر کا پشت پناہ تھا جسکا سب سے پہلا
نمونہ ان کے پہلے افسانوی مجموعے جزیرے (1943ء) کے اختتامیے کی صورت سامنے آیا تھا۔
یہ "اختتامیہ" آج بھی نہ صرف ان کے افسانوی شعور کی انفرادیت کا عکاس ہے بلکہ ان کی زندگی
کے آخری پندرہ بیس برس میں ان کے ادبی و تہذیبی تصورات میں آنیوالی تبدیلیوں کے ابتدائی بیج
بھی اپنے اندر رکھتا ہے۔

محمد حسن عسکری نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز تو افسانہ و تنقید سے کیا تھا مگر ذریعہ روزگار کے
اعتبار سے ان کی زندگی کا بڑا حصہ شعبۂ تدریس و تعلیم میں گزرا، انگریزی ادبیات کے استاد کے طور
پر ان کی تدریس کا آغاز عربک کالج (موجودہ ذاکر حسین کالج) دہلی سے ہوا تھا مگر ایک معلم کی
حیثیت سے ان کی زندگی کا طویل ترین عرصہ اسلامیہ کالج کراچی میں گزرا۔ اُردو شعر و ادب،
افسانہ اور تنقید کے اس خلاق نقاد اور انگریزی زبان و ادب کے نامور استاد کی زندگی اور فکری سفر

کے مختصر احوال درج ذیل ہیں۔

محمد حسن عسکری کا تاریخی نام محمد اظہار الحق تھا۔ وہ 5 نومبر 1919ء (بمطابق 11 صفر 1338ھ) کو "سراوہ" ضلع میرٹھ، اتر پردیش میں پیدا ہوئے۔ وہ اپنے بہن بھائیوں میں سب سے بڑے تھے دو بھائیوں کا چھوٹی عمر میں انتقال ہو گیا۔ اُن کے دادا مولوی حسام الدین اپنے علاقے کی مشہور شخصیت اور حدیث کے عالم تھے وہ "پرتاب گڑھ" میں ڈپٹی کلکٹر کی حیثیت سے 1908ء میں ریٹائر ہوئے۔ عسکری کے والد کا نام محمد معین الدین تھا جنہوں نے پہلے سرکاری اور پھر وہاں سے کچھ دور ایک ہندو ریاست "شکار پور" میں اکاؤنٹنٹ کی حیثیت سے ملازمت کی، اُن کی تقریباً تمام عمر میرٹھ میں گزری۔

عسکری کی تعلیم کا آغاز "سراوہ" ہی کے پرائمری سکول میں قرآن شریف اور اردو سے ہوا مگر بعد میں وہ ریاست کے مسلمان اسکول میں داخل ہو گئے جو چٹائی والے اسکولوں کی طرح کا ایک عام سا اسکول تھا۔ پرائمری کے بعد وہ ریاست کے واحد انگریزی ہندو اسکول D.A. School English چلے آئے۔ رواج کے مطابق پانچویں جماعت سے فارسی بھی پڑھنی شروع کر دی تھی۔ آٹھویں جماعت کے بعد 1934ء میں انہوں نے مسلم ہائی اسکول، بلند شہر میں داخلہ لیا اور 1936ء میں میٹرک کا امتحان پاس کر لیا۔ پھر 1938ء میں میرٹھ کالج سے انٹر میڈیٹ کیا۔ اس کالج میں عسکری دو سال تک رہے۔ اس وقت پروفیسر کرار حسین بھی وہاں پڑھاتے تھے۔ گو عسکری ان سے براہ راست پڑھ نہیں سکے تھے، مگر اس کے باوجود تمام عمر انہیں اپنا استاد ہی سمجھتے رہے۔ ازآں بعد 1940ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے بی اے اور 1942ء میں وہیں سے انگریزی ادب میں ایم اے کی ڈگری لی۔ اس یونیورسٹی کا انتخاب عسکری کا اپنا نہ تھا بلکہ ان کے پھوپھی زاد بھائی نعیم الرحمٰن نے انہیں الہ آباد بلوایا تھا، جو الہ آباد یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر تھے۔ الہ آباد میں ان کا قیام پروفیسر نعیم الرحمٰن کے یہاں رہا، جن کی ذاتی لائبریری ادب، تاریخ، نظم و نثر، اردو، عربی، انگریزی بلکہ فرنچ اور جرمن کتابوں اور ڈکشنریوں سے بھری ہوئی تھی۔ یہ لائبریری عسکری کے لیے نعمت غیر مترقبہ تھی۔

محمد حسن عسکری تعلیم کی غرض سے جب اپنے گھر سے نکلے تو پھر زیادہ تر گھر سے باہر ہی رہے۔ ایم۔اے تک اُن کی رہائش شکار پور میں رہی تعطیلات وہ اپنے والدین کے ساتھ شکار پور میں ہی

گزارتے۔ عسکری کا گھریلو ماحول اس زمانے کے عام گھروں کی طرح مذہبی تھا۔ اُن کے گھر میں رسالے باقاعدگی سے آتے۔ عالمگیر، نیرنگ خیال، انکشاف اور بچوں کا اخبار پھول بڑے شوق سے پڑھے جاتے تھے۔ غلام عباس کی کتاب الحمرا کے افسانے عسکری اور ان کے سب بہن بھائیوں کی مقبول ترین کتاب تھی۔

محمد حسن عسکری کا ایک شوق فلم بینی اور فلم تنقید کا بھی تھا۔ وہ جب کالج سے چھٹیوں میں گھر آتے تو وہاں کی سرگرمیوں کے بارے میں بھائیوں کو بتاتے مشاعروں کی روداد سناتے اور شاعروں کا کلام ان کی نقل کے ساتھ اونچی آواز میں پڑھتے، انگریزی فلموں کے مکالمے ایکٹنگ کے ساتھ بہن بھائیوں کے سامنے دہراتے، فلموں سے اُن کا یہ شوق دراصل فکشن سے رغبت کا حصہ تھا۔

ادبی دنیا میں ادیب کے طور پر عسکری کا نام ایم اے کرنے سے پہلے ہی معروف ہو چکا تھا۔ انکی پہلی دستیاب تحریر ایک ترجمہ "محبوبہ آموں را" ہے، جو نومبر 1939ء کے ساقی، دہلی میں چھپی تھی۔ اور پھر ایک افسانہ "کالج سے گھر تک" ہے، جو ادبی دنیا میں اگست 1940ء میں چھپا تھا۔

ایم۔اے کے فوراً بعد عسکری روزگار کے چکر میں آ گئے۔ ریاست شکار پور کے زوال کی وجہ سے ان کے گھریلو معاشی حالات اچھے نہیں رہے تھے۔ ان کے والد کنبے کے واحد کفیل تھے۔ بڑا بیٹا ہونے کی ذمہ داری کو محسوس کرتے ہوئے خود ہی روزگار کے سلسلے میں دہلی چلے گئے اور وہاں ریڈیو اسٹیشن پر سکرپٹ رائٹر کے طور پر بھی کام کیا۔ اسی زمانے میں شاہد احمد دہلوی اور رسالہ "ساقی" سے تعلق قائم ہوا۔ وہ پانچ سات ماہ اینگلو عربک کالج دہلی میں انگریزی کے استاد رہے۔ اس کے بعد میرٹھ واپس گئے جہاں وہ میرٹھ کالج میں انگریزی پڑھاتے رہے۔ شبلی کالج اعظم گڑھ میں بھی انہیں ملازمت ملی مگر وہ چھوٹے شہروں سے خوش نہ ہونے کی وجہ سے وہاں نہ گئے۔

عسکری اس عمر ہی میں اپنے پہلے افسانوی مجموعے "جزیرے" کے معروف زمانہ افسانوں اور شاہد احمد دہلوی کے "ساقی" میں اپنے ماہانہ کالم "جھلکیاں" (آغاز جنوری 1944ء) کی وجہ سے ہندوستان بھر کے ادبی حلقوں میں اپنی شناخت قائم کر چکے تھے۔ اُن کو دہلی کی زندگی اور اردو زبان، کلچر سے خاص لگاؤ تھا۔ لیکن ادبی طرز احساس میں وہ پنجابی ادیبوں سے زیادہ قُرب محسوس کرتے اور انہیں یوپی والوں پر ترجیح دیتے تھے۔ یہ تحریکِ پاکستان کے عروج کا زمانہ

تھا برصغیر کے مسلمانوں کا قومی کلچر عسکری کے خاص دلچسپی کے موضوع تھے لہذا وہ پاکستان کے قیام کے پرزور حامی بن گئے انہوں نے پروفیسر کرار حسین کے ایک اخبار "الامین" میں سیاسی مضامین بھی لکھے لیکن پاکستان کے قیام کے پسِ منظر میں ان کے قلم کا رخ زیادہ تر مسلمانوں کے ثقافتی معاشی مسائل کی طرف ہی رہا۔ انہوں نے اُردو تہذیب کو اجنبی ہونے سے بچانے کے لیے اس پرآشوب ماحول میں میرٹھ میں مسلم کلچر کانفرس کرانے بھی کوششیں کیں۔

عسکری کی پہلی اور اولین حیثیت ایک افسانہ نگار کی تھی۔ انہوں نے بارہا لکھا ہے کہ ان کے نزدیک تنقید اور افسانہ ایک دوسرے سے الگ نہیں" کیونکہ دونوں کے پیچھے تجربہ اور تحریک وہی ایک ہے"۔ وہ جیسی فضا افسانے میں تخلیق کرتے تھے ویسی ہی کیفیات تنقید میں بھی پیدا کر سکتے تھے۔ ان کے معروف افسانے "پھسلن" (1941ء) "حرام جادی" (1941ء) "میلاد شیریف" (1941ء) اور "چائے کی پیالی" (1942ء) کا زمانہ تحریر 41-1939ء کے درمیان ہے۔ جب وہ ابھی انٹرمیڈیٹ اور بی اے کے نوجوان طالب علم تھے۔ یہ افسانے جو آج ساٹھ، ستر برس بعد بھی پردہ گمنامی میں نہیں چھپ سکے، ایک سخت ناآسودہ، شکستہ اور یکہ و تنہا شخصیت کا نقشہ پیش کرتے ہیں۔

اگست 1947ء میں تقسیم ہند کے بعد اکتوبر میں وہ لاہور آ گئے جبکہ اُن کا خاندان ابھی میرٹھ ہی میں تھا۔ عسکری کی سیاسی دلچسپی پاکستان سے تھی جس کی تہذیبی معنویت اور مسلمانوں کے لیے اس کی اہمیت کے مسلے پر انہوں نے مسلسل لکھا تھا اسی لیے انہوں نے ہجرت کے لیے لاہور شہر کا انتخاب کیا تھا۔ لیکن لاہور سے ان کے تعلق کی پہچان حقیقتاً ادبی حوالوں سے تھی۔ لاہور سے عسکری کی وابستگی ادبی و تمدنی نوعیت کی تھی۔ لاہور میں ان کا کوئی رشتہ دار نہ تھا ان کو صرف ڈاکٹر آفتاب احمد کا سہارا تھا جو قیام پاکستان سے پہلے ہی ادبی حوالوں سے ان کے ذاتی دوستوں میں سے تھے ڈاکٹر آفتاب احمد کی خواہش تھی کی محمد حسن عسکری یہاں کسی کالج میں بطور لیکچرار اپنی خدمات انجام دیں جس کی ان کے لیے آسانی سے جگہ بھی بنائی جا سکتی تھی لیکن محمد حسن عسکری اس پر راضی نہ ہوئے۔ لاہور میں شروع کے چند ماہ انہوں نے ایک آزاد ادیب کے طور پر ادب کے ہوائی رزق پر گزارا کیا۔ اس زمانے میں انہوں نے ادبی ثقافتی اور سیاسی موضوعات پر جم کے لکھا۔ ریڈیو کے

لئے فیچر/تقریریں لکھیں اور بہت سے تراجم بھی کیے۔ معروف فرانسسی ناول مادام بوراری کا ترجمہ بھی قیام لاہور کے اس ابتدائی دور کا ہے۔ محمد حسن عسکری کے ترقی پسند ادیبوں سے شدید نظریاتی اختلاف تھے انہوں نے منٹو کے ساتھ مل کر ایک نیا ادبی رسالہ اردو ادب بھی نکالا۔ جسے اس دور کی ترقی پسند ادبی سیاست نے اپنے خلاف جانا۔

1950ء میں عسکری "ماہ نو" کے ایڈیٹر بن کر کراچی چلے گئے اور باقی زندگی کیلیے اسی شہر کو اپنا مستقل ٹھکانہ بنالیا لیکن وہ وہاں زیادہ خوش نہیں تھے۔ اس وقت کی حکومت انہیں ترقی پسندوں کے خلاف آلے کو طور پر استعمال کرنا چاہتی تھی۔ وہ خود ترقی پسندوں سے اختلاف رکھتے تھے اور ان کے خلاف لکھتے بھی رہے لیکن کسی کی منشا پر لکھنا انہیں گوارا نہیں تھا وہ انہی اختلاف کی بنا پر ماہ نو سے الگ ہوئے لیکن حکومت کے زیر اثر ترقی پسندوں یا کسی کے بھی خلاف لکھنا گوارا نہ کیا۔ حالانکہ ترقی پسندوں کی جانب سے انہیں طعنے بھی سہنے پڑتے اور انہوں نے عسکری اور منٹو کو سرکاری "ڈھنڈورچی" کا خطاب بھی دے رکھا تھا کہ یہ حکومت سے عہدے کے لالچ میں ترقی پسند نظرے کے خلاف لکھتے ہیں۔ لیکن محمد حسن عسکری نے کبھی کسی عہدے کا لالچ نہیں کیا۔ فروری 1950ء سے جولائی/اگست 1950ء تک پانچ چھ ماہ ''ماہ نو'' کے ایڈیٹر رہ کر وہ اس سے الگ ہو گئے۔

ان کی والدہ اور کنبے کے دیگر افراد کا قیام لاہور میں رہا اور خود انہیں بھی کراچی کی آب و ہوا راس نہ آئی وہ واپس لاہور جانے کے لیے پر تولتے رہے لیکن ایسا ممکن نہ ہو سکا۔ کراچی میں عسکری کی دلچسپی ان کے میرٹھ کے زمانے کے دوست سلیم احمد تھے جو عسکری کو اپنا مرشد مانتے تھے۔ شروع کے چند برس عسکری انہی کے گھر میں رہے تھے۔ ماہ نو سے استعفیٰ دینے کے بعد جولائی 1950ء میں عسکری کو کراچی کے ایک نجی تعلیمی ادارے "اسلامیہ کالج میں" انگریزی کے استاد کے طور پر رکھ لیا گیا۔ یہ کالج وہاں کے ایک علم دوست شخص ایم اے قریشی نے قائم کیا تھا۔ یوں جولائی 1950ء سے لے کر اپنی وفات جنوری 1978ء تک 28 برس تک عسکری نے اسی کالج میں پڑھایا۔ اسلامیہ کالج میں پڑھانے کے دوران ہی لاہور کی یاد ہمیشہ اُنہیں ستاتی رہی لیکن اسلامیہ کالج کے طالب علموں کا تعلیمی ذوق اور ادب خصوصاً انگریزی میں ان کی دلچسپی دیکھ کر وہی ٹکے رہے۔

عسکری کے نزدیک پاکستان کو اسلام کی ان تہذیبی نمونوں کا امین بننا تھا جو مسلمانوں نے اپنے چودہ سو سالہ علمی، تمدنی، ثقافتی ادبی اور تعمیراتی وفنی روح کے تحت پیدا کئے تھے۔ قیام پاکستان کو عسکری مسلمانوں کی ملی تاریخ میں ایک بڑا تخلیقی تجربہ سمجھتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اس عظیم الشان تجربے کا تخلیقی ادب اور جمالیاتی فنون میں بھی اظہار ہونا چاہیے۔ اور اہل دانش طبقے کو اس بے حسی سے باہر آنا چاہیے جو انواں نے خود پر طاری کر رکھی ہے۔ عسکری ترقی پسندوں کی اس کاوش کے مداح تھے کہ انہوں نے ادب کو اپنے زمانے کے زندہ مسائل اور سماج وسیاست سے جوڑ دیا مگر عسکری برصغیر کے مسلمانوں کی ملی آرزوؤں اور مذہبی آدرشوں کو بھی ادب کا مسئلہ بنانا چاہتے تھے۔ ان کے نزدیک بڑے ادب کے لیے ضروری تھا کہ ادیب اپنے اندر ملک وقوم کے جذباتی اور اجتماعی مسائل کو اپنی شخصیت کا ایک اہم عنصر بنائیں۔ عسکری نے جس " پاکستانی ادب " اور "اسلامی ادب" کی بات کی تھی اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہونی چاہیے تھی کہ اس میں جھوٹ اور ریاکاری نہ ہو۔ وہ محتسب کا کوڑا نہ ہو بلکہ خود احتسابی کا عمل ہو انہوں نے ناصر کاظمی، حفیظ ہوشیار پوری جیسے شعراء اور سعادت حسن منٹو اور قدرت اللہ شہاب جیسے ادیبوں کی کہانیوں کو پاکستانی ادب کے نمونے قرار دیا تھا۔

1948-49 میں عسکری نے اسی پس منظر میں پاکستانی کلچر اور پاکستانی ادب کی بحثیں اٹھائیں تھیں لیکن 55-1951 میں جب انہیں اپنے ادبی آدرش ٹوٹتے نظر آئے تو وہ ادب کے زوال اور موت کی باتیں کرنے لگے تھے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ عسکری ان لکھنے والوں کے سخت خلاف تھے جو یا تو اپنے اردگرد کے مسائل سے بالکل لاتعلق ہو کر کسی خیالی اور مجرد "خالص ادب" کی دھن میں رہتے تھے (مثلاً جدیدیت اور حلقہ ارباب ذوق والے) یا صرف ترقی پسند نظریہ ادب کے حامی تھے۔ انہوں نے جب ان جدیدیت زدہ ادیبوں اور ترقی پسندوں کو برصغیر کے مجموعی مسلم شعور سے غافل پایا اور ساتھ ہی حکومت کی نااہلیوں، غلط فیصلوں اور کلچر جیسے معاملات کی طرف سے ادیب برادری کو غافل پایا تو ہمیشہ سخت ردِعمل کا اظہار کیا۔

عسکری نے پاکستان کی امریکہ کے ساتھ دوستی پر سخت تنقید کی اور روس کی طرف سے مصر کی حمایت پر تعریف کی۔ وہ دانشوروں صحافیوں کو جھنجھوڑتے تھے کہ صرف ادب وفن میں مست رہنے کی بجائے کچھ اپنے ملک قوم کا بھی سوچیں۔ جس پاکستان کا تصور محمد حسن عسکری کے ذہن میں

ہمیشہ سے تھا، پاکسانی حکومت کی اس تصور کی طرف غفلت شعاریوں کے سبب وہ اس سے مایوس ہونے لگے تھے اور ایوب کے مارشل لاء کے بعد تو وہ بالکل دلبرداشتہ ہو گئے۔

58-57 کا یہی عرصہ تھا جب عسکری کی زندگی میں آخری بڑی تبدیلی آئی۔ اور انہوں نے "پیروی مغرب" سے آگے نکل کر پوری مغربی تہذیب اور ادب پر ہی سوال اٹھانا شروع کر دیے اب وہ مشرقی سرچشموں کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے اور اس نتیجے پر پہنچے کہ مغرب اپنی دینی روایت کو گم کر چکا ہے۔ جبکہ ہماری دینی روایت پوری طرح محفوظ ہے۔ یہاں سے انہوں نے اردو کے ادبی وتہذیبی مباحث میں روایت کا ایک ایسا تصور متعارف کرایا جو ایک طرح سے عربی فارسی اور اردو زبان کے ادب، بلکہ تمام مشرقی تہذیبوں کے ادب، کے لیے بمنزلہ روح کے تھا۔ اس کے بعد اپنی وفات تک وہ مسلسل مغربی ادب وتہذیب میں اس تصور کی گم شدگی، وہاں پیدا ہونے والے روحانی انتشار پر لکھتے رہے اور دوسری طرف اردو کے روحانی سرچشموں کی بازیابی کی اہمیت جتلاتے رہے۔ اس دوران ان کے تعلقات کچھ فرانسیسی نومسلم علما اور ادیبوں سے بھی مسلسل رہے اور اُردو ادب اور دینی روایت کے مسائل پر ان کے لکھے مضامین فرانس کیجرائد میں بھی چھپتے رہے۔ آخری عمر میں عسکری نے مفتی محمد شفیع کی اردو تفسیر معارف القرآن کا انگریزی ترجمہ شروع کر رکھا تھا جو ان کی زندگی کا آخری کام ثابت ہوا۔

جیسا کہ ذکر ہو چکا محمد حسن عسکری کی زندگی کا بڑا حصہ اسلامیہ کالج کراچی میں تعلیم وتعلم اور تدریس میں گذرا تھا۔ اپنے کیریئر کے بالکل ابتدائی برسوں میں انہوں نے کچھ عرصے کیلئے دہلی اور میرٹھ کالج بھی پڑھایا تھا۔ اُسی دوران جب وہ ایم اے انگریزی کرنے کے بعد نوکری کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے تھے الہ آباد یونیورسٹی کے ان کے انگریزی کے استاد ستیش چندر دیپ نے، جنہیں عسکری آخری دم تک بڑے احترام سے یاد کرتے رہے، انہیں الہ آباد یونیورسٹی کے شعبہ انگریزی میں لیکچرر کے طور پر بلانا چاہا تھا لیکن عسکری نے معذرت کر لی تھی۔ یاد رہے اُس زمانے میں جب مسلمانوں پر ابھی ویسے ہی ملازمتوں کے باب بند تھے عسکری کو الہ آباد یونیورسٹی کے شعبہ انگریزی میں ملازمت کی پیش کش اور وہ بھی اپنے محبوب استاد کی طرف سے ہونا معمولی بات نہ تھی۔ بعد میں اسلامیہ کالج کراچی کے زمانے میں انہیں پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ انگریزی میں پڑھانے کی پیشکش اُس وقت کے وائس چانسلر اور عسکری کے دوست ڈاکٹر اجمل نے بھی کی

تھی۔مگر یہاں بھی عسکری راضی نہ ہوئے اور کراچی کے اسی پرائیویٹ کالج میں ہی پڑھاتے رہے تھے۔اسی زمانے میں اسلامیہ کالج کے شعبہ انگریزی میں ایک طرف پروفیسر کرار حسین جیسے استاذ الاستاتذہ بھی پڑھا رہے تھے جن سے عسکری کا نیازمندانہ تعلق میرٹھ کالج کے زمانے سے تھا، اور دوسری طرف شعبہ اردو میں معروف ترقی پسند نقاد پروفیسر ممتاز حسین جیسے لوگ بھی تھے۔ ایسے میں شعبہ انگریزی کی رونق جس استاد کے دم سے تھی وہ محمد حسن عسکری ہی تھے۔اس کالج میں بطور استاد ادیب اور بطور ایک قناعت پسند انسان کے عسکری صاحب کے جوہر طرح طرح سے کھلے تھے۔اسی کالج کے عرصہ ملازمت کے دوران ان کی زندگی میں وہ آخری بڑا انقلاب آیا جس میں انہوں نے تہذیبوں کے ضمیر میں پیوست ہو جانے والے سوالات اٹھا کر اردو زبان و ادب اور تہذیب وثقافت کو قیامت خیز مسائل سے آنکھیں چار کرنے کی طرف متوجہ کیا۔

یوں تو لاہور کے ابتدائی بیروزگاری کے زمانے میں بھی ان کے گھر کے دروازے طالب علموں کیلئے کھلے رہتے تھے اور بنا کسی رسمی تدریس اور ٹیوشن فیس کے انہوں نے مظفر علی سید جیسے ادیب کو فرانسیسی پڑھانی شروع کر دی تھی، لیکن اسلامیہ کالج کراچی میں تو وہ اپنے شاگردوں میں اس قدر مگن ہو گئے کہ پانچ چھ گھنٹے مسلسل پڑھاتے اور یونانی ادب سے لے کر جدید ادب تک کے پانچ پانچ پرچے اکیلے ہی پڑھا دیتے تھے۔

اُن کے پڑھانے کے انداز میں خطابت یا شاعری بالکل نہیں ہوتی تھی، انتہائی خشک منطقی طریقے سے پڑھاتے تھے۔ ایک دفعہ چھوٹی کلاس کے طلبا نے پرنسپل سے عسکری صاحب کے پڑھانے کے "بے مزہ" سے انداز پر شکایت کی تو پرنسپل نے انہیں اپنا انداز ذرا دلچسپ بنانے کا مشورہ دیا اس پر عسکری نے کھرا سا جواب دیا" آپ کوئی اور آدمی رکھ لیجئے"، اور یہ کہہ کر گھر چلے آئے۔ پرنسپل صاحب بہت سٹ پٹائے انہیں اس جواب کی ہرگز توقع نہیں تھی۔ بعد میں بہت منت گزاری کر کے عسکری صاحب کو منایا اور دوبارہ کالج میں لائے۔

بڑی کلاسوں کے طلبا البتہ ان سے بہت خوش تھے۔ان کے شاگرد جو پہلے زیادہ سے زیادہ ہارڈی اور آلڈس ہکسلے پڑھا کرتے تھے عسکری کی عالمانہ تدریس اور ادبی نظر کی وجہ سے ورجنیا وولف، جیمس جوئس، سارتر اور کامیو کو پڑھنے اور ان پر مضمون لکھنے کے قابل ہو گئے تھے۔ پہلے دو دفعہ کے تدریسی تجربے کے برعکس اسلامیہ کالج میں عسکری نے بھی اپنے طلبا کے درمیان خود کو

بہت ہم آہنگ پایا تھا۔ کیونکہ خود طلبا کی ذہنی سطح پر اترنے کی بجائے انہوں نے اپنے شاگردوں کو اپنی سطح پر رکھنے کے قابل بنا لیا تھا۔ان کے خیال میں زندگی کو جائے عبرت یا جائے حسرت نہیں بلکہ جائے حیات ہونا چاہیے۔ یہی شے انہوں نے اپنے شاگردوں کو بھی سیکھا دی تھی۔ وہ جب ادیبوں سے مایوس ہونے لگتے تو طلبا کو ہی اپنا مخاطب بنا لیتے اور ان کے سوالات کو چیلنج کے طور پر قبول کر کے زندگی اور ادب کی تفہیم کے نئے راستے نکالتے تھے۔ پڑھانے میں ان کو اتنا لطف اور سکون ملتا کہ چھٹیوں میں گھر میں بھی کلاسیں شروع کر دیتے تھے۔سمجھدار قسم کے طلبا کا تو یہ رویہ تھا کہ اگر بڑا بھائی عسکری سے پڑھا ہے تو اس کی اور اس کے والدین کی خواہش ہوتی کہ چھوٹا بچہ بھی انہی کا شاگرد بنے۔ان کے شاگردوں کا کہنا تھا کہ ہم عسکری سے صرف انگریزی ادب نہیں پڑھتے تھے بلکہ دنیا جہاں کے ادب سے آگاہی سیکھتے تھے۔ان سے پڑھنے کا مطلب تھا کل زندگی کو پڑھنا۔

اپنی زندگی کی طویل ترین نوکری عسکری نے اسلامیہ کالج میں کی تھی اور وہ اس اعتبار سے واقعی "نوکری" تھی کہ افسری انھیں آتی ہی نہ تھی۔ جب ان کا کالج بھی سرکاری تحویل میں آ گیا تو عسکری کو سینئر پروفیسر ہونے کی بنا پر پرنسپل بنا کر اندرون سندھ بھیجنے کی تجویز بھی آئی تھی۔انہیں کئی بار اپنے کالج کا پرنسپل بننے کی پیشکش بھی ہوئی مگر وہ ہمیشہ انکار کرتے رہے۔ ایک دفعہ پرنسپل کی بیماری کے سبب انہیں عارضی طور پر پرنسپل کا عہدہ سنبھالنا پڑ گیا تو اسے "فضول کی مصروفیت" گردانا۔ وہ پرنسپل کے آفس میں پرنسپل کی کرسی پر نہیں بیٹھتے تھے۔ بلکہ ساتھ کے صوفے پر بیٹھ کر کاغذات نپٹاتے تھے۔کسی صاحب کے پوچھنے پر کہ " آپ کرسی پر کیوں نہیں بیٹھتے؟"، عسکری کا مختصر جواب تھا" یار پھسلتی ہے"۔

کالج میں وہ اکثر چھوٹے دروازے سے داخل ہوتے اور سیدھے اپنے کمرے میں چلے جاتے۔ کلاس اگر چھوٹی ہوتی تو شاگردوں کو اپنے کمرے میں ہی بلا لیتے تھے۔ جب بی اے کو اختیاری انگریزی پڑھانے لگے تو طلباء کی تعداد بڑھتی گئی۔ کلاس میں طلباء کو اکثر کھڑا رہنا پڑتا تھا۔لیکن کلاس کے نظم وضبط میں فرق نہ آنے دیتے تھے۔لیکچر کے دوران سگریٹ اور پانی کا گلاس ان کے پاس رہتا۔ پانی کا گھونٹ اور گولڈ فلیک کا کش انہیں تازہ دم رکھنے کو ضروری ہوتا۔ البتہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد چشمہ درست کرتے جانا محض عادت کا حصہ تھا۔ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ رمضان میں

کلاس لیتے ہوئے پانی کے گھونٹ بھی لئے جا رہے تھے۔ایک طالب علم نے کچھ طنزیہ انداز سے کہا" سر جب آپ پانی پی رہے ہیں تو سگریٹ بھی پی سکتے ہیں"۔عسکری نے شکریہ کہہ کر سگریٹ سلگا لی اور طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے لیکچر اسی انہماک سے جاری رکھا۔کلاس میں وہ گفتگو کی فضا رکھتے تھے۔دھواں دھار تقریر ان کے بس کی بات نہ تھی۔ابتدائی کلمات کے بعد وہ نثر کے حصے طلباء □ سے پڑھواتے۔بیچ بیچ میں سوالات پوچھتے،ان کے جوابات سننے کے بعد تصحیح کرتے، سیاق وسباق پر روشنی ڈالتے اور نوٹس بھی لکھوایا کرتے تھے۔لیکن کسی ہنگامی صورت حال میں گر وقت کی کمی کے باعث طلبا کے لئے کارلائل کی 'پاسٹ اینڈ پریزنٹ' جیسی کوئی ضخیم کتاب خود پڑھنا ممکن نہ رہتا تو عسکری ایک دو دن میں اسے پڑھ کر کتاب کے اہم حصوں کا خلاصہ کر دیتے اور شاگرد امتحان پاس کر کے شاد کام ہوتے۔اسلامیہ کالج کے بانی ایم اے قریشی اگرچہ خود زیادہ پڑھے لکھے نہ تھے مگر عسکری کے بہت قدر دان تھے اور ان کی تنک مزاجی کے باوجود اس پر فخر کرتے تھے کہ ان کے کالج میں عسکری جیسا عالم موجود ہے۔ان سے پڑھنے والوں کا تجربہ تھا کہ وہ کسی موضوع پر پڑھاتے ہوئے طلبا کو خود کفیل کر دیا کرتے تھے۔ان کے ایک شاگرد سید جمال الدین نقوی نے اپنی دلچسپ سوانح حیات Behind Left the Leving میں اسلامیہ کالج میں عسکری کے طرز تدریس کو ایک جامع فقرے میں سمو دیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ عسکری ایک Device Saving-Labour تھے کیونکہ اپنے لیکچرر کے دوران وہ طلبا کو کسی موضوع پر ہر کتاب سے بے نیاز کر دیا کرتے تھے۔وہ ہر چیز کے بارے میں ہر کسی کی کہی ہر بات بتا دیا کرتے تھے۔اصل انگریزی فقرہ یوں ہے:

"Then there was M.H. Askari, the 'Scholar gypsy who was considered an effective 'labor-saving device' because during his lectures he used to tell every thing said by every body about every thing. His lectures all but eliminated the need to consult any other book."

قریبی دوستوں کی محفل میں عسکری خوب ہنستے بولتے تھے لیکن کسی اجنبی کے آجانے پر خاموش ہو جاتے شہرت کی خواہش تو انہیں کبھی بھی نہ تھی لیکن آخری دور میں یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ ادیبوں

کی بحث میں کبھی ان کا نام نہ آ؟ انہوں نے نے جتنی گم نامی کی خواہش کی ان کی تحریریں اتنی ہی چمکیں۔ان کے اٹھائے ہوئے مباحث آج بھی زندہ ہیں۔ رسالہ ساقی میں "جھلکیاں" کے عنوان سے کالم لکھے، تراجم کیے۔ اپنی زندگی میں انہوں نے دو افسانوی مجموعے جزیرے اور قیامت ہم رکاب آئے نہ آئے اور دو تنقیدی مجموعے انسان اور آدمی اور ستارہ یا بادبان چھپوائے تھے۔ان کی ذاتی لائبریری میں کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ موجود تھا لیکن اُن کی اپنی کوئی کتاب وہاں سے نہ ملتی تھی۔ انہوں نے 16 صدی کے بعد کے یورپ وامریکہ کی تمام فکری، تہذیبی اور ادبی تاریخ وتحریکوں اور ان سے جنم لینے والے عہد جدید کے شعور کو صرف اپنی ادبی تربیت وحسیت سے جان کر روائتی مذہب، تصوف اور مابعد الطبیعات کی روشنی میں اس کا کچا چھٹا کھول کر رکھ دیا تھا۔

اپنی تحریروں میں وہ ایک سچے نقاد کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آتے ہیں بغیر تعصب کے سچی بات بلا خوف کہتیہیں، اسی سچائی کی وجہ سے وہ ہمیشہ متنازعہ نقاد رہے۔ان کا خیال تھا کہ جب تک چیزوں کے بارے میں ہمارا طرزِ احساس نہیں بدلے گا اُس وقت تک نئی صداقتیں سامنے نہیں آ سکتیں۔ادبی جمود کی وجوہات بیان کرتے ہوئے اُردو نقادوں کو اس کا ذمہ دار ٹھہراتے تھے کہ وہ تخلیق کاروں کو اس خوش فہمی میں مبتلا کر رہے ہیں کہ ہمارا ادب خوب ترقی کر رہا ہے جب کہ ایسا نہیں ہے۔ہمارے شاعروں نے مغربی ادیبوں کی نقل کرتے ہوئے پھولوں اور چڑیوں پر لکھا اور مشرقی روایات تہذیب اور ضروریات کو نظر انداز کیا ہے۔

بیسویں صدی کے تمام ادیبوں میں عسکری کا اسلوب نثر اپنی مثال آپ تھا۔افسانے سیلیکر تنقید اور بیسویں صدی کے چند اہم ترین ناولوں کے تراجم سے لیکر اردو نثر کے اسالیب کی کوتاہیوں کے بیان تک انہوں نے اردو میں ایک ایسی نثر کا نمونہ پیدا کیا جو خیال اور تجربے کی کلی وحدت کو یک آنی منظر کے طور پر بیان کرنا سکھاتی ہے۔

ان کا تاریخی نام، جیسا کہ شروع میں بیان ہوا، اظہار الحق تھا۔وہ کلاس میں ایک روز طلبا سے مخاطب تھے اور کہہ رہے تھے کسی شے کو اس کے نام سے جاننا اس کی علامتی تسخیر کے مترادف ہے۔ اس لئے بعض قبائل آج بھی اپنا اصل نام کسی کو نہیں بتاتے کہ مبادا وہ تسخیر ہو کر رہ جائے۔ایک ذہین شاگرد فوراً اٹھا اور کہا کہ "میرے دو نام ہیں، ایک اصل ایک عرفیت"! عسکری بولے "میرے

بھی دو نام ہیں میرے دوسرے نام کی وجہ سے ترقی پسند مجھ سے خفا رہتے ہیں وہ ہے 'اظہار الحق' عسکری کا یہ نام اظہارالحق کبھی استعمال نہیں ہوا۔ بھائی بہنوں کو بھی ان کے انتقال کے بعد پتہ چلا تھا۔عسکری نے خود یہ نام، گو، کبھی چھپایا تو نہیں مگر اس کا اظہار کم کیا۔لیکن حق کا اظہار وہ ساری زندگی کرتے رہے۔ جب وہ جدیدیت پسند تھے تو فن اور فکشن کے پردے میں تہذیب نفس کے اصول بیان کرتے ہوئے اور زمانہ آخر میں حق کو تمام آمیزشوں سے پاک کر کے ظاہر کرتے رہے۔شاید اسی لئے ان کے ادبی بھائی بہن ان سے ہمیشہ خفا رہے۔

اُردو کے اس بے مثل افسانہ نگار، نقاد اور انگریزی ادبیات کے استاد محمد حسن عسکری کا انتقال ?? / جنوری ???? ءکو کراچی میں ہوا۔صبح وہ حسب معمول کالج کے لئے گھر سے نکلے مگر کالج کے قریب ہی اچانک دل کا دورہ پڑا اور چلتی سڑک پر گر گئے ۔ٹیکسی پر انہیں گھر پہنچایا گیا۔اس وقت ہوش میں تھے۔شیروانی کی جیب سے کرایہ نکال کر ٹیکسی والے کو دیا۔ زینے چڑھ کے اپنے کمرے میں گئے ،چپ چاپ پلنگ پر لیٹے اور ڈاکٹر کے آنے سے پہلے صبح آٹھ نو بجے کے قریب دوسرا دورہ پڑا اور وہ اللہ کو پیارے ہو گئے ۔ان کی نماز جنازہ جناب تقی عثمانی نے پڑھائی اور تدفین دارالعلوم کراچی کے قبرستان میں مفتی محمد شفیع کے ساتھ ہوئی۔ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ باتیں کرتے کرتے اچانک گھڑی دیکھتے اور اٹھ کھڑے ہوتے۔ یاروں سے کہتے ،لو تم یہ رسالہ دیکھو، میں ابھی آیا اور نماز پڑھنے چلے جاتے ۔جتنی جلدی اور اچانک انہوں نے رخت سفر باندھا اتنی تیزی سے ہی تو وہ نماز پڑھنے ہی جاتے تھے۔ عسکری رخصت ہو گئے مگر ان کی تحریریں رخصت نہیں ہوئیں۔انہوں نے جتنی گمنامی کی خواہش کی ان کی تحریریں اتنی ہی چمکیں۔کوئی چار پانچ سال کا عرصہ ایسا نہیں گزرتا جس میں وہ نئے سرے سے زیر بحث نہ آجاتے ہوں۔

محمد حسن عسکری کا خیال ہے کہ ناقدین لکھنے والوں کی تعریفوں کے پُل باندھ دیتے ہیں اور فنکار یہ سمجھتا ہے کہ وہ صحیح سمت سفر کر رہا ہے اور اس کی تخلیقی کاوشیں اپنے عہد روایات اور تہذیب کی ذمہ داری پوری کر رہی ہے۔ادبی جمود کی ایک وجہ بتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہمارے ادیبوں میں اتفاق نہیں ان میں لکھنے کی صلاحیت تو ہے مگر ہم سفری کا احساس نہیں،کوئی ادیب یا شاعر خواہ کتنا نامور ہو

محض اپنے بل بوتے پر کسی زبان کو نئی زندگی نہیں دے سکتا جب تک لاشعوری طور پر اُسے دوسروں کی رفاقت حاصل نہ ہو حسن عسکری کو دلچسپ اور جاذب جملے لکھنے میں مہارت تھی اور وہ اس بات سے خوب آگاہ ہیں کہ ادب کوئی من وسلویٰ نہیں جو آسمان سے زمین پر آتا ہے بلکہ ہمارے جذبات واحساسات کا نمائندہ ہوتا ہے اور یوں ادب پر صدیوں کے ان گنت تجربات ہوتے ہیں اچھا لکھنے کے لیے اچھا پڑھنا اور دوسرے ادیبوں کی رفاقت کا احساس بھی ضروری ہے۔

پروفیسر محمد نواز طائر

ڈاکٹر سلمیٰ شاہین

پروفیسر محمد نواز طائر صاحب بہت عظیم شاعر، ادیب، محقق، نقاد، مترجم اور مؤلف تھے۔ تقریباً ۷۵ کتابوں کے مصنف رہے ہیں اور ان کی خاموشی اور خودنمائی نہ کرنے کی وجہ نے ان کو اس زمانے تک مشہور نہیں کیا تھا۔ (گناہ دچاوہ) ''قصور کس کا تھا'' اس انداز کی تحریر تھی جو حقیقت پر مبنی تھی۔ رومانی بھی تھی اور ٹریجیڈی بھی۔ محمد نواز طائر جو روایتی پشتون معاشرے کے ایک فرد تھے۔ انہوں نے اس سلیقے سے اس افسانے کو اس کے کردار قصے کو اس انداز سے نبھایا کہ جونہی افسانہ اختتام کو پہنچتا ہے تو دل اور آنکھیں دونوں رونے لگتی ہیں۔ میں جو ایک حساس ذہن رکھتی ہوں۔ اس افسانے کی چاپ لیے ہوئے آگے بڑھتی رہی اور یہ کہانی جس کی بعد میں مجھے سمجھ آئی کہ غیرت کے نام، عزت کے نام اور آنر کلنگ کا پہلا افسانہ تھا جو پشتون معاشرے میں اب بھی رواج پا رہا ہے۔ جب میں نے بی اے کیا تو پشتو ادبیات میں ماسٹر کرنے کا ارادہ کیا۔ اور یہیں میری ملاقات پروفیسر محمد نواز طائر صاحب سے ہوئی۔ ظاہری شکل وصورت سے پروفیسر محمد نواز طائر صاحب مجھے سرخ اور سفید رنگت مغربی لباس زیب تن کیے ہوئے قلم ہاتھ میں لیے اور ہمیشہ کتاب پر جھکے ہوئے انھیں پایا۔ ۱۹۷۷ء کا زمانہ تھا اُن سے بڑی مشکل سے بات ہوا کرتی تھی۔ اور میں ان کو ہمیشہ آتے جاتے دیکھا کرتی اور یہ دیکھ کر میں خوش ہوتی تھی کہ یہ وہ شاعر وادیب ہے جنہوں نے (گناہ دچاوہ) ''قصور کس کا تھا'' جیسا افسانہ تخلیق کیا تھا۔ پشتو ادبیات میں ماسٹر کرنے کے بعد جو میری باقاعدہ پشتو اکیڈیمی میں جونیئر ریسرچ آفیسر کی حیثیت سے تقرری ہوئی تو میں نے پروفیسر محمد نواز طائر کو بے انتہا کم گو اور سنجیدہ پایا۔ میں نے ان کو کبھی بھی بے مقصد گفتگو کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ میں نے ان کے ساتھ زندگی کے بیس سال بہ حیثیت ماتحت گزارے۔

وقت کی پابندی، فرائض کی ادائیگی اور کام کے ڈسپلن کا وہ معیار جو انہوں نے رکھا تھا۔ کبھی کسی ایڈمنسٹریٹر کو میں نے نہیں دیکھا۔ صبح آٹھ بجے دفتر کا ٹائم اور پونے آٹھ بجے وہ حاضر ہوتے تھے۔ دو بجے آفس سے جانے کا وقت ہوتا تھا تو پورے دو بجے نکلتے تھے اور باقی پورا دن ہم دفتروں میں اور اپنے دفتر میں کام کرتے تھے۔ البتہ ڈائریکٹر پشتو اکیڈیمی کی حیثیت سے ہمیشہ Explanation Orders Letters کا جواب دیتے رہتے۔ شائستگی کا یہ عالم تھا کہ کوئی ماتحت لیٹ ہوتا تو اس کو بھلا کر گھڑی کو دیکھتے ہوئے یہ ہمیشہ فرماتے تھے کہ شکر ہے آپ کی صبح گیارہ بجے ہوگئی۔ اور یہی وجہ کہ ان کی تربیت یافتہ لوگ ہمیشہ وقت کی پابندی اور فرائض کی ادائیگی اور ڈسپلن کو اپنی زندگی میں قائم رکھ کر کامیابیاں حاصل کیں۔ میں بھی خود کو ان خوش قسمت ترین لوگوں میں شمار کرتی ہوں۔

پروفیسر محمد نواز طائر کبھی نرمی کبھی سختی سے اپنے ماتحتوں سے کام لینا جانتے تھے۔ اور تحقیقی کاموں میں رہنمائی اس انداز سے کرتے جیسے باپ اپنے بچوں کی تربیت کر رہا ہے۔ اس زمانے میں تحقیق اتنی عام نہیں تھی۔ نہ ہی کوئی ادبی ادارہ ایسا کام کرتا تھا۔ پشتو اکیڈیمی پشاور یونیورسٹی پہلا تحقیقی ادارہ ہے جو ۱۹۵۵ء میں قائم ہوا اور اس میں تحقیقی کام کا سلسلہ ابھی جاری رہا۔ اس باوقار ادارے پشتو اکیڈیمی کے بارے پروفیسر محمد نواز طائر نے اپنی خودنوشت (ادب تراش) میں اس کی پوری تاریخ بیان کی ہے۔ پشتو اکیڈیمی میں جتنے بھی سکالرز، ڈائریکٹر گزرے ہیں۔ ان میں پروفیسر محمد نواز طائر نے کیا۔ پروفیسر طائر صاحب ایک محنتی کارکن تھے۔ فطری طور پر ان کے مزاج اور رجحان تحقیق کی طرف مائل تھی۔ انہوں نے وقت ضائع نہیں کیا اور یہی وجہ ہے کہ ان کی علمی، ادبی اور تحقیقی مقام پشتو ادب کے حوالے بہت ہی مستند ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے حصے کا جو کام انہیں سونپا، انہیں بہت احسن طریقے سے اپنی ڈیوٹی نبھائی اور اپنے ماتحتوں کو ایسی تربیت دی کہ ان کی کمی بہت زیادہ محسوس نہیں ہوئی۔

پروفیسر محمد نواز طائر کی ادبی اور تحقیقی مقام سے قومی سطح پر اور بین الاقوامی سطح پر کسی کو انکار نہیں کیا۔ انہوں نے ہر زبان میں لکھا۔ اور ہر زبان سے پشتو میں تراجم کئے۔ وہ بہت سی کتابوں کے مؤلف بھی ہیں۔ ان کو فارسی، پشتو، انگلش، بنگالی، چینی زبانوں پر عبور حاصل تھا۔

ان کا تحقیقی کام ایک صدی پر محیط ہے۔ ان کی شخصیت کبھی بھی متنازعہ نہیں رہی۔ ان کو کوئی سیاسی وابسطی نہیں تھی محمد نواز طائر صاحب کو ایک محقق، شاعر، ادیب اور ایک جینئس کے طور پر جانا

پہچانا جائے گا۔ ادب، شاعری، تاریخ پشتو زبان کی ان کی محبت تاحیات قائم رہی۔ پشتو اکیڈیمی سے ریٹائرڈ ہونے کے بعد بھی یہ جاری رہا۔ پشتو اکیڈیمی سے جولائی ۱۹۹۴ء سے ریٹائرڈ ہوئے اور ۲۰۱۷ء تک عمر کے آخری حصے تک ان کی شاعری، تحقیق اور نثر کا تازہ تصانیف نئے انداز اور دنیا میں رونما ہونے نئے حوادث کے ساتھ مل جاتی تھی۔ وہ پیدائشی لکھاری تھے۔ ان کی کمٹمنٹ ان کی قلم سے تاحیات قائم رہی۔ ریٹائرمنٹ کے وہ تمام تصانیف اپنے اخراجات پر شائع کرتے رہے۔ مجھے یہ کہنے میں عار محسوس نہیں ہوتی کہ جو بھی کام انہوں نے کیا آئندہ آنے والی نسلیں اور نسلوں کے لیے اتنا کیا کہ سینکڑوں لوگ بھی وہ کام نہیں کر سکتے۔ اُن کا جینا اور مرنا قلم اور کتاب تھا اور ۲۰۱۶ء ہی میں پاکستان اکیڈیمی آف لیٹرز کے آخری کانفرنس میں شریک ہوئے اور میں نے ان کو انہیں خود سیڑھیاں چڑھتے دیکھا جو ان کی صحت کی کمزوری کی وجہ سے ان کو دیکھتے پیش آرہی ہے۔

ان کی ادبی خدمات پر حکومت پاکستان نے انہیں تمغۂ امتیاز اور تمغۂ حسنِ کارکردگی سے نوازا۔ ان کے ساتھ ایک گھنٹہ گزارے ہوئے بھی انسائیکلوپیڈیا جسے علم حاصل ہوجاتا تھا۔ وہ چلتے پھرتے اکیڈیمی تھے۔ اس سے پہلے کہ میں ان کے کیے ہوئے کام کا تذکرہ کروں اُن کی زندگی اور تعلیم کے متعلق کچھ عرض کروں۔

پروفیسر محمد نواز طائر صاحب پشتو میں آزاد اور معریٰ نظم کے بانی شاعروں میں شمار ہوتے ہیں۔ انہوں نے پہلی آزاد نظم تش کاغذ ۱۹۵۸ء میں لکھی۔

پروفیسر محمد نواز طائر علم و ادب کا وہ سرچشمہ ہے جو پشتو ادب کے پیاسے لوگوں کی پیاس بجھاتے ہیں۔ وہ شمع علم کے پروانے تھے اور خود شمع کے مانند بھی خود ایک زندہ کتاب ہے۔ پشتو ادب کے دنیا کی ایک نہ تھکنے والا محنت کش، جن کو تاج سعید صاحب نے پشتو ادبیات کا پکھیرو یا نچنی دلکش نام دیا ہے۔

پروفیسر محمد نواز طائر کو ملک کے اندر اور ملک سے باہر ایک دنیا جانتی ہے۔ اُن کی تحریروں سے واقف ہے۔ انہوں نے اپنی ملازمت کے دوران ہر علمی، ادبی شخصیت اور اداروں سے اپنے تعلقات قائم رکھے تھے۔ میں ان کو جتنا پڑھا ایک ادنیٰ طالب علم کی حیثیت سے انہوں نے مجھے متاثر کیا۔ پروفیسر محمد نواز طائر تحقیقی، ادبی، علمی مقام اور اپنی مادری زبان کے لیے ان کی خدمات

کے حوالے سے کچھ لکھنے سے پہلے ان کی زندگی کی مختصر حالات قارئین کی نظر کروں۔

پروفیسر محمد نواز طائر ملاکنڈ ایجنسی میں تانڑہ نامی گاؤں میں جولائی ۱۹۳۴ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد محترم کا نام عبدالاکبر خان تھا۔ قبیلے کے لحاظ سے خانخیل بائزے یوسفزئے ہے۔ عرب اور پشتونوں کے خوانین کے قدیمی دستور کے مطابق اپنی زندگی کے ابتدائی پانچ سال کا زیادہ تر حصہ ایک ایسے گھرانے میں گزارہ جو محنت، مشقت اور دوسروں کی دہقانی کرکے اپنا رزق پیدا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ محمد نواز طائر صاحب کے تحریروں میں زندگی کی حقیقی عکاسی اور نمائندگی ملتی ہے۔ عام لوگوں کی زندگی ان کی مجبوریاں، تکالیف جن کو انہوں نے قریب سے دیکھا اور بعد میں ان کی تخلیق اور تحریر میں نمایاں نظر آنے لگا۔ بچپن سے وہ اس کا اظہار کرتے رہے۔ طائر صاحب کہا کرتے تھے کہ اس وقت سے لاشعوری طور پر معاشرے کے عام طبقوں میں تفریق کو میں نے ہمیشہ محسوس کیا اور یہی سے اس طبقاتی نظام کے خلاف میرے دل میں بغاوت اور احتجاج میرے ساتھ ہی بڑا ہوتا رہا۔ جن کے لوگوں کے ساتھ انہوں نے زندگی کے ابتدائی پانچ سال گذارے۔ ان سے ان کی وابستگی اپنے حقیقی ماں باپ سے بہت زیادہ تھی۔ اور ہمیشہ ان کے روزمرہ کے کام وہ خود ہی کرتے تھے۔ فرماتے تھے ان کے ساتھ کام کرتے ہوئے میں بہت خوشی محسوس کرتا تھا۔

سکول کے طالب علم تھے ساتویں جماعت میں پڑھتے تھے۔ اس وقت سے شعر و ادب کے شوقین تھے۔ یہ اپنے خاندان کا اکیلا لڑکا تھا جو شعر کے لیے طبع موزدہ رکھتے تھے اور شاعری بھی کرتے تھے۔ ہر وہ نئی بات جو خاندانی روایات کے بارعکس ہوا اس کی مخالفت ہوتی ہے۔ یہی بات تھی کہ ان کے والد صاحب ان کے خلاف ہوگئے اور ایک دن ہم نے سُنا کہ ان کو باپ نے بہت ڈانٹا اور نوبت یہاں تک آئی کہ طائر نے اپنے معصوم جذبوں اور خیالات کا چھوٹا مجموعہ آگ کے شعلوں میں جلا لیا اور خود جلتا رہا۔

یہ ان کا شعری مجموعہ جو ۱۹۴۷ء میں جل گیا تھا لیکن معاشرتی زندگی کے فرسودہ روایات اور نظام کے خلاف لکھی ہوئی پہلی کتاب اب بھی ''دمینے استازے'' غیر مطبوعہ حالت میں محفوظ ہے۔ یہ کتاب اس انداز سے لکھی گئی ہے کہ نوجوان طائر نے بہت سالوں پہلے ۱۹۶۹ء کے بعد ملک ہی میں آنے والے بے چینی اور افسوسناک واقعات کی پیشگوئی کی تھی۔

پروفیسر محمد نواز طائر صاحب نے گورنمنٹ ہائی سکول تانڑہ سے میٹرک کا امتحان ۱۹۵۱ء میں پاس کیا اور تعلیمی سلسلے کو آگے بڑھانے کے لیے تاریخی اسلامیہ کالج پشاور میں فرسٹ ائیر میں داخلہ لیا۔ اسلامیہ کالج کی علمی فضا اور سازگار ماحول نے ان کے پشتو ادب سے محبت اور لکھنے کے لیے ان کا راستہ ہموار کیا۔ اس کے باوجود ان کے ارمانوں، خواہشوں کی تخلیق کا پہلا مجموعہ والد کے ہاتھوں نذر آتش ہوا تھا۔ لیکن اُن کے دل میں پشتو ادب سے محبت کی چنگاریاں بجھی نہیں تھی اور یہاں سے ان کے ادبی سرگرمیوں کا باقاعدہ آغاز ہونے لگا۔

پروفیسر محمد نواز طائر صاحب اسلامیہ کالج کے مشہور میگزین ''خیبر'' کے ایڈیٹر رہے۔ پورے چار سال تک اس میگزین کی ادارت کرتے رہے اور بعد میں اس کے نگران بھی رہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے سرگرم کارکن بھی رہے اور کالج کے جیوگرافیکل سوسائٹی کے بانی ممبر بھی رہے۔ آپ کالج کے بزمِ ادب کے ایک فعال رکن تھے۔ اور بعد میں اس کے جنرل سیکریٹری بھی مقرر ہوئے۔ ۱۹۵۵ء میں انہوں نے اسلامیہ کالج پشاور سے بی اے پاس کیا اور پھر گورنمنٹ کالج لاہور میں جغرافیہ میں ایم اے کرنے کے لیے چلے گئے۔ وہاں جغرافیہ میں ماسٹر کرنے کے بعد انہوں نے پشتو میں آنرز کیا۔

پروفیسر محمد نواز طائر صاحب اسلامیہ کالج کے طالب علمی کے زمانے سے ہی اردو پشتو دونوں زبانوں میں شاعری کرتے تھے۔ افسانے اور مضامین بھی لکھا کرتے تھے۔ اور اسی وجہ سے اسلامیہ کالج پشاور یونیورسٹی سے منسلک پشتو اکیڈیمی کے ڈائریکٹر مولانا عبدالقادر سے ان کی ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ مولانا صاحب پروفیسر محمد نواز طائر صاحب کی ان صلاحیتوں سے بخوبی واقف تھے۔ جغرافیہ میں ماسٹر کرنے کی وجہ سے ان کو سوات کے جہانزیب کالج میں لیکچرر کی حیثیت سے کام کرنے کی پیشکش ہوئی۔ جو انہوں نے قبول نہیں کی۔ اور مولانا عبدالقادر پشتو اکیڈیمی کے بانی ڈائریکٹر کے کہنے پر ۱۹۵۸ء میں انہوں نے پشتو اکیڈیمی میں ریسرچر کی حیثیت سے کام شروع کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ طائر صاحب نے اپنا درسی مطالعہ بھی جاری رکھا۔ ۱۹۶۳ء میں انہوں نے فارسی اور ۱۹۶۴ء میں پشتو زبان میں پشاور یونیورسٹی سے ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔

۱۹۶۳ء میں ان کو ''آدم درخانئ'' ایک رومانی داستان پر علمی اور ادبی تحقیقی مقالہ لکھنے پر

اباسین آرٹس کونسل کی طرف سے بہترین تحریر پر اول انعام دیا گیا۔ ان کی طبیعت تحقیق کے لیے بہت ہی سازگار تھی اور فطری طور پر اس طرف مائل تھے۔ مطالعے کے شوقین تھے اور پشتون معاشرے کے روایات اور ماحول سے بخوبی واقف تھے۔ ان کے مسائل کے حل اور پشتونوں کو جہالت کے اندھیرے ان کی اصلاح کرنے پر غور کرتے رہے۔ محترم طائر صاحب اور بھی پڑھنے کا شوق تھا لیکن ملازمت کی ذمہ داریوں کی وجہ سے آگے اور امتحانوں کا سلسلہ انہوں نے روک گیا اور پشتو اکیڈیمی میں تحقیق کے کام پر خاص توجہ دی۔ ۱۹۶۵ء میں ان کو پشاور یونیورسٹی کی طرف سے بہترین کارکردگی کا ایوارڈ بھی دیا گیا۔

پروفیسر محمد نواز طائر صاحب کی ادبی خدمات کی فہرست بہت لمبی ہے۔ ادب کے میدانوں نظم اور نثر میں ایک ہی طرح کی قلم کی جادو بیانی کی مثال نہیں ملتی۔ نظم میں غزل، آزاد نظموں اور نثر میں تحقیقی مضامین، افسانہ، تنقید، دیباچے، اداریہ، تراجم، تاریخ اور تدوین وغیرہ موضوعاتوں پر کام کیا ہے۔ پشتو شاعری میں آزاد نظم کے بانی شاعروں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر راج ولی شاہ خٹک لکھتے ہیں:

ترجمہ:

''پروفیسر محمد نواز طائر صاحب طرز شاعر ہے۔ ان کے شعر کا مضمون زیادہ تر زندگی کے ان حقیقتوں کا اظہار ہے جو انسانی نفسیات، شعور اور لاشعور دونوں میں ایک ساتھ گھومتے رہتے ہیں۔ لیکن ذات ادراک نہ رکھنے والی اس کی پڑا (پرواہ) نہیں کرتے۔ اس میں بنیادی صنف تحقیق کا المیہ ہے۔ طائر صاحب زندگی کا گہرا تجربہ رکھتے ہیں وہ بنیادی طور پر شاعر ہے اور حُسن کی کیفیت سے خط لینا جانتے ہیں''۔

ان کا جمالیاتی مشاہدہ بکھرا ہوا ہے۔ جمالیات اگر فرد میں ہے یا کائنات میں۔ طائر صاحب ان کا طلب گار بھی ہے اور قدر دان بھی لیکن پشتونولی کے حیا کے سخت قانون نے طائر صاحب کے خوبصورتی کے انداز کو بیان کرنے کے لیے حیاناک اظہار کا انداز بخشا ہے۔ سنجیدہ فکر اور اچھے اقدار و اخلاق کے مالک ہیں۔ انہوں نے گلی کوچوں اور بازاری زبان کبھی استعمال نہیں کی اور ویسے بھی وہ ایک تنقیدی شعور رکھنے والے زندگی کا عالم ہے۔ اور وہ الفاظ کے استعمال کے اچھے طریقے کو جانتے ہوئے ایک ہنرمند فنکار ہے۔

پروفیسر محمد نواز طائر صاحب نے پشتو اکیڈیمی میں ۱۹۵۸ء میں کام شروع کیا اور تقریباً جولائی ۱۹۹۴ء میں پشتو اکیڈیمی سے ریٹائرڈ ہوئے۔ طائر صاحب تقریباً ۱۷ سال پشتو اکیڈیمی کے ڈائریکٹر رہے۔ آپ ریٹائرمنٹ کے بعد بھی انہوں نے اپنے تخلیقات اور تحقیقات کا سلسلہ جاری رکھا اور ریٹائرمنٹ کے بعد تقریباً ۲۱ سال لکھتے ہی رہے۔ ان کے قلم سے کمٹمنٹ آخری دم تک قائم رہی۔ اپنے دوست احباب سے ملنا اپنا فرض سمجھتے تھے ادبی کانفرنسوں، تنظیموں کے اجلاس میں باقاعدہ شرکت کرتے تھے لیکن زندگی نے کبھی بھی کسی سے وفا نہیں کی۔ آپ ۲۰۱۷ء میں اس جہانِ فانی سے رخصت ہوئے۔

۲۰۱۷ء میں پشتو اکیڈمی کی ایک طالبہ نے پروفیسر محمد نواز طائر کی زندگی اور ادبی خدمات پر پشاور یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔

ادبی، علمی اور تحقیقی آثار

۱۔ پہ عرفان دمحمد: نعتیہ مجموعہ ۲۰۰۲ء میں شائع ہوئی۔
۲۔ خوبونہ خپل کلیې کښې: یہ ہائیکو کا مجموعہ ۲۰۰۱ء میں شائع ہوئی۔
۳۔ دژوند سندرہ: یہ ایک طویل نظم ہے جو ۲۰۰۵ء میں شائع ہوئی۔
۴۔ نالیدلے سوات: یہ سوات کے خوبصورت علاقے کے رپورتاژ ہے جو ۱۹۶۵ء میں شائع ہوئی۔
۵۔ پہ پښتنو ادب کښې د ماشومانو سندرې اور صوتونہ: یہ بچوں کے کھیل کود کے وقت کے نغمے اور صوتوں کے متعلق ایک تحقیقی کاوش ہے جو پشتو اکیڈیمی نے شائع کی ہے۔
۶۔ پرواز: یہ ایک طویل آزاد نظم ہے جو پشتو اکیڈیمی نے شائع کی ہے۔
۷۔ روھیی ادب: یہ شہرہ آفاق کتاب ۱۹۸۶ء میں پشتو اکیڈیمی نے شائع کی ہے۔
۸۔ روھیی متلونہ: متلوں (ضرب المثل) کا یہ ضخیم کتاب ۱۹۸۲ء میں شائع ہوئی۔
۹۔ پشتو اکیډمې ایك علمې اور تحقیقې ادارہ: یہ پشتو اکیڈیمی کی طرف سے شائع ہوئی۔
۱۰۔ لرغونے خوب: یہ شعری مجموعہ ۱۹۷۷ء میں شائع ہوا۔

۱۱۔ ادم یہ پشتو اکیڈیمی کی طرف سے ۱۹۸۱ء میں شائع ہوئی۔
۱۲۔ د شعور ډالی: یہ منظومہ مجموعہ ۱۹۸۱ء میں شائع ہوا۔
۱۳۔ پشتو زبان وادب ایک مطالعہ: یہ کتاب ۱۹۸۸ء میں شائع ہوئی۔
۱۴۔ تپہ او ژوند: یہ کتاب ۱۹۸۰ء میں شائع ہوئی۔
۱۵۔ سباوَن:
۱۶۔ اولسې قیصی:
۱۷۔د
۱۸۔ادب
۱۹۔ادب
۲۰۔لنډې
۲۱۔زیږے
۲۲۔وروستے
۲۳۔د
۲۴۔ابدې
۲۵۔تپہ
۲۶۔دا
۲۷۔سلگی:
۲۸۔لرغونې
۲۹۔ متلونہ:
۳۰۔ اولسې
۴۱۔ کغلې

ترجمہ کیے ہوئے اثار:

۱۔ د

۲۔ بنګالۍ سندرې:
۳۔ زمونږ قائد:
٤۔ پیغام رسول ﷺ:
٥۔ ویښ شئی ویښ شئی:
٦۔ مقدمه شعروشاعري:
۷۔ مسدس حالي:
۸۔ کلام صوفیاء:
۹۔ د دوستۍ سفر:
۱۰۔ د قران پاك ترجمه ئې هم کړې ده:
۱۱۔ ګټانجلي:
۱۲۔ نجیب الدوله:

ترتیب کیے ہوئے اثار:

۱۔ صوبہ سرحد پر پہلی لسانی اور ثقافتی کانفرنس:
۲۔ خلاصۃ الانساب:
۳۔ د ادم درخانۍ مثنوي:
٤۔ توایخ

ناچاپ اثار:

۱. په
۲۔ مسافر
۳۔ جواب
٤۔ یوځلې
٥۔ ژوند

٦۔ د
۷۔ د
۸۔ د
۹۔ باغ
۱۰۔ د
۱۱۔ ښائسته
۱۲۔ د
۱۳۔ د
۱٤۔ مجموعه
۱٥۔ مجموعه
۱٦۔ منثور
۱۷۔ نغمه
۱۸۔ تمثیلچې:
۱۹۔ ورکې
۲۰۔ خطبات
۲۱۔ تورپټکې:
۲۲۔ نجیب
۲۳۔ د

ریٹائرڈمنٹ کے بعد چاپ آثار

۱۔ خوبونه خپل کلي کښې
۲۔ ادب
۳۔ ادب
٤۔ په

۵۔ لنډې ګامونه
۶۔ د ژوند سندره
۷۔ د بوډۍ ټال
۸۔ زيړے مازيګر
۹۔ ابدي سندره
۱۰۔ ټپه او ژوند
۱۱۔ لرغونې فکرونه
۱۲۔ نجيب الدوله۔
۱۳۔ ګيتانجلي
۱۴۔ قرآن پاك(ترجمه)
۱۵۔ دا قيصې دا افسانې
۱۶۔ خوږې مصرعې د چا د خولې
۱۷۔ سلګۍ۔
۱۸۔ يادونه ارمانونه۔

☆☆......☆☆......☆☆

ڈاکٹرمحمود احمد غازی

ڈاکٹر سید عزیز الرحمٰن

یہ ستمبر ۱۹۹۸ء کی ایک سرد مگر اجلی صبح کا ذکر ہے، میں بنوں میں ہوں، اور ایک آواز کانوں میں پڑتی ہے، آیئے فاروقی صاحب بیٹھیے، میں سامنے دیکھتا ہوں تو ایک وجیہہ، معتدل القامہ اور روشن شخصیت چھوٹی سی کار میں پچھلی نشست پر بیٹھ کر دروازہ بند کر رہی ہے، میرا قیاس یہی ہوا کہ یہ ڈاکٹر محمود احمد غازی ہیں، برابر میں کھڑے ایک صاحب سے پوچھا تو تصدیق ہوگئی۔ ان کے ساتھ ڈاکٹر محمد یوسف فاروقی تھے، ان کے بہنوئی اور ہمارے ایک اور فاضل مہربان، جو اس وقت اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور کے رئیس کلیۂ علوم اسلامی تھے، اور اب ڈائریکٹر، شریعہ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی کے منصب پر فائز ہیں۔ اسے پہلی ملاقات تو نہیں کہا جا سکتا، پہلی اچٹتی ہوتی، ہلکی سی زیارت ضرور کہا جا سکتا ہے۔ یہ بنوں میں مولانا سید نصیب علی شاہؒ کے زیر اہتمام ان کے ادارے المرکز الاسلامی میں دوسری فقہی کانفرنس کا ذکر ہے، جس میں راقم بھی مدعو تھا۔

ان دنوں ہم اپنے ادارے سے سیرت طیبہ پر ایک شش ماہی مجلّے کے اجرا کے سلسلے میں سرگرم تھے، مشاورت جاری تھی، اہل علم سے رابطے ہو رہے تھے، اور مجلّے کے پہلے شمارے کی تیاریاں عروج پر تھیں۔ راقم نے دوسرے اہلِ علم کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں بھی خط ارسال کیا۔ خلافِ توقع جن چند حضرات نے فوراً جواب دینے کی زحمت کی ان میں ڈاکٹر صاحب نمایاں تھے، اور سب سے مفصل آپ ہی کا خط تھا، یہ ۱۹۹۹ء کے اوائل کی بات ہے، ڈاکٹر صاحب نے بلا تکلف ہمارے خیال اور ارادے کی ستائش کے بعد اس راہ میں آنے والی رکاوٹوں کا ذکر کیا اور پوری تیاری کے بعد حالات کا جائزہ لے کر ہی اس میدان میں آنے کی تاکید کی۔ السیر ۃ کا پہلا شمارہ جون ۱۹۹۹ء ربیع الاول میں شائع ہوا۔ ۱۲ ربیع الاول کو سیرت کانفرنس، اسلام آباد میں شرکت

کا اتفاق ہوا۔السیر ۃ کا نیا شمارہ ساتھ تھا، ارادہ یہ تھا کہ کانفرنس سے فراغت کے بعد اسلامی یونیوسٹی میں ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کی کوشش کروں گا۔ڈاکٹر صاحب اس وقت بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد کے نائب صدر (اکیڈمک) تھے۔

کسی بھی شخص کے کام کی قبولیت کی ایک صورت یہ ہوتی ہے کہ وقت خود اس کے چھوڑے ہوئے کام کا پاسبان اور محافظ بن جاتا ہے، اور لوگوں میں شخصیت اور کام کی ایسی کشش اور جاذبیت پیدا ہوجاتی ہے کہ وہ از خود اپنا کام سمجھ کر اپنی ذمے داری اور شوق سے اس خدمت کی انجام دہی کو اعزاز تصور کرتے ہوئے سرگرم ہوجاتے ہیں۔ڈاکٹر صاحب کے حوالے سے یہی کیفیت دکھائی دیتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب نہایت جفاکش، محنتی، کمیٹڈ اور دل دردمند رکھنے والے محقق، عالم، مفکر، داعی اور فقیہہ تھے، اسلامی بینکنگ کے آپ پاکستان میں بانیوں میں شمار ہوتے ہیں، تکافل کا ابتدائی خاکہ آپ ہی کا تشکیل کردہ ہے جس پر پاکستان سے پہلے بعض عرب ممالک میں عمل ہوا۔

ڈاکٹر صاحب پاکستان میں آئینی اور قانونی معاملات میں اسلامی دفعات کے بھی ماہر سمجھے جاتے تھے، جنرل ضیاالحق مرحوم سے لے کر جنرل مشرف تک ہر دور میں حکمران آپ سے اس سلسلے میں مستفید ہوتے رہے، یہ الگ بات ہے کہ حکومتی مزاج ڈاکٹر صاحب کی باتوں کو کس قدر ہضم کر پایا۔ڈاکٹر صاحب ہمیشہ نتائج سے بے پروا ہوکر دردمندی اور خیرخواہی کے جذبے سے ہر حاکمِ وقت کو صحیح مشوروں سے نوازتے رہے۔ایک گفت گو میں حال ہی میں انہوں نے فرمایا بھی تھا کہ مجھے اس نیک مقصد کے لئے کوئی آئندہ بھی بلائے گا تو میں جانے کو تیار ہوں۔

ڈاکٹر محمود احمد غازی ۱۸ ستمبر ۱۹۵۰ء کو پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم کراچی ہی میں حاصل کی۔کراچی کے بڑے تعلیمی ادارے جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن میں بھی کچھ عرصے زیر تعلیم رہے۔ ۶۰ کی دہائی کے آخر میں آپ کے والد حافظ محمد احمد صاحب اسلام آباد منتقل ہوگئے تو ڈاکٹر صاحب بھی وہیں چلے گئے۔آپ کی مزید تعلیم اسلام آباد اور پنڈی میں ہی مکمل ہوئی، ۱۹۷۲ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ماسٹر کیا، اور پھر اسی یونیورسٹی سے آپ نے پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی۔

ڈاکٹر صاحب نے پاکستان اور بیرون پاکستان اہم ترین ذمے داریاں ادا کیں، اور ہر ذمے داری میں امتیازی صلاحیتوں کے ساتھ نمایاں رہے۔آپ وفاقی وزیر مذہبی امور۔صدر بین الاقوامی

اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد۔نائب صدر، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد۔ڈائریکٹر جنرل شریعہ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد۔ڈائریکٹر جنرل دعوۃ اکیڈمی۔بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد۔جج شریعت اپیلٹ بنچ سپریم کورٹ آف پاکستان۔خطیب شاہ فیصل مسجد، اسلام آباد۔رکن اسلامی نظریاتی کونسل وغیرہ اہم ترین مناصب پر فائز رہے۔اس وقت بھی آپ اہم ترین ذمے داریوں پر فائز تھے۔آپ مارچ ۲۰۱۰ء سے وفاقی شرعی عدالت، اسلام آباد کے جج تھے، اور اسٹیٹ بینک آف پاکستان کے شریعہ ایڈوائزری بورڈ کے چیرمین کا منصب بھی آپ کے پاس تھا۔

نصف صدی کی بھرپور علمی عملی اور سرگرم زندگی گزارنے کے بعد ڈاکٹر صاحب عارضہ قلب میں مبتلا ہوکر مختصر سی علالت کے بعد ۲۶ ستمبر ۲۰۱۰ء کی صبح اسلام آباد کے ایک ہسپتال میں سفر آخرت پر روانہ ہوگئے۔اناللہ وانا الیہ راجعون

ڈاکٹر صاحب نہایت جفاکش، محنتی، کمیٹڈ اور دل دردمند رکھنے والے محقق، عالم، مفکر، داعی اور فقیہہ تھے، اسلامی بینکنگ کے آپ پاکستان میں بانیوں میں شمار ہوتے ہیں، تکافل کا ابتدائی خاکہ آپ ہی کا تشکیل کردہ ہے جس پر پاکستان سے پہلے بعض عرب ممالک میں عمل ہوا۔

ڈاکٹر صاحب پاکستان میں آئینی اور قانونی معاملات میں اسلامی دفعات کے بھی ماہر سمجھے جاتے تھے، جنرل ضیاالحق مرحوم سے لے کر جنرل مشرف تک ہر دور میں حکمران آپ سے اس سلسلے میں مستفید ہوتے رہے، یہ الگ بات ہے کہ حکومتی مزاج ڈاکٹر صاحب کی باتوں کو کس قدر ہضم کر پایا۔ڈاکٹر صاحب ہمیشہ نتائج سے بے پروا ہوکر دردمندی اور خیرخواہی کے جذبے سے ہر حاکمِ وقت کو صحیح مشوروں سے نوازتے رہے۔ایک گفت گو میں حال ہی میں انہوں نے فرمایا بھی تھا کہ مجھے اس نیک مقصد کے لئے کوئی آئندہ بھی بلائے گا تو میں جانے کو تیار ہوں۔

ڈاکٹر صاحب اردو، عربی، فارسی، انگریزی، فرانسیسی سمیت ساتھ زبانوں کے ماہر تھے اور ان زبانوں میں تحریر اور گفت گو دونوں کا مکمل ملکہ رکھتے تھے، یہی سب ہے کہ آپ کی تصانیف خاص طور پر اردو کے ساتھ ساتھ انگریزی اور عربی میں موجود ہیں۔عربی میں آپ کی آخری تالیف تاریخ حرکۃ المجددیہ ہے، جس میں برعظیم کے عظیم عبقری شخصیت حضرت مجدد الف ثانی کے احوال و آثار اور خدمات و تصنیفات کا علمی جائزہ لیا گیا ہے اور چار سو سے زائد صفحات کی اس کتاب کی خاص

بات پچاس سے زائد مکتوبات مجدد کا عربی ترجمہ ہے جو ڈاکٹر صاحب کی فارسی اور عربی دانی، علمی تبحر اور تصوف کے دقائق سے گہری واقفیت کا ثبوت ہے۔ ڈاکٹر حمید اللہ کی فرانسیسی زبان میں دو جلدوں میں سیرت کی مشہور کتاب کا ترجمہ ڈاکٹر صاحب نے براہ راست فرانسیسی سے انگریزی میں کیا تھا۔ جو بہت مقبول ہوا۔ افسوس اس کی دوسری جلد انگریزی میں منتقل نہ ہوسکی۔

اردو داں طبقے میں ڈاکٹر صاحب کا سلسلہ محاضرات بڑا مقبول ہوا۔ جس کی چھ جلدیں اہل علم کو متاثر کرچکی ہیں۔ ان میں سے ہر جلد ۱۲ خطبوں پر مشتمل ہے، جن کے موضوعات یہ ہیں: قرآن ،حدیث، سیرت، فقہ، شریعت، معیشت وتجارت۔ اس کے علاوہ اردو میں ان کی اہم کتب یہ ہیں:

قانون بین الممالک

اسلام اور مغرب تعلقات

محاضرات تعلیم

خطبات کراچی

امت مسلمہ۔ مسائل اور چند اجتماعی فرائض

اسلامی بنکاری ایک تعارف

ادب القاضی

قرآن مجید ایک تعارف

ڈاکٹر صاحب انتہائی متدین اور حد درجہ متقی شخص تھے، برس ہا برس کا مشاہدہ ہے کہ سرکاری ودفتری ذمے داریوں میں سرکاری مراعات سے کبھی ذاتی فائدہ نہیں اٹھایا۔ ڈاکٹر صاحب کا وجود عالم اسلام کے لیے بسا غنیمت تھا، بین الاقوامی فورم پر اسلام اور پاکستان کی نمائندگی کا جو سلیقہ ڈاکٹر صاحب کو حاصل تھا، اس کی مثال کم ملے گی۔ پھر علم وفضل اور دینی حمیت وتصلب کے ساتھ ساتھ حسن تکلم وحکمت کی دولت سے آراستہ تھے، جس سے وہ ایسے مواقع پر پھر پور فائدہ اٹھاتے تھے۔

علوم اسلامیہ میں ایک عجب وحدت پائی جاتی ہے جو اسے دیگر علوم وفنون سے نمایاں وممتاز کرتی ہے، قرآن کو سنت سے الگ کرکے نہیں دیکھا جاسکتا، فقہ کو حدیث سے جدا نہیں کرسکتے، سیرت و تاریخ باہم پیوست ہونے کے ساتھ ساتھ قرآن وسنت سے بھی جڑے ہوئے ہیں، یہی حال دیگر

تمام علوم وفنون کا ہے، ہمارے ڈاکٹر غازی صاحب اس وحدت علوم اسلامی کی نمایاں، زندہ، عملی اور نمائندہ مثال تھے، آپ سب ہی علوم وفنون سے آشنا تھے، سب سے واقف تھے، سب کے شناور تھے، تحریر وتقریر میں ان علوم وفنون کے باہمی تعلق کو ایسے غیر محسوس انداز میں بیان کرتے تھے کہ حیرت ہوتی تھی۔ طرز استدلال اور قوت مشاہدہ دونوں اس قدر قوی تھیں کہ ایسے نکات آپ تلاش کرلیتے تھے جس کی جانب دوسروں کی نگاہ نہیں جاتی۔ ڈاکٹر صاحب کا اسلوبِ استدلال ملاحظہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ سیرت پر گفتگو کرتے ہوئے اصول وفقہ سے استدلال کرتے ہیں، جو ان کا خاص اور پسندیدہ موضوع ہے، تعلیم پر بات کرتے ہوئے تاریخ سے مدد لیتے ہیں، اور قانونی اُمور پر بات کرتے ہوئے نفسیات کے نکات استنباط میں پیش کردیتے ہیں۔ اور اس قوت استدلال و استنباط کی معراج خصوصیت کے ساتھ محاضراتِ سیرت اور اس کے بھی دو خطبوں ،کلامیاتِ سیرت اور فقہیات سیرت میں نظر آتی ہے۔ یہ پچاس پچاس صفحات کے مطبوعہ خطبے جاننے والے جانتے ہیں کہ ہزار ہزار صفحات کی کتابوں پر بھاری ہیں۔

ڈاکٹر صاحب انتہائی متدین اور حد درجہ متقی شخص تھے، برس ہا برس کا مشاہدہ ہے کہ سرکاری ودفتری ذمے داریوں میں سرکاری مراعات سے کبھی ذاتی فائدہ نہیں اٹھایا۔ ڈاکٹر صاحب کا وجود عالم اسلام کے لیے بسا غنیمت تھا، بین الاقوامی فورم پر اسلام اور پاکستان کی نمائندگی کا جو سلیقہ ڈاکٹر صاحب کو حاصل تھا، اس کی مثال کم ملے گی۔ پھر علم وفضل اور دینی حمیت وتصلب کے ساتھ ساتھ حسن تکلم وحکمت کی دولت سے آراستہ تھے، جس سے وہ ایسے مواقع پر پھر پور فائدہ اٹھاتے تھے۔

اس وقت ڈاکٹر صاحب کا جامعۃ الرشید میں ہونے والا خطاب میری آنکھوں کے سامنے گھوم رہا ہے، جو چند برس پیش تر دورۂ قضا وتحکیم کے اختتامی روز فرمایا تھا، جس میں آپ نے مسلمانوں کی قضا کی پوری روایت اور اس کا محاکمہ اپنے اسلوب میں پیش کیا تھا، یہ خطاب لگ بھگ دو گھنٹے جاری رہا، اور جس کے اختتام پر ملک بھر سے آئے ہوئے مفتیانِ کرام نے متفقہ طور پر اس خطاب کو پورے کورس کا حاصل قرار دیا۔

ڈاکٹر صاحب ان خوش نصیب فضلا میں شامل ہیں جنہوں نے سترہ برس کی عمر میں تدریس کا منصب سنبھال لیا تھا اور اسلامی علوم وفنون کی نمائندہ وچنیدہ کتب کی تدریس ان کی زندگی کا حصہ رہی۔ یوں اکنافِ عالم میں ان سے استفادہ کرنے والے تلامذہ کی تعداد ہزاروں سے کم نہیں۔

ڈاکٹر صاحب حافظِ قرآن تھے اور رمضان المبارک میں اپنی رہائش گاہ پر تراویح میں قرآن کریم سنانے کا اہتمام فرماتے تھے۔ رمضان کے علاوہ بھی ڈاکٹر صاحب عام طور پر باوضو رہتے اور فارغ اوقات میں خصوصاً دورانِ سفر آپ کے لبوں پر تلاوتِ قرآن جاری رہتی۔

بل کہ پورا شعر ہی حسبِ حال محسوس ہوتا ہے:

حیف در چشم زون صحبت یار آخر شد
روئے گل سیر نہ دیدم و بہار آخر شد

پروفیسر مریم سلطانہ نوحانی

مہتاب اکبر راشدی

ہماری زندگیوں پر اپنے والدین، آس پاس کے ماحول، ساتھ بڑے ہونے والے بہن بھائی اور پھر ہمارے اساتذہ کا اثر ہوتا ہے اور انہی میں کوئی شخصیت ایسی ہوتی ہے جس سے آپ شعوری اور لاشعوری طور پر متاثر ہوتے ہیں۔

میں خوش قسمت ہوں کہ آج اپنی ایسی استادِ محترم کے حوالے سے کچھ تحریر کر رہی ہوں جو خود طویل عرصے تک علم و تدریس کے افق پر چاند کی مانند فروزاں رہیں اور اپنے علم کی روشنی سے نہ جانے کتنی لڑکیوں کے ذہن نہ صرف منور کیے بلکہ سوچ اور تحقیق کے نئے زاویوں سے انہیں آشنا کیے رکھا۔

میں پروفیسر مریم سلطانہ نوحانی کا ذکر کر رہی ہوں جو ایک طویل عرصے تک گورنمنٹ گرلز کالج حیدرآباد (المعروف زبیدہ گرلز کالج) میں درس و تدریس سے وابستہ رہیں۔ اُس دور کی ہر خاتون کی زندگی جو کہ ہمیں اپنی عملی زندگی میں متحرک اور نمایاں نظر آتی ہیں۔ اُن کی اپنی زندگیاں بھی گویا ایک کہانی کی صورت ہمارے سامنے آتی ہیں۔ ذرا سوچیے تو سہی کہ آج سے اَسی برس پہلے سندھ میں وہ کیا ماحول ہوگا جہاں لڑکیاں پیدا ہوتی ہوں اور تعلیم کا حصول ان کے لیے محض ایک خواب ہو۔ سندھ کے دیہات تو دور کی بات ہے، حیدرآباد جیسے سندھ کے دوسرے بڑے شہر میں بھی لڑکیوں کے لیے علیحدہ اسکول خال خال ہی ہوتے تھے۔ ایسے ماحول میں حیدرآباد میں رہنے والے رئیس غلام قادر نوحانی (بلوچ قبیلے کی ایک شاخ) کے گھر میں بچی کی پیدائش ہوتی ہے اور اس کا نام مریم سلطانہ رکھ دیا جاتا ہے۔ مریم سلطانہ اس لحاظ سے خوش قسمت ٹھہریں کہ اُن کے والد علم سے شغف رکھتے تھے بلوچ خاندان سے تعلق رکھنے اور رسوم اور رواج کے پاسدار تو تھے لیکن

مذہبی تعلیمات سے بھی بخوبی واقف تھے۔ لہٰذا خاندان کے اعتراضات اور تنقید کو نظر انداز کر کے اپنی بیٹی کو اپنے محلے کے پرائمری اسکول میں داخل کروا دیا۔ بس اسی پہلے قدم کی ہی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر یہ پہلا قدم اُٹھالیا جائے تو منزل تک پہنچنا آسان ہو جاتا ہے۔ آپا مریم یقیناً اپنے اسکول میں بھی ایک نمایاں شاگرد رہی ہوں گی۔ اُن کے اساتذہ یقیناً اُن کی ذہانت اور محنت کے معترف رہے ہوں گے۔ میٹرک انہوں نے سندھ مدرسۃ اللبنات اسکول سے پاس کیا اور پھر اپنے والد صاحب کے دستِ شفقت اور رہنمائی کے ساتھ کالج کی دہلیز پر جا پہنچیں۔ کالج بھی کیسا؟ جو لڑکوں کے لیے مختص تھا لڑکیوں کا داخلہ منع تو نہیں تھا لیکن لڑکوں کے کالجوں میں اس زمانے میں ان کی موجودگی نہ ہونے کے برابر تھی۔ مریم سلطانہ نوحانی حیدرآباد کے گورنمنٹ بوائز کالج (جو پھلیلی کالج یا کالی موری والے کالج کے نام سے مشہور ہے اور اُسے اب یونیورسٹی کا درجہ دیا جا رہا ہے اُس کالج کے قیام کو ایک صدی ہو چکی ہے) میں داخل ہوئیں۔ ایک تو خاندان روایتی بلوچ اوپر سے لڑکیوں کی تعلیم حاصل کرنے کو غیر ضروری تصور کرنا اور ساتھ ہی پردہ لازمی! ان تمام باتوں کے ہونے کے باوجود ہماری استادِ محترم آپا مریم نے ان مشکل مراحل کو بڑے حوصلے کے ساتھ عبور کر لیا اور بی اے (آنرز) مسلم ہسٹری مضمون کے ساتھ پاس کیا اور ماسٹرز کی ڈگری کے لیے ''اسلامک کلچر اور ریلجن'' کا انتخاب کیا۔

اُس دور میں آپا مریم کے سامنے بھی کچھ ایسی اساتذہ تھیں جو خاتون ہونے کے ناطے ان کے لیے حوصلے اور راہنمائی کا سبب نہیں۔ اُن میں نمایاں نام ڈاکٹر شمس عباسی صاحبہ کا ہے جو تعلیم کے شعبے میں پاکستان اور سندھ میں بڑا معتبر حوالہ ہے۔ ان کے زیرِ انتظام زبیدہ کالج اپنے تعلیمی معیار اور ہم نصابی سرگرمیوں میں پاکستان بھر کے اچھے کالجوں میں گنا جاتا رہا ہے۔

1953 میں جب گورنمنٹ گرلز کالج حیدرآباد کا قیام عمل میں آیا تو محترمہ شمس عباسی اُس کی پرنسپل منتخب ہوئیں اور اسی کالج میں محترمہ مریم سلطانہ نوحانی ایم اے کرنے کے بعد بحیثیت لیکچرر مقرر ہوئیں۔ اس تاریخی کالج سے آپا مریم کی بڑی طویل رفاقت رہی۔ اسی کالج سے پاکستان بھر سے نوجوان بچیاں تعلیم کے زیور سے آراستہ ہو کر جاتی رہیں۔ اسی کالج میں بے انتہا محترم اور اپنے مضامین کی ماہر اساتذہ بچیوں کو آرٹس اور سائنس کے مضامین میں یکتا بنا کر میدانِ عمل میں بھیجتی رہیں۔ اسی کالج کی سند یافتہ لڑکیاں آج پاکستان اور دنیا کے کئی ممالک میں موجود

ہونگی جو اُس دورِ زریں کی امین ہیں۔

مریم سلطانہ نوحانی (جو میری بڑی بہن پروفیسر عزیزہ چند کی بھی استاد تھیں) سے میری شناسائی تب ہوئی جب میں نے زبیدہ کالج میں داخلہ دیا۔ میری زندگی کے یہ چار سال (1963-1967) یہی وہ بنیادی عرصہ تھا جس میں، میں نے اپنے اردگرد نہایت قابل اساتذہ کی ایک کہکشاں دیکھی اور اس کہکشاں میں آپا مریم سلطانہ نوحانی ایک چاند مانند دمکتی تھیں۔ وہ اپنی شخصیت میں بالکل مختلف اور نمایاں تھیں۔ ان کا لباس شائستہ اور باوقار ہوتا تھا۔ وہ اکثر ساڑھی پہنتی تھیں۔ شخصیت میں رعب و دبدبہ، لیکن چہرے پر مسکراہٹ، سندھی، اردو اور انگریزی زبانوں پر یکساں عبور رکھتی تھیں۔ کالج کی اسٹوڈنٹ یونین کی پیٹرن تھیں اور کالج کی پرنسپل محترمہ شمس عباسی کی دستِ راست تصور ہوتی تھیں۔ انہی کی زیرِ نگرانی کالج کی ڈبیٹنگ ٹیمز منتخب ہوتی تھیں جو پورے پاکستان میں منعقد ہونے والے تقریری مقابلوں میں حصہ لیتیں اور اپنے کالج کے لیے ٹرافی اور دیگر اعزازات لے کر آتیں۔ میں بھی کالج کی ان خوش قسمت شاگردوں میں سے رہی جو چار سال تک پورے پاکستان میں سندھی اور اُردو مباحثوں میں اپنے کالج کی نمائندگی کرتی رہی اور کبھی ٹرافی اور اول اور دوئم نمبر کا اعزاز لیے بغیر نہیں لوٹی۔ ان تقریری مقابلوں کی تیاری آپا مریم خود کرواتیں۔ موضوع کا مواد جمع کرنا، دلیل دینا، لفظوں کا انتخاب کیا ہو؟ بولنے کا انداز کیسا ہونا چاہیے، لہجہ اور تلفظ، کونسی ایسی چیز تھی جن پر اُن کی توجہ نہ ہو۔

حیدرآباد میں ہمارا گھر، آپا کے گھر کے قریب ہوتا تھا، لہٰذا اُن کی مجھ پر یہ عنایتیں بھی ہوتی تھیں کہ اگر کالج میں وقت نہ ملتا تو مباحثے کی تیاری کے لیے وہ شام کو گھر پر بُلا لیتیں۔ ایک شاگرد کے لیے اس سے بڑھ کر کیا خوش بختی ہو سکتی تھی کہ اُسے اپنے استاد کا قربِ مسلسل حاصل رہے۔ مجھ پر اُن کی شفقتیں مسلسل اور بے شمار رہیں۔ کالج کا عرصہ تو صرف چار سال تھا لیکن محبتوں کا یہ سلسلہ اُن کے سفرِ آخرت تک رہا۔ اور آج جب اس جہانِ فانی سے رخصت ہو گئی ہیں تو اُن کے بیٹے عیسیٰ عرفات اور بیٹی ڈاکٹر ماریہ عفیفہ سے مسلسل رابطے میں رہتی ہوں۔

محترمہ مریم سلطانہ نوحانی میں آخر ایسی کیا بات تھی جو انہیں اپنی ہم عصر ساتھیوں سے ممتاز اور منفرد بناتی تھیں جو اُس وقت ہم کم عمر لڑکیوں کے لیے تو ہر ٹیچر اکثر ہی آئیڈیل ہوتی تھیں لیکن ان میں کچھ بہت پسندیدہ تھیں تو کچھ سخت گیر۔ کچھ اپنے کام سے کام رکھتیں اور بس! لیکن یہ ایک

سی ہستی تھیں۔ جو ہر وقت سب کے لیے حاضر ہوتی تھیں۔ رعب و دبدبے کا وہ عالم کہ دور سے آتی دکھائی دیتیں تو شاگردوں کے قدم احتراماً وہیں تھم جاتے۔ اُن کا دل اتنا بڑا کہ ان کی ہر چھوٹی بڑی کامیابی پر دل کھول کر حوصلہ افزائی کرتیں۔ اصلاح اس طرح کرتیں کہ غلطی، غلطی ہی نہیں لگتی تھیں یہ سب تحمل برداشت اور خوش مزاجی تو ان کی شخصیت کا حصہ تھے لیکن ان کی اس شخصیت کو اعتماد اس علم اور بصیرت کی بنا پر ملا تھا جن کا محرک اور منبع وہ مطالعہ اور علماء وقت سے مکالمے اور ہمہ وقت سیکھنے کی جستجو تھی۔ اور یہ سب کیوں نہ ہوتا؟ ان کے دور میں علامہ غلام مصطفیٰ قاسم، ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ، پروفیسر امیر احمد خان، مولانا غلام محمد گرامی اور ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان جیسے مستند عالم اور بزرگ موجود تھے۔ وہ ان کے علم و فیوض سے مستفید ہوتی رہتی تھیں۔ پدرشاہی معاشرے میں، صوبہ سندھ ہی وہ جگہ تھی جہاں ایک خاتون نے اپنے علم اور کلام کے باعث ان جید علماء میں اپنی جگہ بنائی اور اپنی حیثیت منوائی۔

آپ نے مولانا محمد ہاشم فاضل شمسی سے آٹھ سال تک قرانِ پاک اور حدیث کی تعلیم حاصل کی۔ تاریخِ اسلام پر پروفیسر نوحانی صاحبہ کو بڑی دسترس حاصل تھی وہ اپنے مقالوں اور خطاب اور کلاس کے لیکچرز میں کوئی بھی بات کسی دلیل اور قرآن اور حدیث کا مستند حوالہ دیئے بغیر نہیں کرتی تھیں۔ اُن کے لکھے ہوئے پر مغز مقالے اپنے اندر سوچ کے کئی پہلو اُجاگر کرتے تھے اور علم و ادب کا ایک شہ پارہ ہوتے تھے۔ وہ ملکی اور بین الاقوامی کانفرنسوں میں اپنی علمی قابلیت اور خطابت کا سکّہ بٹھا کر آتی تھیں۔ اسلام کی تاریخ حیاتِ رسول پاکؐ، صحابہ کرام، اُمہات المؤمنین اور اسلام میں خواتین کا مرتبہ اور کردار کے موضوعات پر انہیں دسترس حاصل تھی۔

ان کا اندازِ بیان اور خطابت تو ہمارے اندر رچ بس گیا تھا۔ ہمارے کالج (زبیدہ کالج حیدرآباد) میں یہ دستور تھا کہ ہر جمعہ کو اسمبلی کے بعد آپا مریم، تاریخ اسلام، قرآن اور خواتین سے متعلق موضوعات پر ایک لیکچر دیتی تھیں۔ اُن کے لیکچر یا خطبات نے ہم اسٹوڈنٹس کی سوچ کو مثبت سمت میں سوچنے اور اسلامی تعلیمات کی سمجھ سے زندگی کو اعتدال پر ڈالنے میں بڑی مدد کی۔ عشقِ رسولؐ ان کی زندگی کا مرکز اور محور رہا۔ وہ اپنی ملازمت کے دوران اور ریٹائرمنٹ کے بعد بھی، سیرتِ رسولؐ پر منعقد تقریبات، محفلوں، مذاکروں اور کانفرنسوں کا حصہ ہوتی تھیں۔ میلاد کی محفلیں ان کی موجودگی سے سج جاتی تھیں۔ وہ ایک ایسی ہی سیرت کانفرنس تھی جو شاہ ولی اللہ

اکیڈمی کی جانب سے منعقد کی گئی تھی۔ جس میں پروفیسر مریم سلطانہ نوحانی کا خطاب اتنا مدلل اور پُر اثر تھا کہ علامہ غلام مصطفیٰ قاسمی صاحب نے انہیں ''اُم الکلام'' کا خطاب دیا جو ان کے نام کا حصہ بن گیا۔

اپنی ملازمت کے کیریئر میں وہ سندھ کے بڑے کالجوں کی پرنسپل رہیں۔ ڈاکٹر شمس عباسی کے بعد، زبیدہ کالج کی سب سے کامیاب اور مؤثر پرنسپل پروفیسر نوحانی رہیں۔ سندھ بیورو آف کریکیولم میں سبجیکٹ اسپیشلسٹ رہیں اور ڈائریکٹر آف کالجز سندھ کے منصب سے ریٹائر ہوئیں۔ اُن کی اپنی ذاتی زندگی کامیابیوں سے عبارت رہی۔ ایک باوقار بیٹی، کامیاب معلم، بے مثل عالم، پُر اثر خطیب، قابلِ رشک شخصیت، خوش شکل اور خوش لباس۔ گفتگو پر اثر اور حلقہ احباب وسیع۔ سندھ کے ایک معزز بلوچ خاندان سے تعلق رکھنے والے ماہرِ زراعت عبدالرحمٰن بلوچ سے اُن کی شادی ہوئی۔ والد کے بعد بھائی اور شادی کے بعد شوہر نے ہر قدم پر ان کا ساتھ دیا اور اپنی زوجہ کی قابلیت اور کامیابیوں پر ہمیشہ فخر مند رہے۔

سندھ یونیورسٹی کی سنڈیکیٹ کی ممبر رہیں، بہت سے ایڈوائزری بورڈز پر بھی خدمات انجام دیتی رہیں۔ کسی بھی ادارے کے ساتھ اُن کی وابستگی سے گویا ادارے کی ساکھ اور وقار بلند ہو جاتا تھا۔

بحیثیت ایک اُستاد میں نے انہیں بہت بلند مرتبہ پایا۔ اپنے عمل سے انہوں نے ساتھیوں، دوستوں، جاننے والوں، رشتہ داروں اور ضرورت مندوں کی اس طرح مدد کرنے کا سلیقہ سکھایا مدد اس طرح کرو کہ ان کی عزتِ نفس کو ٹھیس نہ پہنچے۔

''دین میں جبر نہیں'' یہ نسخہ کیمیا جو قرآن اور رسولؐ کی زندگی سے انہوں نے حاصل کیا وہ ہمیں سمجھایا۔ دینِ اسلام کس طرح دینِ فطرت ہے؟ یہ فلسفہ بھی ہم نے انہی سے سیکھا۔ اسلام میں عورت کا مرتبہ اور تقدس کتنا بڑا ہے، ہم شاید اتنی کچی عمر میں نہ جان پاتے لیکن ہماری استادِ محترم نے بی بی حاجرہ، بی بی مریم، حضرت خدیجہ الکبریٰ، بی بی فاطمہ اور عائشہ صدیقہ اور زینب علیہ السلام کی حیات اور عمل کو ہمارے سامنے اس طرح پیش کیا کہ یہ ہستیاں ہماری رول ماڈل بن گئیں۔

میں نے ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان کو تاریخِ اسلام اور قرآن و حدیث پر آپا مریم سے ان کی

رائے معلوم کرتے اور اپنا نقطہ نظر بیان کرتے دیکھا اور سُنا۔ ڈاکٹر نبی بخش بلوچ، ڈاکٹر عبدالواحد ہالیپوٹو، علامہ غلام مصطفیٰ قاسمی کو بھی اُن کی علمیت کا معترف پایا۔

میں آج جو کچھ بھی ہوں اپنی اساتذہ کے طفیل ہوں لیکن گفتگو کا سلیقہ، حلم و شائستگی، صبر و برداشت اور عزت دینے اور عزت لینے کا طریقہ میں نے آپا مریم سے سیکھا۔ کالج سے نکلنے کے بعد بھی میری یہ محترم استاد میری رہبر رہیں۔ اور صرف میں ہی کیوں؟ اُن کے دستِ شفقت سے مستجاب ہونے والی اُن کی ہونہار شاگردوں کے نام تو دیکھئے۔ انیس ہارون، سلطانہ صدیقی، پروفیسر خالدہ فاروقی، پروفیسر عزیزہ چند، فہمیدہ ریاض، ڈاکٹر سحر امداد، ڈاکٹر پروین نعیم شاہ، روبینہ قریشی، ڈاکٹر فہمیدہ حسین، سلطانہ وقاص اور مہتاب اکبر راشدی۔

25 نومبر 2014ء کی صبح کو کیسے بھول سکتی ہوں جب اُن کے بیٹے عیسیٰ عرفات کا یہ پیغام ملا ''آپا! ممی ہمیں چھوڑ کر رخصت ہوگئیں'' بس! آج بھی دل میں ٹیس سی اُٹھتی ہے۔ موت برحق ہے، لیکن جدائی تکلیف دہ ہوتی ہے۔

بس یہی دعا ہے کہ ہماری پیاری آپا جنت کی ٹھنڈی چھاؤں میں رہیں۔

پروفیسر مولوی محمد شفیع

ڈاکٹر محمد اشرف کمال

پروفیسر مولوی محمد شفیع ۶، اگست ۱۸۸۳ء کو قصبہ قصور میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۰۰ء میں قصور سے انٹرنس کا امتحان اور ۱۹۰۴ء میں اسلامیہ کالج لاہور سے بی اے کا امتحان درجہ اول میں پاس کیا۔

۱۹۰۵ء میں انھوں نے پنجاب یونیورسٹی سے انگریزی ادبیات میں ایم اے کیا، بعد ازاں انھوں نے عربی ادبیات میں ایم اے کیا۔

۱۹۰۶ء میں محکمہ تعلیم میں نارمل سکول لاہور میں سیکنڈ ماسٹر اور بعد میں انسپکٹر مدارس کے عہدے پر کام کیا۔ ۱۹۱۳ء میں پنجاب یونیورسٹی سے پرائیویٹ ایم اے اُردو کیا۔

مولوی محمد شفیع اعلیٰ تعلیم کے لیے ۱۹۱۵ء میں حکومت ہند کے سکالرشپ پہ انگلستان چلے گئے اور وہاں ۱۹۱۸ء تک انھوں نے کیمبرج یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی۔ وہاں سے بی اے کرنے کے بعد وہ عربی کے شعبہ میں تحقیق کرتے رہے۔ پھر وہیں سے ایم اے کیا اسی دوران ۱۹۱۸ء میں انھیں وہاں پر اردو زبان وادب کی تدریس کا موقع بھی ملا۔ (۱)

۱۹۱۹ء میں وہ واپس لاہور آ گئے اور فروری ۱۹۱۹ء میں پنجاب یونیورسٹی میں عربی کی تدریس کے لیے ان کا تقرر (۵۰۰۔۵۰۔۱۲۵ کے گریڈ میں) بطور پروفیسر کر دیا گیا۔ (۲) یہاں وہ عربی فارسی کے شعبہ میں تدریس میں مصروف رہے۔ مسٹر اے۔ سی وولنر یکم جنوری ۱۹۲۰ء سے چھ ماہ کی رخصت پر گئے تو پروفیسر محمد شفیع ان کی جگہ عارضی پرنسپل لگا دئے گیے۔ ۱۹۲۱ء سے پروفیسر محمد شفیع وائس پرنسپل بنے اور مسٹر اے۔ سی۔ وولنر کے انتقال (۷ جنوری ۱۹۳۶ء) کے بعد ۲۲ جنوری ۱۹۳۶ء کو پنجاب یونیورسٹی کے اورینٹل کالج کے پرنسپل مقرر ہو گئے۔ ۳۰ ستمبر ۱۹۴۲ء کو مولوی محمد شفیع پروفیسر عربی اور پرنسپل کالج کے عہدوں سے سبکدوش ہو گئے۔ (۳) انھیں حکومت نے ۱۹۴۲ء

میں خان بہادر کا خطاب دیا۔

اردو انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کمیٹی (اردو دائرہ معارف اسلامیہ) کا منصوبہ ڈاکٹر سید عبداللہ کی محنت اور کوششوں سے بروئے کار آیا۔ ۱۹۵۰ء میں پنجاب یونیورسٹی نے اس منصوبے کی منظوری دی اور پروفیسر ڈاکٹر مولوی محمد شفیع کو اس ادارے کا چیئرمین اور مدیر اعلیٰ (چیف ایڈیٹر) مقرر کیا گیا۔ (۴) انھوں نے کالج سے فراغت کے بعد انسائیکلو پیڈیا کے اردو ترجمہ کی نگرانی کا کام شروع کیا۔

اردو انسائیکلو پیڈیا آف اسلام: ۱۹۵۰ء میں یہ شعبہ لائیڈن کی انسائیکلو پیڈیا کی چار جلدوں کا ترجمہ کرنے کے لیے قائم ہوا تھا۔ ترجمے کا کام ۱۹۶۰ء تک ختم ہو گیا۔ (۵)

انھوں نے ریٹائرمنٹ کے بعد شعبہ اردو اورینٹل کالج میں بھی عارضی (جز وقتی) لیکچرار کی حیثیت سے کام کیا اور ۱۹۶۱ء تک مختلف اوقات میں ڈین آف فیکلٹی کے طور پر بھی کام کرتے رہے۔

اس دور میں پنجاب یونیورسٹی میں حافظ محمود شیرانی، شیخ محمد اقبال، ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ ڈاکٹر سید عبداللہ اور مولانا عبدالعزیز المیمنی جیسی شخصیات موجود تھیں جنھوں نے علمی سطح پر تحقیق کے لیے نئی راہیں متعین کیں، تجسس، جستجو اور تحقیقی سرگرمیوں کو فروغ دیا۔

مولوی محمد شفیع کی شخصیت میں انفرادیت، بردباری، متانت اور کشش تھی۔ ان سے مل کر معلوم ہوتا تھا کہ کسی علمی شخصیت سے ملاقات ہو رہی ہے۔ ان کا خاکہ بیان کرتے ہوئے سید حسام الدین راشدی لکھتے ہیں:

> ''قد دراز، مضبوط کاٹھی، بدن چوڑا چکلا، کھلا ہوا گندمی رنگ، چہرہ مہرہ مردانہ نہایت شاندار اور پروقار، پیشانی کشادہ اور تابندہ، آنکھیں چھوٹی لیکن چمکدار اور اتنی تیز کہ تاب لانا بڑا ہی مشکل کام تھا، بلکہ ناممکن تھا کہ ان کو گھور کے دیکھا جا سکے۔ مونچھیں مناسب حد تک لمبی اور اس دور کی یادگار جس دور میں مرد مرد دکھائی دیتے تھے۔ ان کا منہ بہت دلکش اور ٹھوڑی بہت خوبصورت اور جاذب تھی۔ سر کے بال جھڑ چکے

> تھے، کنپٹیوں پر بال جتنے بھی تھے وہ سفید ہو چکے تھے۔ آواز باریک نہایت ملائم اور حریر و پرنیان کی طرح نرم اور نازک۔ ایسی آواز۔ تند اور تلخ کبھی' کاہے کو ہوتی ہوگی' سراسر مشفقانہ اور دلوں کو اپنی طرف کھینچنے والی یہ آواز تھی۔''(۶)

پرانی وضع قطع کے روایتی لباس پہننے والے ایک وضعدار انسان تھے۔ مگر عملی زندگی کی طرح لباس کے معاملے میں بھی صفائی پسند تھے۔

وہ جسم پر سفید شلوار میل خور رنگ کی شروانی اور کھڑی دیوار کی سرخ ترکی ٹوپی سر پر رکھتے تھے۔ زندگی کے آخری برسوں میں موڑ سے اترتے وقت لکڑی کا سہارا لیے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے خیمے میں داخل ہوتے۔ (۷)

انھوں نے زندگی کو ایک ضابطہ کے تحت گزارا۔ ہر لمحے کو قیمتی بنایا۔ نئے نئے علمی اور تحقیقی کاموں میں مصروف رہتے۔ ان کی زندگی ایک سانچے میں ڈھلی ہوئی نظر آتی ہے۔ ان کی زندگی مین ایک اطمینان اور سکون کی کیفیت دکھائی دیتی ہے۔

ان کی شخصیت دل موہ لینے والی تھی۔ وہ ایک دیانت دار اور کھرے انسان تھے۔ غلط بات پسند نہیں کرتے تھے اور وقت کو بے کار کی باتوں میں ضائع کرنا گناہ سمجھتے تھے۔

سیرت اور مزاج:

مولوی محمد شفیع ایک محنتی اور با اصول انسان تھے۔ وہ اپنے تحقیقی کاموں اور علمی مصروفیتوں کی وجہ سے خشک مزاج سمجھے جاتے تھے لیکن حقیقت میں ایسا نہیں تھا ان کی شخصیت میں سختی ان کی اپنے کام سے لگن اور دیانت و جانفشانی کی وجہ سے نظر آتی تھی۔

وہ بہت دلچسپ، بڑے شفیق اور مزاج کے نہایت مہربان اور ملائم۔ ان کی باتیں تلطف آمیز، ان میں دل بڑھانے والی شفقت تھی جو آدمی کو ان کا گرویدہ بنا دیتی تھی۔

انھوں نے اپنی زندگی اصولوں اور ضابطے کے تحت گزاری۔ ہر لمحے اور ہر گھڑی کو کارآمد بنایا، اپنے شب و روز کو اپنے تحقیقی اور علمی کاموں سے قیمتی بنایا۔ ان کا اٹھنے والا ہر قدم منزل کی طرف آگے کی جانب تھا۔ وہ ہمہ وقت کسی نہ کسی کھوج میں تحقیقی اور تلاش مین لگے رہتے۔ انھوں

نے نئی معلومات کے حصول کے لیے تحقیق کا کٹھن راستہ اپنایا۔

کام، تحقیق اور دریافتوں کے عمل کی مسلسل مصروفیات میں انھیں سکون اور آرام ملتا تھا۔انھوں نے اپنی زندگی اک علمی شیڈول کے مطابق گزارا۔ان کی زندگی ایک سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی۔انھیں اپنے کام ہی میں آرام، چین اور اطمینان ملتا تھا۔

مولانا ان لوگوں سے خشک رویہ رکھتے تھے جو ذہنی افلاس کا شکار تھے۔وہ فکری، علمی اور تحقیقی حوالے سے عام چلتی ہوئی چیز اور سطحی لکھت کو برداشت نہیں کرتے تھے۔(۸)

وہ صاحب نظر تھے۔نکتہ رس اور باریک بین تھے۔تحقیقی طلبی ان کی شخصیت کا لازمی جزو تھی۔ان کی تحقیقی دنیا لامحدود اور وسیع تھی۔ذہنی گیرائی اور فکری رسائی رکھتے تھے۔

> ''مولانا کی شخصیت اپنے کردار عمل خواہ علم کے لحاظ سے، ہمارے لیے نہ فقط مثالی بلکہ مشعل راہ ہے۔ان کو اپنے موضوعات سے لگاؤ ہی نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ایک عشق تھا۔''(۹)

وہ مردم شناسی کا ملکہ رکھتے تھے۔اچھے لوگوں کے قدردان تھے۔اپنی خوش مزاجی اور شخصیت کی کشش کی وجہ سے اہل علم میں مقبول تھے۔

وہ ہمہ وقت اپنے کام میں مصروف رہتے تھے اور علمی و تحقیقی موضوعات کی ٹوہ میں منہمک رہتے تھے۔گھر میں ہوں، دانش گاہ میں یا اندرون ملک یا بیرون ملک سفر میں ہوں وہ تحقیق اور علم کی متلاشی رہتے تھے۔

ان کی یادداشتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا حافظہ کمال کا، حیرت انگیز حد تک وسیع، انتہائی دقیق اور قابل رشک تھا۔وہ انگریزی، اردو، فارسی، عربی، جرمن، لاطینی سریانی، ترکی پنجابی اور ہسپانوی زبانیں جانتے تھے۔

اسفار اور اعزازات:

۱۹۵۳ء میں انھیں حکومت کی جانب سے علمی وثقافتی دورے پر ایران جانے والے وفد کی سربراہی کے لیے منتخب کیا۔انھوں نے اس وفد کے ساتھ ایران کے کئی مشہور مقامات کا دورہ کیا۔

ایران کی حکومت نے ان کی تحقیقی اور علمی سرگرمیوں کے اعتراف میں انھیں ایران کا نشان علمی پیش کیا۔

دوسرا سفر بھی انھوں نے ایران کا کیا۔جہاں وہ ۱۹۵۳ء میں ابن سینا کے حوالے سے ہونے والے ہزار سالہ جشن میں شرکت کے لیے تشریف لے گئے۔

دوسرا سفر انھوں نے انگلستان کا کیا۔جہاں انھوں نے کیمبرج میں منعقد ہونے والی مستشرقین کی بین الاقوامی ۲۳ ویں کانفرنس میں شرکت کی اور وہاں پنجاب یونیورسٹی کی نمائندگی کی۔

کیمبرج سے واپس آ کر وہ پھر دوبارہ دائرۃ المعارف اسلامیہ اُردو کی ترتیب وتالیف کا کام کرنے لگے۔بعدازاں وہ پنجاب یونیورسٹی کی سینٹ کے رکن بھی رہے اور کلیۂ علوم مشرقی کے سربراہ کے طور پر کام کرتے رہے۔وہ شہنشاہ ایران کی جانب سے مجلس اعانت کے ناظم اور سربراہ بھی مقرر کیے گئے۔انھوں نے عربی فارسی کی انجمن بھی بنائی اور اس کا تحقیقی مجلّہ بھی جاری کیا جس کی ادارت کا فریضہ بھی انھوں نے سنبھالا۔

۱۹۴۲ء میں انھوں نے اورینٹل کالج میگزین جاری کیا۔یہ ان کا ایک اہم تحقیقی اور علمی کارنامہ ہے۔یہ رسالہ ۱۹۲۵ء سے اگست ۱۹۴۲ء تک مولوی محمد شفیع کی ادارت میں شائع ہوتا رہا۔

مشرقی زبانوں کے حوالے سے انھوں نے جو خدمات سرانجام دیں ان کے اعتراف میں پنجاب یونیورسٹی نے انھیں ۱۹۵۲ء میں ڈاکٹریٹ (D.O.L) کی اعزازی ڈگری عطا کی۔

اکتوبر ۱۹۵۵ء میں پروفیسر ڈاکٹر مولوی محمد شفیع کی خدمت میں ایک ارمغان علمی پیش کیا گیا۔(۱۰) جس میں ان کی سوانح وشخصیت کے علاوہ مختلف محققین اور علماء کے ۴۱ تحقیقی مقالات شامل کیے گئے۔

اس ارمغان علمی میں ۱۲ مقالہ جات اردو میں، ۶ مقالہ جات فارسی میں، ۴ مقالہ جات عربی میں ۱۵ مقالہ جات اور دیگر ۶ تحریریں انگریزی زبان میں شامل کی گئی ہیں۔۳ مضامین فرانسیسی میں اور ایک مضمون جرمن زبان میں ہے۔(۱۱) یہ مضامین ومقالات کا ایک ایسا گلدستہ ہے جو علمی اور

تحقیقی نوعیت کی تحریروں پر مشتمل ہے۔

۱۹۵۹ء میں حکومت پاکستان نے ان کی خدمات کے اعتراف میں نشان ستارۂ پاکستان عطا کیا۔

بڑھاپے میں بھی وہ جوانوں کی طرح کام کرتے تھے۔ کام کے وقت وہ اپنے ضعف اور بڑھاپے کو بھول جاتے تھے کمزوری یا کسی بھی قسم کے ضعف کا شائبہ تک نہیں ہوتا تھا۔ وہ اپنی کتابوں اور عبارتوں میں خود کو مصروف کر لیتے تھے۔ آخری دنوں میں انھیں دل کا عارضہ ہو گیا تھا۔ مگر اس حالت میں بھی انھوں نے کام کرنا نہ چھوڑا۔

۱۱ مارچ بروز سوموار انھیں ہلکا سا بخار ہوا جس کی وجہ سے انھیں ہسپتال لے جایا گیا۔ بدھ کی دوپہر تک ان کی طبیعت سنبھل گئی۔ لیکن دوپہر کے بعد طبیعت بگڑنے لگی اور نبض ڈوبنے لگی۔ وہ ۱۴ مارچ ۱۹۶۳ء بمطابق ۱۸ شوال ۱۳۷۲ھ کو لاہور میں رات بارہ بجے اس دنیائے فانی سے رخصت ہو گئے۔ (۱۲) اگلے دن شام پانچ بجے انھیں اچھرہ، لاہور کے قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔

مولوی محمد شفیع کی وفات سے تحقیقی سرگرمیاں متاثر ہوئیں۔ دائرہ معارف اسلامیہ کے حوالے سے پروفیسر حمید احمد خاں لکھتے ہیں:

> 'یونیورسٹی نے چند ایسے علمی ادارے بھی قائم کیے ہیں جنھیں قوم کے تاریخی اور تہذیبی ورثے کا تحقیقی جائزہ لینے کی ذمہ داری سونپی گئی ہے۔ ان میں دائرۂ معارف اسلامیہ کو ڈاکٹر مولوی محمد شفیع کی وفات سے شدید نقصان پہنچا تھا۔ تین چار برس تک کام کی رفتار پر بھی اس کا اثر پڑتا رہا۔'' (۱۳)

تحقیق اور خاص طور پر معیاری تحقیق کے حوالے سے ان کی ذات سے وابستہ جو فیوض و برکات کا سلسلہ تھا وہ بند ہو گیا۔

علمی و تحقیقی سرگرمیاں:

مولوی محمد شفیع ایک متنوع الجہات شخصیت کے مالک تھے۔ انھوں نے زبانوں کے حوالے سے اور خاص طور پر عربی فارسی کے میدان میں تحقیقات کو اپنا محور و مرکز بنایا۔ انھوں نے اس

حوالے سے گرانقدر کام کیا۔ کئی علمی رسائل اور کتابیں تالیف کیں۔ انھوں نے کئی تحقیقی مقالات رقم کیے۔ تاریخ و فرہنگ ایران پر خصوصی کام کیا۔

انھوں نے ٹھوس اور علمی بنیادوں پر تحقیق کی بنیاد رکھی۔ شعر و ادب، خطاطی، مصوری، سوانح، تاریخ، کتبات، مقابر جیسے شعبوں میں بھی تحقیقی کام کیے۔ نئی نئی دریافتیں کیں۔ تیموریوں کی تاریخ کے حوالے سے عقدہ کشائیاں کیں۔

> ''ان کی یہ خواہش اور کوشش رہی کہ ملک میں تحقیق کا معیار بہت بلند ہونا چاہئے اور قلم سے جو بات نکلے وہ سپاٹ سرسری اور پست نہ ہو بلکہ جچی تلی بات ہو۔'' (۱۴)

تدوین کے حوالے سے بھی ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ تصحیح متون کے حوالے سے بھی وہ ایک قابل انسان تھے، جن کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ بقول احمد ربانی:

> ''نادر متون کی تصحیح و اشاعت تو ایسے موضوعات میں سے ہے جن کی بنا پر انھیں دنیا بھر میں دائمی شہرت حاصل ہوئی۔ اس کے علاوہ کتاب شناسی یعنی نادر قلمی نسخوں کو متعارف کرانے سے آپ کو والہانہ لگاؤ تھا۔ اس سے ان کی دقتِ نظر اور وسعتِ معلومات کا اندازہ ہوتا ہے۔'' (۱۵)

خزائن مخطوطات اور کتب خانوں کے نوادرات کا وہ جس طرح تعارف پیش کرتے تھے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مخطوطات کے جوہر شناس تھے۔

> ''ڈاکٹر مولوی محمد شفیع مرحوم کو عربی ادبیات کے علاوہ پاکستان و ہند کی علمی و ادبی سرگرمیوں کی روداد کی تکمیل سے بھی خاص دلچسپی تھی اور انھیں کتبات، خطاطی اور دیگر اسلامی فنون کے بعض پہلوؤں سے بھی بغایت شغف تھا۔ یہ وہ خوبی ہے جو دیگر محققین اور مؤرخین میں شاذ ہی دستیاب ہوتی ہے۔'' (۱۶)

انھوں نے جو علمی اور ثقافتی سرمایہ چھوڑا ہے وہ اہل تحقیق اور تہذیب و تمدن کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے نئی منزلوں کا نشان راہ ثابت ہوگا۔ وہ ایک سچے محقق تھے جن میں ایک اچھے محقق کی تمام خوبیاں موجود تھیں۔

''ایک محقق میں جن صفات کا ہونا ضروری ہوتا ہے وہ ساری صفات ان کی ذات گرامی میں بدرجہ اتم موجود تھیں یعنی معیاری علمی ذوق، ادب وتاریخ سے والہانہ لگاؤ، دقت نظری، کمال احتیاط، وسعت معلومات، کتب ومخطوطات سے بے پناہ محبت۔ یہ سب ان کی طبیعت میں اس طرح رچ بس گئی تھیں گویا قدرت کی طرف سے ورثے میں ملی ہوں۔''(۱۷)

تحقیقی کام کے لیے ان کا ایک معیار تھا۔ وہ اس معیار سے کبھی نیچے نہیں آتے تھے۔ تحقیق بھی ایسی کہ ہر بات اور دریافت کی وضاحت کرنا وہ اپنا فرض سمجھتے تھے۔

''مستند حوالہ جات تشفی بخش تصریحات کے ساتھ ہر جگہ موجود ہیں اور جہاں جہاں دوسرے حوالہ جات کی طرف قاری کی رہنمائی ضروری معلوم ہوئی ہے، وہاں مطلوبہ حوالہ جات صحت وتفصیل سے درج کر دیے گئے ہیں۔ مؤرخ اور محقق کے لیے جہاں کہیں لمحۂ فکریہ پیدا ہوا ہے، علامہ شفیع کبھی اس مقام سے بے نیازانہ نہیں گزرے۔''(۱۸)

معیار مقرر کرنے کے بعد وہ اپنے موضوع سے متعلق تحقیق کے اصول وضوابط بناتے اور پھر ان اصول وضوابط کی پابندی کرتے۔

''مولوی محمد شفیع کے تحقیقی کام کی اہمیت وعظمت اور بین الاقوامی شہرت کا راز یہی ہے کہ انھوں نے ہر قسم کی تحقیق سے پہلے اس کے لیے حوالے کی کامل یادداشتیں علمی اصولوں کے مطابق مرتب کیں بعد میں انہی علمی نقشوں سے ان کی تصنیف وتحقیق کی عالیشان عمارتیں تعمیر ہوئیں۔''(۱۹)

ایک جگہ ان کے صاحبزادے نے اسلامی کانفرنس منعقدہ لاہور ۱۹۵۸ء کے بارے میں لکھا ہے کہ اس کانفرنس میں کیمبرج یونیورسٹی کے مشہور مستشرق پروفیسر مینورسکی بھی مندوب کی حیثیت سے شریک ہوئے اور ایک شام ملاقات میں انھوں نے مجھے کہا کہ تمھارے والد برصغیر کی ایک بڑی شخصیت ہیں۔ مگر تمھارے ملک نے اس گوہر نایاب کی قدر و قیمت نہیں پہچانی۔(۲۰)

فہرست سازی میں ماہر تھے۔ مخطوطوں کی فہرست سازی میں خصوصی دلچسپی لیتے رکھتے تھے۔ اسی لیے انھوں نے علی گڑھ اور رام پور کے اہم مخطوطات کا تعارف پیش کیا۔

وہ تحقیق اور غور وخوض کرتے وقت دقت نظری سے کام لیتے کسی بھی شخص سے رعایت نہیں کرتے تھے۔ وہ نہ صرف عام لوگوں بلکہ جانے پہچانے اور مانے ہوئے اور اہل علم وعمل کے لیے بھی یہی رویہ رکھتے تھے۔

عربی فارسی، اردو پنجابی اور سندھی کے نادر ونایاب مخطوطات جمع کرنا ان کا پسندیدہ اور محبوب ترین مشغلہ تھا۔ اسی لیے انھوں نے ہزاروں مخطوطات کا ذخیرہ جمع کیا۔ جو کہ ان کے انتقال کے بعد مقالات محمد شفیع کے نام سے پانچ جلدوں میں شائع کر کے محفوظ کیا گیا۔

مقالات مولوی محمد شفیع کی جلد اول میں وہ مقالات شائع ہوئے جن کا موضوع کتبہ شناسی، خطاطی، عمارات، خط وخطاطان اور فنون اسلامی کی دریافت سے تھا۔ اس کے علاوہ اقتباسات تحفۂ سامری، واقعات بابری، سکھر، بھکر اور روہڑی کے مقامات سے متعلق ہے۔

جلد دوم ۴۴۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں فرقۂ نوربخشی، رام پور کے ۲ کتب خانے، مثنوی سحر البیان کا ایک پرانا دیباچہ، شمس العلماء مولوی محمد حسین، تذکرۂ میخانہ، خزائن مخطوطات کتاب خانہ ریاست کپورتھلہ، اقتباس از فرحت الناظرین، فہرست کتب عربیہ رام پور، تذکرۃ الملتان کے دو اقتباس، قصہ ہیر رانجھا، قصہ سسی پنوں جیسے مضامین شامل ہیں۔

جلد سوم میں ۲۶ مضامین اور آخر میں ضمیمہ دیوان مطہر کڑہ از ڈاکٹر وحید مرزا شامل ہے۔ چیدہ چیدہ مضامین میں سفر نامۂ چین، فہرست مصنفات علامہ شہرستانی، لفظ کوکبہ کی تحقیق، مطہر کڑہ، کتاب المتشابہ، تاریخ ہرات فامی، کلمۂ مجوس، قاہرہ کی وجہ تسمیہ، ڈاکٹر اے سی وولنر، الخلیل بن احمد العروضی، مرحوم حافظ محمود شیرانی، ایک شاہجہانی برتن، اخبار علمیہ، تصحیح میخانہ وغیرہ شامل ہیں۔

جلد چہارم میں فہرست مضامین جواہر نامہ، تذکرۂ میخانہ اور خلاصۃ المضامین، لطف اللہ مہندس، مثنوی گلستان خیال، دارا شکوہ کے حالات، مزارات اولیائے ہند، عالمگیر نامہ، فہرست تراجم، مشائخ عظام، تصنیفات شاہ رفیع الدین دہلوی، کتاب التکمیل، کتاب خانۂ حصار، علی گڑھ

کے مخطوطات، مصور نسخے، وصلیاں، مشاہیر علی گڑھ، شاعر اور ادیبوں کے خطوط، مائکرو فلمیں، نوادر سکے، تصاویر، فرامین، نقشے، مسعود سعد سلمان کے فارسی اشعار، آثار ہرات کا نقشہ، تیمور اور اس کا جانشین شاہ رخ وغیرہ شامل ہیں۔ آخر میں اشاریہ بھی دیا گیا ہے۔

جلد پنجم میں احیاء علوم الدین کا فارسی ترجمہ، شاہ طہماسپ صفوی کی ایک سیور غال، مفتی صدرالدین دہلوی، مرقع دارا شکوہ، نام ونسب سعدی شیرازی، ابومحمد زکریا ملتانی، شیخ الاسلام، ہبار بن الاسود، ھباریان سندھ، ظفر نامہ، رسالہ در معرفت عناصر و کائنات الجّو، بدائع وقائع، حیات اللہ خان بہادر، احوال حضور لامع النور، فقرات عبرت، رسیدن تابوت نواب وزیر الملک، احمد شاہ بہادر نقل نامۂ عبدالباقی خان وزیر والیٔ ایران، تتمہ احوال پنجاب، نقل عرضداشت نواب سیف الدولہ بہادر دلیر جنگ، نقل فتح نامہ اورنگ، اور دیگر کئی مضامین شامل ہیں۔

تصانیف:

کتب:

۱۔ فہارس العقد الفرید لابن عبدربہ: کلکتہ ۱۹۳۵ء، ۱۹۳۷ء، تعداد صفحات ۱۴۰۰ (متعدد بار پنجاب یونیورسٹی سے شائع ہوئی)

۲۔ میخانۂ عبدالنبی فخر الزمانی قزوینی (تذکرۂ شعراء) فارسی متن مع حواشی وفہارس تحلیلی لاہور، ۱۹۲۶ء، تعداد صفحات ۵۰۷

۳۔ تتمہ صوان الحکمۃ لعلی بن زید البیقہی: متن عربی مع حواشی وفہارس مطبوعہ پنجاب یونیورسٹی ۱۹۳۵ء، تعداد صفحات ۳۶۰

۴۔ تتمہ صوان الحکمۃ ترجمہ فارسی (درۃ الخبار) مطبوعہ پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۳۵ء

۵۔ مطلع سعدین، از کمال الدین عبدلرزاق سمرقندی: متن فارسی مع حواشی وفرہنگ
جلد دوم: حصہ اول، لاہور ۱۹۴۱ء، حصہ دوم، سوم ۱۹۴۹ء، تعداد صفحات ۱۵۵۸

۶۔ مکاتبات رشیدی، (مکاتبات رشید الدین فضل اللہ طبیب): متن فارسی وحواشی، لاہور ۱۹۴۷ء صفحات ۴۷۹

۷۔ وولنر کو میموویشن وولیوم: تصحیح وترتیب بزبان انگریزی، لاہور ۱۹۴۰ء، صفحات ۳۲۸

۸۔ وامق عذرا، عنصری کی ناپید مثنوی کے چند اوراق (زیر طبع) (۲۱)

۱۰۔ یادداشتہائے علامہ مولوی محمد شفیع، جلد اول، لاہور، مجلس ترقی ادب

۱۱۔ سکھر بکھر، روہڑی، سکھر، سکھر ہسٹاریکل سوسائٹی، ۲۰۱۰ء

مقالات:

محمد شفیع، مولوی، مقالات مولوی محمد شفیع، مرتبہ احمد ربانی جلد اول، لاہور، مجلس ترقی ادب، س ن

محمد شفیع، مولوی، مقالات مولوی محمد شفیع، مرتبہ احمد ربانی جلد دوم، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۲ء

محمد شفیع، مولوی، مقالات مولوی محمد شفیع، مرتبہ احمد ربانی جلد سوم، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۴ء

محمد شفیع، مولوی، مقالات مولوی محمد شفیع، مرتبہ احمد ربانی جلد چہارم، لاہور، مجلس ترقی ادب ۱۹۷۲ء

محمد شفیع، مولوی، مقالات مولوی محمد شفیع، مرتبہ احمد ربانی جلد پنجم، لاہور، مجلس ترقی ادب، جون ۱۹۸۱

ان کے مقالات کو پڑھ کر یہ پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے تحقیق وتنقیح کا جو معیار اپنایا ہے وہ قابل قدر ہے۔ انھوں نے مستند حوالوں کے ساتھ تصریحات پیش کی ہیں۔ انھوں نے جگہ جگہ قاری کی رہنمائی کا خیال رکھا ہے۔ اور تمام حوالہ جات اور حواشی کو صحت اور تفصیل کے ساتھ درج کیا ہے۔

حواشی وحوالہ جات

۱۔ محمد شفیع، مولوی، سکھر بکھر، روہڑی، سکھر، سکھر ہسٹاریکل سوسائٹی، ۲۰۱۰ء، ص ۶

۲۔ حواشی: ڈاکٹر عظیم الدین احمد ۱۹۱۹ء میں ریٹائر ہوئے تو ان کی جگہ مولوی محمد شفیع کو پروفیسر عربی مقرر کیا گیا۔

۳۔ تاریخ یونیورسٹی اورینٹل کالج، مرتبہ ڈاکٹر غلام حسین، لاہور، جدید اردو ٹائم پریس، ص ۷۰

۴۔ تاریخ اورینٹل، ص ۱۰۳

۵۔ حمید احمد خاں، پروفیسر، تعلیم وتہذیب، مجموعہ خطبات ومقالات، لاہور، مجلس ترقی ادب،

۱۹۷۵ء،ص۳۱۴
۶۔ مولانا محمد شفیع مرحوم ومغفور از سید حسام الدین راشدی مشمولہ مقالات مولوی محمد شفیع، مرتبہ احمد ربانی، جلد اول، لاہور، مجلس ترقی ادب، ص۵
۷۔ مولانا محمد شفیع مرحوم ومغفور از سید حسام الدین راشدی، ص۱۴
۸۔ ایضاً، ص۸
۹۔ ایضاً، ص۱۱
۱۰۔ تاریخ اورینٹل کالج، ص۱۰۶
۱۱۔ ارمغان مولوی محمد شفیع، لاہور، پنجاب یونیورسٹی لاہور
۱۲۔ حسام الدین راشدی، ص۱۹
۱۳۔ حمید احمد خاں، پروفیسر، تعلیم وتہذیب، مجموعہ خطبات ومقالات، ص۲۶۶
۱۴۔ حسام الدین راشدی، ص۸
۱۵۔ پیش لفظ از احمد ربانی، مقالات مولوی محمد شفیع، جلد دوم، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۲ء
۱۶۔ محمد شفیع، مولوی،، مقالات مولوی محمد شفیع، مرتبہ احمد ربانی جلد سوم، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۴ء، فلیپ
۱۷۔ پیش لفظ از احمد ربانی، مشمولہ مقالات مولوی محمد شفیع، جلد چہارم، لاہور مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۲ء، ص ب
۱۸۔ احمد ربانی (مرتب) مقالات مولوی محمد شفیع، جلد پنجم، لاہور مجلس ترقی ادب، ۱۹۸۱ء
۱۹۔ یادگار از احمد ربانی مشمولہ یادداشتہائے علامہ مولوی محمد شفیع، جلد اول، لاہور، مجلس ترقی ادب، س ن
۲۰۔ پیش لفظ از احمد ربانی، مشمولہ مقالات مولوی محمد شفیع، جلد چہارم، لاہور مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۲ء، ص ب
۲۱۔ تاریخ یونیورسٹی اورینٹل کالج، مرتبہ ڈاکٹر غلام حسین

پروفیسر میرا فیلبوس

ڈاکٹر شیبا عالم

پاکستان کی نامور خواتین جنھوں نے علم و ادب، فنونِ لطیفہ، تعلیم و تمدن، قانون اور پارلیمانی امور سے لے کر کھیل اور سیاست کے میدانوں میں دنیا میں اپنا کردار ثابت کیا اُن میں ڈاکٹر میرا فیلبوس (Dr. Mira Phailbus) کا نام بلاشبہ بے حد نمایاں ہے۔ انھوں نے تعلیم، انسانی حقوق، خواتین کی معاشی و سماجی بہبود کے ساتھ اعلیٰ انتظامی صلاحیتوں کی وجہ سے ناقابلِ فراموش خدمات انجام دی ہیں۔ اُن کے اس سفر کی مختلف منازل کا جائزہ اس طرح سے ہے۔

میرا فیلبوس ۱۹۳۷ء میں کلکتہ (بنگال) کے ایک تعلیم یافتہ گھرانے میں پیدا ہوئیں۔ آپ کے والد ارنسٹ جیوانندن اور والدہ آئرین مِتّر (Irene Mitter) نے بیٹی کا نام میرا رُتھ (Mira Ruth) رکھا۔ میرا بہن بھائیوں میں دوسرے نمبر پر تھیں۔ میرا فیلبوس کی دادی نے دہلی میں مماڈل سکول فار بوائز کا سنگ بنیاد رکھا اور دادا ہندو تھے۔ ان کا نام متھرا ناتھ بوس تھا جو ۱۸۶۵ء میں عیسائی مذہب میں داخل ہوئے۔ میرا کے والدین کی شادی ۱۹۲۸ء میں ہوئی۔ میرا کے والد نے لکھنؤ میں تعلیم پائی اور سرکاری ملازمت حاصل کی اور ۱۹۲۸ء میں پنجاب آ گئے۔ میرا فیلبوس نے لاہور کیتھڈرل سکول میں تعلیم پاوی۔ یہاں انھوں نے سینئر کیمبرج کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد میرا فیلبوس نے کینئرڈ کالج فار رویمن میں داخلہ لے لیا۔ اُس وقت کالج کی پرنسپل مس منگت رائے تھیں۔ جن کی شخصیت سے متاثر ہو کر میرا نے ارادہ کیا کہ ایک دن وہ بھی اس کالج کی پرنسپل بنیں گی۔ یہاں کالج میں میرا نے بہت محنت کی۔ ان کے مضامین میں جغرافیہ ایسا مضمون تھا جس میں ان کی دلچسپی نے اُنھیں پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے جغرافیہ کی ڈگری

دلوائی۔

۱۹۶۰ء میں میرؔا کی شادی تھیوڈور فیلبوس (Theodere Phailbus) سے ہوئی جو واپڈا میں انجینئر تھے اور لاہور کی سماجی زندگی میں جانے پہچانے جاتے تھے۔ میرا فیلبوس کے ہاں چار بچوں کی پیدائش ہوئی۔ ان کی تین صاحبزادیاں اور ایک بیٹا ہے۔ میرؔا کی علمی زندگی کا آغاز کینئرڈ کالج میں جغرافیہ کے اُستاد کی حیثیت سے ہوا۔ بحیثیت اُستاد وہ کالج کے ہر اُستاد اور طالبات میں بے حد مقبول ثابت ہوئیں۔

۱۹۷۲ء میں جب پورے ملک میں پرائیویٹ تعلیمی اداروں کو نیشنلائز کیا جا رہا تھا تو اُس وقت کی پرنسپل مارگریٹ رابنس نے انھیں بتایا کہ اس اہم مرحلے پر اساتذہ، والدین اور طلبا کے ساتھ ایسوسی ایشن کی یہ رائے ہے کہ انھیں پرنسپل بنایا جائے تاکہ وہ اس دور میں بہتر خدمات انجام دیں۔ میرؔا نے بتایا کہ وہ ابھی عمر کے اس حصے میں نہیں ہیں جہاں اتنی اہم ذمہ داری نبھائی جا سکے۔ مگر یہی تو ان کا امتحان تھا۔ انھوں نے یہ ذمہ داری سنبھالی اور پھر اُن کی انتظامی صلاحیتوں کی آزمائش ہوئی۔ انھوں نے مشکل وقت میں کینئرڈ کالج کو سنبھالا اور اُس کی تاریخی روایات اور علمی حیثیت کو برقرار رکھنے میں بہت محنت کی اور پینتیس (۳۵) سالوں تک کینئرڈ کی رہنمائی کا فرض ادا کیا۔ اس دوران اساتذہ اور طالبات کی مدد سے اس کی اُفق میں اضافے کے ساتھ اعلیٰ تعلیمی معیار کو نہ صرف برقرار رکھا بلکہ ہر طرح کی سیاسی مداخلت سے پاک رکھنے میں کامیاب ہوئیں۔

۱۹۷۵ء میں میرؔا نے کالج میں پاکستان ویمن انسٹی ٹیوٹ قائم کیا جس کا افتتاح خاتونِ اوّل بیگم نصرت بھٹو کے ہاتھوں انجام پایا۔ ۱۹۷۲ء میں میرؔا پراونشیل ایجوکیشن کونسل کی رُکن بنائی گئیں۔ ۱۹۷۴ء میں ممبر ووکیشنل ایجوکیشن کمیٹی کی رُکن بنیں۔ ۱۹۷۵ء میں آپ کو پاکستان ویمن رائیٹس کمیشن کا ممبر بنایا گیا۔ ۱۹۷۷ء میں یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی ممبر بنیں۔ ۱۹۹۵ء میں میرؔا نے بیجنگ میں یونائیٹڈ نیشنز کے چوتھے ورلڈ ویمن کنونشن میں پاکستان کی نمائندگی کی۔

ایک وقت ۱۹۸۸ء میں ایسا آیا کہ میرا فیلبوس کو کسی اور کالج میں تبدیل کرنے کے جب احکامات آئے تو پورے کالج نے تحریک چلائی اور دوسرے دن وہ احکامات واپس لینے پڑے۔ اپنے انتظامی دور میں کالج کی توسیع میں اور اکیڈیمک معیار میں اضافے کی کئی منازل طے کیں۔ کالج میں میرا فیلبوس سینٹر اور پوسٹ گریجویٹ بلاک کی تعمیر عمل میں آئی۔ اس کے ساتھ ہی اسے

ڈگری ایوارڈنگ کالج کا درجہ بھی حاصل ہو گیا۔ میرا فیلبوس نے ڈیوڈسن یونیورسٹی یو ایس اے سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ ان کی خدمات کے اعتراف میں حکومت پاکستان کی جانب سے ''اعزازِ فضیلت''، پرائڈ آف پرفارمنس اور ''ستارۂ امتیاز'' کے اعزازات سے نوازا گیا۔

میرا فیلبوس کو ویمن کرکٹ بورڈ کی پہلی چیئرپرسن کا اعزاز بھی حاصل رہا۔

۲۰۱۳ء میں پہلی خاتون محتسب پنجاب کا منصب سنبھالا، جہاں انھوں نے خواتین کے خلاف مختلف سطح کی ناانصافیوں کو دور کرنے کی کوشش کی۔

۲۰۱۳ء میں ان کی کتاب "Kinnaird Remmbered" شائع ہوئی۔ جو کینئرڈ کالج کے پینتیس سالوں کی تاریخ کا احاطہ کرتا ہے۔ یہ وہ موقع تھا جب کالج کی سو سالہ تقریبات منائی جا رہی تھیں۔

میرا فیلبوس نے تعلیمی، تدریسی، انتظامی اور انسانی حقوق کے لیے جو خدمات انجام دی ہیں اس سے کئی اداروں نے فیض پایا ہے۔ انھوں نے ہمیشہ عظیم اقدار کے معیار کو سامنے رکھا اور کبھی ان اقدار پر سمجھوتہ نہیں کیا۔ وہ کئی نسلوں کے لیے اپنے کردار اور دانش کی وجہ سے بہترین مثال کے طور پر یاد کی جاتی ہیں۔ ان کا سفر جاری ہے اور وہ آج بھی اپنے قائم کیے گئے نقوش کو تابندہ رکھنے کی جستجو کرتی رہتی ہیں۔

پروفیسر نادر قمبرانی

افضل مرادؔ

پروفیسر نادر قمبرانی ایک بلند پایہ دانشور، شاعر اور ادیب تھے۔لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ ان کی اصل پہچان بحیثیت استاد کی تھی ۔

پروفیسر نادر قمبرانی 13 رمضان المبارک ۱۳۴۳ھ / 1924 بروز منگل حاجی صاحب خان قمبرانی کے ہاں پیدا ہوئے۔آپ قمبرانی (بلوچ) قبیلے سے تعلق رکھتے تھے، براہوئی، بلوچی، فارسی، پشتو، اردو، انگلش زبانوں پر دسترس حاصل تھی ۔ پروفیسر نادر قمبرانی نے ایم اے، (اردو) ایم اے (براہوئی) فاضل فارسی کی تعلیم حاصل کرنے کے علاوہ ادب، فلسفہ و تاریخ اور سماجی سائنس کے بے شمار موضوعات پر اپنے مطالعے کی دھاگ جمائی تھی ۔ پروفیسر نادر قمبرانی نے فارسی میں منشی فاضل بھی کیا اور 1950ء میں سریاب پرائمری سکول میں بطور مدرس متعین ہوئے ۔نادر قمبرانی صفات کے نادر ہی نہیں بلکہ نادر و نایاب شخصیت تھے ۔خوددار، غیرت مند، اصول پرست، سیر چشم اور سب سے بڑھ کر عوامی بھلائی کو ذاتی مفاد اور اغراض کی خاطر قربان کرنا گویا نادر صاحب کی سرشت میں تھا۔ان کی مجلسی نشستیں یادگار ہوتی تھی جو برسوں تک یونیورسٹی کے ڈیپارٹمنٹس، کوریڈورز اور کنٹین کے سبزہ زار کے علاوہ ان کے یونیورسٹی کیمپس میں بھی سجتی تھیں ۔ پروفیسر نادر قمبرانی نے یونیورسٹی کی سطح پر صدر براہوئی ڈیپارٹمنٹ، صدر شعبہ فارسی بلوچستان یونیورسٹی ،ڈائریکٹر پاکستان اسٹیڈی سینٹر بلوچستان یونیورسٹی کوئٹہ جیسے اہم عہدوں پر برسوں خدمات انجام دینے کے باوجود اپنے استاد اور ادیب، شاعر کے منصب کو کہیں دبنے اور پس پشت ڈالنے نہیں دیا ۔وہ اپنے اندر کے استاد کو بارہا سامنے لاتے اور ان کا تخاطب ایک معتبر استاد کی حیثیت سے سامنے آتا ہے ۔ پروفیسر نادر قمبرانی کے والد عالم دین تھے ۔انہوں نے ابتدائی تعلیم کلی احمد خان

زئی میں حاصل کی میٹرک اسلامیہ ہائی سکول سے اور گریجویشن پنجاب یونیورسٹی سے کیا۔

پروفیسر نادر قمبرانی ایک روشن خیال اور ترقی پسند سوچ رکھنے والے شاعر تھے ان کی تحریروں کے ساتھ ساتھ ان کے عملی سطح پر بلوچستان میں علم و ادب کے فروغ اور خاص طور پر بلوچی، براہوئی زبان کی ترقی کو مدنظر رکھتے ہوئے اقدامات کئے ۔نادر قمبرانی چونکہ ایک مذہبی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے ۔اس لئے عربی زبان سے بھی قدر واقفیت رکھتے تھے ۔ فارسی کو وہ اپنی دوسری مادری زبان قرار دیتے تھے ۔ جامعہ بلوچستان میں فارسی ڈیپارٹمنٹ کے اولین اساتذہ میں ان کا شمار ہوتا تھا۔اس طرح اردو میں بھی وہ اکثر بیشتر اپنی تحریریں اور گفتگو سے رنگ جماتے تھے ۔

ان کی شخصیت میں ایک کشش، وقار اور خوبصورتی تھی جہاں اور جس محفل میں جاتے سب کے دل موہ لیتے تھے ۔انہوں نے اپنی عملی زندگی کا آغاز بطور اسکول ٹیچر کیا اور ایک جذبے کے ساتھ علم کے فروغ کا بیڑا اٹھایا۔

نادر قمبرانی کا تعلق لٹ خانہ سے ہوا تو ان کی یہ تعلق شاعر و ادیبوں کے علاوہ نواب، سردار اور سیاسی کارکنوں سے ہوئی ۔ وہ ان کے جلسوں میں اپنے نظموں کو پڑھ کر لوگوں کے دلوں میں گھر کر لیا۔آپ سیاسی تحریکوں میں ہمیشہ پیش پیش تھے ۔اپنے دیگر دوستوں کے ساتھ مل کر اس نظام کے خلاف آواز بلند کیا۔ان کے دوستوں میں بابو عبدالرحمٰن کرد، میر عبداللہ جان جمالدینی، آزاد جمالدینی، غلام محمد شاہوانی، ملک عبدالرسول لہڑی، ڈاکٹر خدائیداد ملک عبدالرحیم خواجہ خیل، حاجی عبدالرحمٰن شاہوانی، حبیب اللہ جنگ اور دیگر دوست شامل تھے ۔

جب انہوں نے بطور استاد بلوچستان یونیورسٹی جوائن کر لی ۔تو وہ نئی نسل کے ذہنوں کے قریب ہو گیا ۔ اور نہایت خاموشی، صبر اور دلجمعی کے ساتھ نوجوانوں پر کام کرنے لگا ۔ پروفیسر عبداللہ جان جمالدینی جیسے ماہرین تعلیم بھی یونیورسٹی میں موجود تھے ۔ایک علمی و ادبی کہکشاں سی بن گئی ۔ یہ بلوچستان یونیورسٹی کے طلباء کا ایک سنہری دور تھا۔جس میں ذہنوں کو جلا ملی ۔ آزادی افکار اور جرات اظہار کا سلیقہ ملا۔

پروفیسر نادر قمبرانی یونیورسٹی کے استاد ہونے کے ساتھ ریڈیو، ٹی وی سے بھی وابستہ تھے ۔ شام کے وقت یہ تمام لوگ عبداللہ جان جمالدینی کے ساتھ یونیورسٹی میں گھوما کرتے تھے علمی اور ادبی گفتگو کرتے تھے ۔ان کا حلقہ احباب بہت وسیع تھا۔ وہ علمی و ادبی محلفوں میں ہمیشہ شریک

رہے۔ساری زندگی علم وادب کی خدمت میں گزاری۔ 27 سال بلوچستان یونیورسٹی میں تعلیم کی روشنی پھیلاتے رہے۔ان کو وہ مقام اور عزت ملی جو بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔

گل بنگلزئی اپنے ایک مضمون میں پروفیسر نادر قمبرانی کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ

''نادر جان کو اپنے دوست وشاگروں سے بہت محبت تھی۔ان میں سے کسی کو دیکھتے تو وہ بہت خوش ہوتے۔جولائی 1985ء میں جب میں بلوچستان یونیورسٹی کے کالونی میں اپنے لئے مکان الاٹ کروایا (C-10) تو پروفیسر عبداللہ جان جمالدینی، نادر قمبرانی، میر عاقل خان مینگل (مرحوم) پروفیسر عدالرحمٰن فکر، الٰہی بخش بھنگر، حسن خان مندوخیل، غلام قادر لاشاری قریب قریب تھے۔شام کے وقت جمالدینی صاحب، میر عاقل خان صاحب، نادر جان، پروفیسر برکت علی اور کبھی کبھی پروفیسر بہادر خان میرے ہاں آتے تھے۔یا نادر صاحب کے ہاں جاتے تھے۔یہ جب میرے پاس آتے تو لان میں درخت کے سائے میں بیٹھتے۔علم وادب و حالات پر گفتگو کرتے''

نامور مصنف اور نقاد وحید زہیر نے اپنے ایک مضمون ''ہائیڈ پارک کا اجنبی'' کے عنوان سے لکھتے ہیں کہ۔

''جسے سوچنے سے سفر آسان ہو جسے دیکھ کر چہرے پر خوشگواری میں اضافہ ہو جو آئینہ کی طرح ادبی چہروں کے لئے تراشا گیا ہو جو بے تعلقی میں تعلق جوڑنے کا فن جانتا ہو جو فارسی کی طرح شیریں ہو اور اردو کی طرح پھیلنے ک صلاحیت رکھتا ہو براہوئی کی طرح ٹھوس ہو وہ بھلا نادر قمبرانی کے علاوہ کون ہوسکتا ہے۔نادر قمبرانی سونے والوں کے لئے جاگتا ہے ہنسنے والوں کے لئے روتا ہے پلانے والوں کے لئے پیٹا ہے (چلم) ٹھہرنے والوں کے لئے چلتا ہے کھونے والوں کے لئے سوچتا ہے دیکھنے والوں کے لئے نمودار ہوتا ہے پڑھنے والوں کے لئے لکھتا ہے سیکھنے والوں کے لئے پڑھاتا ہے۔یہ وہ شخصیت ہے جو سمجھنے والوں کے لیے براہوئی ہے جو نوجوانی میں کابل تھا جوانی میں کوئٹہ اور اب بڑھاپے میں مہرگڑھ ان کی محبت کا یہ سفر مہرگڑھ کے بعد ہی زندہ ہوگا مگر یہاں تاریخ کے فن میں ڈوبنے کا ہنر کون جانتا ہے۔''

عبدالقیوم بیدار اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ

''پروفیسر نادر قمبرانی صاحب ایک مہربان استاد کی حیثیت سے ہمیں نہ صرف براہوئی پڑھایا بلکہ ہمیں براہوئی ادب سے بھی متعارف کروایا۔بلوچستان کے سیاسی وسماجی حالات کے متعلق ہمیں آگاہی دی۔وہ آگے لکھتے ہیں کہ براہوئی ادب سے ہمیں متعارف کروانے اور براہوئی ادب کے نزدیک تر کرنے میں نادر قمبرانی صاحب کا بڑا ہاتھ ہے۔بلکہ میں یہ کہوں گا کہ وہ براہوئی ادب کا وہ امتیاز ہے جنہوں نے براہوئی ادب کی بنیاد ڈالی۔اور ان کی محنت اور کوششوں سے براہوئی ادب میں بہت سے نوجوان شامل ہوکر آگے بڑھے۔''

پروفیسر نادر قمبرانی کی شخصیت نہ صرف بلوچستان بلکہ ملکی سطح پر سب کے لئے جانی پہچانی تھی۔وہ 82 سال کی عمر تک علم وفضل کی شمع روشن کئے رہے۔لوح وقلم کی پرورش کرتے اور حرف کی حرمت کا پاس رکھتے رہے۔پروفیسر نادر قمبرانی ایک ہمہ پہلو شخصیت کے مالک تھے قابل اور شفیق استاد تھے۔ان کی ہزاروں شاگرد آج مختلف شعبہ ہائے زندگی میں نمایاں مقام پر ہیں۔پروفیسر نادر قمبرانی بلوچستان یونیورسٹی کے ابتدائی اساتذہ کرام میں شامل ہوتے تھے۔

پروفیسر نادر قمبرانی ہمیشہ ظالم اور ڈکٹیٹروں کے خلاف جدوجہد کرتے رہے۔جس کی بنا پر انہیں جلاوطن کردیا گیا۔وہ 1961ء تا 1972ء تک اپنا وطن چھوڑ کر افغانستان میں جلاوطنی اختیار کی۔ایک دانشور کی حیثیت سے ان کا قلم اپنی شاعری کے ذریعے ایک مضبوط آواز بن کر ابھری۔انہوں نے ریڈیو کابل سے مختلف پروگرام کئے۔

ان کی تصانیف.....شنزہ گروپ (براہوئی شاعری) بلبل خزدار رابعہ خضداری کی فارسی کی پہلی شاعرہ کی داستان اور فارسی اشعار کا براہوئی ترجمہ شامل ہیں۔وہ انجمن فارسی بلوچستان کوئٹہ کے صدر رہے۔جبکہ براہوئی اکیڈمی، بلوچی اکیڈمی کوئٹہ اور قلم قبیلہ کوئٹہ ممبر اگزیکٹو تھے۔انہوں نے مدیر بولان (ترجمان انجمن فارسی) اور ماہنامہ نوائے بولان (بلوچی، براہوئی، اردو) کے مدیر اعلیٰ رہے۔پروفیسر نادر قمبرانی بورڈ آف گورنرز پاکستان اکیڈمی ادبیات اسلام آباد، تاحیات ممبر اکادمی ادبیات، پاکستان اسلام آباد، ادارت میگزین، قلم قبیلہ کوئٹہ، ادارت میگزین مرکز مطالعہ پاکستان کوئٹہ کے ممبر رہے۔انہوں نے پاکستان ٹیلی ویژن کوئٹہ اور ریڈیو پاکستان کوئٹہ کے لئے بطور

مضمون نویس کا م کیا۔اور وہ صدارتی ایوارڈ، ''اعزاز کمال''، تعلیمی خدمات 2000ء پر دیا گیا۔جبکہ صدارتی ایوارڈ برائے حسن کارکردگی 14 اگست 2005ء دیا گیا (جسے نہیں لیا) غیر سرکاری و غیر قومی اعزاز میں وہ دنیا (5000) مشہور شخصیات میں نام ہے۔

نادر قمبرانی بنیادی طور پر اس سوچ اور اپروچ کے آدمی تھے جو عوامی شعور کی بالیدگی کو ایک نئے رجحان اور ایک نئے نکتہ نظر کے ساتھ آگے بڑھانے کی خواہش رکھتے تے ان کے غیر روایتی انداز میں علمی، ادبی مجلس اور غیر رسمی نشستوں کا بڑا کردار رہا ہے۔ان کے گفتگو میں کوئی نہ کوئی ایسا پہلو موجود ہوتا جو ارد گرد کی فضا اور حالات سے جڑ کر سامنے آتا۔نادر قمبرانی نے پرائمری ٹیچر سے یونیورسٹی کے استاد بننے تک کے سفر میں انسانی احترام اور آفاقی قدروں کو بنیادی موضوع بنا کر اپنی بات کا آغاز کیا اس کے لئے انہیں تاریخ، فلسفہ، سیاستِ دوراں، دیگر سماجی علوم کے علاوہ فارسی اور اردو کے کلاسیکی اشعار کی مدد سے طلباء کے ذہنوں کو گرماتے۔ ایک سینئر ادیب اور بزرگ کی حیثیت سے نادر صاحب نے بلوچستان کے ادبی سفر میں کئی نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کا سامان کیا۔جو آج ادبی افق پر نمایاں حیثیت کے حامل ہیں ان میں نوشین قمبرانی، افشین قمبرانی، وحید زہیر، حمید شاہوانی، ظفر معراج، شبیر شاہوانی، قیوم بیدار، ڈاکٹر عبدالرزاق صابر، ڈاکٹر لیاقت سنی......وغیرہ شامل تھے۔

ان تمام حوالوں سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ نادر قمبرانی ایک مثالی استاد تھے۔ نادر قمبرانی 15 ستمبر 2006ء کو اس جہان فانی سے کوچ کر گئے۔

ڈاکٹر نبی بخش خاں بلوچ

پروفیسر ڈاکٹر محمد قاسم بگھیو

مجھے اپنی بات کی ابتداء اس مشاہدے سے کرنے میں بہت خوشی ہو رہی ہے کہ جیسے بجلی اور کمپیوٹر انسانی ذات کے لیے بیسویں صدی کے عظیم تحفے ہیں، ویسے ہی ڈاکٹر نبی بخش خاں بلوچ، تحقیق، تنظیم اور سندھی زبان و ادب کے حوالے سے سندھیوں کے لیے بیسویں صدی کا تحفہ ہیں۔اس پوری کائنات میں اگر کوئی انسان کسی دوسرے کے لیے کوئی اہم تحفہ یا کارنامہ انجام دے سکتا ہے تو وہ ہے ایک اچھی مثال قائم کرنا اور مجھے یہ کہتے ہوئے کوئی جھجھک محسوس نہیں ہوتی کہ ڈاکٹر بلوچ ہماری نسل اور سندھ کی آنے والی نسلوں کے لیے ایک عظیم تحفہ کے شکل میں وہ مثال ہے، جس کو صدیوں تک مثال کے طور پر پیش کیا جائے گا، جیسے شاعر نے کہا ہے:

تن جي لاءِ مثال ڇڏي وڃ — ان کے لیے مثال چھوڑ جاؤ

۽ جي چاهين خال ڇڏي وڃ — اور اگر چاہو تو خال چھوڑ جاؤ

(شیخ ایاز)

کئی حوالوں سے ڈاکٹر بلوچ صاحب پر لکھنا میرے لیے ضروری بھی ہے فرائض میں بھی شمار ہوتا ہے اور میں اپنے آپ کو انسانوں کے اس گروہ میں شامل سمجھتا ہوں جن کو ہر صورت میں فرائض پورے کرنے ہوتے ہیں۔ضروری اور فرض اس لیے سمجھتا ہوں کہ گزشتہ 40 سالوں سے زائد کے عرصے سے میں ڈاکٹر بلوچ صاحب کے علم اور شخصیت سے کسی نہ کسی حوالے سے مستفیض ہوتا رہا ہوں۔

پچھلے چالیس سالوں سے ایک قاری، طالب علم، استاد اور منتظم کی حیثیت میں ڈاکٹر صاحب سے کسی نہ کسی حوالے سے میرا تعلق رہا ہے۔میں نے ان کی تحریروں کے آئینے میں بچپن

سے لے کر لوک کہانیوں کے مجموعے اور گیتوں کے عکس ہی نہیں دیکھے بلکہ لغات جیسے محنت طلب کام اور تحقیق مقالوں کے لیے عرق ریزی بھی دیکھی ہے۔ میں نے اپنی سالم آنکھوں سے وزرا، اور صدور کو ڈاکٹر بلوچ سے جھکتے ہوئے ملتے دیکھا ہے اور بڑے بڑے بیوروکریٹس کو انہیں پاؤں پڑنے کے مناظر بھی دیکھے ہیں، میں نے بڑے بڑے علماء اور اسکالرز کو ڈاکٹر صاحب کی موجودگی میں چپ کی مہر لگاتے دیکھا ہے۔ مگر مجھے وہ ہمیشہ ایک محبت کرنے والے دیہاتی ہنس مکھ اور سادہ انسان نظر آتے تھے جو وزارت ملنے کے بعد بھی بنا کسی سرکاری پروٹوکول کے اپنے محلے کی طرف لوٹتا ہے۔

ٹھنڈی سڑک (حیدرآباد کی ایک مشہور سڑک) پر طویل پیار (walk) کرتے ایک لمحے کے لیے بھی محسوس ہونے نہیں دیتے تھے کہ وہ آج کی سندھ کا سب سے بڑا محقق اور مدبر ہے بلکہ وہ تو محفل میں تمام اعزازات اور مرتبات کے جبے اتار کر پھینک دیتے تھے۔

میں 60 کی دہائی سے لے کر ڈاکٹر صاحب کی مختلف کتابوں کا مطالعہ جاری رکھتا آیا ہوں۔ یونیورسٹی میں طالب علمی کے دوران ڈاکٹر صاحب کی کتابوں کے ساتھ ساتھ ان کی شخصیت سے بھی آشنائی ہوئی۔ ذاتی طور پر واقفیت ہوئی، علمی طور پر ان کی کتابوں کے قریب آ گیا۔ میں نے اپنا پہلا مقالا 'پھاکو' پروفیسر محرم خان کی نگرانی میں ڈاکٹر صاحب کے لوک ادب کی کتابوں پر علمی مقدموں کے مطالعے اور حوالوں سے ہی مکمل کیا۔ سندھ یونیورسٹی میں پہلا تحقیقی مقالا **'شاہ لطف اللہ قادری، سندھی زبان کا اساسی شاعر'** بھی ڈاکٹر بلوچ صاحب کے مختلف اساسی شعرا کے کلام کی ترتیب اور مقدموں کو پڑھ کر تیار کیا اور ایک سیمینار میں پیش کیا۔

ڈاکٹر بنی بخش بلوچ ایک ایسے عالم تھے، جنہوں نے جس موضوع کو ہاتھ میں لیا اس میں اپنی ماہرانہ اور علمی حیثیت منوائی اور علم کے ایسے دریا بہائے کہ اس موضوع پر ان کے بعد اب تک کسی بھی عالم نے اس معیار کا کام نہیں کیا۔ لوک ادب کے ضخیم اور مستند تحقیق پر مشتمل کتابیں ہوں، زبان و ادب کی تاریخ ہو، لغات کا سلسلہ ہو یا شاہ کے رسالو کی ترتیب، تدوین یا تشریح ہو۔ ان کا ہر کام علمی اور تحقیق کے اعلیٰ اصولوں اور معیار کے مطابق ہے اور موجودہ سندھ کے کسی بھی عالم کا اس موضوع پر کام ان کے کام سے مقابلہ نہیں کر سکتا۔

نوکری کے حوالے سے ڈاکٹر صاحب جس سندھی شعبے کے پہلے سربراہ بنے، مجھے بھی اس

شعبے کی سربراہی نصیب ہوئی، سندھی زبان کی ترقی کے لیے قائم ادارے سندھ لینگویج اتھارٹی کے پہلے سربراہ بھی ڈاکٹر بلوچ بنے اور اسی ادارے کا ساڑھے تین سال کے لیے مجھے بھی سربراہ بننے کا موقع ملا۔ اس حوالے سے مجھ پر واجب ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی شخصیت اور علمی کاوشوں پر لکھوں۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کی شخصیت اور علمی کاوشیں اتنی وسیع الجہتی ہیں کہ اس مضمون میں تو کیا بلکہ کئی سو صفحات میں بھی نبھانا ممکن نہیں۔ میرے لیے پہلے مضمون لکھتے وقت بھی یہ سوال اہم رہا کہ کہاں سے شروع کروں، اور کس پہلو پر لکھوں۔ ڈاکٹر صاحب کے کس علمی کام کا تذکرہ، تعریف یا تشریح کروں:

- ☆ ان کی وسیع الجہتی شخصیت
- ☆ عام نوجوان کی حیثیت
- ☆ تعلیم اور تربیت والے ان کے زمانہ طالب علمی کی حیثیت
- ☆ استاد، منتظم، محقق، اسکالر اور حکیم (Wiseman) کی حیثیت
- ☆ سندھ دوست ادیب۔ ماہر لسانیات۔ زبان پر کام کرنے والی حیثیت
- ☆ تعلیم کے موضوع پر ان کی تحاریر اور تقاریر کا تذکرہ
- ☆ اساسی شعرا پر تحقیق اور تعارفی مقالوں میں ان کی علمیت پر روشنی
- ☆ سگھڑوں سے کچہریاں، بیٹھکیں اور لوک ادب کی تحقیق، تدوین، تالیف اور تعارفی علمی مقالے
- ☆ سندھی زبان کی جامع لغات
- ☆ سندھی زبان و ادب کی تاریخ
- ☆ شاہ جو رسالو کی ترتیب
- ☆ شاہ جو رسالو کی لغت
- ☆ سندھی شعبہ کا سربراہ۔ اور عالمانہ تحقیق
- ☆ فیکلٹی آف ایجوکیشن میں استاد۔ تحقیقی مقالے اور تعلیمی پالیسی میں حصہ داری۔
- ☆ لوک ادب کی اسکیم
- ☆ وائس چانسلر شپ کے دوران واقعات
- ☆ ملکی اور بین الاقوامی سطح کی مختلف ذمہ داریاں۔

☆ سندھی لینگویج اتھارٹی کا چیئرمین۔اس دوران کی ہوئی منصوبہ بندی۔

☆ سندھ کی وزارت

☆ اولاد کی تربیت۔ چھوٹوں سے شفقت۔ حسد کرنے والوں اور مخالفین کو جواب نہ دینا۔ اپنی صحت کا خیال رکھنا۔ بے جا شہرت سے دور رہنا۔

☆ سماجی کردار کے حوالے سے۔

☆ ترقی پسند اور رجعت پسند تحریک کے حوالے سے۔

☆ سندھی زبان کے دشمن اور دوسروں کو مواقع نہ دینے اور Ph.D نہ کروانے والے الزاموں کے حوالے سے کون کون سے موضوعات پر مضمون لکھوں؟

ڈاکٹر صاحب سے مذکورہ بالا تمام نسبتوں کے باوجود میری ڈاکٹر صاحب سے ملاقاتیں بہت کم رہیں ہیں۔اس کا بڑا سبب یہ رہا کہ ''میرا یقین ہے کہ انسان اپنے کام اور تخلیقوں میں موجود ہوتا ہے'' جب ان سے ملنے کو دل کرے تو اس کی کسی کتاب کا مطالعہ کریں۔وہ آپ کے ساتھ ہوگا۔جیسا زیب النساء مخفی نے اپنے ایک شعر میں کہا ہے کہ:

ہر کہ دیدن میل دارد در سخن بیند مرا

(اگر آپ مجھے دیکھنا چاہتے ہو تو مجھے میرے اشعار میں ڈھونڈیں)

ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کے لیے جاتے وقت یا فون کرتے وقت ہمیشہ یہ احساس ہوتا کہ کہیں کوئی کتاب نہ پڑھ رہے ہوں، کسی علمی کام میں مصروف نہ ہوں، میرا فون کرنا یا چلے جانا ان کے کام اور Concentration میں رخنا نہ ڈالے، کیونکہ میرے مشاہدے کے مطابق ڈاکٹر صاحب اپنے آپ میں ایک مکمل لائبریری ہیں اور لائبریری میں صرف خاموشی سے مطالعے کے لیے تو جایا جاسکتا ہے لیکن بات چیت اور گفتگو کے لیے نہیں۔ مجھے ڈاکٹر صاحب کے لیے ہمیشہ یہ احترام رہا ہے جو ایک سچے عالم اور محقق کو کسی لائبریری کے لیے ہوتا ہے۔اور لائبریری، میں ہمیشہ احترام اور عزت سے داخل ہونا چاہیئے۔ یہ ہمارا قومی المیہ ہے کہ ہم زیادہ تر وقت کچہری، گپ شپ اور گفتگو میں ضایع کرتے ہیں۔اور اس حقیقت کو بھلا بیٹھے ہیں کہ کام ہی حقیقی تفریح، عبادت اور عیاشی ہے۔جس سے آدمی کی تھکان دور ہو جاتی ہے اور ذہنی آسودگی اور اطمینان نصیب ہوتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب انسانوں کے اس گروہ میں تھے جو کام کو عبادت سمجھتے ہیں اور اپنی زندگی کا ملا ہوا تمام وقت ایسی عبادت میں گذار دیتے ہیں۔ یہ ہی سبب ہے کہ اتنی بڑی عمر ہوتے ہوئے بھی ان کی شخصیت دلچسپ، باغ و بہار، چہرے پر اطمینان اور خوشی کے آثار اور شادابی نمایاں رہی ہے۔ اس باغ و بہار اور دلچسپ ہونے کے اسباب واضح کرنے کے لیے اگر میں ایک مغربی دانا ء ولیم ڈین ھوویل کے الفاظ کا سہارا لوں تو بے جا نہ ہوگا۔

"The secret of man, who is universally interesting is that, he is universally interested"

ڈاکٹر بلوچ صاحب سندھ کے ایسے یگانہ عالم، جسے زمانے کی سرد گرمی، دوستوں کی بے وفائی، دشمنوں کی نادانیاں اور حسد بھرے رویوں، عام لوگوں اور سطحی ادیبوں کی منافقیوں، علم دوست اور وطن دوست لوگوں کی محبتوں اور حجتوں کے پس منظر میں مسلسل جدوجہد اور مسلسل جفاکشی اور نیک نیتی نے آج اسے سندھ اور ملک کے ایک بڑے عالم کے طور پر تحسین اور قبولیت دلائی ہے۔ان کے ہمعصر مخالف بھی آج اسے عزت دے کر ان کی علمیت اور مسلسل تحقیق کو احترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ انہیں اپنی محافل اور تقریبات کی زینت بناتے رہے۔ ایسی تحسین کا ادراک انہیں پوری طرح حاصل تھا۔جس کا اظہار کچھ برس پہلے ہی سندھ انٹیلکچوئل فورم کی ایک تقریب میں کیا کہ، ''ترقی پسندوں کی اس محفل میں بلا کے تعظیم دینے پر میں آپ کا بہت ممنون ہوں۔نہیں تو اب تک مجھے رجعت پرست سمجھ کر ہمیشہ دور رکھا گیا ہے''۔

ڈاکٹر صاحب ایک درویش صفت انسان ہونے کے ساتھ ادب اور تاریخ کے جَید عالم تھے۔ان کا شمار مشاہیر اور معمار ادب میں ہوتا ہے۔انھیں مختلف ادارے بنانے اور ان میں کام کرنے کے بہت سے مواقع ملے جہاں پر انہوں نے بہت ہی ایمانداری سے سماج کی ترقی اور ادب کی آبیاری کے بہت سے منصوبے تکمیل تک پہنچائے۔انہوں نے جامع سندھ کی انتظامیہ سے سندھ یونیورسٹی جامشورو کیمپس علامہ آئی آئی قاضی اور حیدرآباد کیمپس ایلسا قاضی کے نام سے منسوب کرا کر دونوں عالموں کی تعلیمات کا اعتراف کروایا۔

جب حالات نے مجھے موقع دیا تو میں نے بھی مشاہیر کی علمی ادبی خدمات کے اعتراف میں بہت سے مقامات ان کے نام سے منسوب کروائے۔ جیسے کہ 2001ء میں سندھی لینگویج

اتھارٹی ہال ڈاکٹر بلوچ صاحب، لائبریری علامہ غلام مصطفیٰ قاسمی اور کتاب گھر مرزا قلیچ بیگ کے نام منسوب کیا۔

سندھی یونیورسٹی میں آرٹس فیکلٹی آڈیٹوریم شیخ ایاز اور شعبہ سندھی کی لائبریری پروفیسر محرم خان کے نام منسوب کروائی۔

حال ہی میں اکادمی ادبیات پاکستان کے بورڈ آف گورنرز سے کانفرنس ہال کو شیخ ایاز، نیا تیار ہونے والا آڈیٹوریم فیض احمد فیض، رائٹرز ہاؤس احمد راہی، کتاب گھر میر گل خاں نصیر اور کمیٹی روم حمزہ خاں شنواری کے نام سے منسوب کروائے۔

اس طرح اپنے مشاہیروں کو یاد رکھنا نہ صرف ان کے علمی و ادبی خدمات کا اعتراف ہوتا ہے بلکہ اگلی نسلوں تک ان کے کام، سوچ اور نظریہ کو پہنچانا بھی مقصود ہوتا ہے۔

ڈاکٹر بلوچ صاحب بہت سے اداروں کے مشاورتی بورڈ پر رہے اور 2001ء سے 2004ء تک سندھی لینگویج اتھارٹی میں میرے بورڈ آف گورنر پر بھی رہے اور کھلے دل سے ہماری رہنمائی کی۔ اسی دوران وہ ایک دن وقت نکال کر میرے پاس آئے اور کہا کہ ''میں نے شاہ لطیف کے رسالو پر کام کے دوران محسوس کیا کہ شاہ لطیف کے کلام کی ایک جامع لغات تیار کی جائے اور کچھ عرصہ پہلے میں نے وہ لغات تیار کر کے آپ سے پہلے والے چیئرمین کو شایع کرنے کے لیے گزارش کی تو انہوں نے یہ کہہ کر چھاپنے سے انکار کر دیا کہ یہ ادارہ زبان کی ترقی کے لیے ہے اور شاہ لطیف کی لغات زبان کی ترقی کی مد اور ہمارے دائرہ کار میں نہیں آتی، اور مجھے مشورہ دیا کہ شاہ لطیف چیئر کو چھاپنے کے لیے دے دیں۔ میں نے جب شاہ لطیف چیئر کی ڈائریکٹر سے رابطہ کیا تو انہوں نے یہ کہہ کر چھاپنے سے انکار کیا کہ وہ یہ شاہ لطیف کی لغت کا کام پہلے ہی ج۔ع منگھانی کو دے چکی ہیں، اس لیے وہ یہ کام نہیں چھاپ سکتیں۔ اب آپ کے پاس آیا ہوں۔ آپ شاہ لطیف کو بھی سمجھتے ہیں، لغات کی اہمیت کو بھی جانتے ہیں اور سندھی لینگویج اتھارٹی کے دائرہ کار کو بھی سمجھتے ہیں اور اب میں آپ کے بورڈ آف گورنرس پر بھی ہوں مجھے بتائیں کہ اس لغت کو شایع کرنا آپ کے دائرہ کار میں ہے یا نہیں اور کیا آپ یہ لغت شایع کریں گے؟ تو اس کے مطابق میں آپ کو خط لکھوں۔

میں نے ڈاکٹر صاحب کو کہا کہ جناب شاہ لطیف کے رسالو کی لغات اور سندھی زبان الگ الگ کس طرح ہو سکتی ہیں اور جب یہ کام آپ جیسے جید عالم نے کیا ہو تو اس کی افادیت اور اہمیت

اور بڑھ جاتی ہے۔ یہ کام بالکل ہمارے دائرہ کار میں ہے اور ہمیں شایع کر کے نہایت خوشی ہوگی۔ اب آپ ہمیں نہ لکھیں، ہم خود آپ کو لکھیں گے اور گزارش کریں گے کہ یہ کام ہمیں چھاپنے کے لیے دیں۔ اسی طرح دوسرے دن ہم نے خط لکھ کر انہیں گزارش کی اور انہوں نے مسودہ بھیج دیا جو بہت ہی کم عرصے میں **'روشنی'** کے نام سے شایع کیا گیا۔ اس بات کا ذکر بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ اس کام کے اعزازیہ کا چیک جو ایک لاکھ سے زیادہ بنتا تھا انہوں نے یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ آپ کا ادارہ غریب ہے اس لیے میں اعزازیہ کی یہ رقم واپس کرتا ہوں کہ آپ کوئی اور اچھا کام کر سکیں۔

شاہ کے رسالو کی یہ لغت **'روشنی'** ڈاکٹر صاحب کی پوری زندگی کی تحقیق کا نچوڑ اور تجزیے کی عرق ریزی اور عکاسی ہے۔ لوک ادب، زبان و ادب کی اور تاریخ، لغات کے سلسلے اور شاہ صاحب کے دس جلدوں کی ترتیب و تدوین کا پورا تجربہ اور محنت اس لغت میں نمایاں ہے۔ بقول ان کے ''شاہ سائیں کا قوم پر قرض واجب تھا، جس کی ادائیگی کی میں نے کوشش کی ہے۔ شاہ کے رسالو پر دس جلدوں پر محیط تحقیق لطیفی کلام اور زبان کی اس تفصیلی لغت کی اشاعت سے یہ قرض ادا ہوا۔''

علمی حالات نے مجھ میں ایک نیا علمی جوش پیدا کیا۔ بہت سے ریسرچ اسکالرز کی Ph.D ڈگری کے لیے رہنمائی کی اور اپنی نگرانی میں ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کے لوک ادب پر کیے ہوئے کام پر ایک سکالر کو Ph.D کے لیے رجسٹرڈ کیا اور ان کی زندگی میں ہی (2004) میں Ph.D کا کام مکمل ہوا اور محترم علی اکبر اسیر کو Ph.D کی ڈگری ملی۔

اس طرح ان کی وفات کے دن صبح 6:15 پر جیسے ہی مجھے ناز ستھو (KTN) سے یہ معلوم ہوا کہ ان کا انتقال ہوا ہے اور جنازہ ان کے گاؤں جعفر خان لغاری ضلع سانگھڑ لے جایا جا رہا ہے تو میں نے ان سے پوچھا کہ جہاں تک مجھے پتہ ہے ان کی خواہش سندھ یونیورسٹی میں علامہ آئی آئی قاضی کے مزار پر ان کے پاؤں میں دفن ہونے کی تھی۔ اس کا کیا ہوا؟ تو ناز ستھو نے بتایا کہ اس کے بارے میں انھیں کچھ پتا نہیں لیکن ان کے بیٹے کہہ رہے ہیں یونیورسٹی انتظامیہ نے انہی کی زندگی میں ہی انکار کر دیا تھا۔ اس لیے اب انتظامات ان کے آبائی گاؤں جعفر خان لغاری میں کیے جا رہے ہیں اور دس بجے جنازہ یہاں سے اٹھایا جائے گا۔ ناز ستھو صاحب KTN کے لیے

رکارڈنگ کے حوالے سے وہاں موجود تھے۔ میں نے انہیں کہا کہ مجھے تھوڑا وقت دیں میں یونیورسٹی کے وی سی سے بات کر کے یہ مدعا اٹھاتا ہوں اور ایک کوشش کرتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب کو ان کی خواہش کے مطابق یونیورسٹی میں دفنایا جائے۔ میں نے اسی وقت سندھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر (ڈاکٹر نذیر مغل) سے رابطہ کرنے کی کوشش شروع کی۔ آخر 8:15 پر رابطہ کرنے میں کامیاب ہوگیا، جو اس وقت کراچی میں تھے۔ آخر انہیں سمجھانے میں کامیاب ہوگا کہ ڈاکٹر بلوچ کتنے بڑے آدمی تھے اور ان کی خواہش کے مطابق انہیں سندھ یونیورسٹی میں دفنانے سے ان کی اور یونیورسٹی کی نیک نامی ہوگی۔ جس کے لیے وہ اصولی طور پر تو راضی ہوئے لیکن کراچی میں ہونیکی وجہ سے مشاورتی اجلاس جو پہلے سے دس بجے کے لیے طے تھا میں شریک نہیں ہوسکیں گے کہ فیصلہ کرا سکیں۔ میں نے ان سے اجازت مانگی کہ آپ مجھے اجازت دیں میں یہ بات اجلاس کے آگے رکھو کہ ممبران کو آپ کی مرضی بتا کر ان سے فیصلہ کروالوں جس کی انہوں نے اجازت دی کہ اگر کرا سکتے ہو تو کرالو۔ اجلاس دس بجے ہونا تھا۔ اس دوران میں نازستھو اور بلوچ فیملی سے رابطے میں رہا۔ بحرحال اجلاس ممبران کو ڈاکٹر بلوچ اور ان کی خواہش کے مطابق یونیورسٹی میں دفنانے کی تجویز پر قائل کرلیا جس کی سارے ممبران نے متفقہ طور پر منظوری دی۔ اس طرح مجھے اللہ تعالیٰ نے یہ نیک کام کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔

ڈاکٹر نذیر احمد

ڈاکٹر آفتاب احمد

ڈاکٹر نذیر احمد شاہ (۱۹ دسمبر ۱۹۰۵ء لاہور، و: ۱۳ اگست ۱۹۸۵ء لاہور) ان کا پورا نام یہی تھا (Zoology) زوآلوجی کے پی ایچ ڈی تھے یعنی ماہر حیوانیات، طالبِ علمی کے زمانے میں انہوں نے اس مضمون میں امتیاز سے اعلیٰ درجہ کی ڈگریاں حاصل کیں اور اسی کی تعلیم و تدریس ان کا پیشہ قرار پایا۔ مگر ان کی تمام تر دل چسپیوں کا مرکز ہمیشہ حیوانِ ناطق ہی رہا۔ اسی کے نطق و لب، خیال و فکر اور دست و بازو کے کارناموں کو وہ سراہتے رہے اور اسی سے خلوص و محبت کے رشتے قائم کرتے رہے۔ ان کو جو لگاؤ فنون لطیفہ، کرکٹ، ہاکی اور دوسرے کھیلوں اور سیر و سیاحت سے تھا وہ اپنے درسی مضمون سے نہیں تھا، ان کی گہری دوستیاں بھی ادیبوں اور فن کاروں سے تھیں نہ کہ سائنس دانوں سے، اگرچہ ان سے بھی میل ملاقات رکھتے تھے۔

ڈاکٹر نذیر احمد شاہ احمد کا بچپن اور لڑکپن لاہور کے محلّہ ہارودخانہ، تاثیر صاحب کی ہمسائیگی میں گزارا تھا۔ تاثیر صاحب نے جس خاندان کے زیرسایہ پرورش پائی تھی اس خاندان سے ڈاکٹر صاحب کے خاندان کے قریبی تعلقات تھے۔ عمر میں تو وہ تاثیر صاحب سے کوئی تین چار سال چھوٹے تھے مگر شروع ہی سے ان کے ہم جولی تھے اور آخر وقت تک ان سے بے تکلف دوستی قائم رہی۔ تاثیر صاحب کے بچپن اور لڑکپن پر انہوں نے ایک بے مثل مضمون اسلامیہ کالج کے میگزین ،کریسنٹ، کے تاثیر نمبر کے لیے لکھا تھا جو تاثیر صاحب کی وفات کے بعد شائع ہوا۔

ڈاکٹر صاحب اسلامیہ کالج کے پرانے طالبِ علم تھے جہاں وہ چودھری محمد علی صاحب کے ہم جماعت رہے تھے، جو بہت سے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہنے کے بعد وزیراعظم پاکستان بھی ہوئے۔ چودھری صاحب سے ڈاکٹر صاحب کی ملاقات تو تھی مگر دوستی نہیں بھی۔ ۱۹۳۰ء کی دہائی

کے وسط میں ڈاکٹر صاحب انگلستان کے بہت سے علاقے میں نے اپنی ریسرچ کے سلسلے میں سائیکل پر گھوم پھر کے دیکھے ہیں۔ سائیکل سواری کی ی عادت آخر دم تک ان کے ساتھ رہی۔ یہ بھی ان کی سادہ طبیعت کی ایک نشانی تھی، جب گھر والوں کے اصرار پر انہوں نے ایک پرانی موٹر خرید لی تو وہ اکثر و بیشتر گھر والوں کے استعمال میں رہی، ڈاکٹر صاحب پھر بھی سائیکل ہی پر سوار نظر آئے۔

سادگی ان کے رہن سہن کے طریقے اور لباس میں بھی نمایاں تھی، میں نے انہیں کبھی سوٹ بوٹ پہنے نہیں دیکھا۔ گرمیوں میں کھدر یا لٹھے کا سفید کرتا اور شلوار۔ ضرورت کے وقت کے لیے ایک صدری بھی رکھ لیتے تھے، پاؤں مین ملتانی کھسا یا پشاوری چپل۔ سردیوں میں اس لباس کے ساتھ شیروانی یا ٹویڈ جیکٹ اور پتلون اور ایک ڈھیلی ڈھالی پرانی ٹائی۔ پاؤں میں موزوں کے ساتھ وہی پشاوری چپل۔ البتہ کرکٹ کھیلتے ہوئے سفید قمیض پتلون کے ساتھ فلیٹ شوز پہن لیتے تھے۔

انگلستان سے واپسی پر وہ کسی سرکاری محکمے کے اہل کار ہونے کی حیثیت سے سندھ کے ریگستانوں اور بلوچستان کی سنگلاخ چٹانوں میں مقول ان کے کیڑوں مکوڑوں پر ریسرچ کرتے رہے لیکن آخر انہوں نے تعلیم و تدریس کا پرسکون پیشہ اختیار کیا۔ میں جب گورنمنٹ کالج لاہور مس طالبِ علم ہوا تو ڈاکٹر صاحب وہاں لیکچرار تھے۔ صوفی غلام مصطفےٰ تبسم کی وساطت سے میاران ست تعارف ہوا، پھر مجلس اقبال کے جلسوں میں ان سے ملاقاتیں ہونے لگیں اور میں کبھی کبھی شعبہ حیوانیات مین ان کے پاس جانے لگا۔ وہاں ان کا دستور نرالا تھا۔ لبارٹری سے ملحقہ ان کے کمرے میں میز کے ساتھ کرسی کی بجائے ایک سٹول رکھا رہتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب ہمیشہ اس پر بیٹھتے ، کمرے کے ایک طرف ایک دیوان تھا جس پر وہ دوپہر کے وقت آرام کرتے تھے، میز کے سامنے والی دیوار پر جو بلیک بورڈ تھا وہ گویا ڈاکٹر صاحب کی ڈائری کا کام دیتا تھا، اس پر یاد رکھنے والی تفصیلات مثلاً ملاقاتوں کے اوقات، اپنے شعبے، کالج اور گھر کی مصروفیات وغیرہ کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کے اپنے رنگ میں وضع کیے ہوئے اشارات لکھے رہتے تھے اور ہاں کبھی کبھی کوئی تازہ سنا ہوا شعر بھی جو انہیں پسند آ گیا ہو، دوپہر کا کھانا اپنے شعبے کے ساتھیوں کے ساتھ اس کمرے میں کھاتے۔ کبھی کبھی مجھے بھی اس میں شریک کر لیتے۔ یہ کھانا عموماً آج کل کی اصطلاح میں فاسٹ فوڈ (Fast Food) قسم کی چیزوں پر مشتمل ہوتا جو نیلے گنبد کے ایک خاص کھوکھے

سے لائی جاتی تھیں، کھانے اور دوپہر کے آرام کے بعد ڈاکٹر صاحب اس کمرے میں بیٹھے رہتے اور پھر وہاں سے پیدل چل کر ماڈل ٹاؤن کے بس کے اڈے پر پہنچتے کہ اس زمانے میں وہ ماڈل میں رہا کرتے تھے، حفیظ جالندھری بھی وہیں رہتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب سے ان کی ملاقات تاثیر صاحب کے زریعہ ہوئی تھی بہرحال وہ حفیظ کے گیتوں اور غزلوں کے بہت قائل تھے اور اسز مانے میں کہ جب صفیظ اور نیاز مندان لاہور کے حلقہ احباب میں وہ اگلا سا رربط ضبط باقی نہ رہا تھا جس کے متعلق میں نے صوفی تبسم صاحب پر اپنے مضمون میں ذرکیا ہے، ڈاکٹر صاحب کے مراسم حفیظ جالندھری سے مسلسل قائم رہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ دونوں ماڈل ٹاؤن میں ایک دوسرے کے بہت قریب رہتے تھے۔

ڈاکٹر نذیر احمد اور تاثیر صاحب کے ایک مشترکہ انگریز دوست وکٹر کیرنن تھے جن سے ان دونوں کی ملاقات ان کے قیامِ انگلستان کی یادگار تھی، کیرنن کیمرج سے ڈگری تو تاریخ کے مضمون پر لی تھی مگر ان کو شعروادب سے بھی بڑی دل چسپی تھی۔ دوسری جنگِ عظیم کے دوران وہ لاہور آ گئے اور ایچیسن کالج میں انگریزی پڑھانے لگے۔ یہاں ان کی تاثیر صاحب کے حلقہ احباب خصوصاً فیض صاحب سے بھی دوستی ہوگئی۔ میری طالب علمی ہی کے زمانے میں ڈاکٹر صاحب نے مجھے بھی کیرنن سے ملوایا بلکہ دو بار مجھے اپنے ساتھ ان کے ہاں بھی لے گئے۔ وہ ایچیسن کالج کے ملحقہ بنگلوں میں سے ایک میں رہتے تھے۔ کیرنن کو انگریزی شعروادب کا ذوق تو تھا ہی ڈاکٹر صاحب کی دوستی میں انہیں اردو پڑھنے کا شوق ہوا۔ اس میں انہوں نے کافی استعداد پیدا کر لی تھی اور آخر ڈاکٹر صاحب کی مدد سے انہوں نے اقبال کی نظموں کا انگریزی میں نہایت اعلیٰ ترجمہ کیا جو انگلستان میں شائع ہوا۔ اس کے بعد کیرنن نے ڈاکٹر صاحب ہی کی مدد سے فیض کی غزلوں اور نظموں کا بھی انگریزی میں منظوم ترجمہ کا کام شروع کر دیا۔ کیرنن جنگ کے خاتمہ پر واپس انگلستان چلے گئے اور کچھ عرصہ کے بعد ایڈنبرا یونیورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر ہو گئے۔ میں ان سے ۱۹۵۵ء میں اپنے دوران قیام لندن میں بھی ملا۔ ۱۹۶۵ء کی گرمیوں میں وہ پھر لاہور آئے اور ڈاکٹر صاحب کے ہاں جو اس وقت گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل تھے لاج میں مہینوں قیام کیا اس دوران میں کئی بار میرا بھی ان سے ملنا ہوا۔ اس زمانے میں انہوں نے فیض کے ترجوں پر ڈاکٹر صاحب کے ساتھ مل کر نظر ثانی کی۔ کراچی جا کر فیض سے بھی مشورے کیے اور آخر یہ ترجمہ جو میری

نظرِ ثانی کی۔ کراچی جا کر فیضؔ سے بھی مشورے کیے اور آخر یہ ترجمے جو میری نظر میں آج بھی اپنی مثال آپ ہیں کتابی شکل میں یونیسکو کے زیر اہتمام ایک انگریز پبلشر نے اردو نظموں کے ساتھ انتہائی حسن و خوبی سے شائع کیے۔ اس کتاب میں کیرن کا ایک طویل دیباچہ فیضؔ کی زندگی اور شاعری پر بھی شامل ہے۔ جس میں انہوں نے ڈاکٹر نذیر احمد کا انتہائی خلوص و محبت سے ذکر کرتے ہوئے ترجمے میں ان کی بیش قیمت اعانت کا اعتراف کیا ہے اسی قسم کا اعتراف انہوں نے اقبال کے ترجموں والی کتاب کے دیباچے میں بھی کیا تھا۔ یہاں یہ بتاتا چلوں کہ پطرس بخاری صاحب پاکستان بننے سے چند مہینے قبل ہی آل انڈیا ریڈیو سے رخصت ہو کر گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل کی حیثیت سے واپس آ گئے تھے۔ تقسیم کے ہنگاموں اور گرمیوں کی تعطیلات کے بعد جب کالج دوبارہ کھلا تو بخاری صاحب کا دور شروع ہوا۔ انہوں نے کالج کی مختلف انجمنوں کے سربراہوں میں جو تبدیلیاں کیں ان کے نتیجے میں ڈاکٹر صاحب کو شعر و ادب سے ان کے شغف کی بنا پر مجلس کا سربراہ بنا دیا گیا۔ اس پراسٹاف کے ممبروں میں بھی کچھ چہ مہ گوئیاں بھی ہوئیں۔ کیوں کہ ڈاکٹر صاحب سائنس کے شعبے سے تعلق رکھتے تھے مگر واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے بڑی محنت اور خوبی سے اس ذمہ داری کو نبھایا۔ وہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر لکھنے والے لڑکوں کی حوصلہ افزائی کیا کرتے تھے اور انہیں مجلس میں اپنے مضامین اور افسانے پڑھنے کی ترغیب دیتے تھے۔ اشفاق احمد جو بعد کو ہمارے چوٹی کے افسانی نگار شمار ہونے لگے کالج می ڈاکٹر صاحب کی دریافت تھے۔ انہوں نے ہی ان سے بخاری صاحب کی موجودگی میں مجلس میں ان سے ان کا پہلا افسانہ پڑھوایا تھا۔

ڈاکٹر صاحب جب تک ماڈل ٹاؤن میں رہے تو کچھ شہر کی زندگی سے الگ تھلگ رہے جب چند برسوں کے بعد پروفیسر سراج الدین پرنسپل کے عہدے پر فائز ہوئے اور لاج میں منتقل ہو گئے تو ڈاکٹر صاحب کو کالج سے ملحقہ کوٹھیوں میں سے سراج صاحب والی کوٹھی الاٹ ہو گئی اور وہ ماڈل ٹاؤن کا گھر چھوڑ کر یہاں آ گئے۔ سراج صاحب کے زمانے میں تو یہ کوٹھی ان کے ساز و سامان سے بھری ہوئی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کے رہن سہن کا انداز دوسرا تھا۔ بہر حال انہوں نے اپنے سادہ طریقے سے اسے آراستہ کر لیا۔ اب ان کے دوست احباب ان کے ہاں آنے جانے لگے اور باہر سے آنے والے قیام بھی کرنے لگے۔ اس زمانے کے مشہور سارنگی نواز شریف پونچھ والے جن کے فن کے ڈاکٹر صاحب گرویدہ تھے جب لاہور آتے تو ڈاکٹر صاحب ہی کے ہاں

ٹھہرتے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک شام ڈاکٹر صاحب نے مجھے دعوت دی اور ہم رات گئے تک سارنگی پر ان سے مختلف راگ سنتے رہے۔ میرے سوا دو حضرات ہی اور تھے، کیونکہ ڈاکٹر صاحب آرائی کے نہ قائل تھے اور نہ اس دماغ تھا۔ موسیقی سے اپنے ذوق و شوق کی تسکین، ریڈیو اور ریکارڈ ں سے کیا کرتے تھے۔ صرف اپنی موسیقی ہی کے نہیں مغربی موسیقی کے بہت سے ریکارڈ ان کے پاس موجود تھے۔ خصوصاً بیتھو ون اور موتزارٹ کے۔ ان کے فن میں خاصا درک بھی رکھتے تھے۔

موسیقی کے ساتھ ساتھ انہیں مصوری سے بھی لگاؤ تھا۔ انگلستان جاتے تو چیدہ چیدہ مصوروں کے پرنٹ خرید لاتے۔ ایک دفعہ میرے لیے بھی گوگاں کے دو پرنٹ لائے تھے۔ اپنے ہاں کے مصور عند الرحمٰن چغتائی سے تو ان کے خاص تعلقات تھے۔ چغتائی صاحب سے میرا تعارف تو تاثیر صاحب کے زریعے ہوا تھا وہ ایک دفعہ مجھے اپنے ساتھ ان کے بھی لے گئے تھے۔ اس کے بعد مجید ملک صاحب کے ساتھ بھ میں کئی بار ان کے ہاں گیا۔ مگر چغتائی صاحب کے ساتھ میرا زیادہ ملنا جلنا ڈاکٹر صاحب کی معیت میں ہوا۔ گورنمنٹ کالج میں میری لیکچراری کے زمانے میں داکٹر صاحب کا اور میرا ایک پروگرام طے پا گیا تھا جس پر بعد میں بھی میرے قیام لاہور کے دوران عمل ہوتا رہا۔ موسم سرما کے دوران مہینے میں ایک دو بار چھٹی کے دن دس گیارہ بجے کے قریب سائیکلوں پر راوی کے کنارے پہنچ جاتے، سائیکل گورنمنٹ کالج کی کشتیوں کے اڈے پر چھوڑتے اور پیدل دریا کے اوپر کی طرف درختوں کے اس جنگل میں نکل جاتے جو اس زمانے میں ذخیرہ کہلاتا تھا۔ وہاں ہم سوکھے پتوں کو روندتے، پرندوں کی چہکاریں سنتے دور تک نکل جاتے۔ پھر دریا کے کنارے بیٹھ کر دوپہر کا کھانا کھاتے جو ہم نیلے گنبد کے اسی مخصوص کھوکھے والے کے ہاں سے ساتھ لے آتے، اس کے بعد اپنی سائیکلوں پر سوار جب ہم راوی روڈ سے گزرتے تو اکثر چغتائی صاحب کے ہاں پڑاؤ کرتے۔

موتی شاہ ڈاکٹر صاحب کے ملنگ بھائی تھے اور ان سے عمر میں چھ برس چھوٹے۔ اتفاق کی بات کے ہے میری ان سے ملاقات پہلے ہوئی اور ڈاکٹر صاحب سے بعد میں۔ وہ اس طرح کہ میرے دوستوں میں مرحوم حمید شیخ بھی تھے۔ آخری عمر میں پاکستان ٹائمز میں ایچ ایس کے نام سے کالم لکھا کرتے تھے مگر اس زمانے میں کہ جس کا میں ذکر کر رہا ہوں وہ ایم اے کے طالب علم تھے اور کلاسیکی موسیقی سے بھی شوق رکھتے تھے۔ ان کے ساتھ ہم سب دوست یعنی امجد حسین اور صفدر

میر (زینو) دوایک بار شاہی محلے کی ایک بیٹھک میں گانے کی محفل میں بھی گئے تھے۔ وہاں بڑے غلام علی خان، چھوٹے غلام علی اور برکت علی خان وغیرہ کا اجتماع ہوتا تھا۔ موتی شاہ کو میں نے پہلی بار وہیں دیکھا۔ آواز انہوں نے ایسی پاٹ دار اور ساحرانہ پائی تھی کہ باید وشاید۔ وہیں ہم نے یہ سنا کہ بڑے غلام علی خاں ان کو کلاسیکی موسیقی کی باقاعدہ تعلیم دینا چاہتے تھے۔ تاکہ وہ بطور شاگردان کا نام روشن کریں۔ اس سلسلے میں انہوں نے کوشش بھی کی، مگر موتی شاہ تو پیدائشی طور پر کمزور ذہن رکھتے تھے، ان میں کچھ سیکھنے اور پڑھنے کی صلاحیت نہ تھی، بس غزلیں اور پنجابی گیت سادہ سُروں میں گا لیا کرتے تھے اور آواز کے سہار جادو جگا دیتے تھے۔ حمید شیخے کے گھر کے قریب ایک صاحب غلام فاروق رہتے تھے جو موسیقی کے ماہر تھے۔ بعد میں انہوں نے لاہور میں ایک میوزک سوسائٹی بھی قائم کی۔ انہی کی صحبت میں حمید شیخ کو بھی موسیقی سے لگاؤ پیدا ہوا تھا۔ موتی شاہ فاروق صاحب کے ہاں بھی آتے جاتے تھے اور عموماً رات کے وقت راستے میں ہمارے گھر کی سڑک سے گزرتے تو اکثر گاتے ہوئے گزرتے۔ ان کو رات کے وقت شاہراہوں پر گانے کی عادت تھی۔ جہاں جاتے وہاں اپنی آمد کا علان بھی اسی انداز سے کرتے، مختصر یہ کہ موتی شاہ سے آشنا تھا اور مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ ان کے بھائی پروفیسر ہیں پھر جب میری ملاقات ڈاکٹر صاحب سے ہوئی تو میں ان کے ہاں بھی موتی شاہ سے کئی بار ملا۔

میرے جھنگ کے قیام کے دوسرے دن ڈاکٹر صاحب نے مجھے اپنا کالج دکھایا۔ کچھ اساتذہ اور لڑکوں سے ملوایا۔ سہ پہر کو ڈاکٹر صاحب نے لڑکوں کے ساتھ کرکٹ کھیلی۔ ڈاکٹر صاحب کے طور طریقوں سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ بڑے دوستانہ ماحول میں کالج چلا رہے ہیں۔ حالانکہ جھنگ کالج کا پورا ماحول ان کے لیے نیا تھا انہوں نے اسے اپنے لیے بڑا سازگار بنا لیا تھا۔ شام کو ڈاکٹر صاحب نے ایک لڑکے کو مجھ سے ملوانے کے لیے گھر بلایا اور اس نے مجھے حیران کر دیا، وہ لڑکا کالج میں ایف اے کا طلب علم تھا اور عمر میں کسی قدر زیادہ کیونکہ اس نے کالج سے پہلے مدرسے کی تعلیم میں وقت گزارا تھا۔ اس کی فارسی دانی کا یہ عالم تھا کہ سعدی و حافظ کی غزلوں کے علاوہ خاقانی اور عرفی کے قصیدے بھی اسے ازبر تھے اور ان کے بارے میں خاصی سمجھ بوجھ بھی رکھتا تھا۔ جھنگ میں شاعر جعفر طاہر کے علاوہ یہ لڑکا بھی ڈاکٹر صاحب کی دریافت تھا۔

ڈاکٹر صاحب گورنمنٹ کالج لاہور کے بھی پرنسپل ہوئے مگر میں اس زمانے میں لاہور سے

رخصت ہو چکا تھا۔ لاہور سے کراچی گیا اور وہاں سے کوئی تین سال بعد امریکہ۔ گورنمنٹ کالج کے یوم تاسیس کی صد سالہ تقریبات ۱۹۶۴ء میں ہوئیں تو ڈاکٹر صاحب نے ازراہ شفقت مجھے ان کا دعوت نامہ واشنگٹن میں بھجوایا۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے یہاں بھی بطور پرنسپل ڈاکٹر صاحب نے اسٹاف ممبروں سے دوستانہ اور طلبہ سے مشفقانہ سلوک برقرار رکھا۔ اس زمانے میں پہلے تو جنرل ایوب خان کا ۱۹۶۲ء کا دستور آیا جس نے بارے میں مشہور عوامی شاعر حبیب جالب کی نظم کا ملک بھر میں بہت چرچا تھا خصوصاً اس شعر کا:

ایسے دستور کو، صبح بے نور کو
میں نہیں جانتا، میں نہیں مانتا

پھر اس کے بعد جنرل ایوب خان کا فاطمہ جناح کے خلاف صدارتی انتخاب ہوا۔ دونوں موقعوں پر طلبا کی سیاسی تنظیموں نے ہنگامے کیے۔ گورنمنٹ کالج میں طارق علی اور سلمان تاثیر جیسے طالب علم لیڈر تھے۔ طارق علی کے والد مظہر خان ڈاکٹر صاحب کے جاننے والے تھے اور سلمان تاثیر تو گویا ان کے بھتیجوں کی طرح تھے۔ یہ دونوں احتجاجی جلوس لے کر نکلتے تو ڈاکٹر صاحب ان کے ساتھ ہو جاتے۔ پولیس جلوس کا محاصرہ کرتی تو ڈاکٹر صاحب طلبہ اور پولیس میں بیچ بچاؤ کراتے، گورنمنٹ کالج کے پرنسپل حضرات تو بڑے الگ تھلگ اور رعب داب والے ہوا کرتے تھے، مرڈاکٹر نذیر کا زمانہ لوگ اسی لیے یاد کرتے ہیں وہ بہت غیر معمولی قسم کے مگر بڑے مقبول پرنسپل تھے۔

میں ۱۹۶۵ء کے وسط میں امریکہ سے لوٹا تو میرا تقرر لاہور میں اس وقت کی فنانس سروز اکیڈیمی میں ہوا۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب سے ملاقاتوں کا سلسلہ پھر سے جاری ہو گیا مگر یہ ڈاکٹر صاحب کا بطور پرنسل کالج آخری زمانہ تھا، پھر بھی ستمبر کی جنگ کے بعد ملک کو ذرا سکون ہوا۔ لاہور کی زندگی اپنی تہج پر آئی تو ڈاکٹر صاحب ایک اتوار کو گورنمنٹ کالج کے کچھ لڑکوں اور استادوں کی کرکٹ ٹیم لے کے اکیڈمی سے میچ کھیلنے آئے۔ اکیڈیمی کی ٹیم میں بھی کچھ لڑکے تو گورنمنٹ کالج ہی کے پرانے طالب علم تھے۔ سردیوں کے دن تھے برے مزے کا میچ ہوا لڑکوں نے ڈاکٹر صاحب کی خوب خاطر تواضع کیا و رعزت افزائی بھی، کیونکہ چند دنوں کے بعد یعنی دسمبر ۱۹۶۵ء میں وہ پرنسپل کے عہدے سے ریٹائر ہونے والے تھے۔

میں نے ابتدا میں ڈاکٹر صاحب کی ایک خاص دلچسپی سیر و سیاحت کا بھی ذکر کیا تھا اس کا

بھی اوہ ۱۹۳۰ء کی دہائی کے وسط میں اعلیٰ تعلیم کے سلسلے میں انگلستان گئے ان کے ماموں کی جن کی بیٹی سے ان کی شادی ہوئی تھی، انگلستان میں کاروبار کرتے تھے اور لندن میں رہتے تھے۔ لہٰذا دوسری جنگ عظیم کے دوران تو نہیں مگر جنگ کے بعد سے ایک عرصے تک کبھی اکیلے اور کبھی بیوی بچوں کے سمیت گرمیوں کی چھٹیوں میں انگلستان چلے جاتے تھے اور وہاں سے یورپ کے مختلف ملکوں کی سیر و سیاحت کو نکل جاتے تھے۔ وہ سادہ آدمی تھے اور سیر و سیاحت بھی نہایت سادہ ہی طریقے سے کرتے تھے۔ پانی کے جہازوں بسوں ٹرینوں سے سفر کرتے۔ یوتھ ہوسٹلز یا اسی قسم کی سستی جگہوں پر قیام کرتے اور اکثر پیدال گھومتے پھرتے۔ کچھ عرصے بعد ان کے ماموں اپنا کاروبار بند کر دیا اور وہ بمبئی آ گئے کہ ان کے کاروبار کا کچھ حصہ وہاں بھی تھا۔ اب ڈاکر صاحب انگلستان کے بجاے بمبئی جانے لگے وہاں ان کا زیادہ تر وقت ادیبوں اور شاعروں کے درمیان گزرتا۔ راجندر سنگ بیدی اور کرشن چندر کو تو وہ لاہور سے ہی جانتے تھے خواجہ احمد عباس، علی سردار جعفری سے ان کی ملاقات وہاں ہوئی۔ غرض سفر ہو یا حضر ڈاکٹر صاحب نے اپنے ڈھب کے لوگوں سے ملتے تھے اور اسی میں خوش رہتے۔ بمبئی جانے میں روکاٹ ہوتی تو ڈاکٹر صاحب تعطیلات کاغان سوات اور چترال میں نکل جاتے غرض انکی جہاں گردی کا شوق تھا۔

ریٹائرمنٹ سے پہلے ہی ڈاکٹر صاحب نے لاہور چھاؤنی میں اکک خاصے بڑے قطعے پر جس کے پچھواڑے اور سامنے سڑک پر قطار اندر اطقر درخت تھے اپنے مکان کی طرح ڈالی مکان بھی انھوں نے خاص اپنی پسند کا بنوایا چاروں طرف پرانی طرز کے دالان اور برآمدے اور بیچ میں ایک وسیع صحن پیچھے درکتوں سے بھرا ہوا باغ ساری عمات سرخ اینٹ کی کہیں پلستر کا نام ونشان نہیں، فرش بھی ہست پہلو سرخ اینٹوں کے غرض وہ اس زمانے کے مکانوں کی طرح کا مکان نہیں تھا قدیم وضع کا مکاں ہے کہ ڈاکٹر صاحب خود بہت سے باتوں میں وقدم وضع کو پسند کرتے تھے۔

ریٹائرمنت کے بعد سید بابر علی نے ڈاکٹر نذیر احمد کو اپنے ادارے پیکیجز کے اشاعتی پروگرام کا مشیر بنایا۔ اس حیثیت میں ڈاکٹر صاحب کو شعر و ادب سے شغف کے اطہار کا موقع ملا۔ یہاں انھوں نے پنجابی کے صوفی شاعروں بلھے شاہ اور شاہ حسین کے کلام کی بڑی محنت اور جانفشانی سے تدوین کی۔ اس سلسلے میں تحقیق و تفتیش کے سلسلے میں انہوں نے مشرقی پنجاب کا سفر کیا اور وہاں کی یونیورسٹیوں کے پنجابی ادب کے شعبے اور دوسرے اہل علم سے رابطہ کیا۔

ڈاکٹر صاحب کو پنجابی کے صوفی شاعروں سے ایک خاص ربط و تعلق تھا۔ وہ اپنی طبیعت سے صوفی تھے اور اہل دل لوگوں میں سے تھے۔ اس کا اظہار انہوں نے میرے نام خط میں کیا جو اس مضمون کے آخ رمین شامل ہے ان کے بھای تو موتی شاہ عرف عام میں ملنگ تھے مگر ایک خاص طرح کے ملن ڈاکٹر صاح بھی تھے جو ان کے ایک ہندوستانی دوست اقبال سنگھ ان کو خط لکھتے تو ہمیشہ ''مائی ڈیر ملنگ'' کہہ کر مخاطب کرتے۔ اقبال سنگھ کی تاثیر صاحب سے بھی دوستی تھی۔ انھوں نے تاثیر صاحب پر نہایت اچھا انگریزی مضمون اسلامیہ کالج کے میگزین کریسنٹ کے تاثیر نمبر میں لکھا۔ ڈاکٹر نذیر احمد ان کے تعلقات کے آخر ک دم بھرتے۔ قیام لندن کے دوران میں ان سے اکثر ملتا رہا آخری بار۔ ان سے میری ملاقات لندن ہی میں ہوئی۔ اکتوبر ۱۹۸۹ء، با وہ اسی برس کی عمر سے تجاوز کر چکے تھے ڈاکٹر صاحب کا تو انتقال ہو چکا ان کو بڑی محبت سے یاد کرتے ہوئے پنجابی شاعروں کے ایڈیشنوں کی تعریف کرتے رہے۔

آخری عمر میں ڈاکٹر صاحب گردوں کی خرابی کا مرض ہوا اس کی شدت بڑھی تو صاحب فراش و ہئے۔ اس کے باوجود فیض صاحب کی تدفین کے دن ان کے ہاں پہنچے گاڑی ہی میں بیٹھے رہے وہیں انھوں نے ایلس اور فیض کے بچوں سے ملاقات کی اور سخت بے قراری کے عالم میں آنسو بہائے۔ میں بھی وہاں ان سے ملا مگر تفصیلی ملاقا کے لے اس شام ان کے گھر گیا۔ بستر پر لیٹے ہوئے تھے مجھ سے کہنے لگے کہ گھر والے خواہ مخواہ میرا علاج کروا رہے ہیں۔ اب وقت آن پہنچا ہے اس حقیقیت کو قبول کرنا ہوگا یہ بھی ان کے صوفی مزاج اور درویشانہ طبیعت تھی کہ وہ بالکل راضی برضا نظر آتے تھے۔ یہی میری ان سے آخری ملاقات ثابت ہوئی۔ کچھ عرصہ بعد وہ اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

ڈاکٹر نذیر احمد اپنے تربیت اور پیشے کے اعتبار سے سائنس دان تے مگر وہ ادیبوں شاعروں مصورو بلکہ اس زمرے میں ہر نئے جو ہر قابل کے قدر دان تھے قدرت نے انہیں ادب وفن کے معاملات میں خبر اور نظر دونوں سے نوازا انھوں نے تمام عمر اپنی انہی صلاحیتوں کی پرورش کی اور انہی سے سہارے کتابوں کی دنیا میں ایسا نشایاں چھوڑیں جو اس کی یاد کو دلوں میں محو نہیں ہونے دیں گی۔

(۱۹۹۶ء)

ڈاکٹر وحید قریشی

ڈاکٹر نسیم بانو

گوجرانوالا کے معروف روحانی بزرگ حضرت داتا شاہ جمال نوری کے علمی خانوادے سے تعلق رکھنے والے وحید قریشی ۱۴ / فروری ۱۹۲۵ء کو میانوالی میں پیدا ہوئے۔ان کے نانا محمد شریف قریشی بسلسلہء ملازمت یہاں قیام پذیر تھے۔تعلیم کی ابتدا میانوالی میں ہی ہوئی۔والد عبداللطیف قریشی محکمہء پولیس میں سب انسپکٹر تھے،ان کا تبادلہ مختلف شہروں میں ہوتا رہا اور ان کے ساتھ وحید قریشی کے سکول بھی بدلتے رہے۔منٹگمری،شملہ اور گوجرانولہ کے سکولوں سے ہوتے ہوئے لاہور پہنچے اور اسلامیہ ہائی سکول بھاٹی گیٹ سے ۱۹۴۰ء میں میٹرک کیا۔والد کی خواہش پر گورنمنٹ کالج لاہور میں ایف۔ایس۔سی میں داخلہ لیا مگر ان کا رجحان ادب کی طرف تھا اس لیے ایف ایس سی کے بجائے فارسی اور تاریخ کے بنیادی مضامین کے ساتھ امتحان دیا اور اعزازی نمبروں کے ساتھ ایف۔اے کیا۔۱۹۴۴ء میں گورنمنٹ کالج لاہور ہی سے بی۔اے آنرز (فارسی) کا امتحان پاس کیا۔مزید تعلیم کے لیے اورینٹل کالج آ گئے اور یہاں سے پہلے ایم۔اے فارسی اور بعد ازاں ایم۔اے تاریخ کی سند حاصل کی۔الفرڈ پٹیالہ ریسرچ سکالر شپ پر پی۔ایچ۔ڈی کا آغاز کیا۔۱۹۵۰ء میں پروفیسر عباس شوستری اور ڈاکٹر سید عبداللہ کی نگرانی میں ''Insha Literature in Persia:A Critical Study'' کے موضوع پر مقالہ لکھ کر پنجاب یونیورسٹی سے پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی۔کچھ عرصہ اورینٹل کالج میں جز وقتی استاد کے طور پر ایم۔اے فارسی کی کلاس کو پڑھایا،اسی دوران میں سی۔ایس۔ایس کا امتحان دیا اور پوسٹل سروس کے لیے منتخب ہو گئے لیکن یہ ملازمت مزاج سے لگا نہیں کھاتی تھی لہٰذا جوائن نہ کیا۔ملازمت کا باقاعدہ آغاز ۱۹۵۱ء میں اسلامیہ کالج گوجرانوالا سے بہ حیثیت لیکچرار تاریخ

کیا۔کچھ عرصہ اسلامیہ کالج لاہور میں تدریس کے فرائض انجام دیے۔۱۹۶۲ء میں اورینٹل کالج کے شعبہ اردو سے بہ حیثیت لیکچرار وابستہ ہوئے۔ترقی کرتے ہوئے صدر شعبہ، پرنسپل اور ڈین کے عہدوں تک پہنچے۔۱۹۸۳ء میں ان کی خدمات مقتدرہ قومی زبان کے کل وقتی صدر نشین کے طور پر مستعار لے لی گئیں ۱۹۸۶ء میں آپ مغربی پاکستان اردو اکیڈمی کے اعزازی رکن مجلسِ عاملہ منتخب ہوئے اور وفات تک اس ادارے سے وابستہ رہے۔۱۹۸۷ء سے ۱۹۹۳ء تک آپ بزم اقبال، لاہور کے اعزازی معتمد رہے۔۱۹۹۰ء تا ۱۹۹۲ء تک آپ کا انتخاب حمید نظامی چیئر پر ہوا اور آپ پروفیسر شعبہ ابلاغیات پنجاب یونیورسٹی سے وابستہ رہے۔۱۹۹۳ء سے ۱۹۹۷ء تک اقبال اکادمی پاکستان، لاہور کے ڈائریکٹر رہے۔۱۵/اکتوبر ۲۰۰۰ء سے ۲۵/دسمبر ۲۰۰۱ء تک شعبہ اردو اورینٹل کالج میں بطور وزیٹنگ پروفیسر ایم۔اے اردو کی کلاسوں کو تحقیق پڑھاتے رہے۔۶/ اگست ۲۰۰۳ء کو وائس چانسلر جی۔سی یونیورسٹی ڈاکٹر خالد آفتاب کی تجویز پر یونیورسٹی کے سنڈیکیٹ نے ڈاکٹر وحید قریشی کو ان کی علمی خدمات کے اعتراف میں تاحیات ممتاز پروفیسر (Distinguished Professor) کے اعزاز سے نوازا۔

ڈاکٹر وحید قریشی کی تصنیفات و تالیفات کی تعداد ساٹھ (۶۰) سے زائد ہے۔بیسیوں مقالات اور شعری کلیات بھی ترتیب و تدوین کا منتظر ہے۔انھوں نے مختلف اوقات میں مجلّہ علمی، اقبال، اقبال ریویو، اخبار اردو، تحقیق، اورینٹل کالج میگزین اور مخزن کے لیے ادارتی ذمہ داریاں بھی نبھائیں۔۱۹۹۴ء میں ان کی خدمات کے اعتراف میں انھیں تمغہء حسنِ کارکردگی سے نوازا گیا۔علاوہ ازیں وہ طفیل ایوارڈ، نیاز فتح پوری میڈل، ہمدرد وثیقہ ایوارڈ، خانہء فرہنگ جمہوری ایران ایوارڈ، ادارہء تخلیقات، فارسی ایوارڈ اور اقبال ایوارڈ کے بھی مستحق قرار پائے۔ڈاکٹر وحید قریشی نے ۱۷/اکتوبر ۲۰۰۹ء کو لاہور میں وفات پائی۔

ڈاکٹر وحید قریشی ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے،وہ علمی حلقوں میں محقق، نقاد، شاعر، ماہرِ غالبیات، ماہرِ اقبالیات اور مخطوطہ شناس کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں لیکن ان کی شخصیت کا اہم اور نمایاں پہلو اُستاد ہونا ہے۔وہ پختہ کار اُستاد اور معلم تھے۔چوں کہ ان کا تعلق خانوادۂ صوفیا سے تھا اور صوفیا کا مسلک علوم و فنون سے محبت ہے۔اسی نسبت سے آپ نے بھی ساری عمر تعلیم و تعلم سے محبت کی۔ڈاکٹر صاحب کے خاندان کے لوگ پیشے کے اعتبار سے پولیس کے محکمے سے تعلق

رکھتے تھے۔ والدین کے اصرار پر آپ نے بھی سول سروسز کا امتحان دیا اور ایک بڑے سرکاری عہدے کے لیے انتخاب بھی ہو گیا، مگر آپ نے اسے محض اُستاد بننے کے لیے سب کچھ تیاگ دیا۔ لیکن پولیس والوں کا رنگ ڈاکٹر صاحب کے مزاج پر بھی حاوی رہا۔ وہ محقّق کے بھیس میں سی آئی ڈی کرتے رہے۔ مرحومین کی درست تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات کا سراغ لگانا، نایاب کتابوں کا کھوج لگانا، مخطوطوں کو Decipher کرنا، ناقص یا نامکمل مخطوطہ کے گم شدہ اوراق یا خراب یا حذف شدہ سطروں کو قیاس سے مکمل کرنا۔ یہ سب کچھ ادبی سی آئی ڈی ہی تو ہے۔(۱) ڈاکٹر صاحب اسلامیہ کالج گوجرانوالہ اور اسلامیہ کالج سول لائینز میں تدریسی فرائض انجام دینے کے بعد پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج سے وابستہ ہوئے پھر ممتاز پروفیسر کے طور پر گورنمنٹ کالج یونیورسٹی کے تشنگان علم کو سیراب کرتے رہے۔ بہ حیثیت اُستاد ان کا طریقۂ تدریس یہ تھا: ''وہ ہر مصنف یا موضوع شروع کرنے سے پہلے اس کے مآخذ کا تفصیلی ذکر کرتے اور کلاس کو لکھواتے جاتے تاکہ مفصل مطالعے کے لیے فکر و خیال کے دریچے کھل جائیں۔ مآخذ کی تفصیل کے بعد موضوع کے بارے میں معلومات فراہم کی جاتی تھیں یعنی کس کس نے اس موضوع پر کیا کیا لکھا ہے اور لیکچر کے تیسرے مرحلے میں موضوع کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کے ذاتی تاثرات اور تحقیق کا نچوڑ ہوتا تھا۔ وہ مرحلہ تھا جہاں محسوس ہوتا تھا کہ کلاس روم میں فرشتہ الہام نے پر پھیلا رکھے ہیں اور کلاس کے ہر طالب علم کی صریر خانہ نوائے سروش بنی ہوئی ہے۔''(۲) ہمیشہ تیاری کر کے پڑھاتے۔ پڑھائے جانے والے موضوع کے خاص نکات، اشارے اور یاداشتیں کاغذ پر لکھ لیتے اور پڑھاتے وقت موضوع پر ان کی توجہ مرکوز رہتی۔ ان کے عمل کو ان کے شاگرد خاص ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی تفصیلاً بیان کرتے ہیں:

> ''ان کے ہاتھ میں ایک بھاری بھرکم بیگ ہوتا تھا۔ اتنا فربہ کہ اسے وہ خود ہی اٹھا سکتے تھے۔ ایم۔ اے اردو کی کلاس، کالج کی دوسری منزل پر ہوتی تھی اور ڈاکٹر صاحب کرسی پر بیٹھ کر لیکچر دیتے تھے وہ کلاس میں آتے اور اپنی کرسی پر بیٹھ کر بیگ کرسی کے دائیں جانب رکھ دیتے۔ حاضری لگانے کے بعد کلاس کو لیکچر کا موضوع بتاتے پھر بیگ سے ایک کتاب نکالتے اور لیکچر شروع ہو جاتا۔ ان کے سامنے کسی طرح یاداشتیں یا شذرات (Note) نہیں ہوتے تھے گفتگو کے دوران میں کتاب

> کے اوراق پلٹتے جاتے، کتاب کی مدد سے اور اس کے مباحث کے حوالے سے بات جاری رہتی۔ کبھی کتاب سے کوئی اقتباس پڑھ کر سنا دیتے، پھر اس پر تبصرہ کرتے مثلاً اگر غزل زیر بحث ہے تو فراق، کلیم الدین احمد یا عندلیب شادانی کا ذکر آنا لازم تھا۔ ڈاکٹر صاحب غزل کے متذکرہ بالا نقادوں یا بعض دیگر نقادوں کی آرا سے تعرض کرتے ہوئے ان کی تائید یا تردید کرتے۔ پھر بیگ سے دوسری کتاب نکالتے، لیکچر جاری رہتا۔ کچھ حوالے دوسری کتاب سے دیتے پھر تیسری، پھر چوتھی.....اس طرح ڈاکٹر صاحب کے بیگ سے کتابیں نکلتی آتیں۔ بعض اوقات کتابوں کے اندر نشانی کے کاغذ (Book Mark) رکھے ہوتے، جس سے اندازہ ہوتا کہ لیکچر تیار کر کے آئے ہیں۔ بیگ سے نئی کتاب نکالنے یا میز پر اس کے ڈھیر ہونے سے لیکچر کی روانی میں فرق نہ آتا۔ جب بیگ کی سب کتابیں یکے بعد دیگرے میز پر پہنچ کر ڈھیر ہو چکتیں تو اس کے ساتھ ہی ڈاکٹر صاحب کا ایک گھنٹے کا پُر مغز لیکچر بھی مکمل ہو جاتا۔''(۳)

انھوں نے بطور اُستاد اپنے پیشے سے محبت کی ان کی طبیعت ہی نہیں مزاج بھی اُستادوں والا تھا۔ جتنے اچھے استاد تھے اتنے ہی کڑے نگران تھے۔ وہ ایم-اے، ایم-فل اور پی ایچ-ڈی کے سیکڑوں طلبا کے تحقیقی مقالات کے نگران رہے لیکن معیار پر سمجھوتا نہ کیا۔ ان کی نگرانی میں کام کرنے والوں میں ایک نام مظہر محمود شیرانی کا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''ڈاکٹر صاحب اپنی نگرانی میں مقالہ لکھنے والوں کے منہ میں لُقمے ڈالنے کے مطلق قائل نہ تھے۔ ان کی مثال تیراکی کے ان روایتی اُستادوں کی سی تھی جو پہلے ہی دن کسی نئے شاگرد کو ساتھ لے جا کر دریا میں دھکا دے دیتے تھے اور خود کنارے پر کھڑے اس پر نظر جمائے رکھتے تھے کہ ڈوبنے نہ پائے۔''(۴)

ڈاکٹر صاحب کے ہزاروں شاگرد ایسے ہیں جو آپ کی راہ نمائی سے بلند مقام تک پہنچے اور مختلف شعبوں میں سرگرم عمل ہیں۔ بعض شاگرد علمی و ادبی دنیا میں خاصی شہرت کے مالک ہیں اور علمی ادبی سطح پہ کارہائے نمایاں انجام دے رہے ہیں ایک اُستاد کا اصل سرمایہ تو وہ اذہان ہوتے ہیں جو اس سے اکتساب فیض کرتے ہیں۔ ڈاکٹر وحید قریشی جب تک زندہ رہے، شاگردوں کی ذہن سازی

کرتے رہے۔ارشد میرؔ لکھتے ہیں:

''مجھے ڈاکٹر وحید قریشی کا پہلوٹی کا شاگرد ہونے کا فخر حاصل ہے۔ میں ان معدودے چند خوش نصیبوں میں شامل ہوں جو بقائمی ہوش وحواس بچشمِ خود انھیں پیدل چلتے، بیڈمنٹن کھیلتے، سائیکل چلاتے دیکھ چکے ہیں۔علامہ اقبال سے کسی نے استفسار کیا کہ دنیا میں سب سے مشکل چیز کیا ہے تو انھوں نے جواب دیا ''ذہن سازی''۔ڈاکٹر وحید قریشی میں یہ خوبی بدرجہ اتم موجود ہے وہ شاگردوں کے طبعی رجحان کو بھانپ کر ان کی ذہنی صلاحیتوں کو جلا بخشتے ہیں۔''(۵)

ڈاکٹر وحید قریشی نے جس ماحول میں پرورش پائی؛ جن اساتذہ سے کسبِ فیض کیا؛ اُس کے اثرات اُن کی شخصیت اور علمی کارناموں میں دیکھے جا سکتے ہیں۔اُن کے موضوعات اور علمی مصروفیات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔اُنھوں نے چار زبانوں (اردو، فارسی، پنجابی اور انگریزی) کو ذریعہ اظہار بنایا اور مختلف اصنافِ ادب میں طبع آزمائی کی۔تاہم اُن کی غالب حیثیت محقّق اور نقاد کی ہے۔ تحقیق اور تنقید کا غلبہ اُن کے ہاں اس قدر ہے کہ ان کی تحقیق کو تنقید اور تنقید کو تحقیق سے الگ کرنا ممکن نظر نہیں آتا۔اُن کی تحقیق کا یہ انداز انھیں اپنے معاصر محقّقین میں امتیاز اور انفراد عطا کرتا ہے۔

اردو کی ادبی تحقیق میں ڈاکٹر وحید قریشی کو کئی حوالوں سے اختصاص حاصل ہے۔انھوں نے حافظ محمود شیرانی کے تاریخی اور دستاویزی طریق تحقیق کو مکمل طور پر اپنی تاریخ میں برتا ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی تاریخ کے باقاعدہ طالب علم رہے۔انھوں نے پہلا ایم-اے تاریخ میں کیا۔ برصغیر پاک و ہند کی ادبی اور سیاسی تاریخ پر اُن کی گہری نظر تھی۔ اِس علم سے انھوں نے بھرپور فائدہ اٹھایا ہے۔اُن کا بیش تر تحقیقی کام تاریخ کے سہارے مکمل ہوتا ہے۔اُن کے درست تحقیقی نتائج کے استخراج کا سبب بھی یہی ہے کہ وہ تاریخی مآخذ سے بھرپور استفادہ کرتے ہیں۔اُن کا پہلا تحقیقی وتنقیدی مقالہ ''شبلی کی حیاتِ معاشقہ'' اگرچہ بنیادی طور پر تنقید کی ذیل میں آتا ہے۔تاہم اس ہنگامہ خیز اور روایتشکن مقالے کا تمام تر ڈھانچہ تاریخی حقائق پر استوار ہوا ہے، دوسرا ڈاکٹر وحید قریشی نے اس میں نفسیات کے علم سے بھرپور استفادہ کیا اور فرائیڈ کے نظریۂ تحلیل نفسی کا اطلاق شبلی کے خطوط اور شاعری پر کرتے ہوئے منفرد نتائج نکالے۔

''میر حسن اور اُن کا زمانہ'' نہ صرف ڈاکٹر وحید قریشی کا اہم تحقیقی کارنامہ ہے بل کہ ہماری ادبی تاریخ کا معتبر حوالہ اور قابلِ تقلید مثال بھی ہے۔ اِس تحقیقی کتاب پر پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے انھیں ڈی-لٹ کی ڈگری تفویض کی گئی۔مثنوی سحرالبیان سے لازوال شہرت پانے والے میر حسن کے حالات گوشۂ گم نامی میں رہ جاتے اگر ڈاکٹر وحید قریشی کی تحقیق انھیں دریافت نہ کرتی۔ڈاکٹر وحید قریشی نے اہم تاریخی ماخذات کی مدد سے میر حسن کے حالات کا کھوج لگایا اور اُن تاریخی، سیاسی اور سماجی محرکات کو نشان زد کیا جنھوں نے میر حسن کے تخلیقی عمل کو متاثر کیا تھا۔ڈاکٹر وحید قریشی نے تاریخ کی مدد سے میر حسن کی پیدائش، تعلیم و تربیت، خاندان، لکھنؤ کی طرف ہجرت، اساتذہ کی شاگردی، معاشی واقتصادی حالات، اِس کے تخلیقی کارناموں اور وفات سے متعلق سنین و واقعات کا تعین کیا ہے۔میر حسن پر کام کرنے والے دوسرے محقّقین کی نسبت اُن کے نتائج زیادہ معتبر اور مستند قرار دیے جا سکتے ہیں۔ اِس کی وجہ اُن کا تنقیدی شعور اور تحقیق میں تاریخی مآخذ سے استفادہ ہے۔

کلاسیکی ادب میں غالب، حالی اور اقبال ڈاکٹر وحید قریشی کی تحقیق کے اہم موضوعات ہیں۔انھوں نے اہم کلاسیکی شعرا و ادبا جہاں دار شاہ، شوق، مصحفی، میر حسن، میر امن دہلوی، افسوس، حیدر بخش حیدری، بہادر علی حسینی، مومن، داغ وغیرہ کے حالات کو دریافت کیا اور اردو کی ادبی تاریخ کو درست سمت عطا کی۔حالی پر اُن کا پیش تر کام تنقیدی نوعیت کا ہے۔لیکن تحقیقی حوالے سے حالی کے بعض تسامحات کی نشان دہی کر کے انھوں نے ادبی تاریخ کی درستی کا ادبی فریضہ بھی انجام دیا ہے۔ غالب اور اقبال کے حالات اور کلام کی تحقیق سے انھوں نے ان دو اہم موضوعات کے کئی گوشوں کو منور کیا ہے۔غالب کے نسخۂ شیرانی سے متعلق ان کا طویل مقالہ (نذرِ غالب) غالبیات کے ضمن میں خاص اہمیت کا حامل ہے۔اقبال کی زندگی کے فراموش شدہ اوراق کی دریافت بالخصوص، علامہ اقبال کی تاریخِ ولادت پر اُن کی تحقیق، حیاتِ اقبال سے متعلق غلط رواج پا جانے والی روایات کو مسترد کرتی ہے اور ہماری ادبی تاریخ کی اصلاح کا فریضہ انجام دیتی ہے۔

ادبی متون کی تدوین ایک ادبی محقّق سے جن خصائص کا مطالبہ کرتی ہے، ڈاکٹر وحید قریشی کی شخصیت اُن تمام مطالبات کو پورا کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔تدوین کا تقاضا ہے کہ محقّق ایک سے زاید زبانوں پر دست رس رکھتا ہو اور دیگر معاون علوم میں مہارت کا حامل بھی ہو۔ڈاکٹر وحید قریشی

اردو کے علاوہ فارسی، پنجابی اور انگریزی پر مکمل عبور رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ عربی اور فرانسیسی سے بھی واقفیت تھی، علمِ عروض، مخطوطہ شناسی، لسانی واملائی تغیرات، عتیقیات، تاریخ اور نفسیات جیسے علوم سے واقفیت کی بنا پر اُن کا تدوینی کام اعلیٰ معیار کی ضمانت ہے۔ اردو میں بہتکم ایسے مدوّنین نظر آئیں گے جنھوں نے ایک سے زاید زبانوں کے کلاسیکی سرمایے کی تدوین وترتیب کی ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی کے تدوینی کام کا دائرہ کار بہت وسیع تھا۔ انھوں نے تین زبانوں (اردو، فارسی اور پنجابی) کے شعری ونثری کلاسیکی متون کی تدوین اور تصحیح وترتیب سے ہمارے ادب کو وقار بخشا ہے۔ حالی کا ''مقدمہ شعر وشاعری'' ہمارے ادب میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ مسلسل اشاعت سے اس کا متن عدم صحت کا شکار ہو چکا تھا۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے بنیادی مآخذ تک رسائی کے بعد مقدمہ شعر وشاعری کے اصل متن کو صحت کے ساتھ محفوظ کر دیا ہے۔ تذکرہ ہمیشہ بہار (فارسی) کی تدوین بھی اُن کا قابلِ ستائش تدوینی کارنامہ ہے۔ شعری متون میں ''مثنویات حسن'' کی تدوین، اردو تدوین کے اعلیٰ معیار کی ضمانت ہے۔ میر حسن کی شہرت صرف مثنوی سحر البیان تک محدود تھی اور اس کے دوسرے تخلیقی کارنامے تاریخ کی گرد میں دھندلاتے جا رہے تھے۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے میر حسن کی تمام مثنویات کا کھوج لگایا اور انھیں پوری صحت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ مثنویات کے ابتدائی قدیم قلمی نسخوں اور منتشر مطبوعہ اشعار کی مدد سے اُن کا مکمل اور مستند متن پیش کیا ہے۔ تیموری شہزادے جہاں دار شاہ کی شعری حیثیت اگرچہ مستحکم نہیں ہے لیکن اُس کے گم شدہ دیوان کی دریافت اور اس کی تدوین سے ڈاکٹر وحید قریشی تاریخ کا ایک دوسرا رُخ بھی ہمارے سامنے لائے ہیں۔ ''مثنوی چندر بدن مہیار'' اور ''یار نامہ'' (پنجابی) کے متون پہلی مرتبہ منظر عام پر لا کر ڈاکٹر وحید قریشی نے پنجابی ادب کی ترویج میں بھی اپنا حصہ ڈالا۔ مثنوی سحر البیان، نامہ عشق، دربارِ ملی، شاہجہان نامہ اور ثواقب المناقب کی تصحیح وترتیب اور تدوین بھی ڈاکٹر وحید قریشی کے اہم تدوینی کارنامے ہیں۔

ڈاکٹر وحید قریشی کے نزدیک تحقیق صرف ایک ادبی عمل نہیں ایک سائنسی عمل بھی ہے۔ اپنے ماقبل بیش تر محققین کی طرح وہ تحقیق میں تنقید سے پہلوتہی نہیں کرتے۔ بل کہ نتائج کے استخراج کے ساتھ ساتھ اُن کی فلسفیانہ اور تنقیدی توجیہہ بھی پیش کرتے ہیں۔ اس کے لیے وہ دوسرے سائنسی اور ادبی علوم سے مدد لیتے ہیں۔ نفسیات اور بالخصوص علمِ تاریخ کی کارفرمائی اُن کے ہاں زیادہ نظر

آتی ہے۔ ان کے ہاں محض افسانہ طرازی اور عبارات آرائی نہیں ہوتی بل کہ وہ حقائق کو ان کے خشک واقعاتی تناظر میں پیش کرتے ہیں۔ ڈاکٹر وحید قریشی بنیادی طور پر معاصر شہادتوں کو ترجیح دیتے ہیں۔ معاصر شہادتیں نہ ملنے پر وہ متاخر شہادتوں سے بھی استفادہ کرتے ہیں۔ وہ بنیادی مآخذ تک رسائی کو زیادہ ضروری خیال کرتے ہیں۔ بنیادی مآخذ کا کھوج لگاتے ہیں اور ان کی بنیاد پر اپنی تحقیق کی عمارت استوار کرتے ہیں۔ صرف بنیادی مآخذ نہ ملنے کی صورت میں ثانوی مآخذ استعمال کرتے ہیں۔

ڈاکٹر وحید قریشی کی دوسری اہم جہت نفسیاتی تنقید ہے۔ ان کا شمار اردو کے اولین نفسیاتی ناقدین میں ہوتا ہے۔ نفسیاتی تنقید کے ضمن میں ڈاکٹر وحید قریشی کا سب سے اہم کارنامہ شبلی کی حیات معاشقہ ہے جو اردو تنقید کی روایت میں ادب کو فرائڈین نفسیات کی روشنی میں دیکھنے کی طرف بنیادی قدم ہے۔

مطالعہ حالی پیش کرتے وقت انھوں نے حالی کی تنقید نگاری اور اس کے تنقیدی معیارات کو اجتماعی لاشعور کی روشنی میں پرکھا ہے۔ ان کے نزدیک حالی بے شک ایک بڑے نقاد ہیں لیکن جب تنقید کو دوسری زبانوں کی ادبیات اور تنقیدی نظام کی روشنی میں دیکھا جائے گا تو حالی کی تنقید پر بہت سے سوالات اٹھتے ہیں اور وہ محض وضاحتی تنقید کا درجہ حاصل کرتی ہے۔ انھوں نے حالی کے تنقیدی نظریات کو معاشرتی پسِ منظر اور خود حالی کی شخصیت کی روشنی میں پرکھ کر ہدف تنقید بنایا ہے۔ انھوں نے حالی کے بعض تنقیدی معیارات کو حالی کی شخصی زندگی کا شاخسانہ قرار دیتے ہوئے رد کیا ہے۔ ان کے نزدیک حالی کی طرف سے غزل کے نظام میں قافیے وغیرہ کی بحث' مطلوب کے مذکر ومونث ہونے پر اعتراض اور غزل میں عورتوں کے لوازمات اور خصوصیات کو بیان کرنے والے الفاظ کے استعمال کو نامناسب قرار دینا' حالی کی نفسیاتی الجھنوں کا نتیجہ ہیں (۶)

ڈاکٹر وحید قریشی ایک ظریف اور بذلہ سنج انسان تھے۔ عام محققین کے برعکس زاہد خشک مزاج کا لیبل اُن پر چسپاں نہیں کیا جا سکتا۔ تحقیقی حقائق اور نتائج کو ان کے خشک واقعاتی تناظر میں پیش کرنے کے باوجود اُن کی تحریروں میں بین السطور شوخی کی لہر کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اُن کا یہی انداز اُن کے اسلوب کو بوجھل نہیں بننے دیتا۔ ڈاکٹر وحید قریشی کے نزدیک ''خطاے بزرگاں'' پر گرفت خطا نہیں بل کہ برائے اصلاح ہے۔ بعض لوگ ان کے اس رویّے کو کسی تعصب پر محمول

کرتے ہیں۔ ان کی تحقیق اور تنقید نے شبلی کو تقدیس کے اونچے استھانوں سے اُتار کر زمین پر لا کھڑا کیا اور اُسے ایک فرشتے کے بجائے ایک عام انسان ثابت کر دیا۔ حالی کے تنقیدی مستعار خیالات پر انھوں نے کاری ضرب لگائی یا اپنے معاصرین کے تحقیقی نتائج کو رد کر کے ادبی تاریخ کی اصلاح کی، تو اِسے تعصب نہیں کہا جا سکتا۔ ایک محقّق کا اوّلین فرض ہے کہ وہ کسی ذاتی تعصب، مفادات، تعلقات اور لگی لپٹی کے بغیر درست تحقیقی نتائج پیش کرے۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے یہ فریضہ بطریقِ احسن سرانجام دیا ہے۔

> انھوں نے جس علمی روایت سے استفادہ کیا اور جن اساتذہ سے کسبِ فیض کیا تھا، نہ صرف اس کا پاس رکھا بل کہ اُسے وسعت بھی دی۔ اردو تحقیق کی روایت پر اُن کے گہرے اثرات مرتب ہوئے ہیں، اس لیے سیّد ابوالخیر کشفی کا کہنا ہے: ''وہ ہمارے عہد کی تحقیق اور تنقید کے اہم نقش گر ہیں۔''(۷)

ڈاکٹر وحید قریشی نے اپنے تحقیقی سرمایے سے نہ صرف اردو کی تحقیقی روایت کو معتبر کیا، بل کہ اپنے معاصرین اور بعد میں آنے والی دو تین نسلوں کو بھی متاثر کیا ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی کے اندازِ تحقیق سے متاثر ہونے والے اور اس روایت کو آگے لے کر چلنے والے ان کے شاگردوں اور محقّقین کی ایک طویل فہرست ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی کو حافظ محمود شیرانی کی تحقیقی روایت سے وابستہ قرار دیا جاتا ہے۔ انھوں نے اس روایت کے اثرات کو قبول کیا اور اس کی پیروی کی لیکن اس کے ساتھ ساتھ اپنا ایک الگ رنگ بھی اختیار کیا اور اس روایت کو جدّت اور تنوّع سے نوازا۔ انھوں نے تحقیق میں تاریخ کے ساتھ ساتھ تنقید کو جس طرح برتا ہے۔ اس سے ان کی ایک جداگانہ حیثیت مستحکم ہوتی ہے۔

حوالہ جات:

۱۔ ڈاکٹر سلیم اختر، طوفان اور شبنم، مشمولہ مخزن (ڈاکٹر وحید قریشی نمبر) جلد۱۰ شمارہ۱۹، لاہور: ۲۰۱۰ء، ص۲۵

۲۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی، ڈاکٹر وحید قریشی، شخصیت و فن، اسلام آباد: اکادمی ادبیات، ۲۰۰۶ء،

ص۲۷

۳۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، ''یادوں کے آئینے میں''، مطبوعہ الحمراء لاہور: ۲۰۰۱ء، ص۴۰

۴۔ ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی، ''کیا عمارت قضائے ڈھائی ہے''، مطبوعہ مجلّہ راوی، لاہور: گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، ۲۰۱۰ء، ص۱۳۰

۵۔ ارشد میر، ''وحید عصر، ڈاکٹر وحید قریشی''، مشمولہ سالنامہ محفل، فروری ۱۹۹۰ء، لاہور، ص۸۷

۶۔ ڈاکٹر اورنگ زیب نیازی، پاکستام میں اردو تنقید، لاہور: بیکن بکس، ۲۰۱۵ء، ص۱۳۱

۷ سید محمد ابو الخیر کشفی، کلماتِ سپاس و اعتراف، مشمولہ سہ ماہی روشنائی، اپریل۔ جون ۲۰۰۸ء، ص۱۵۵

پروفیسر سید وقار عظیم

ڈاکٹر اصغر ندیم سید

اگرچہ قیامِ پاکستان سے پہلے پنجاب اور خصوصاً لاہور اُردو کے ایک بڑے تہذیبی وثقافتی مرکز میں تبدیل ہو چکا تھا اور اُردو کے صفِ اوّل کے ادیب انگریزوں کی زیرِ سرپرستی علمی اور ادبی دنیا میں اثر انگیز تبدیلیاں لا رہے تھے۔ محمد حسین آزاد، الطاف حسین حالی، اسماعیل میرٹھی کے بعد کچھ ایسی فضا بن گئی تھی کہ پنجاب یونیورسٹی اور اورینٹل کالج نسبتاً قدامت پسندوں کا مسکن بن رہا تھا اور گورنمنٹ کالج لاہور جدت پسند، تربیت یافتہ، ذوقِ جمال رکھنے والے فنونِ لطیف کی فعالیت سے کام لے کر ایک سیکولر فنون پرور ماحول بنانے والے افراد کا مرکز بنتا جا رہا تھا جس میں پروفیسر احمد شاہ بخاری، پروفیسر سراج، ن م راشد، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، ڈاکٹر نذیر احمد اور اس طرح کے لوگوں کا بڑا حصہ ہے جن کے ساتھ سید عابد علی عابد، امتیاز علی تاج، عبدالمجید سالک، ڈاکٹر دین محمد تاثیر اور چراغ حسن حسرت جیسے تخلیقی ذہن رکھنے والے مجلس آرا لوگ نئے ذہنوں کی آبیاری کر رہے تھے۔ لیکن پنجاب یونیورسٹی اور گورنمنٹ کالج لاہور کی علمی مسابقت لاہور کی فکری اور تخلیقی فضا میں زرخیزی پیدا کر رہی تھی۔ ایسے میں تقسیم ہند کے بعد تعلیم یافتہ اور علمی حلقوں میں معروف اساتذہ یوپی سے لاہور منتقل ہوئے اور ان دانشگاہوں سے وابستہ ہوئے اور پھر اورینٹل کالج کی علمی اور ذہنی فضا میں بھی تبدیلی آئی۔ انہی میں سید وقار عظیم بھی تھے۔ وہ اورینٹل کالج لاہور سے وابستہ ہوئے۔ نقوش، لاہور کو بھی مرتب کیا اور پھر تین سے زائد عشروں تک تین نسلوں کی ذہنی آبیاری کی۔ ان کی کتابیں اب تک اُردو دنیا میں ایک بنیادی حوالہ رکھتی ہیں۔

سید وقار عظیم کے دادا کا نام جناب فضل عظیم تھا جو ڈپٹی کلکٹر کے طور پر پہلی بار ہمیر پور (کانپور) میں تعینات ہوئے۔ ان کے بیٹے سید مقبول عظیم 1300ھ میں پیدا ہوئے۔

سید مقبول عظیم پولیس میں ملازم تھے۔ تاہم شعر گوئی سے انہیں خاص شغف تھا۔ عرش تخلص کیا کرتے تھے۔ وہ بیان یزدانی میرٹھی کے شاگرد تھے۔

سید وقار عظیم کا اصل وطن انبیٹھہ ہے جو کہ تحصیل گنگوہ کے قریب ضلع (سہارنپور) کا ایک قصبہ ہے۔ اُن کی ننھیال میرٹھ کی تھی۔ آپ کے نانا ادیب میرٹھی تھے، جو کہ صاحب دیوان غزل گو شاعر تھے۔ وہ داغ کے رنگ میں غزل کہتے تھے۔ آپ کے دو ماموں بھی شاعر تھے۔ بڑے ماموں لبیب اور چھوٹے ماموں طبیب تخلص کرتے تھے۔ سید وقار عظیم کی والدہ بھی گو کہ گھریلو خاتون تھیں تاہم وہ بھی اُردو، فارسی دینیات سے واقف تھیں۔

سید وقار عظیم نے ابتدائی تعلیم گھر سے حاصل کی۔ والدہ صاحبہ انہیں اُردو، دینیات اور کلام پاک پڑھاتیں۔ فارسی کی ایک کتاب بھی انہوں نے والدہ سے پڑھی۔ اس زمانے میں ابتدائی تعلیم کے لیے سکول نہیں ہوتے تھے بلکہ پرائمری تعلیم مکتبوں میں حاصل کی جاتی تھی۔ طلبہ چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں الگ الگ بیٹھے ہوتے اور اُستاد باری باری ان کو سبق دیتے۔ چھٹی جماعت میں آپ کانپور کے گورنمنٹ ہائی سکول میں داخل ہوئے۔

سید وقار عظیم کے والد کا تبادلہ 1919ء میں اناؤ میں ہو گیا۔ اناؤ میں سید وقار عظیم کو علمی و ادبی فضا میسر آئی۔ اس ضلع کے بہت سے شعراء و ادباء نے ہندوستان بھر میں شہرت حاصل تھی۔

سید وقار عظیم کے والد کا حلقۂ احباب بھی شعراء و ادباء پر مشتمل تھا۔ مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی، جگت موہن رواں، رضی بدایونی، فرخ بنارسی (داغ کے شاگرد) کا آنا جانا، گھر میں شعر و شاعری کی باتیں ہونا۔ اس پر مستزاد کہ گھر میں اُردو اور فارسی کے مشہور شعراء کے دیوان موجود تھے۔ کتابوں سے الماریاں بھری ہوئی تھیں اور گھر میں کئی قسم کے رسائل آتے تھے، جن سے فیضیاب ہونے کا اکثر انہیں موقع ملتا تھا۔ خود کہتے ہیں:

''دراصل ہمارے گھر کا ماحول ہی کچھ اس قسم کا تھا کہ اگر میری جگہ کوئی دوسرا بچہ ہوتا تو وہ بھی اس سے متاثر ہوتا اور میری طرح اسے بھی پڑھنے لکھنے کا شوق ہوتا۔''

(سید وقار عظیم، سوانحی خاکہ، صفحہ 27)

علامہ اقبال سے دلچسپی کا آغاز بھی اسی دور میں ہوا۔ شعراء کی صحبت، شعر و سخن کی محافل

میں شرکت نے تنقیدی شعور کو جلا بخشی۔

''شعر وسخن کی طویل محفلیں گرم ہوتیں، میں پان یا کوئی چیز دینے کی خاطر کمرے میں آتا تو ایک آدھ شعر میرے کان میں پڑ جاتا جو اکثر مجھے یاد ہو جایا کرتا۔ بعد میں والد صاحب مجھے دیدہ دانستہ ایسی محفلوں میں بٹھانے لگے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ ایسی محفلیں بچوں کی تربیت کے لیے بڑی مفید ہوتی ہیں۔'' (سید وقار عظیم، سوانحی خاکہ، صفحہ 28)

شعر وشاعری کی اس پُر مغز فضا کا اثر یہ ہوا کہ وہ خود بھی شاعری کی طرف مائل ہو گئے۔ طالب علمی کے اس دور کی غزلیں اور ان کے اثرات کے متعلق لکھتے ہیں: ''وہ شعر کیا تھے بس تک بندی ہوتی تھی مثلاً ہمارے ایک دوست حشمت علی ایک دفعہ ہم نے ان پر ایک مصرع کہا۔ ایک اس لیے کہ دوسرا مصرع غالب کا ہے۔

جان لیوا ہیں ناز حشمت کے
موت آتی ہے پر نہیں آتی

شعر گوئی کا یہ رجحان بہت جلد ترک کر دیا جس کا تجزیہ اُنہوں نے خود کیا اور ترک شاعری کی وجہ کچھ یوں بیان کی کہ مختلف شعراء کی کتب کے مطالعے نے اس شوق کو ختم کر دیا۔

آٹھویں جماعت میں سید وقار عظیم نے وظیفہ کا امتحان دیا جس میں پورے صوبے کے طلبہ شریک ہوتے تھے۔ آپ نے بھی اچھے نمبروں سے یہ امتحان پاس کر کے وظیفہ حاصل کیا۔ اسی وظیفہ کی رقم سے مولوی انوار الحق کے کہنے پر کتب خریدنا شروع کیں۔ یوں درسی کتابوں کے علاوہ نئی کتابیں پڑھنے کا شوق بھی پیدا ہوتا چلا گیا۔

یوں نویں دسویں جماعت میں ستر اسی کتب پر مشتمل ایک ذاتی لائبریری بن گئی جن میں شاعری اور تنقید کی کتابیں اور شرر اور ڈپٹی نذیر احمد کے اور پریم چند کے ناول وغیرہ شامل تھے۔ آب حیات کے مطالعے نے انہیں تنقیدی شعور کی طرف مائل کیا۔ گورنمنٹ ہائی سکول اناؤ سے ایک رسالہ بھی نکلتا تھا جس میں آپ بھی لکھتے تھے۔ اناؤ سے ایک ہفت روزہ ''آفتاب'' شائع ہوتا تھا، جس کے ایڈیٹر وقار عظیم صاحب کے پڑوس میں رہتے تھے۔ ایک مرتبہ سید وقار عظیم اپنے والد کے ساتھ صفی پور عرس پر گئے۔ جہاں مشاعرہ منعقد ہوا۔ ایڈیٹر صاحب کے کہنے پر آپ نے مشاعرہ کی روداد تحریر کی۔ خود فرماتے ہیں:

''یہی روداد میرا پہلا مضمون ہے جو میں نے سکول کے رسالے سے الگ کسی باہر کے اخبار کے لیے لکھا، یہ 1929ء کا ذکر ہے۔'' (ماہنامہ 'سیارہ'، لاہور دسمبر 1962 صفحہ 82)

سید وقار عظیم نے میٹرک کا امتحان گورنمنٹ ہائی سکول اناؤ سے پاس کیا۔ جس کے بعد آپ لکھنؤ چلے گئے اور وہاں گورنمنٹ جوبلی انٹرمیڈیٹ کالج میں داخلہ لیا، یہاں مولوی محمد حسین (فارسی)، علی عباس حسینی (اُردو) اختر علی تلہری (اُردو) اور حامد اللہ افسر جیسے قابل اساتذہ سے آپ نے کسب فیض کیا۔

''حامد اللہ افسر صاحب کی شاعری اور تنقید نے بہت متاثر کیا، وہیں سے تنقید لکھنے کا شوق پیدا ہوا، ان دنوں علی عباس حسنی صاحب ''ناول کی تاریخ اور تنقید'' لکھ رہے تھے۔ وہ اس کتاب کے کئی باب ہمیں پڑھ کر سناتے ..... ان کی اِس کتاب میں جا بجا انگریزی ناولوں کے حوالے تھے جن کے باعث مجھے انگریزی پڑھنے کا شوق پیدا ہوا۔''

(ہفت روزہ نصرت، لاہور، 11 ستمبر 1960، صفحہ 60)

اسی دوران آپ نے مختلف ادبی رسالوں نیرنگ خیال، ہمایوں، ساقی، ادبی دنیا، عالمگیر، ہندوستانی، معارف، الناظر اور نگار میں مضامین لکھے۔ بعض انگریزی مضامین کا ترجمہ بھی کیا۔ ساتھ ہی مغربی ادب سے شناسائی پیدا کی اور سجاد ظہیر، فراق گورکھپوری، پروفیسر احمد علی کی رہنمائی میں لائبریری سے لارنس، جوائس، موپساں اور چیخوف کے افسانے پڑھے۔ 1934ء میں سید وقار عظیم نے ایم۔اے کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ الہ آباد یونیورسٹی کا یہ قاعدہ تھا کہ فرسٹ آنے والے طالب علم کو وظیفہ دیا جاتا تھا جو ریسرچ ورک کے لیے ہوتا تھا۔ سید وقار عظیم کی بھی اس وظیفے کے لیے منظوری ہو گئی۔ آپ کے مقالے کا موضوع تھا ''اُردو کی شاعری پر مقامی اثرات''۔ اصل میں یہ موضوع انگریزی میں تھا Influance of Environment on Urdu Poetry۔ پہلے مقالے انگریزی میں لکھے جاتے تھے اسی سال طلبہ کو اُردو میں لکھنے کی اجازت ملی۔ ایک سال کے اندر آپ نے یہ تحقیقی مقالہ لکھا، صدر شعبہ اُردو ضامن صاحب نے اسے پسند کیا اور پھر انہی کی سفارش پر آپ کو پی۔ ایچ۔ ڈی کی اجازت مل گئی، تاہم ڈاکٹریٹ کی خواہش پایہ تکمیل کو نہ پہنچ سکی کیونکہ ایم۔اے کرنے کے بعد مئی 1935ء میں والد مقبول عظیم اللہ کو پیارے ہو گئے۔ والد کی اس ناگہانی موت نے سید وقار عظیم کے کندھوں پر معاش کی بھاری

ذمہ داری ڈال دی۔ بہن بھائیوں کی تعلیم، پرورش، شادی بیاہ سب آپ کے ذمے تھا کیونکہ آپ گھر میں سب سے بڑے تھے۔ لہٰذا اب آپ کی ساری توجہ اس بات پر تھی کہ اپنی گزر اوقات کے ساتھ ساتھ ان کے اخراجات بھی پورے ہوسکیں۔ ایم۔اے کے بعد الہ آباد یونیورسٹی کے اُستاد ڈاکٹر حفیظ سید چھٹی پر انگلستان گئے، ان کی جگہ چھ مہینے کے لیے سید وقار عظیم کا تقرر ہوا اور اس عرصے میں آپ نے بی۔اے اور بی۔اے آنرز کی کلاسوں کو پڑھایا۔ ڈاکٹر حفیظ سید کے آنے سے یہ سلسلہ منقطع ہوگیا۔ دوران طالب علمی آپ کی دو کتابیں ''افسانہ نگاری''، اور ''ہمارے افسانے'' بھی چھپ چکی تھیں۔ ساتھ ساتھ ترجمے کا کام بھی جاری رکھا اور کچھ درسی کتابیں بھی لکھیں۔ بعض درسی کتابیں منظور بھی ہوئیں اور یہ انڈین پریس کے رام نرائن لعل نے شائع کیں۔ ایچ۔جی ویلز کی کتاب ''اے شارٹ ہسٹری آف دی ورلڈ'' کا ترجمہ بھی کیا۔ ''بچوں کی دنیا'' رسالہ کی ادارت بھی آپ نے کی۔ ساتھ ہی رسالہ ''سکاؤٹ'' کی ادارت کی۔ رسالہ ''نیساں'' کے ایڈیٹوریل بورڈ کے رکن بھی رہے۔ اسی دوران سید وقار عظیم کی ملاقات خواجہ غلام السیدین سے ہوئی، جو اس وقت ٹریننگ کالج علی گڑھ کے پرنسپل تھے، ان کی تحریک پر وقار عظیم صاحب نے بی۔ٹی کیا۔ ٹریننگ کالج سے بی۔ٹی کرنے کے بعد سید وقار عظیم واپس الہ آباد آ گئے اور پھر تلاش معاش شروع کی۔''

انہی دنوں خواجہ غلام السیدین کا خط اُن کے نام آیا جس میں ذکر تھا کہ ڈاکٹر ذاکر حسین یورپ گئے ہیں اور جاتے ہوئے یہ خواہش ظاہر کی ہے کہ اگر شعبہ اُردو کے لیے سید وقار عظیم جامعہ ملیہ آ جائیں تو اچھا ہو۔ سیدین صاحب نے مزید لکھا کہ اگر آپ جامعہ جانا چاہتے ہیں تو وہاں یہ خط لے کر جائیے اور مجیب صاحب سے مل لیجئے۔ بی۔ٹی کے دوران وہ ایک مرتبہ وقار صاحب کو جامعہ ملیہ دکھا لائے تھے۔ جہاں کا ماحول دیکھ کر سید وقار عظیم بہت متاثر ہوئے تھے لہٰذا جب انہیں سیدین صاحب کا یہ خط ملا تو بے حد خوش ہوئے اور باقاعدہ طور پر 1938ء میں جامعہ ملیہ میں پڑھانا شروع کر دیا۔ اسی دوران اُن کی شادی آگرے کے کوتوال عابد حسین خاں کی صاحبزادی عابدہ بیگم سے 27 دسمبر 1938ء کو لکھنؤ میں ہو چکی تھی۔

(ثمرین اختر، سید وقار عظیم بحیثیت اقبال شناس، غیر مطبوعہ مقالہ برائے ایم۔فل، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد، 2006ء۔ صفحہ 22)

جامعہ ملیہ میں سید وقار عظیم 1938ء سے 1942ء تک رہے، کہتے ہیں:

''یہ پانچ برس، میری زندگی میں ایک طرح سے خاصی اہمیت رکھتے ہیں یہاں میں نے ایک خاص قسم کی تربیت حاصل کی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعد میں کوئی ایسا کام نہ تھا جسے کرنے میں عار نظر آئے یا جو ایک پروفیسر کے شایان شان نہ ہو۔ اکثر اوقات مالی پریشانیاں بھی تنگ کرتیں مگر کیا مجال جو ماتھے پر ذرا شکن آئے۔'' (سید وقار عظیم، سوانحی خاکہ، صفحہ 42)

جامعہ میں بی۔اے تک کلاسیں پڑھائی جاتی تھیں۔ وہاں تین درجے تھے، ابتدائی، ثانوی اور کالج۔ سید وقار عظیم کا تقرر ثانوی درجے میں ہوا۔ تاہم ایک سال کے بعد دو کلاسیں کالج کی بھی مل گئیں۔

''جامعہ ملیہ اسلامیہ کا نام بڑا تھا، لیکن اس کی اس زمانے میں مالی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ یہاں کے کسی اُستاد کو سوا سو روپے سے زیادہ مشاہرہ نہیں ملتا تھا۔ سید وقار عظیم کو بھی جو تنخواہ ملتی تھی، وہ ان کی ضرورتوں کے لیے ناکافی تھی۔ لیکن آدمی تھے متحمل مزاج اور ایثار والے، اس لیے کسی سے شکایت بھی نہیں کی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین (مرحوم شیخ الجامعہ (ف: مئی 1969ء) نے خود ہی ایک دن کہا کہ اگر آپ چاہیں تو کسی دوسری جگہ ملازمت کا انتظام کر لیں، تاکہ آپ کی مالی دشواریاں بھی کچھ کم ہو جائیں اور لکھنے کے شوق کی تسکین بھی ہو۔ پھر ذاکر صاحب نے خود ہی نواب زادہ لیاقت علی خان (ف: اکتوبر 1951ء) صدر مجلس انتظامیہ اینگلو عربک کالج سے سفارش کی (ذاکر صاحب خود اس کے نائب صدر تھے) اور وقار عظیم اس کالج میں اُردو کے اُستاد مقرر ہو گئے۔ اس کے چندے بعد دہلی پالی ٹیکنیک میں اُستاد اُردو کی جگہ نکلی۔ وہاں کے اصحابِ مجاز نے وقار عظیم کو اپنے ہاں آنے کی دعوت دی، مشاہرہ بھی زیادہ تھا اس پر وہ اینگلو عربک کالج سے مستعفی ہو کر وہاں چلے گئے۔'' (''سید وقار عظیم، پروفیسر'' مطبوعہ سہ ماہی، تحریر، علمی مجلّہ دلی، مرتبہ مالک رام، جلد: 11 شمارہ: 1، جنوری مارچ، 1977، صفحہ 111)

یہاں آپ نے 1942ء سے 1946ء تک کام کیا۔ 1946ء میں آپ کو حکومتی پرچے ''آج کل'' دہلی کا مدیر بنا دیا گیا۔ یہاں آپ کو پولی ٹیکنیک کی تنخواہ سے تین گنا زیادہ رقم دی گئی۔ ہوا کچھ ہوں یوں کہ ''آج کل'' میں سید وقار عظیم صاحب کے دوست اسسٹنٹ ایڈیٹر تھے، انہیں اس شرط پر ترقی مل رہی تھی کہ وہ اپنا کوئی بدل رکھ دیں، ان کے ذہن میں سید وقار عظیم

کا نام آیا، وقار صاحب نے یہ عذر پیش کیا کہ میں سرکاری ملازم ہوں اس لیئے عرضی نہیں دے سکتا تاہم انہوں نے کہا کہ آپ صرف انٹرویو دے دیں، اور منتخب ہونے کی صورت میں استعفیٰ دے دیجئے گا، چنانچہ ایسے ہی ہوا اور یوں انہوں نے ''آج کل'' کی نوکری قبول کر لی۔ اس سارے عرصے میں مصروفیت کے باعث سید وقار عظیم ادبی مصروفیات سے کنارہ کش رہے تاہم اُن کا حلقۂ احباب وسیع ہو گیا۔ پطرس بخاری کی قائم کردہ مجلس اور ترقی پسند تحریک کے مختلف اجلاسوں میں آپ لازمی شرکت کرتے۔ اس طرح ادب سے رشتہ ٹوٹا نہیں بلکہ قائم رہا اور تاثیر، فیض، چراغ حسن حسرت، حفیظ جالندھری، حمید احمد خان، حامد علی خان، کیپٹن عبدالواحد، ممتاز حسین، اے ڈی اظہر، کرشن چندر، منٹو، میراجی، شاہد احمد دہلوی، رازق الخیری اور صادق الخیری، فضل حق قریشی، انصار ناصری، مرزا محمد سعید سے ملاقاتیں ہوتی رہیں، اسی دوران 1947ء میں تقسیم ہند ہوئی۔ سارے سرکاری ملازمین سے پوچھا گیا کہ وہ ہندوستان میں رہنا چاہتے ہیں یا پاکستان، اس پر رسالہ ''آج کل'' کے سارے عملے نے پاکستان کے حق میں رائے دی یوں یہ سب لوگ کراچی آ گئے، ہندوستان میں رسالہ ''آج کل'' پبلی کیشنز ڈویژن انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ کے زیر انتظام تھا۔ اس لیے اس عملے کو پاکستان آنے میں کوئی دشواری نہ ہوئی۔

12 اگست 1947ء کو سید وقار عظیم کراچی پہنچے۔ یہاں آ کر حکومت نے پرچہ ''ماہِ نو'' نکالنے کا فیصلہ کیا اور وقار صاحب اس کے پہلے ایڈیٹر بنے اور 1950ء تک اس عہدے پر فائز رہے۔ بقول ڈاکٹر اعجاز حسین: ''سرکاری جریدے کی ابتداء دونوں مملکتوں میں ان ہی کے ہاتھوں سے ہوئی۔'' (اعجاز حسین، ڈاکٹر، مختصر تاریخ اُردو، کراچی: اُردو اکیڈمی سندھ، 1971ء)

ان مصروفیات کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب تک وقار عظیم ''آج کل'' اور ''ماہِ نو'' میں رہے ان کا تصنیفی و تالیفی کاموں کا سلسلہ منقطع رہا۔ کراچی کی آب و ہوا بھی سید وقار عظیم کو راس نہ آئی اور انہیں سانس کی تکلیف (دمہ) ہو گئی اور ڈاکٹروں نے کراچی چھوڑ کر لاہور جانے کا مشورہ دیا۔ اسی اثناء میں آپ کو پنجاب یونیورسٹی لاہور کی طرف سے شعبہ اُردو میں بطور اُستاد لینے کی پیش کش ہوئی۔ یوں 2 فروری 1950ء کو لاہور پہنچے۔ 4 فروری 1950ء کو آپ پنجاب یونیورسٹی لاہور میں بطور پروفیسر تعینات ہوئے۔ ''یونیورسٹی اورینٹل کالج سے ان کی وابستگی ان کی زندگی کا طویل ترین تدریسی تجربہ بن گئی اور یہاں آنے کے بعد انہوں نے صرف شعبہ اُردو ہی میں خدمات انجام

نہیں دیں بلکہ یونیورسٹی کے بعض دوسرے اداروں نے بھی ان کی خدمات سے استفادہ کیا۔

اورینٹل کالج میں آنا سیّد وقار عظیم صاحب کی زندگی کا ایک انقلاب آفریں واقعہ ثابت ہوا۔ ان بیس اکیس سالوں میں جہاں انہوں نے خود مسلسل کام کیا وہاں دوسروں کو بھی کاموں میں لگایا یوں ان کی عمر عزیز کے یہ دو عشرے علم و ادب کی دنیا میں گونا گوں ثروتمندی کا باعث بنے۔''

(ڈاکٹر زاہد منیر عامر۔ پدرم سلطان بود، سنگ میل پبلی کیشن 2017 صفحہ 343)

اے حمید نے ان دنوں کی روداد ''سنگ دوست'' میں تفصیل سے رقم کی ہے:

''وقار صاحب کلاس میں داخل ہوتے تو مسکرا رہے ہوتے۔ وہ کرسی پر بیٹھ کر لیکچر دیتے۔ اُردو افسانے پر ان کے لیکچر آج بھی یاد آتے ہیں۔ معلوم ہوتا کہانی سنا رہے ہیں۔ داستان پڑھ رہے ہیں۔ ذرا خاموش ہوتے تو کلاس روم کی یہ خاموشی اور زیادہ گھمبیر ہو جاتی۔ بڑی خاموشی اور بڑا سکون ہوتا تھا۔ کلاس روم کی کھڑکی کے باہر برگد کے شاخوں کی نئی سرخ کونپلیں بہار کی سنہری دھوپ میں چمک رہی ہوتیں۔ کوئی طالب علم ان کونپلوں کی طرف دیکھتا تو وقار صاحب کبھی منع نہ کرتے۔ انہیں معلوم تھا کہ درخت بھی لیکچر دیتے ہیں اور کبھی کبھی ان کا لیکچر بھی ضرور سننا چاہیے۔''

(اے حمید، سنگِ دوست، جودت پبلی کیشنز، لاہور 1984، صفحہ 336)

اورینٹل کالج میں ادبی و علمی، تحقیقی کاموں میں منہمک رہنے میں آپ بہت راحت محسوس کرتے تھے۔ اپنی مصروفیات کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''زیادہ کوشش یہی رہتی کہ انہیں چیزوں کا مطالعہ کیا جائے جو طلبہ کے لیے زیادہ مفید ہو سکیں۔ چنانچہ ان موضوعات پر نئی پرانی سب چیزیں نظر سے گزرتی رہیں۔ مضامین بھی زیادہ تر انہیں موضوعات پر لکھے۔۔'' (سید وقار عظیم، سوانحی خاکہ، صفحہ 49)

اپنے اس تدریسی سفر کے دوران آپ نے بہت سی ادبی تخلیقات کو جنم دیا۔ ساتھ ہی اقبالیات سے متعلق دو عظیم کتب سامنے آئیں۔

''سید وقار عظیم کی تصنیف و تالیف کردہ کتب کی فہرست مرتب کی جائے تو ان کی تعداد پچاس سے اوپر تک جاتی ہے۔ مقالات و مضامین کی تعداد دو سو سے زیادہ ہے۔ درسی کتب ان کے علاوہ ہیں۔ اُردو فکشن پر وقار صاحب کا کام اتنا وقیع اور جامع ہے کہ کوئی دوسرا فکشن کا نقاد ان کی ہم سری کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔

وقار عظیم صاحب کے علمی اور ادبی کاموں کا ایک اہم پہلو دیگر زبانوں کے تراجم بھی ہیں۔اُنہوں نے بے شمار کتابوں اور مضامین کو اُردو میں منتقل کیا۔ایک مترجم کی حیثیت سے بھی اُن کا مقام بہت اُونچا ہے۔''

(ڈاکٹر اے بی اشرف، سید وقار عظیم: شخصیت اور فن، اکادمی ادبیات، 2017ء، صفحہ 23)

اُن کی چند مشہور تصانیف یہ ہیں: ہمارے افسانے، فنِ افسانہ نگاری، نیا افسانہ، ہماری داستانیں، داستان سے افسانے تک، آغا حشر اور اُن کے ڈرامے، اُردو ڈرامہ فن اور منزلیں، اُردو ڈرامہ تنقیدی اور تجزیاتی مطالعہ، اقبال شاعر اور فلسفی، اقبالیات کا مطالعہ، اقبال معاصرین کی نظر میں، فن اور فنکار، وقارِ غالب، فورٹ ولیم کالج۔

اورینٹل کالج کی ملازمت کے دنوں میں حکومت کی طرف سے رسالہ ''نقوش'' پر کچھ پابندیاں عائد تھیں۔محمد طفیل کے کہنے پر آپ نے اُس وقت اعزازی طور پر ''نقوش'' کی ادارت سنبھالی اور شمارہ نمبر 11 سے 18 شماروں تک بحیثیت مدیر فرائض انجام دیئے۔

1962ء میں آپ نے رسالہ ''اُردو''، کراچی، کے ''بابائے اُردو نمبر'' کی ادارت بھی کی۔

1965ء میں آپ کو صدر شعبہ اُردو (پنجاب یونیورسٹی) مقرر کیا گیا۔اسی سال آپ عارضی طور پر پرنسپل پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور کے منصب پر بھی فائز رہے۔سید وقار عظیم پاکستانی اہل قلم کے ایک وفد کے رکن کی حیثیت سے اپریل 1966ء میں ایک مختصر سے خیر سگالی دورے پر چین تشریف لے گئے۔جہاں چین کے ممتاز اہل قلم اور حکام نے پاکستانی ادیبوں کا گرمجوشی سے استقبال کیا۔جمہوریہ چین کے صدر نے بھی اس وفد کو بازیابی کا شرف بخشا۔ وزیر خارجہ مارشل چن ژی سے اس وفد کی دو گھنٹے ملاقات ہوئی۔اس دورے کے دوران آپ نے چین کے سکولوں کا بھی دورہ کیا اور ایسے چینی اساتذہ سے ملے جو اُردو بلکہ اچھی خاصی اُردو جانتے تھے۔ پیکنگ یونیورسٹی کے صدر شعبہ اُردو سے بھی ملے۔وہاں ایک غیر رسمی محفل میں سید وقار عظیم کو فلسفۂ اقبال پر تقریر کرنے کا موقع ملا۔چین کے شہروں ''پیکنگ'' اور ''شنگھائی'' کے کتب خانے بھی دیکھے۔آپ نے تقریباً تین ہفتے وہاں قیام کیا۔اس سفر کے دوران ڈاکٹر وحید قریشی، اعجاز حسین بٹالوی، پیر حسام الدین، ابن انشاء آپ کے ہمراہ تھے۔

(پروفیسر سید وقار عظیم کے دورہ چین کے تاثرات، صفحہ 89)

''1969ء میں غالب کی صدی کے موقع پر، پنجاب یونیورسٹی لاہور کے شعبہ اُردو میں کرسیٔ غالب، (غالب چیئر) قائم ہوئی، پہلا غالب پروفیسر شپ، سید وقار عظیم کو ملا جس پر آپ اپنی ریٹائرمنٹ 1970ء تک فائز رہے۔'' (نقوش، لاہور، جنوری 1977ء، صفحہ 607)

سید وقار عظیم پنجاب یونیورسٹی کے ادارہ تالیف و ترجمہ سے بھی منسلک رہے۔جو 1964ء میں قائم ہوا۔آپ کے دور میں طبعیات، معاشیات، سیاسیات، فلسفے اور نفسیات کی اصطلاحات وضع ہوئیں جو کتابی شکل میں بھی چھپیں۔

ریٹائرمنٹ کے بعد آپ Visiting Prefessor کی حیثیت سے پنجاب یونیورسٹی سے منسلک رہے۔ملازمت سے سبکدوشی کے بعد آپ کی مصروفیات کا سلسلہ ختم نہ ہو ابلکہ بڑھتا چلا گیا۔آپ بیک وقت بہت سے اداروں کے رکن، نگران اور مشیر تھے۔آپ مجلس ادارت تاریخ ادبیات اُردو پنجاب یونیورسٹی کے رکن رہے۔نصاب ساز کمیٹی حکومت کے رکن بھی رہے۔1965ء سے آپ بزم اقبال مجلس لاہور کی مجلس عاملہ کے رکن بھی چلے آ رہے تھے۔

پروفیسر وقار عظیم ایک جامع الصفات مرنجانِ مرنج اور بہت وضع دار انسان تھے۔ان کے ذکر سے ہی ان کی وہ دلکش، سنجیدہ اور سراپا شفقت شخصیت سامنے آ جاتی ہے جس میں علم کا تدبر، تجربے کی پختگی، محبت اور شائستگی کا بلند معیار نظر آتا تھا۔

سید اقبال عظیم، وقار عظیم کے شخصی حلیے کو یوں بیان کرتے ہیں۔

''دراز قد، تناسب اعضاء اور اچھے ہاتھ پیروں کے باوجود، بے حد دبلا پتلا بدن، کشادہ پیشانی اور ذہین آنکھوں کے باوجود بے آب و تاب اور جھریوں دار چہرہ اور بھرپور علمی وصلاحیت کے باوجود رفتار و گفتار میں انتہاء درجہ کی سادگی اور عجز۔''

''شیروانی، علی گڑھ کٹ پاجامہ اور اکہرے کالر کی قمیض ہمیشہ سے ان کا لباس ہے، جس میں موسم سرما صرف مفلر کا اضافہ کر دیتا ہے۔'' (پروفیسر سید وقار عظیم، سوانحی خاکہ، صفحہ 100)

''سید وقار عظیم صاحب پڑھانے کے لئے کمرے میں تشریف لاتے تو سناٹا چھا جاتا۔ سب طلبہ و طالبات احتراماً کھڑے ہو جاتے۔وقار صاحب بڑے شفیق انداز میں مسکراتے اور یہ مسکراہٹ اتنی دل پذیر ہوتی تھی کہ ہم سب کو اپنی شفقت کے سائے میں لے لیتی۔روسٹرم پر

حاضری لے کر کرسی پر بیٹھ جاتے اور لیکچر شروع کر دیتے۔ نہایت سادہ انداز میں پڑھاتے۔ فکشن کا حصہ کہانی کی طرح دلچسپ انداز میں یون ذہن نشین کراتے کہ دوبارہ اسے پڑھنے کی ضرورت نہ ہوتی اقبالیات کے فلسفیانہ نظریات کو پانی کر کے رکھ دیتے۔ فن اور فنکار کے رشتے تلاش کرتے وقت کہانی کہنے کا سا انداز اختیار کر لیتے اور طلبہ وطالبات اُن کے دلربا اندازِ بیان میں کھو جاتے۔''

(ڈاکٹر اے بی اشرف، سید وقار عظیم: شخصیت اور فن، صفحہ 21)

شوکت تھانوی سید وقار عظیم صاحب کے بارے میں لکھتے ہیں:

''وقار عظیم صاحب کالج میں پروفیسر ہیں مگر ادائیں طالب علمانہ ہیں، دھان پان جسم بھی عجیب کلک نما پایا ہے، ہر وقت ہنسنے والی آنکھیں اور ان آنکھوں میں اپنے مخاطب کے لیے چمک۔ ہوا کا تیز جھونکا آ جائے تو یہ نقاد اُڑ جائے، مگر کسی ادبی بحث میں حصہ لے تو معلوم ہو کہ یہ وقار عظیم نہیں بلکہ ایک کوہ وقار ہے جو اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہوتا۔'' (قاعدہ بے قاعدہ، صفحہ 105)

''ایک رکھ رکھاؤ، ایک وضعداری زندگی میں بھی، تحریر میں بھی۔ جس رکھ رکھاؤ سے بولتے بات کرتے تھے اُسی رکھ رکھاؤ سے فقرہ لکھتے تھے۔'' (انتظار حسین، روزنامہ مشرق لاہور، 17 نومبر 1980ء)

''وقار اور عظمت ان کا امتیاز اور اختصاص ہے وہ ذات میں معلّمین کی برگزیدگی کا اعتبار وافتخار یا علامت ہیں۔ ان کے دم سے اس پیشے کی تقدیس وتحریم، وقار وآبرو اور معلم ومتعلم کے رشتے کی مان دان سلامت ہے ترسیل علم، فن ہی نہیں فسون بھی ہے، وقار عظیم صاحب نے اسے سچ کر دکھایا ہے۔ تدریس کو انہوں نے عبادت اور ریاضت کا ہم عناں وہم معنی بنالیا ہے اور یہ وہ منزل بلند ہے جہاں غالباً وہ تنہا بھی ہیں اور تصرف ذات کے اعجاز اور لحاظ سے پارس صفت کے حامل بھی۔'' (معین الرحمان، سید، شخصیات وادبیات (کچھ وقار عظیم صاحب کے بارے میں)، صفحہ 59)

سید وقار عظیم ان خوش نصیب افراد میں شامل ہیں جن کی خدمات کا اعتراف ان کی زندگی ہی میں کر لیا جاتا ہے۔ اپنی زندگی میں آپ نے بہت نیک نامی اور عزت پائی۔ آپ کی خدمت

کے اعتراف میں وقار صاحب کے نام سے گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور میں ''سید وقار عظیم گولڈ میڈل'' کا اجراء کیا گیا، جواب بھی باقاعدگی سے ہر سال دیا جاتا ہے۔

پروفیسر سید وقار عظیم صاحب اپنی زندگی کے آخری دنوں تک علمی، ادبی اور تعلیمی مشاغل میں مصروف رہے۔ نومبر 1976 کو انہوں نے جان جاں آفریں کے سپرد کی۔ منظور حسین عباسی نے ہجری میں تاریخ کہی:

ازاں کی ہر نفش بودہ فیض بارِ عظیم
تراش قلمش گشتہ شاہکارِ عظیم
چورخت بست زدنیائے دوں' گفت احسن
زسالِ رحلت او ''نوحہ وقار عظیم'' (1396)

(''سید وقار عظیم، پروفیسر'' مطبوعہ سہ ماہی تحریر، دہلی، مرتبہ مالک رام، جلد: 11 شمارہ: 1 جنوری مارچ 1977، صفحہ 113)

شرق و غرب کے تمام معاشروں میں اساتذہ کی قدر و منزلت بنیادی جوہر کی حیثیت رکھتی ہے۔ افراد کے ذہن و فکر کی تعمیر اور معاشروں کی تہذیب و اقدار کی پرورش میں اساتذہ بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔ تعلیم و تدریس کے عمل میں جدید تکنیکی مہارتوں اور متنوع تبدیلیوں کے باوجود استاد کا کردار آج بھی مرکزی اہمیت رکھتا ہے۔ پاکستان جیسے نظریاتی معاشرے اور مخصوص سماجی اقدار کے حامل ماحول میں استاد کی حیثیت اور بھی زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ ہمارے بعض اساتذہ نے کمرہ جماعت کی محدود دنیا سے ہٹ کر پورے معاشرے کی علمی، ادبی اور اخلاقی جہتوں پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔

قومی تاریخ و ادبی ورثہ ڈویژن کے منصوبے کی تکمیل کے لیے ادارہ فروغ قومی زبان کا نامور اساتذہ کے احوال و کوائف اور جذبات کو کتابی شکل میں مرتب کرنے کا سلسلہ لائق تحسین ہے۔ میں اس منصوبے کی کامیابی کے لیے دعا گو ہوں۔

اسلام آباد [illegible] ۲۰۱۸